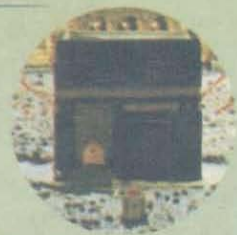


اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ

اور مستشرقین مغرب کا اندازِ فکر



اللَّهُ



ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

مرتب

آصف اکبر



معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب و سنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِيقِ الْإِسْلَامِيِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم

(ذکر)

مستشرقین مغرب کا انداز فکر

(تحقیقی مقالہ، پی ایچ ڈی، جامعہ کراچی)

از

ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

مرتبہ — آصف اکبر

بیحدیکت
لاہور

جملہ حقوق محفوظ

٤٢٠٠٦

کتاب: اسلام، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور

مستشرقین مغرب کا انداز فکر

ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی

صف اکبر

لیت الحکمت، لاہور

تقدوسیہ اسلامک پریس، لاہور

۲۵ روپے

اُسری بیوٹرز

کتاب خانہ



پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات

۱۔ آصف آبر، اسلام آباد 051-4444191

۱۔ نندن، عارف اکبر، 35 وال کٹ اوینو، کرکل روڈ،

44-79584866969: فون

۳۔ بھارت، باندو، ہتورہ، جناب نفیس اکبر اولیس صاحب

فون 97-519-2237228

۴۔ سعودی عرب، جدہ، رئیس اکبر، فون: 966-5-7549243

۵۔ سعودی عرب، مدینہ منورہ، شفیق احمد جنجوعہ، مدینہ الیکٹرونک سیٹائی کالونی،

فون: 966-4-8391907

۶۔ یحییٰ عظیم اکبر، فون: 971-4-2633645

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ

7320318 آرو و مازار، لاهور فون

ای میل: hikmat100@hotmail.com

کراچی میں منے کا یہ

• فضلی بک سیر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی ۲۲۱۲۹۹۔۲۱

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

فہرست مضامین

- ☆ ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی مرحوم (عزم و عمل کی داستان)، از آصف اکبر..... ۵
- ☆ کچھ ضروری باتیں (مرتب آصف اکبر کی طرف سے)..... ۱۵
- ☆ پیش لفظ از ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی (مرحوم)..... ۱۷
- ☆ باب اول: مغرب کا پس منظر..... ۲۳
- رومن ایمپائر کا زوال اور طلوع مغرب..... ۲۴
- باشندے..... ۴۴
- چرچ..... ۴۹
- دوہر نظام اقتدار..... ۷۱
- ☆ باب دوم: ریاست اسلامیہ کی توسیع اور عہدِ وسطیٰ کا مغرب..... ۸۵
- اسلام کا عالمِ عیسائیت میں نفوذ اور علاقائی نقصانات..... ۸۶
- مغرب پر مسلم فتوحات کے دور رس اثرات..... ۹۳
- نفوذِ اسلام کے معاشی نتائج اور معاشرتی اثرات..... ۱۰۸
- اسلام کے ثقافتی اثرات..... ۱۱۳
- ☆ باب سوم: مغرب کا ردِ عمل..... ۱۲۱
- اسلامی اثرات کے خلاف اقدامات..... ۱۲۲
- چرچ کا کردار..... ۱۳۹
- نظریاتی محاذ..... ۱۵۰
- انیسویں صدی عیسوی اور نظریاتی حملے..... ۱۵۵

- ☆ باب چہارم: مستشرقین..... ۱۶۷
- مستشرقین کی ابتداء..... ۱۶۸
- عالمِ اسلام سے علمی استفادہ..... ۱۷۱
- مستشرقین کی کاوشوں کا جائزہ..... ۱۸۲
- ☆ باب پنجم: سترہویں تا انیسویں صدی عیسوی کا مشترکہ انداز..... ۲۰۹
- اسلام، قرآن، حدیث اور حیاتِ طیبہ پر اعتراضات..... ۲۱۰
- مسخ بالعد اور ازالہ اعتراضات..... ۲۱۶
- حیاتِ طیبہ اور مستشرقین..... ۲۶۱
- مسخ کردہ حقائق..... ۲۸۱
- کردارِ نبوی..... ۳۱۹
- ☆ باب ششم: حاصلِ کلام..... ۳۵۳
- ☆ کتابیات..... ۳۶۱
- ☆ اشاریہ..... ۳۶۹

ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی مرحوم عزم و عمل کی داستان

(آصف اکبر)

یہ کتاب، ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی مرحوم کے اس تحقیقی مقالہ پر مشتمل ہے جس پر انہیں ۱۹۸۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے اسلامی علوم میں پی ایچ ڈی کی سند عطا کی گئی تھی۔ مقالے کا موضوع مغربی دنیا کے ان صاحبان علم کا انداز فکر ہے، جنہیں مستشرقین (Orientalist) کہا جاتا ہے، اور جنہوں نے سترہویں صدی عیسوی سے لیکر انیسویں صدی عیسوی تک اسلام کے موضوع پر اختصاص کیا، اور اسلام کو نیچا دکھانے، جھوٹا، حقیر اور کمتر ثابت کرنے کے لیے، (بزع خود) تحقیقی کتابیں لکھیں۔ میرا مقصد مقالے پر اظہار خیال کرنا نہیں ہے، کیونکہ یہ کام علماء اور فضلاء بہت بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ اس وقت مقصد تحریر صرف اپنے قابل فخر والد صاحب، ڈاکٹر جیلانی صاحب کی زندگی پر کچھ روشنی ڈالنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مقالہ انکی تحقیقی کاوشوں کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ ان کا اصل کام توریث و انجیل، اور دیگر مذاہب کی مقدس کتب میں پائی جانے والی بشارتوں کی روشنی میں مرتب کی جانے والی رسول اللہ ﷺ کی سیرت طیبہ ہے۔ یہ کتاب ہنوز منظر طبعات ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا کرے گا تو انشاء اللہ کسی وقت اسے بھی پیش کرنے کا بیڑہ اٹھاؤں گا۔

اس تحقیقی مقالے کے مصنف، عام محققین کے حالات کے برعکس، تدریسی شعبے سے متعلق نہیں تھے۔ انکا پیشہ مہندی (Engineering) تھا، اور وہ ایک سرکاری ادارے سے جنرل مینیجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ایک تیکنیکی شعبے سے تعلق رکھنے والا ایک بڑا عہدیدار، اسلامی علوم میں پی ایچ ڈی کرے، یہ ایک انہونی بات ہے۔ اور پھر موضوع بھی منفرد۔ یہ کیونکر ہوا، میری خواہش ہے کہ اس داستان میں، میں اس کتاب کے قارئین کو بھی شریک کروں، کیونکہ یہ حوصلے، عزم و عمل، انتھک جدوجہد، علمی پیاس، عشق رسول اللہ ﷺ، غیرت ایمانی، رکاوٹوں، حوصلہ شکنیوں، پیشہ ورانہ رقابتوں اور بے لوث کوششوں کی داستان ہے۔ ایسی داستانیں ہمارے زوال پذیر معاشرے میں روز بروز جنم نہیں لیتیں۔

ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی مرحوم ۲۶ اپریل ۱۹۲۶ء کو بسوہ، ضلع فٹپور، یوپی، بھارت کے ایک چھوٹے زمیندار، علمی، مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم سید عبدالحمید صاحب ایک دیندار، پڑھے لکھے، نیک طبع اور روشن خیال زمیندار تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے بڑے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں، جبکہ تین بھائی ان سے چھوٹے تھے۔ الحمد للہ انکے دو چھوٹے بھائی حیات ہیں، جبکہ دیگر بہن بھائی اپنے رب سے جا ملے ہیں۔ سب سے بڑے بھائی محمد اکبر صاحب مولوی نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا، سعید اکبر صاحب صوفی نے نظام ریلوے (حیدر آباد دکن) میں ملازمت کی، ان سے چھوٹے حفیظ اکبر الیاس صاحب نے کامرس میں گریجویشن کیا اور کراچی میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے اس وقت کے صدر اسکندر مرزا سے تمغہ حاصل کیا، ان سے چھوٹے نفیس اکبر اولیس صاحب نے دیوبند سے سند حاصل کی اور مدزی کا پیشہ اختیار کیا، جبکہ سب سے چھوٹے بھائی جلیل اکبر صاحب نے زمینیں سنبھالیں۔

یوپی کے کئی تعلیم یافتہ گھرانے ایسے تھے جن کی مستقل رہائش تو اپنے دیہی علاقوں میں تھی مگر کسب معاش کے سلسلے میں وہ ریاستوں وغیرہ میں ملازمت کرتے تھے۔ ہمارے گھرانے کے افراد ملازمت کے سلسلے میں زیادہ تر ریاست حیدر آباد، دکن جاتے تھے۔ یہ ایسا ہی سلسلہ ہے، جیسے آجکل پنجاب اور صوبہ سرحد کے بہت سے لوگ کراچی میں کام کرتے ہیں مگر انکی مستقل رہائش، اپنے آبائی علاقوں میں ہوتی ہے۔ جیلانی صاحب کے دادا، پردادا بھی ملازمت کے لیے حیدر آباد میں مقیم رہے تھے۔ گھر کی زمینوں کی آمدنی ناکافی ہونے کی وجہ سے انکے بڑے بھائی سعید اکبر صاحب نے، جوان سے عمر میں تقریباً دس بارہ سال بڑے تھے، نوعمری میں ہی نظام ریلوے میں ملازمت کر لی تھی، جہاں وہ ریلوے گارڈ کے فرائض انجام دیتے تھے۔ واضح رہے کہ اکبر ہمارا خاندانی نام ہے، جو ڈاکٹر صاحب کے پردادا کے نام پر چل رہا ہے، اور اس وقت ساری دنیا میں اس خاندان کے سو سے زیادہ خواتین و حضرات ایسے ہیں جن کے نام کا ایک حصہ اکبر ہے۔ جیلانی صاحب کا پیدائشی نام بھی 'معشوق اکبر' تھا، اور عرفیت جیلانی تھی مگر انہوں نے اسکول کے زمانے میں ہی اس نام کو نامناسب جانتے ہوئے اپنا نام، جیلانی کی مناسبت سے، عبدالقادر رکھ لیا تھا۔ اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ نوعمری سے ہی عزم و شعور کی دولت سے مالا مال تھے۔

آٹھ دس سال کی عمر میں ہی وہ اپنے والدین کو چھوڑ کر اپنے بھائی کے پاس حیدر آباد دکن چلے گئے، جہاں انکی پرورش کی ساری ذمہ داری انکی بھائی 'سلمیٰ خاتون' نے اٹھائی۔ اس کے لیے وہ ساری زندگی اپنے بھائی اور بھائی کے احسان مند رہے اور انہیں اپنے ماں باپ کی طرح سمجھتے رہے۔ اس طرح انکی ابتدائی تعلیم و تربیت حیدر آباد دکن میں ہوئی اور وہاں کے علمی ماحول نے انکے کردار کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔

اسکول کی تعلیم سترہ برس کی عمر میں مکمل کرنے کے بعد انہوں نے اپنا بوجھ خود اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ انکے والد کے اور بھائیوں کے مالی حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ کالج کی تعلیم کی عینائی کر سکتے۔ سعید اکبر صاحب کے ذریعے انہوں نے نظام ریلوے میں اپنٹرشپ حاصل کر لی، جو تین یا چار سال کا کورس تھا، لیکن دو تین سال

کے بعد ہی بڑے صغیر کی تقسیم ہو گئی، جس کے بعد حیدر آباد دکن کے حالات دگرگوں ہوتے گئے، اور انکے لیے تعلیم جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔ حیدر آباد کے دفاع کے لیے ریاست کی فوج انتہائی ناکافی تھی۔ بھارت اسکو ضم کرنے کے درپے تھا، اس لیے سید قاسم رضوی کی قیادت میں وہاں کے مسلمانوں نے رضا کا تحریک شروع کی۔ جیلانی صاحب بھی اس تحریک کے رضا کاروں میں شامل ہو گئے اور انہوں نے جیسی بھی میسر تھی فوجی تربیت بھی حاصل کی۔ اس سے پہلے بھی وہ اپنے آبائی گھر کے گاہے بگاہے قیام کے دوران حربی فنون، بنوت وغیرہ سیکھتے رہے تھے، جنکی انہوں نے اچھی خاصی مشق بہم پہنچالی تھی۔

ستمبر ۱۹۳۸ء میں قائد اعظم کے انتقال کے دوسرے ہی دن بھارت نے ریاست حیدر آباد میں اپنے فوجی دستے داخل کر کے اس پر قبضہ کر لیا، اور اسکو بھارت کا ایک حصہ بنالیا۔ رضا کاروں نے حتی المقدور مزاحمت کی اور بے شمار شہید ہوئے۔ تمام رضا کار گردن زدنی قرار پائے، اور اندھا دھند پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ اب ڈاکٹر صاحب کا سابق ریاست میں کوئی مستقبل نہیں تھا۔ بھائی کو اپنی اور بچوں کی جان کی سلامتی اور اپنی ملازمت خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ انکے مشورے سے ریل گاڑی کے جانوروں کے ڈبے میں چھپ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوئے، اور اپنے والد کے پاس پہنچے۔ ہفتہ دن دن میں کسی نے مخبری کر دی اور مقامی پولیس اگلو گرفتار کرنے کے درپے ہوئی۔ وہاں سے فرار ہوئے اور کراچی آ کر دم لیا۔ جس وقت کراچی پہنچے تو انکے پاس پچاس روپے اور ایک کھل، اور جسم پر کپڑوں کا ایک جوتا تھا۔ یہاں ایک عزیز کے گھر عارضی قیام کیا اور کسی محکمے میں کلرکی کی نوکری کر لی۔

ایک ڈیڑھ سال کے بعد انہیں پتہ چلا کہ لاہور میں ریلوے کے محکمے میں کچھ ٹیکنیکل لوگوں کی ضرورت ہے۔ انکا نظام ریلوے کا ادھورا ڈپلومہ اس نوکری کے لیے کام آیا، اور ۱۹۵۰ء میں وہ مغلیہ ریلوے ورکشاپ میں ملازم ہو گئے۔ ایک سال کے بعد اپنے والدین سے ملنے کے لیے ہسہ گئے۔ اس موقع پر والدین نے انکی شادی حافظ سید حبیب الرحمن جعفری صاحب (جوان کے پھوپھی زاد بھائی تھے)، کی بڑی بیٹی رضیہ سلطانہ سے کر دی اور وہ اپنی بیوی کو لیکر لاہور آ گئے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں عنایت کیں۔ ان میں سب سے بڑا میں ہوں اور میری پیدائش لاہور میں نومبر ۱۹۵۳ء میں ہوئی۔ مجھ سے دو سال چھوٹی بہن 'اضفیہ' بھی لاہور میں پیدا ہوئیں، جبکہ کراچی میں پیدا ہونے والے، عطیہ مجھ سے پانچ سال، عارف اکبر نواسل، توصیف اکبر گیارہ سال، احنف اکبر تقریباً تیس سال (جنہیں چھ ماہ کی عمر میں اللہ نے واپس لے لیا)، اور اوصاف اکبر بائیس سال چھوٹے ہیں۔

لاہور کے قیام کے بھی انکی زندگی پر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ یہاں انکی زندگی میں تین اہم چیزیں داخل ہوئیں۔ ٹریڈ یونین ازم، علم و ادب اور برج کا کھیل۔ ٹریڈ یونینز کے حوالے سے انکا سابقہ مشہور کمیونسٹ ٹریڈ یونین لیڈر مرزا ابراہیم سے بھی رہا اور کمیونزم بھی انکی زندگی میں گھس آیا۔ علم و ادب کے حوالے سے انکے قریبی دوستوں میں شوکت تھانوی، احسان دانش اور کریم فرہان میں جگہ مراد آبادی شامل رہے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ان کے اس دور کے ایک ساتھی جناب عبدالکلیم وفا الحمد للہ بقیدِ حیات ہیں، اور لاہور میں ہی ہیں، اور ابھی حال ہی میں [۲۰۰۴ء] انکی شاعری کا ایک مجموعہ سامنے آیا ہے۔ جیلانی صاحب نے اس دور میں شاعری بھی کی اور اچھی شاعری کی۔ غزلیں بھی لکھیں، نظمیں بھی۔ انکی شاعری میں انقلابی اقدار ہمیشہ نمایاں رہیں۔ انکی ایک انقلابی نظم کا ایک نمائندہ مصرعہ پیش کرتا چلوں،

”بدلنے والے شعور انسان جو ہم نہ ہو گئے تو کون ہوگا“

اس علمی ادبی ماحول نے انکو مطالعے کا ذوق فراہم کیا۔ اور لاہور کے سات سالہ قیام میں انہوں نے اردو و فارسی راگزیری ادب، تاریخ، مذہب، فلسفہ، منطق، انجینیئرنگ، وغیرہ پر تقریباً دو تین سو کتابیں پڑھ ڈالیں، جو ماہانہ تین چار کتابوں کا اوسط بنتا ہے۔ اس کو مبالغہ نہ سمجھا جائے، جو کتابیں انہوں نے خرید کر پڑھیں، وہ کراچی بھی لیکر گئے اور میں نے کئی صندوق انکی کتابوں کے دیکھے ہیں اور ان سے کسی حد تک استفادہ بھی کیا ہے۔ زیادہ تر کتابیں انگریزی زبان کی تھیں۔ اس کے بعد کراچی کے قیام کے دوران بھی سو سے زائد خریدی ہوئی کتابیں انکی الماریوں کی زینت بنیں۔ کیونکہ اس بے ضرر تعلق کی بازگشت ضیاء الحق صاحب کے زمانے میں سنی گئی جب خفیہ پولیس کے ایک اہلکار تفتیش کرنے کے لیے ہمارے گھر آئے، اور یہ جان کر مطمئن ہو کر چلے گئے کہ جیلانی صاحب ایک مذہبی اسکالر بن چکے ہیں۔

کیونٹ لٹریچر کے حوالے سے ان کے مطالعے میں وہ اعتراضات بھی آئے جو اہل مغرب اسلام پر کرتے آئے ہیں۔ ان اعتراضات کو کیونٹ اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس دور میں جیلانی صاحب کا ذہن مذہبی نہیں تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ انہوں نے کبھی مذہب کی مخالفت کی ہو یا اسے غیر اہم جانا ہو۔ وہ اس دور میں بھی تمام مذہبی اور اخلاقی اقدار کی مکمل پاسداری کرتے تھے۔ ہاں مولویت سے وہ شروع سے بیزار تھے اور ہمیشہ رہے۔

۱۹۵۶ء میں انہیں کراچی شپ یارڈ میں ایک بہتر ملازمت مل گئی، اور وہ لاہور کو خیر باد کہہ کر کراچی منتقل ہو گئے۔ لاہور میں تو قریبی اعزہ کوئی نہیں تھے مگر کراچی میں بہت تھے۔ لاہور میں تو وہ سارا عرصہ کرائے کے مکان میں رہے مگر کراچی آنے کے ایک سال کے اندر انہوں نے لیاقت آباد میں ایک کمرے کا ایک مکان خرید لیا۔ اس کے بعد تقریباً پانچ سال کا عرصہ انہوں نے اس مکان کی تعمیر نو میں گزارا۔ اس عرصے میں ایوب خان کا مارشل لاء بھی گزرا، جس میں عوام کی سہولت کی خاطر بسوں میں کھڑے ہو کر سفر کرنے پر پابندیاں عائد کی گئیں، اور بس اسٹاپوں پر سہولت یافتہ عوام کی لمبی لمبی قطاریں لگ گئیں، جنہیں دفتر دیر سے پہنچنے کی پاداش میں سزائیں بھی پڑتی تھیں۔ اس مسئلے کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ دفتر سائلنگ پر جانا شروع کر دیا، جو ایک دو سال تک جاری رہا۔ یہ یکطرفہ فاصلہ تقریباً نو [۹] میل یا پندرہ کلومیٹر کا بنتا تھا۔ دفتر سے واپس آ کر مکان کی تعمیر میں ایک مزدور کی حیثیت سے لگ جاتے تھے۔ انٹینس تو مستری بناتے تھے، مگر انکی سیپانگی کے لیے پانی کافی دور سے بالٹیوں میں بھر کر لاتے تھے اور سیپانگی کرتے تھے۔ اسی طرح انٹینس اٹھانا رکھنا، دیواروں اور چھت کی ترائی کرنا وغیرہ،

پھر مجھے اور دیگر بچوں کو پڑھانا، اور پھر بھی وقت مل جائے تو کوئی نہ کوئی کام ڈھونڈ لینا، انکا معمول تھا۔ مجھے یا نہیں کہ اس زمانے میں انکا مطالعے کا مشغلہ کس حد تک جاری رہا، کیونکہ میرے سونے تک وہ کسی نہ کسی کام میں مشغول ہی رہتے تھے۔ اب مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ کام کرنا انکا نشہ تھا، اور وہ یہ نشہ ٹوٹنے نہیں دیتے تھے۔

۱۹۶۱ء میں ہمارے گھر بجلی آئی۔ یہ گلی کا، بلکہ اس محلے کا پہلا گھر تھا جس میں بجلی آئی تھی۔ بجلی کی تقریباً مکمل وائرنگ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے کی۔ اس کے بعد انہوں نے گھر پر سالانہ محفل میلاد کا سلسلہ شروع کیا، جسمیں خاندان کے مرد عورتیں جمع ہوتے تھے اور وہ خود میلاد پڑھتے تھے۔ کچھ ہی عرصے میں گھر پر ماہانہ مشاعرے کا بھی سلسلہ شروع ہو گیا جو تقریباً ۱۹۷۰ء تک جاری رہا۔ ۱۹۶۲ء میں کراچی شپ یارڈ نے اپنا پہلا جہاز ’وہمبرل‘ تیار کیا۔ اس کی افتتاحی تقریب میں غالباً صدر مملکت نے شرکت کی تھی۔ جیلانی صاحب نے اس موقع پر ایک خوبصورت نظم پڑھی جو بعض اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔

۱۹۶۵ء یا اس کے لگ بھگ، انہوں نے اپنے دفتر میں بھی سالانہ جلسہ ’عید میلاد النبی کا سلسلہ شروع کروایا جس میں وہ خود بھی ایک مقرر ہوتے تھے۔ یہاں سے ان کے دینی مطالعے کا سلسلہ چلا۔ اس مطالعے کے ضمن میں ان کی نظر سے کچھ ایسے حوالے گزرے جن میں یہ کہا گیا تھا کہ قدیم آسمانی کتب میں رسول اللہ ﷺ کے بارے میں واضح بشارتیں دی گئی ہیں۔ اردو میں دستیاب تو ریت و انجیل میں تو بظاہر ایسی بشارتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ انہوں نے انگریزی متن کا مطالعہ کیا اور محققہ کتابیں پڑھیں تو انہیں یہ اندازہ ہوا کہ ترجمہ کرتے وقت جب ایسی کوئی چیز سامنے آتی ہے تو مترجمین اسکا ترجمہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ حق چھپ جائے، جیسے اصل عبرانی متن میں لفظ ’محمد‘ آیا ہے، تو اردو میں اسکا ترجمہ ’عشق انگیز‘ کیا گیا ہے۔ اس بات نے شوق کو انگیز کیا۔ انہوں نے پارسیوں، ہندوؤں، بدھوں، زرتشتیوں وغیرہ کی مذہبی کتابوں کا بھی مطالعہ کیا اور عربی زبان بھی سیکھنی شروع کر دی۔ اس دوران قرآن، تفسیر، حدیث، تاریخ اسلام وغیرہ کا بھی مطالعہ جاری رکھا۔ ساتھ ساتھ ’منہج یورسیلف‘ کتابوں کی مدد سے، جو انہوں نے یورپ سے منگوائی تھیں، عبرانی زبان کا بھی مطالعہ شروع کیا۔ جرمنی میں چھپی ہوئی ایک بائبل بھی منگوائی اور اسکا مطالعہ شروع کیا، جسکا متن عبرانی میں تھا، اور جسمیں بحر مردار سے تازہ دریافت شدہ مخطوطات کی مدد سے حاصل ہونے والی معلومات سے توریت اور انجیل کو مرتب کیا گیا تھا، اور مخطوطاتی انجیل اور مروّجہ انجیل کا موازنہ کیا گیا تھا۔ کراچی میں انہیں عبرانی زبان کا جاننے والا کوئی نہیں مل سکا، جو اس سلسلے میں کوئی مدد کر سکتا۔ اس بائبل کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوا کہ بہت ساری بشارتوں کو دانستہ یا نادانستہ مسخ کر دیا گیا ہے۔

اب اسلام کی حقانیت انکے سامنے انتہائی واضح ہو کر آگئی تھی۔ اس یقین نے انکی زندگی کو مزید صالح بنادیا۔ اب انہیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ غیروں کے پروپیگنڈہ نگاروں کے، خاص کر مغربی تعلیم یافتہ طبقے کے ذہنوں میں جو شکوک و شبہات پیدا کر دیے ہیں، ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ لاہور کے قیام کے دوران انہیں جس قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا، اس سے انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ الحاد اور تشکیک کی جڑیں کہاں کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

انہیں جس قسم کے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا، اس سے انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ الحاد اور تشکیک کی جڑیں کہاں تک پھیل چکی ہیں۔

اس مطالعے کے لیے انہیں شدید محنت کرنی پڑی۔ بد قسمتی سے لاہور میں، کام کے دوران، کسی ساتھی کی لا پرواہی کے نتیجے میں آتش بھٹی میں جھانکنے والی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا تھا، جس میں جھانکنے سے انکی آنکھیں بھٹی کی آگ سے جھلس گئی تھیں۔ اس حادثے کے نتیجے میں کراچی آنے کے بعد ان کو موتیا ہو گیا۔ ایک سال کے وقفے سے دونوں آنکھوں کی جراحی کی گئی۔ اس زمانے میں یہ عمل بجد صبر آزما ہوتا تھا۔ جراحی کے بعد ان کی آنکھوں پر بجد موٹے عدسوں کے چشمے لگ گئے۔ پڑھنے کا چشمہ الگ، عام استعمال کا الگ تھا۔ رات کے وقت چلنا اچھا خاصا مشکل کام تھا۔ دن میں بھی دائیں بائیں دیکھنے کے لیے پوری گردن موڑنا پڑتی تھی۔ اس مجبوری کے نتیجے میں وہ سائل، بانیک، کارو غیرہ، کچھ نہیں چلا سکتے تھے اور آنا جانا بسوں پر ہی کرتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس لاکار کو بھی قبول کیا۔ دن بھر دفتر کی مشقت کے بعد شام میں وہ براہ راست کتب خانوں میں چلے جاتے تھے۔ ان کے مطلب کی کتب نایاب تھیں۔ کچھ کتب بعض اہل علم جیسے خالد الخلق صاحب کے ذاتی کتب خانوں میں ہی تھیں۔ گھرانے کی اجازت کوئی نہیں دیتا تھا۔ یہی مہربانی تھی کہ بیٹھ کر پڑھنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ فوٹو اسٹیٹ کا لفظ بھی اس زمانے میں کسی نے نہیں سنا تھا۔ صبح بچے گھر سے نکل کر انکی گھر واپسی کبھی دس بجے رات اور کبھی بارہ بجے تک ہوتی تھی۔ کتابیں پڑھتے تھے اور انکے نوٹ اور حوالے ڈائریوں پر لکھتے جاتے تھے۔ چھٹی کا دن ان حوالوں کو مرتب کرنے میں استعمال ہوتا تھا یا پھر گھر کے ضروری کاموں میں، کیونکہ اس وقت تک ہم سب بھائی اسکول میں ہی تھے، اور خاطر خواہ انکا ہاتھ نہیں بٹا سکتے تھے۔ اس علم جوئی کے دوران انکی صحبتیں بہت سی محترم صاحب علم شخصیتوں سے رہیں جن میں مولانا ڈاکٹر فضل الرحمن انصاری (اسلامک سینٹر تارنہ ناظم آباد والے) اور مولانا حامد حسن قادری صاحب کا نام مجھے یاد ہے۔ انہوں نے ان صاحبان سے بہت فیض اٹھایا۔

اسی دوران انہوں نے مشہور شاعر قاتل دہلوی کا ایک واقعہ کہیں پڑھا کہ وہ نانکی کے پاس ڈاڑھی منڈوانے کے لیے گئے۔ نانکی نے ان سے پوچھا ”آقا، شہریش می تراشی؟“ یعنی آپ اور ڈاڑھی منڈواتے ہیں، انہوں نے بھنا کر جواب دیا ”ہلی، ریش خودی تراشم، دل کسی رانی تراشم“، ہاں، ڈاڑھی منڈواتا ہوں، کسی کا دل نہیں چھیلتا۔ اس نے آہستہ سے کہا، ”دل کسی نمی تراشی، آلا دل رسول“، یعنی کسی کا دل نہیں چھیلتے سوائے رسول اللہ ﷺ کے دل کے۔ یہ عشق رسول ﷺ ہی تھا کہ اس دن کے بعد سے ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی صاحب نے باقاعدہ ڈاڑھی رکھ لی۔

اس عیتق مطالعے سے انہیں یہ اندازہ ہوا کہ قدیم کتب مقدسہ میں یہ بشارتیں اتنی کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ ان کی روشنی میں پوری سیرت طیبہ مرتب کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ اب انہوں نے اپنا نصب العین ایک ایسی کتاب سیرت رسول اللہ ﷺ کی تدوین کو بنالیا جس میں ہر واقعے کا حوالہ کسی قدیم مقدس کتاب سے دیا گیا ہو۔ اس اہم کام میں تین سال سے زیادہ کا عرصہ لگ گیا۔ اس دوران انہیں خیال آیا کہ کتاب کا آخری باب کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اگر وہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک، مسجد نبوی میں بیٹھ کر لکھنے کا موقع مل جائے تو کیا ہی بابرکت بات ہو۔ چنانچہ انہوں نے حج کی درخواست دی جو اللہ کے بے پایاں کرم سے قبول ہوگئی، اور ۱۹۷۲ء میں وہ پانی کے جہاز کے ذریعے حج کا مقدس فریضہ ادا کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ اور اس طرح اس کتاب کا اختتامی باب انہوں نے مسجد حرام اور مسجد نبوی میں بیٹھ کر لکھا۔

اسی اثناء میں جب یہ بات پھیلی کہ جیلانی صاحب ایک سیرت کی کتاب لکھ رہے ہیں تو کچھ اعزہ نے، جو بی۔ اے وغیرہ کی سند رکھتے تھے، ازراہ طنز کہا کہ پڑھے لکھے تو ہیں نہیں، کتاب لکھنے چلے ہیں۔ یہ بات درست تھی کہ ان کے پاس اس وقت تک کسی تعلیمی بورڈ کی کوئی سند نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب ایک حد درجہ غیور اور خوددار آدمی تھے۔ انہوں نے عملی جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً تیس سال کے وقفے کے بعد، جس دور میں، میں کراچی یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھا، انہوں نے انٹر کے امتحان کے لیے پرائیویٹ رجسٹریشن کروائی، اور دونوں سالوں کا امتحان ایک ساتھ دیا۔ اس امتحان کو انہوں نے فرسٹ ڈویژن میں بڑی آسانی کے ساتھ پاس کر لیا۔ پھر بی۔ اے کے لیے رجسٹریشن کروائی، اسے بھی فرسٹ کلاس میں پاس کیا اور پھر اسلامی علوم میں ایم۔ اے بھی فرسٹ کلاس میں پاس کر لیا۔ اس طرح سے جس سال میں نے اپنا ایم۔ ایس۔ سی، مکمل کیا، اسی سال انہوں نے بھی پچاس سال کی عمر میں، ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔

اس درمیان میں انہوں نے اپنی کتاب سیرت کی مائپنگ وغیرہ مکمل کر لی تھی اور اس کو شش میں تھے کہ کوئی ادارہ اسے چھاپنے پر تیار ہو جائے۔ یہ کتاب تقریباً ایک ہزار سے زائد مائپ کیے ہوئے صفحات پر مشتمل تھی۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی دفعہ اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ اگر میں اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر اس کتاب کو اپنے اخراجات سے چھپوا بھی لوں تو اسکی اشاعت کون کرے گا۔ انکا خیال تھا کہ بڑے ادارے اس کی کماٹھ اشاعت کر سکیں گے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کئی پبلشرز سے رابطہ کیا۔ اندازہ یہ ہوا کہ پبلشرز صرف ان کتابوں کو چھاپنے میں دلچسپی رکھتے ہیں جو کسی معروف مصنف کی لکھی ہوئی ہوں، یا کسی مقبول عوام موضوع پر ہوں۔ یہ موضوع علمی اعتبار سے بہت اہم تھی، مگر تجارتی نقطہ نظر سے اہم نہیں تھا۔ انہوں نے پھر یہ کوششیں کیں کہ کوئی سرکاری ادارہ ان کی کتاب شائع کرنے کو تیار ہو جائے۔ بھٹو دور کے وزیر مذہبی امور جناب کوثر نیازی کو بھی انہوں نے کئی خطوط لکھے، جنکے انکے عملے کے لوگوں نے نہایت مناسب دفتری زبان میں معذرت خواہانہ جوابات دیے۔ اب انہوں نے متعدد دیگر معروف شخصیات سے، جن میں حکیم محمد سعید شہید، ڈاکٹر اسرار احمد، اے کے بروہی، محمد طفیل مدیر نقوش، وغیرہ شامل ہیں، رابطہ کیا اور بالمشافہ ملاقاتیں کیں مگر کسی نے بھی اس بات کو درخور اعتناء نہیں سمجھا۔

اس مایوسی نے انہیں بد دل تو ضرور کیا مگر وہ ہمت ہارنے والے آدمی نہیں تھے۔ اب انہوں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۹۷۸ء میں جب انکی عمر باون سال کی تھی، انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے کتا بل و علم سندھ کی پی۔ ایچ۔ ڈی کی کئی کئی دفعہ درخواستیں دیں اور بالمشافہ ملاقاتیں کیں، جن میں حکیم محمد سعید شہید، ڈاکٹر اسرار احمد، اے کے بروہی، محمد طفیل مدیر نقوش، وغیرہ شامل ہیں، رابطہ کیا اور بالمشافہ ملاقاتیں کیں مگر کسی نے بھی اس بات کو درخور اعتناء نہیں سمجھا۔

صاحب نے خود ڈائریکٹر شپ قبول کی، اور مستشرقین کے اندازِ فکر پر کام کرنے کے لیے مقالہ 'بذاکا موضوع ان کے لیے منتخب کیا۔ اس دور میں انکی صحت مسلسل محنت سے کافی حد تک متاثر ہو چکی تھی۔ پیروں میں ورم، بے خوابی، تھکن وغیرہ معمول بن چکے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی صحت کی پروا نہیں کی اور اس مقالے کی تکمیل کے لیے دل و جان سے مصروف ہو گئے۔ پھر وہی شب و روز کی محنت تھی، وہی کتب خانوں کے چکر تھے۔ پھر کاتبوں اور نائپٹلوں سے بھی معاملات کرنے پڑے۔ دو تین سال کی مختصر مدت میں انہوں نے یہ مقالہ جنوری ۱۹۸۰ء میں حصول سند کے لیے جمع کروادیا۔

لیکن اگلا مرحلہ اتنا آسان نہیں تھا۔ جلد ہی انکے مقالے کے ڈائریکٹر جناب طاہر ملک صاحب کو ناخبر یا میں ایک اچھی ملازمت مل گئی، اور وہ چھٹی لیکروہاں چلے گئے۔ انکے جانشین کو پی۔ ایچ۔ ڈی کے اس مقالے کو سند دلوانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جیلانی صاحب کی باتوں سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ طاہر ملک صاحب سے انکے جانشین کی کوئی رقابت قسم کی چیز تھی۔ جس مقالے کو لکھنے میں دو تین سال کی مختصر مدت لگی، اسے سنڈ کیٹ پانچ سال میں بھی پرکھ نہیں سکی، حالانکہ منصفین نے ایک سال کے اندر اپنی مثبت سفارشات بھجوا دی تھیں۔

پانچ سال کے بعد جب طاہر ملک صاحب پاکستان واپس آئے اور دوبارہ انہوں نے صدر شعبہ کا منصب سنبھالا، تب انکی کوششوں کے نتیجے میں ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی صاحب کو اس مقالے پر ساٹھ سال کی عمر میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند عطا کی گئی۔

اب انہوں نے کوشش کی کہ اس مقالے کو ہی کتاب کی شکل میں چھپوایا جائے۔ اس کے لیے بھی بہت بھاگ دوڑ کی۔ انکا خیال تھا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے، لوگ اسکے موضوع کو دیکھتے ہوئے اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے، مگر یہ خیال خام تھا۔ کسی نے بھی اس کی پذیرائی نہیں کی۔ بڑی کوششوں کے بعد تاج کمپنی والوں نے، کڑی شرائط پر، اسکی اشاعت پر رضامندی ظاہر کی۔ کتاب کی کتابت شروع ہوئی مگر ابھی دو تہائی سے کچھ زیادہ ہی کتابت مکمل ہوئی تھی کہ تاج کمپنی بھی اس دور کے سرمایہ کار کمپنیوں کے بحران کا شکار ہو گئی۔ یہ ۱۹۹۱ء کا دور تھا۔ کمپنی کی تالہ بندی ہو گئی اور منصوبہ ختم ہو گیا۔

۶۔ فروری ۱۹۹۲ء کو یہ نادر روزگار انسان اپنی آنکھوں میں اپنی کتابوں کی اشاعت کا خواب لیے اپنے رب سے جا ملا۔ دل کا دوسرا دورہ اس کا سبب بنا۔ پہلا شدید دورہ دسمبر ۱۹۸۴ء کی آخری تاریخ کو پڑا تھا۔ ان کی تدفین لیاقت آباد اور حسن اسکوائر کے درمیان واقع قبرستان میں کی گئی، اس موقع پر میرے پھوپھی زاد بھائی علی اکبر شاہد صاحب نے کچھ اجنبیوں کو جو کسی اور میت کی تدفین کے لیے آئے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ یہ کس کا جنازہ ہے، یہ کہتے سنا کہ یہ کسی ولی اللہ کا جنازہ لگ رہا ہے۔

ڈاکٹر جیلانی انتہائی خوددار انسان تھے۔ زندگی بھر کسی سے قرض نہیں مانگا۔ ان کی وفات کے بہت عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ وہ ضرورت مند لوگوں کو اکثر خاصی بڑی رقم قرض دے دیا کرتے تھے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

انکی روزمرہ کی زبان، اپنے عالی خاندان کی مناسبت سے، انتہائی شریفانہ تھی۔ گھر میں، دوستوں میں، غصے کے عالم میں، مایوسی میں، کبھی بھی ان کی زبان سے کوئی برہنہ حرف ادا نہیں ہوا۔ وعدے کے پابند تھے۔ بزرگوں کا ادب اور رشتوں کی پاسداری کرتے تھے، لیکن اگر کسی نے ان کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تو پھر ہمیشہ کے لیے اس سے بیگانہ ہو جاتے تھے۔ ریاکاری انہیں چھو کر بھی نہیں گئی تھی۔ عام لوگوں کی محفل میں ایسی گفتگو کبھی غلطی سے بھی نہیں کی جس سے علم کا رعب پڑے۔ یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ ساری زندگی کسبِ حلال میں گزاری اور کسی مشتبہ چیز میں بھی کبھی ملوث نہیں ہوئے۔ ان کے طرزِ زندگی سے یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسے عہدے پر فائز ہوں گے جس کے لیے لوگ تمنائیں کرتے ہیں۔

زندگی انہوں نے سادگی سے بسر کی۔ کبھی پلاٹوں یا آسائش زندگی کے پیچھے نہیں دوڑے۔ آخر عمر تک لیاقت آباد کے توڑے گز کے اسی مکان میں مقیم رہے جو انہوں نے کراچی آنے کے بعد سترہ سو روپے میں خریدا تھا، اور ان کے لواحقین اب بھی اسی مکان میں رہ رہے ہیں۔ حالانکہ اس دوران ان کے دوسرے ساتھی ناظم آباد اور گلشن اقبال وغیرہ میں بنگلے بنائے چکے تھے۔

۱۹۸۲ء یا ۱۹۸۳ء میں جب وہ کراچی شپ یارڈ میں (مینجر کے مساوی) اسٹور سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر تھے، اور پروکیورمنٹ کا کام بھی اسی شعبے کے سپرد تھا، اس ادارے میں ایک (ریٹائرڈ) ریئر ایڈمرل، ایم ڈی بن کر آئے، اور جیسا کہ سب کرتے ہیں، پہلی میٹنگ میں انہوں نے تمام افسران کے لئے لیے اور حسب استطاعت برا بھلا کہا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اعلان بھی کیا کہ میں سب کو ٹھیک کر دوں گا۔ اس ضمن میں انہوں نے جیلانی صاحب کی طرف دیکھ کر کہا کہ مجھے سب پتہ ہے کہ اسٹور میں کیا ہو رہا ہے اور اسٹور والے بھی سدھر جائیں۔

دوسرے ہی دن، مجھ سے مشورہ کر کے، جیلانی صاحب نے اپنا استعفیٰ ایم۔ ڈی کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ شپٹائے، معذرت بھی کی کہ میرا مطلب یہ نہیں تھا، مگر انہوں نے کہا کہ آپ نے سب کے سامنے الزام لگایا ہے، انہی کے سامنے معذرت بھی کریں۔ ایم۔ ڈی صاحب سے یہ نہ ہوا اور جیلانی صاحب نے اپنی ملازمت کو چھوڑ دیا۔ ان کے ساتھ ہی ان کے شعبہ کے چار پانچ دوسرے انجینئروں نے بھی احتجاجاً ملازمت سے استعفیٰ دیدیا۔ جلد ہی ان سب لوگوں کو دوسرے اداروں میں بہتر ملازمتیں مل گئیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی بلوچستان و میلو میں پہلے سے بہتر ملازمت مل گئی، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے انہیں روزانہ گھر سے ویسٹ و ہارف جانا پڑتا تھا، اب روزانہ جب، بلوچستان جانا پڑا۔ دل کے دورے کے بعد، جو انہیں حب میں ہی پڑا تھا، انکی پوسٹنگ کراچی دفتر میں ہی ہو گئی۔ خودداری کے ایسے نمونے اب نایاب ہیں۔

ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی صاحب مرحوم کا شجرہ نسب، جو جناب ابوالقاسم عبدالسلام حسینی ہسوی کی وقیع کتاب 'عربی النسل مسلمانوں کی دینی و علمی خدمات'، ۱۹۸۴ء، شائع کردہ مجلس اشاعتِ علوم اسلامیہ، کراچی سے لیا گیا ہے، انکے احباب اور خصوصاً اہل خاندان کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے، پیش خدمت ہے۔

عبدالقادیر جیلانی، بن عبدالحمید (جھٹکن میاں)، بن عبدالاحد، بن محمد اکبر کاظمی (مورث اعلیٰ خاندان اکبریہ)، بن صفدر حسین، بن اصغر علی، بن مقصود علی، بن یار محمد، بن ابو محمد، بن محمد وارث، بن غلام عالم، بن محمد صادق، بن محمد اکرم، بن شاہ محمد صادق، بن بندگان شاہ فرید، بن شاہ اشرف، بن محمد علی، بن محمود علی، بن نظام الدین، بن حسین (سید حسین مفتی الجُن والانس)، بن ابوالقاسم، بن علاؤ الدین، بن بہاء الدین، بن جلال الدین، بن عبدالحق، بن ابوالخیر (مورث اعلیٰ کڑہ)، بن قطب الدین موسوی، بن عبدالقد، بن محمد قاسم، بن محمد اسماعیل، بن ضیا الدین، بن علی قاسم، بن محمد ہاشم، بن ابوالقاسم، بن طاہر، بن طیب، بن محمد، بن موی کاظم، بن جعفر صادق، بن محمد باقر، بن علی زین العابدین، بن حسین، بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

مزید برآں: کتاب پریس میں جانے سے دو تین دن پہلے میری ملاقات لاہور میں والد صاحب مرحوم کے یرینہ رفیق، اور سکہ بند شاعر جناب عبدالکیم وفا صاحب سے ہوئی، جنہیں میں نے یہ مضمون دکھا کر ان سے استماع کیا کہ اگر اس میں کوئی کمی ہوگی تو یا کسی تصحیح کی ضرورت ہو تو وہ فرمادیں۔ انہوں نے دیر تک گفتگو کی اور کچھ اہم نکات کی نشاندہی کی۔ ساتھ ہی یہ عندیہ بھی دیا کہ وہ اپنی یادداشتیں مرتب کر رہے ہیں اور اس میں وہ ڈاکٹر جیلانی صاحب مرحوم کا تفصیلی تذکرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ حیدر آباد دکن میں وہ جیلانی صاحب کے ساتھ ہی لالہ گوزہ ریلوے ورکشاپ، سکندر آباد میں زیر تربیت تھے۔ اس ورکشاپ کے جنرل منیجر جناب معین الدین صاحب تھے۔ تقسیم ہند کے وقت سندھوستان سے مہاجرین کا ایک ریلہ حیدر آباد دکن بھی گیا تھا۔ ان مہاجرین کی دیکھ بھال میں جیلانی صاحب نے معین الدین صاحب کا بھرپور ساتھ دیا، اور انکے لیے راشن کارڈز وغیرہ بنوا کر انہیں اناج اور دیگر ضروریات کی فراہمی کے لیے بہت متحرک رہے۔

لاہور میں، جیلانی صاحب، وفا صاحب اور اختر رومانی صاحب مرحوم کا اپنا ایک ادبی حلقہ تھا، جہاں یہ لوگ انقلابی شاعری کرتے تھے۔ ان میں سے جیلانی صاحب اور رومانی صاحب جگر مراد آبادی صاحب کے باضابطہ شاگرد تھے۔ جگر صاحب نے ایک نشست میں ان دو حضرات کو سگریٹ کشی سے باز رہنے کی تلقین کی تھی، جس پر ان دونوں نے بہت عرصے تک عمل بھی کیا۔ اس کے نتیجے میں وفا صاحب نے بھی سگریٹ کشی ترک کر دی، جس پر وہ آج تک عمل پیرا ہیں۔ جگر صاحب کے انتقال کے بعد جیلانی صاحب نے کسی وقت یہ کام دوبارہ شروع کر دیا۔

وفا صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر جیلانی بہت اعلیٰ معیار کی شاعری کرتے تھے، جبکہ اس دور کے اساتذہ کبھی پڑھی مار رہے تھے۔ میں نے اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون لکھا ہے۔ وفا صاحب نے مجھے اس غزل کے کئی اشعار سن کر حیران کر دیا۔ انہیں اس کے علاوہ بھی ان کے کئی اشعار یاد ہیں۔

کچھ ضروری باتیں

مرتب کی طرف سے

یہ مقالہ بنیادی طور پر جامعہ کراچی کو پیش کیا گیا تھا، اور اس اعتبار سے اسکی زبان عام فہم بنانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ پھر کتابت کی بھی کئی غلطیاں رہ گئی تھیں۔ کچھ جگہوں پر انگریزی عبارتوں کا اردو ترجمہ نہیں دیا گیا تھا اور کہیں کہیں کچھ حوالے رہ گئے تھے۔

اس کتاب کی ٹائپنگ، اسی سبب سے میں نے خود کی ہے تاکہ حسب ضرورت و ضاحتیں، تراجم اور اضافے کرسکوں۔ اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں پیش نظر رکھی جائیں۔

- ۱۔ جو عبارتیں [چوکور بریکٹ] کے اندر ہیں، وہ مرتب کا اضافہ ہیں۔
- ۲۔ جو نام غیر انگریزی ہیں جیسے رومن، یونانی، فرانسیسی وغیرہ، انکا تلفظ انکی اپنی زبان میں دیا گیا ہے، جیسے کائنستان، والتیغ، وغیرہ
- ۳۔ اصل مقالے میں متعدد مقامات پر رسول اللہ ﷺ کے لیے 'بانی اسلام' کا لقب استعمال کیا گیا تھا۔ اگرچہ ذاتی طور پر مجھے اس لفظ کے استعمال میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی مگر کچھ اہل علم کی اس رائے کے پیش نظر کہ بانی اسلام کا لفظ اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے زیبا ہے، اس کو لفظ 'داعی اسلام' سے بدل دیا گیا ہے۔

- ۴۔ حوالے عبارتوں کے ساتھ ہی دیے گئے ہیں۔ اس میں کچھ لوگوں کو یقیناً الجھن تو محسوس ہوگی مگر موضوع کی نزاکت کے پیش نظر، میں نے یہی موزوں سمجھا۔ اردو متن میں انگریزی حوالے یا اصطلاحات شامل کرنا، ترتیب دی کے حوالے سے اچھا خاصا مشکل کام ہے۔ انگریزی حوالے قوسین '()' میں دیے گئے ہیں۔ ان کی ابتدا '()' سے ہوتی ہے۔ درمیان میں جہاں سطر بدلنے کی وجہ سے انقطاع ہوتا ہے وہاں ']' کی علامت دی گئی ہے، اور اگلی سطر میں '[' کی علامت سے تحریر پھر شروع ہو جاتی ہے۔ تحریر کا اختتام '()' پر ہوتا ہے۔ [Here the text line breaks (and here it continues)]۔ انگریزی اقتباسات انا لک میں دیے گئے ہیں۔

- ۵۔ مقالے میں کئی مقامات پر ایسے حوالے ہیں، جہاں رسول اللہ ﷺ کی شان میں مستشرقین کی گفتگو کا حوالہ دیا گیا ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد کے مصداق، بادل ناخواستہ۔ یہ حوالے شامل اشاعت

کیے جا رہے ہیں۔ میری پوری کوشش رہی ہے کہ ایسے تمام مقامات پر نعوذ باللہ تحریر کیا جائے، لیکن ممکن ہے کہ کچھ مقامات پر نادانستگی میں رہ گیا ہو۔ فاضل مولف بذات خود بہت بڑے عاشق رسول تھے، اور انہوں نے موضوع کی مناسبت سے ضروری حوالے استہان شہادت سے بچنے کے لیے، دل پر پتھر رکھ کر دیے تھے۔ اکثر انہوں نے ایسے مقامات پر حضور ﷺ کی ذات گرامی کے الفاظ حذف کر کے ان کی جگہ ... کے الفاظ دے دیے ہیں۔ گو ایک تحقیقی مقالے میں اس احتیاط کی ضرورت نہیں تھی مگر اسے ان کے عشق رسول کا تقاضا سمجھا جائے۔

۶۔ کتاب کے آخر میں کتابیات کے باب میں ان تمام کتب کی فہرست دی گئی ہے جن کا حوالہ مصنف نے کتاب میں دیا ہے۔ مجھے احساس ہے کہ یہ فہرست حوالے کے بین الاقوامی معیار کے مطابق نہیں ہے، لیکن میرے پاس یہی کچھ دستیاب تھا۔ اپنے طور پر میں نے اسے معیاری بنانے کی امکان بھر کوشش کی ہے۔

۷۔ ان سطور کی کمپیوٹر ٹائپنگ ان جج میں کی گئی ہے۔ اردو ورڈ پراسیسنگ ابھی زیر ارتقاء ہے، اس لیے بعض مقامات پر الفاظ کی نشست و برخاست میں کچھ کی رہ گئی ہے۔ ازراہ کرم اس حوالے سے اس قسم کی خامیوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔

۸۔ اس کتاب کی طباعت کا مقصد اہل علم تک اس کو پہنچانا ہے۔ اس غرض سے کوشش یہ کی گئی ہے کہ کم سے کم قیمت پر یہ کتاب عوام تک پہنچائی جائے، ساتھ ہی ساتھ، کاغذ، جلد بندی اور طباعت کا معیار بھی اعلیٰ رکھا جائے۔ لاگت کم کرنے کے لیے اس کو درمیانے حروف میں طبع کیا جا رہا ہے، ورنہ بڑے سائز میں، اسکے صفحات سات سو سے تجاوز کر رہے تھے۔ میری تو خواہش یہ تھی کہ اس کی قیمت سو روپے رکھی جائے، مگر کاغذ کی گرانی، اور دیگر اخراجات کے پیش نظر دو سو پچاس روپے مقرر کی گئی ہے، جبکہ بازار میں اسی جسامت کی کتابیں پانچ سو روپے تک فروخت ہوتی ہیں۔

میں اس کتاب کی تدوین کے حوالے سے اپنے بیٹوں اور بھانجی ثناء انصار کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اسے پڑھ کر مجھے انبیا اور مجھے ٹائپ کرنے میں سہولت حاصل ہوئی۔ جناب علامہ قمر عینی صاحب، جناب علامہ بشیر حسین ناظم صاحب اور جناب عزیز احسن صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کے مسودے کو بخیر غایت دیکھ کر غلطیوں کی نشان دہی کی۔ میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے، اس سلسلے میں وقتاً فوقتاً مجھے میری ذمہ داری کا احساس دلایا۔ خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں جناب علامہ قمر عینی صاحب کا جنہوں نے اس کتاب کے ایک حصے کو اپنے مؤخر ماہنامے، فیض الاسلام، راولپنڈی، میں قسط وار شائع کیا، اور کتابی شکل میں شائع کرنے میں میری عملی رہنمائی اور مدد کی۔ میں جناب جمال الدین افغانی کا بھی شکر گزار ہوں، جنہوں نے اس کتاب کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کی۔

میری والدہ ماجدہ، میرے بھائی عارف اکبر، توصیف اکبر، و احف اکبر اور بہنیں اصفیہ اور عطیہ، میری بیوی یعنی، یہ سب لوگ تحسین اور شکر کے مستحق ہیں جنہوں نے اس کام میں میری عملی معاونت کی۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

پیش لفظ

از

ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی [مرحوم]

تہذیبیں گروہ انسانی کی شدید محنت اور جاں فشانی کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ ہر گروہ کو اپنی تہذیب سے فطری وابستگی ہوتی ہے۔ جب تک اسکی تہذیب اسے تسکین عطا کرتی ہے، وہ دیگر تہذیبوں سے بے نیاز رہتا ہے۔ جب کوئی بیرونی تہذیب اس پر دباؤ ڈالنے لگتی ہے تو معاشرہ اپنی تہذیب کی مدافعت کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، اور مخالف تہذیب کو اپنی تہذیب پر اثر انداز ہونے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مدافعت اکثر حربی ٹکراؤ کی صورت اختیار کرتی ہے، اور اگر حربی مدافعت کی قوت باقی نہیں رہ جاتی تو غالب معاشرے کے خلاف سرد جنگ شروع کی جاتی ہے۔ تا آنکہ دونوں میں سے کسی ایک کو قطعی برتری حاصل نہ ہو جائے۔ بصورت دیگر کوئی نئی تہذیب وجود میں آتی ہے جس میں متحارب معاشرے ضم ہو جاتے ہیں۔

پہلی صدی عیسوی تک بحر روم سے ملحق تمام علاقے رومن ایمپائر کے صوبے بن چکے تھے۔ اسلام سے قبل کرہ ارض پر رومن ایمپائر کا کوئی مد مقابل نہیں تھا۔ رومن ایمپائر کی پیشرو، گریک [یونانی] ایمپائر تھی، جس کے عظیم شہنشاہ، سکندر اعظم کی قلمرو میں مصر سے پنجاب تک کا پورا علاقہ شامل تھا۔ رومن خود کو یونانیوں کا جانشین سمجھتے تھے، اور اس اعتبار سے یونانی تہذیب کے وارث تھے۔ یہ مشترکہ معاشرہ، ہلینک سوسائٹی کہلاتا تھا۔ اس معاشرے نے مصری، آشوری، کلدانی، یہودی، فنیقی اور رومی تہذیبوں کو شکست دیکر اپنی برتری قائم کر لی تھی۔ ان قدیم تہذیبوں کے ورثے اپنے معاشرے میں منتقل کر لیے تھے۔ ان کا علم و فن اپنے بام عروج پر تھا۔ ایک ہزار سال سے دنیا پر رومن برتری مسلّمہ تھی۔ روم کا نام عظمت اور سر بلندی کی علامت بن گیا تھا۔ رومن خود کو دنیا کا متمدن آقا تصور کرتا تھا، جسے، اور صرف جسے، دنیا پر حکومت کرنے کا حق حاصل تھا۔ باقی دنیا صرف اس لیے تھی کہ روم کی خدمت گزاری کرے۔

روم ثقافت میں یونان کا شاگرد تھا۔ یونانی فلسفہ اس کے لیے آخری حجت تھا۔ اس کی روشنی میں ہلینک معاشرہ یہ غامی محسوس کرتا تھا کہ اس کے مروجہ مذاہب [دیوتا پرستی، افلاطون و ارسطو کی فکر سے ہم آہنگ نہیں تھے۔

[سینٹ اپال رومی شہری ہونے کی بنا پر اس ضرورت سے آگاہ تھا۔ حضرت عیسیٰ کے [وصال کے] بعد اوّل تو خود اس نے عیسائیت کی ترویج اس انداز سے کی کہ بلیک معاشرے کے لیے قابل قبول ہو، پھر اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ رومن معاشرے نے اس مذہب کو اپنے سانچے میں ڈھال کر پوری کر دی۔ جب عیسائیت کو اس نے اپنے قالب میں ڈھال لیا تو رومن شہنشاہ نے عیسائیت کو اپنے اقتدار کے بل بوتے پر رومن ایمپائر میں نافذ کر دیا۔ اس طرح یہ خامی بھی دور ہو گئی۔ اب رومن معاشرہ بنیال خویش عالمی اقتدار، عالمی فکر، عالمی سچائی اور عالمی برتری کا حامل تھا۔ رفتہ رفتہ اقتدار، فکر اور برتری کا طلسم ٹوٹنے لگا۔ صرف عالمی سچائی [عیسائیت] کا بھرم باقی رہ گیا۔ پھر یہی بھرم سب سے بڑی قدر بن گیا، باقی قدریں ثانوی حیثیت اختیار کر گئیں۔

یہ تھا وہ پس منظر جس میں مغرب نے اسلام کو طلوع ہوتے دیکھا۔ (ملاحظہ ہو باب اوّل، مغرب کا پس منظر)۔ ساتویں صدی عیسویں کے نصف اوّل میں عرب، اسلام کا جھنڈا لیکر بیک وقت روم و ایران کی عظیم سلطنتوں سے نبرد آزما ہوئے۔ سلطنت ایران کا وجود تو پچیس سال کے اندر اندر ختم ہو گیا، لیکن سلطنت روم اپنی بقا کی جنگ مسلسل لڑتی رہی۔ اس دور میں سلطنت روم دو حصوں میں منقسم تھی۔ مشرقی سلطنت روم (بازنطین) اصل اقتدار اور طاقت کی حامل تھی۔ اس وقت تک مغرب رومن ایمپائر کا جزو تھا۔ گواسکی اپنی جداگانہ حیثیت نہ تھی، تاہم مغربی اور مشرقی عیسائیت میں رقابت پیدا ہو چکی تھی اور عیسائیت کو رومن شہریت پر تفتوح حاصل ہو چکا تھا۔ جب تک عرب بازنطین سے نبرد آزما رہے، مغرب ایک خاموش تماشا بن گیا تھا۔ [اس کے لیے] مشرقی سلطنت روم یا مشرقی عالم عیسائیت کی پسپائی ایک رقیب کی پسپائی تھی۔ بازنطین کی شکست گویا مشرقی کلیسا کی شکست تھی۔ لیکن جب ان شکستوں کے مختلف النوع اثرات ظاہر ہونے لگے، تو مغرب نے بھی اپنی حفاظت کی جدوجہد شروع کر دی۔ اس کا اوّلین رد عمل، کمزور بازنطین سے خود کو آزاد کرانے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ بازنطین نے مغرب کی علیحدگی کو بادل نا خواستہ برداشت کیا اور اسے اپنے زیر اقتدار رکھنے کے لیے طاقت کے استعمال سے گریز کیا۔

مغرب خود کو عظیم رومن ایمپائر کا وارث تصور کرتا تھا۔ عرب جیسی ناقابل اعتناء قوم کے ہاتھوں رومن صوبوں کا نقصان اپنا نقصان سمجھ رہا تھا۔ انہیں پھر سے فتح کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ رومن نخوت کے لیے اسکے عظیم اقتدار اور ردائی برتری کا اس گمنام قوم کے ہاتھوں مجروح ہونا ناقابل برداشت تھا۔ آٹھویں صدی کی ابتداء میں عرب نہ صرف اپنی فتح کر چکے تھے، بلکہ سسلی سے اطالیہ پر حملے کر رہے تھے۔ نویں صدی میں دوبار روم کا محاصرہ کر چکے تھے۔ روم کو مغربی عالم عیسائیت میں حرم کا درجہ حاصل تھا اور روم پر حملوں کو کلیسا کبھی بھلا نہ سکتا تھا۔ آٹھویں صدی کے نصف سے مغربی سیاست کلیسا کے قبضے میں آ گئی، جس کے بعد کلیسا مغربی معاشرے پر مسلط ہو گیا۔ اس نے کلیسائی قدروں کو معاشرتی قدریں بنا کر پورے معاشرے کو کلیسا کے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ کلیسا کے لیے سلطنتیں بننے لگیں، اور کلیسا پر سلطنتیں قربان کی جانے لگیں۔

کلیسا کا اقتدار مذہبی تھا۔ اس کا رقیب اگر ہو سکتا تھا تو صرف ایک دوسرا مذہب۔ عرب، یس، بے پناہ کی طرح عالم عیسائیت کو درہم برہم کر رہے تھے۔ انکی توانائی کا راز محض مذہب تھا۔ کلیسا نے نہ صرف عرب، بلکہ اسلام کو بھی اپنا دشمن قرار دیا، اور اسکے خلاف مختلف محاذ کھولے۔ حربی مقاصد کے لیے اس نے جنگجو جرمن اقوام کو استعمال کیا اور فکری محاذ خود سنبھالا۔

پروپیگنڈے کی قوت سے کلیسا اچھی طرح سے واقف تھا۔ کلیسا اسی پروپیگنڈے کے بل پر استوار ہوا تھا۔ پروپیگنڈے ہی کے بل پر چوتھی صدی عیسوی میں رومن ایمپائر کو کرجین ایمپائر بنایا گیا تھا۔ اسی قوت سے کلیسا نے مغرب میں تمام رقیب مذاہب کا صفایا کیا تھا۔ اسی قوت سے جرمنوں کو قابو کیا تھا۔ کلیسا کے اختیار میں ویسے بھی صرف یہی ایک ہتھیار تھا، اور اس کی مدد سے وہ نہ صرف خود کو بلکہ مغربی معاشرے کو بھی [اسلام جیسے خطرناک] دشمن سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ چنانچہ کلیسا نے اسلام کے خلاف جنگی پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا۔

مغرب پر اگر صرف سیاسی دباؤ ہوتا تو شاید کلیسا کا پروپیگنڈہ اس قدر مقبول، موثر اور نتیجہ خیز نہ ہوتا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ عالم اسلام کا شدید دباؤ ہمہ جہتی تھا۔ سیاسی اعتبار سے بحر روم کا نصف رقبہ اور بحر روم کی اجارہ داری چھین چکی تھی۔ اس سے قبل رومی معاشرے نے کبھی، کسی کے ہاتھوں بھی، اس قدر شدید نقصانات نہیں اٹھائے تھے۔ ہزار سالہ بالادستی نے یہ عقیدہ راسخ کر دیا تھا کہ روم لافانی، ابدی اور لازوال ہے۔ عیسائیت نے اس عقیدے کو مذہبی رنگ عطا کر دیا، کہ یہ شہر خدا کا شہر ہے، اور قیامت تک کوئی طاقت اسے سرنگوں نہیں کر سکے گی۔ اگر کوئی اسے تباہ کرے گا تو وہ صرف 'دجال' ہوگا۔ اس عقیدے نے مسلمانوں کو دجال کی قوم باور کروایا، جو مغربی کلیسا اور عقیدہ تثلیث کو ختم کرنے اچھی تھی۔ عقیدہ تثلیث بڑی خوریزی کے بعد رائج ہوا تھا۔ اسلام کے باعث اس معاشرے میں پھر وہی مسائل [جنہیں بمشکل کچلا گیا تھا] سراٹھانے لگے تھے، جس کے باعث کلیسا کی بقاء خطرے میں پڑنے لگی تھی۔

سیاسی اور مذہبی دباؤ کے ساتھ ساتھ، علمی، معاشرتی اور ثقافتی دباؤ بھی پڑ رہا تھا۔ جہاں جہاں اسلام نے قدم رکھے، عیسائیت کے نقوش پھیکے پڑ گئے۔ عربی نے لاطینی کی جگہ لے لی۔ خود عیسائی عوام ثقافت و معاشرت میں عربوں کی پیروی کرنے لگے۔ اقتصادی دباؤ سب سے شدید تھا۔ بحر روم سے محرومی نے جہاز رانی مسدود کی۔ بحری تجارت بند ہوئی۔ بندرگاہیں اجڑیں۔ درآمد برآمد کے خاتمے نے بازار بند کیے۔ شاہی خزانہ درآمدی ٹیکس، کسٹم ڈیوٹی، اور بازار ٹیکس سے محروم ہوا۔ صوبوں [مقبوضات] سے حاصل ہونے والی آمدنی جاتی رہی۔ غلاموں کی درآمد بند ہوئی۔ خزانہ اس قابل نہ رہا کہ حکومت کے اخراجات برداشت کر سکے۔ شاہی خدمت کے عوض زمین تقسیم ہونے لگی، یہاں تک کہ تقسیم کے لیے زمین باقی نہ رہ گئی۔ حکومت کے تمام ادارے ختم ہو گئے۔ شہر غائب ہونے لگے۔ زمین امراء کی ملکیت بن گئی اور غرباء زمین کے غلام ہو گئے۔

عالم اسلام کے ہمہ جہتی دباؤ نے ہر فرد کو سرگرداں کر رکھا تھا۔ (ملاحظہ ہو باب دوم، ریاست اسلامیہ کی توسیع اور عہد وسطیٰ کا مغرب)۔ نہایت ہی کوئی امید تھی تو صرف کلیسا کے ادارے سے تھی۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

کلیسا کے نزدیک ان حالات کا واحد حل یہ تھا کہ سراسیمہ (مغرب کی طرف سے مسلمانوں کو دی گئی عرفیت) کو اور ان کے مذہب کو مکمل طور پر تباہ کر دیا جائے تاکہ بہتری کی کوئی شکل پیدا ہو۔

نفرت کا پروپیگنڈہ جذبات میں تلاطم پیدا کرتا رہا۔ تین صدیاں اضطراب میں گزریں اور جب عالم اسلام میں انضلال پیدا ہوا تو گیارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں عالم اسلام پر دھاوا بولا گیا۔ شام و فلسطین میں صلیبیوں نے اپنی چار لاطینی سلطنتیں قائم کر لیں۔ مصر و افریقہ کو بھی فتح کرنے کے لیے یورپس ہونے لگیں۔ اسپین کو عملاً مغرب نے اپنا جاگلز بنا لیا۔ مکمل دو صدیوں تک لاطینی تسلط مسلم ممالک پر قائم رہا۔ پھر جب یہ تسلط ختم ہوتا نظر آیا تو کلیسا نے صلیبی مقاصد منگولوں کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی۔ منگول قہر الہی بن کر عالم اسلام پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے باوجود صلیبی سو ماؤں کو بجز حسرت و یاس کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک مشرق وسطیٰ میں قائم صلیبی سلطنتوں کا نام و نشان تک مٹ گیا اور مغرب اپنی قدیم حدود میں واپس لوٹ آیا۔

جس دور میں صلیبی جنگوں میں عیسائی ناکام ہو رہے تھے، اسپین میں مسلمان قدم بقدم پسپا ہو رہے تھے۔ اسی دور میں ترکان عثمانی نے یورپ پر مشرق کی جانب سے پیش قدمی شروع کی۔ آٹھویں صدی عیسوی کی عرب فتوحات اتنی تشویشناک نہیں تھیں جتنی تشویشناک پندرہویں صدی عیسوی کی ترک فتوحات تھیں۔ چنانچہ مغرب نے تنخیدگی کے ساتھ اسلام کے خطرے سے نمٹنے کے طریقوں پر غور کرنا شروع کیا۔ ان سات صدیوں میں دشمنی اتنی راسخ ہو چکی تھی کہ ایک مفکر بھی ایسا نہیں ملتا جس نے مصالحت کی تجویز پیش کی ہو۔

ریمنڈل کے نزدیک اس کا واحد حل یہ تھا کہ مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ کی جائے۔ راجر بیکن نے السنہ مشرق کے مطالعے اور ان پر عبور پر زور دیا، تاکہ اسلام کے براہ راست مطالعے کے ذریعے اس کی کمزوریوں کا پتہ چلایا جائے۔ ان پیچیدگیوں کو معلوم کیا جائے جن کی وجہ سے عالم اسلام دین مسیحی کو قبول نہیں کرتا یا نہیں کر سکتا۔ ان اسباب کا تجزیہ کیا جائے جن کے باعث مسلمانوں میں اپنے عقیدے سے وابستگی ختم نہیں ہوتی، اور ان کے ازالہ کے لیے دلیلیں فراہم کی جائیں۔

اس نے فلسفہ کی افادیت پر بھی زور دیا کہ فلسفہ بے دینوں [مسلمانوں] کا موثر ہتھیار ہے اور عیسائیوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ فلسفے پر عبور حاصل کریں اور مسلمانوں کے خلاف اسکا استعمال کریں۔ کلیسا نے ان تجاویز پر طویل عرصے تک غور و خوض کرنے کے بعد بالآخر انہیں عملی اقدام کے لیے منظور کر لیا۔

پندرہویں صدی عیسوی مغرب کے لیے شدید بھائی دور تھا۔ ۱۴۵۰ء سے ۱۴۶۰ء کے دوران یہ ہیجان نقطہ عروج پر رہا۔ اس دوران ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے مشرقی سلطنت روم کا وجود منا دیا۔ مشرقی عالم عیسائیت نے مغرب کی بالادستی قبول کرنے پر ترکوں کی اطاعت کو ترجیح دی۔ اب عالم اسلام اور مغرب کے مابین کوئی شے حائل نہیں تھی۔ سرحدوں کا راست اتصال ایک مستقل خطرہ تھا۔ ان حالات میں مغرب خود کو بے یار و مددگار بنا رہا تھا۔ ہر ملک فکر اس خطرے سے متاثر تھا۔ متعدد مفکرین مغرب نے اس خطرے کے ازالے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

کے لیے اپنی اپنی تجاویز پیش کیں۔ ان تجاویز پر غور و فکر کے لیے کانفرنس منعقد ہوئیں۔ یہ تجاویز طریقہ کار کے اعتبار سے مختلف تھیں لیکن سب کا مطمح نظر مشترک تھا کہ کسی نہ کسی طرح اسلام کو جز سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

جان آف سیگو ویہ قرآن کے دقیق مطالعے کے بعد اس میں خامیاں دریافت کر کے مسلمانوں پر یہ ثابت کرنے کا داعی تھا کہ یہ کلام ربانی نہیں ہے۔ وہ ہتھیاروں کے بجائے دلائل و براہین کے ذریعے اسلام کو شکست دینے کا حامی تھا۔ نکولاس آف کیوسہ اختلافی مسائل سمیٹ کر مجتمع کرنا چاہتا تھا اور اختلافی وجوہات ختم کر کے مسلمانوں کو دائرۂ عیسائیت میں داخل کرنے کا متمنی تھا۔ جین جرمین کے نزدیک اسلام کا علاج صرف تلوار تھا۔ اس نے مغرب کو متحد کر کے عالم اسلام کو تہہ و بالا کرنے کا پرچار کیا۔

انائیس سلویس مسلم حکمرانوں کو تخریص و ترغیب کے ذریعے عیسائی بنانا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے سلطان محمد فاتح کو بھی ایک خط لکھا۔ مذہبی مصلحین [لوقر وغیرہ] کلیسا کی اصلاح اس لیے چاہتے تھے کہ کلیسا کے سبب عالم اسلام میں جو انتشار تھا وہ دور ہو سکے اور عالم عیسائیت متحد ہو کر مسلمانوں کا مقابلہ کر سکے۔

بالآخر ایک مربوط لائحہ عمل مرتب ہوا۔ یونیورسٹیوں میں عربی شعبے قائم ہوئے۔ علوم اسلام کا ترجمہ ہوا۔ مستشرقین کا گروہ وجود میں آیا اور کلیسا کے مقاصد کی تکمیل کرنے لگا۔ اس نے اسلامی مواد کو مغربی سانچے میں ڈھالا۔ یہ سانچے مستشرقین کو عہد وسطیٰ سے وراثت میں ملے تھے۔ عہد وسطیٰ سے ملنے والا [نام نہاد] علمی ورثہ مستشرقین کے ہاتھوں منتقل ہوا۔ اس پر ملمع چڑھایا گیا۔ اور مغربی ساکھ نے اسے دنیا میں عام کیا۔ جب دنیا مغرب کی اسیر ہوئی تو ہرن میں مغرب کو سند تسلیم کیا جانے لگا۔

اسلام کے بارے میں بھی مستشرقین کی رائے کو عالمی اہمیت میسر آئی، جس کے باعث عیسائی دنیا بدستور تعصب میں چور، اسلام سے گریز کرتی رہی۔ غیر جانبدار دنیا نے بھی اسلام کو مغرب کی عینک سے دیکھا، جس کے سبب وہ نہ صرف اسلام کے صحیح خد و خال سے نا آشنا رہی بلکہ بڑی حد تک ان کی غیر جانبداری مغرب کی ہمنوائی میں تبدیل ہونے لگی۔ اسلامی معاشرے میں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا جس نے اسلام کو مستشرقین کی عینک سے دیکھا اور پرکھنا شروع کر دیا، جس کے زیر اثر مغربی تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

[اس مقالے میں مستشرقین مغرب کے اسی طرز عمل کو موضوع بنایا گیا ہے، تاکہ شکوک میں مبتلا اہل مغرب، مرعوبیت کے مارے مغربی تعلیم یافتہ مسلمان اور بیچارگی کے شکار مسلمان علماء پر مستشرقین کی سوچ، ان کے مقصد اور طریق کار کو واضح کیا جاسکے اور یہ بات کھل کر سامنے آئے کہ مستشرقین کی تحریروں میں علم کی پیاس، حق کی تلاش اور پیشہ ورانہ دیانتداری کس حد تک عنقاء ہے، اور ان کے پھیلانے ہوئے شکوک و شبہات کی اصل کیا ہے۔] باب پنجم میں حسب توفیق ان اعتراضات پر بحث کی گئی ہے جو عام طور پر مغربی اہل قلم کا شیوہ ہیں۔ بحث میں شعوری طور پر اس بات کا التزام کیا گیا ہے کہ مسلم اہل قلم کے حوالے صرف بدرجہ مجبوری ہی دیے جائیں، اور حتی الامکان وہی شہادتیں پیش کی جائیں جو خود مغرب کی [اور نتیجتاً ان کے حساب سے مستند اور شبہ

سے بالاتر ہوں، یا کم از کم مغرب کی نظر میں بھی مستند ہوں۔ تاریخی واقعات کے حوالے کم سے کم دیے گئے ہیں، [کیونکہ یہ مقالہ براہِ راست تاریخی مقالہ نہیں ہے،] اور یہ واقعات ہر مستند تاریخی کتاب میں ملتے ہیں۔

یہ شعوری کوشش بھی کی گئی ہے کہ قلم جذبات سے بچ کر چلے، تاہم میں نہ جذبات سے عاری ہوں، نہ عقیدتِ ختمی مرست سے بیگانہ۔ [میرے جذبات میری تحریر میں کہیں نہ کہیں چھلکیں گے]۔ انشا پر دازی سے بھی مملہ گریز پیش نظر رکھا گیا ہے۔

احسان فراموشی ہوگی اگر میں اس مقالے کے ڈائریکٹر، مکرّمی ڈاکٹر محمد طاہر ملک صاحب [مرحوم]، چنیر مین شعبہ اسلامیات، جامعہ کراچی کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی پر خلوص معاونت و نگرانی کے بغیر یہ مقالہ تشنہ تکمیل ہی رہ جاتا۔

عبدالقادر جیلانی

کراچی، نومبر ۱۹۸۰ء

باب اول مغرب کا پس منظر

- ۱۔ رومن ایمپائر کا زوال اور طلوع مغرب
- ۲۔ باشندے
- ۳۔ چرچ
- ۴۔ دوہرا نظام اقتدار

رومن ایمپائر کا زوال اور طلوع مغرب

مغرب کی تعریف: مغرب سے مراد یورپ کا وہ علاقہ ہے جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے معاشرے پر مشتمل ہے۔ دوسرے الفاظ میں مغرب 'پاپا' کے روحانی اقتدار کا خطہ ہے۔ [cf. Toynbee, A.J., A] (Study of History, Vol. I, p.29)۔ مغرب جن ممالک پر مشتمل ہے وہ تمام کے تمام بحر روم کے شمال میں واقع ہیں۔ ان میں پرتگال، اسپین، فرانس، اطالیہ، جرمنی اور ان سے ملحق چھوٹے چھوٹے ممالک، نیز جزائر برطانیہ شامل ہیں۔

عیسائیت سے قبل رومن ایمپائر سیاسی اور انتظامی ضروریات کے پیش نظر مشرقی اور مغربی خطوں میں منقسم تھی۔ یہ خطے مشرقی شہنشاہیت (Eastern Empire) اور مغربی شہنشاہیت (Western Empire) کہلاتے تھے۔ جب رومن ایمپائر میں عیسائیت رائج ہوئی تو ان ہی خطوں کے اعتبار سے منقسم ہو کر مشرقی عیسائیت (Eastern Christianity) اور مغربی عیسائیت (Western Christianity) کہلائی۔

مغرب کی تقسیم جغرافیائی اعتبار سے بھی کی جاسکتی ہے۔ بحر روم میں سسلی کے جنوب میں کیپ سوریلو (Cape Sorello) اور تیونس کی (Cape Bon) کیپ بون کے درمیان اندازاً سو میل [۱۶۰ کلومیٹر] عرض آبی گزرگاہ بن جاتی ہے جس کے سبب قدرتی طور پر اس کی تقسیم مشرقی اور مغربی سمندروں میں ہو جاتی ہے۔ مشرقی بحر روم کے کنارے واقع ممالک مشرقی یورپ اور مغربی بحر روم کے کنارے واقع ممالک مغربی یورپ یا صرف مغرب کہلاتے ہیں۔

مغربی تہذیب: ایام قدیم سے بحر روم کے یہ دونوں خطے مشرقی یورپی تہذیب اور مغربی یورپی تہذیب کے گہوارے رہے ہیں۔ مشرق میں اگر یونانی تہذیب پر ان چڑھی تو مغرب میں رومن تہذیب پھلی پھولی۔ موجودہ مغربی تہذیب نے خود کو رومی تہذیب کے آثار پر استوار کیا۔ رومن تہذیب کے لٹن میں رومن چرچ نے پردش پائی، اور روم الکبریٰ کے زوال کے بعد یہی رومن چرچ رومی تہذیب کا وارث ہوا۔ چرچ نے مغرب میں ایک نئے معاشرے کو جنم دیا، جو مغربی معاشرہ کہلایا۔

رومن ایمپائر

روم کے معمار : رومی تہذیب کے اولین معمار ایشیائے کوچک کے باشندے 'اترسکن' (Etruscans) تھے۔ انہوں نے شمالی اطالیہ پر قبضہ کیا۔ صنعتی اور تجارتی شہر بسائے۔ عظیم بحری قوت قائم کی۔ یونان اور کارتھجہ کے علاقے فتح کر کے اطالیہ میں شامل کیے۔ ڈھائی سو سال حکمرانی کی اور ۴۹۷ء قبل مسیح میں پردہ گمنامی میں چھپ گئے۔ (John Bowle, A New Outline of World History, p.184)۔ ہرچند روم کی تہذیب ان ہی کی مہوں منت ہے مگر مغرب اترسکن دور کو اپنی تاریخ میں جگہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو، حوالہ بالا)

رومن ایمپائر کا قیام : اترسکن حکمرانوں کے بعد، روم نے پانچویں صدی ق م میں رومن ایمپائر کا سنگ بنیاد رکھا۔ (Encyclopedia Britanica, Vol. 15, article 'Senate', p.1087)۔ تیسری صدی ق م تک رومن ایمپائر اس قدر مستحکم ہو چکی تھی کہ بیرون اطالیہ بسنے والی اقوام سے ٹکر لینے لگی۔ ۲۱۸ ق م میں کارتھجہ کے ساتھ جنگیں شروع ہوئیں، جو پیونک وارئ (Punic Wars) کہلاتی ہیں۔ (Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.10)۔ ان جنگوں کا اختتام ۱۴۶ ق م میں کارتھجہ کی مکمل تباہی پر ہوا۔ کارتھجہ جی ایک عظیم سامی تہذیب تھی۔ یہ تجارتی اور صنعتی تہذیب، جس کا بحر روم پر راج تھا، اور جس کے عظیم الشان شہر آباد تھے، رومی بربریت کے سیلاب میں غرق ہو گئی۔

رومن ایمپائر کی توسیع : کارتھجہ جی کی تباہی کے بعد روم، بحر روم کی عظیم ترین قوت بن گیا۔ یونان کی قوت و اقتدار کو جیسے جیسے زوال آتا گیا، روم اس کی جگہ لیتا گیا۔ سسلی اور ساردینیہ کا الحاق پیونک وارئ سے قبل ۲۴۲ ق م میں ہی ہو چکا تھا۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو حوالہ بالا)۔ اسپین کو ۲۰۲ ق م میں رومن ایمپائر کا صوبہ بنایا گیا۔ آفریقہ کو ۱۴۶ ق م میں سقوط قرطاجنہ (کارتھجہ جی) کے بعد شامل سلطنت کیا گیا۔ مقدونیہ اور یونان بھی اسی سال روم کے زیر نگین آئے۔ ایشیائے کوچک اور جنوبی گال ۱۱۸ ق م میں فتح ہوئے۔ اسی سال شام پر فوج کشی کر کے اسے شامل سلطنت کیا گیا۔ ۶۶ تا ۶۳ ق م آرمینیا کی فتوحات ہوئیں۔ ۵۸ تا ۴۸ ق م جولیس سیزر نے شمالی گال (فرانس) کو رومن ایمپائر کا حصہ بنایا۔ آگستس نے مصر اور دریائے دینیوب کے علاقوں کو شامل سلطنت کیا۔ آگستس کے عہد کے بعد اہم الحاق جزائر برطانیہ کا ہے جسے کلادیس نے ۴۳ء میں فتح کیا۔ ۹۹ء میں بالائی عراق کو فتح کر کے رومی سلطنت میں شامل کیا گیا۔ اس طرح پہلی صدی عیسوی کے اختتام تک رومن ایمپائر دنیا کی عظیم ترین سلطنت بن چکی تھی جو بحر روم سے ملحق تمام علاقوں پر مشتمل تھی۔

شہنشاہ کا انتخاب : شہنشاہ آگستس کا دور حکومت رومہ الکبریا کے انتہائی عروج کا دور تھا۔ آئینی اعتبار سے شہنشاہ روم کو عوام اور سینیٹ نے چند قانونی اختیارات دیے ہوئے تھے، مگر عملاً رومی شہنشاہ مطلق العنان حکمراں ہوتا تھا۔ وہی رومن افواج کا سپہ سالار ہوتا تھا، اسی کے نمائندے تمام صوبوں پر حکومت کرتے تھے۔ قانونی معاملات میں بھی وہی مقتدر اعلیٰ تھا۔ سلطنت کا اعلیٰ ترین جج بھی وہی تھا اور مملکت کے تمام مالی ادارے اور خزانے اسی کے اختیار میں تھے۔

رومی شہنشاہیت موروثی نہیں تھی۔ شہنشاہ کا انتخاب رائے شماری کے ذریعے روم کی سینیٹ کرتی تھی۔ یہ انتخاب ہر شہنشاہ کے مرنے کے بعد ہوتا تھا۔ شہنشاہ آگستس کے جمہوری آئین (Republican Constitution) مجریہ ۲۷ ق م کی رو سے شہنشاہ کے انتخاب کا حق صرف سینیٹ کو تھا۔

(Encyclopedia Britanica; Vol.15, article 'Republic Restitute', p.1107)

(Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.12)

لیکن پہلی صدی عیسوی میں فوج کا اثر و اقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ خود سینیٹ فوج کے زیر اثر ہو گئی۔ چنانچہ شہنشاہ کلادیوس (Cladius) (۱۴ء تا ۵۴ء) کی تخت نشینی کا اعلان فوج نے کیا اور سینیٹ نے اس اعلان کی توثیق کی۔ آہستہ آہستہ اس انتخاب نے وراثتی جانشینی کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ پہلی صدی عیسوی کے بیشتر شہنشاہ، آگستس کے گھرانے کے لوگ تھے۔

مسئلہ جانشینی : شہنشاہ کی جانشینی ایک ایسا مسئلہ تھی جس کے باعث روم کو متعدد بار خانہ جنگیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے رومی شہنشاہوں نے اپنی حیات میں ہی اپنے جانشینوں کو اہم اختیارات تفویض کرنا شروع کر دیے، تاکہ ان کے آئندہ اقتدار سنبھالنے کی راہ ہموار ہو جائے۔ لیکن یہ طریقہ کار بھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ فوج اور سینیٹ اگر کسی شخصیت کے انتخاب پر متفق نہ ہوتیں تو مختلف سپہ سالار اپنی اپنی افواج سے اپنی شہنشاہیت کا اعلان کروا دیتے۔ چنانچہ شہنشاہ 'وسپاسین' ۶۹ء میں ایسی ہی ایک خانہ جنگی کے بعد فاتح کے طور پر ابھرا۔

۹۶ء میں جب نروا (Nerva) کو فوج اور سینیٹ نے شہنشاہ منتخب کیا تو اس نے یہ طریقہ کار بنایا کہ ہر شہنشاہ اپنا جانشین سینیٹ سے منتخب کروا کر اسے اپنا بیٹا (متبئی) بنائے۔ (Chamber's Encyclopedia, Vol. IX, p. 746; & Vol. XI, p. 774)۔ گو یہ طریقہ کار تقریباً ایک سو سال تک رائج رہا، لیکن خانہ جنگیوں کا سلسلہ بدستور قائم رہا اور جانشینی کا اختیار دوبارہ فوج نے لے لیا۔

سلطنت کی مشرقی اور مغربی حصوں میں تقسیم : ۲۸۴ء میں فوج نے دایوکلے تیان (Diocletian) کو شہنشاہ منتخب کیا۔ (حوالہ بالا ثانی۔ صفحہ ۷۷)۔ اس نے سلطنت کے استحکام کی خاطر رومن ایمپائر کو دو انتظامی خطوں میں تقسیم کر دیا۔ اس میں سے ایک مشرقی سلطنت روم (Eastern Roman Empire)

اور دوسرا خطہ مغربی سلطنت روم (Western Roman Empire) کہلایا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

(Encyclopedia Britanica, Vol. 15, p.1128)۔ مشرقی سلطنتِ روم کا نظم و نسق اس نے خود سنبھالا اور مغربی سلطنت کی حکمرانی کے لیے میکسی مین (Maximian) کو اپنا ہم منصب منتخب کروایا۔

(Jones A.H.M., The Decline of the Ancient World, p.29)

نیز ہر دو حکمرانوں کے ایک ایک معاون، جنہیں قیصر (Caesar) کہا جاتا تھا، منتخب کروائے تاکہ یہ نہ صرف اپنے علاقے کے شہنشاہ کے معاون ہوں بلکہ ان کے جانشین بھی ہوں۔ یوں عملاً سلطنتِ روم دو حصوں میں بٹ گئی، اور اس پر دو شاہانِ کبیر اور دو شاہانِ صغیر یک وقت حکمراں ہو گئے۔

دایو کلے تیان نے ۳۰۵ء میں تخت سے دستبرداری اختیار کی تو ہر طرف آگستس (شاہِ کبیر) اور قیصر (شاہِ صغیر) اٹھ کھڑے ہوئے۔ ۳۰۶ء میں سات حکمرانوں کو آگستس ہونے کا دعویٰ تھا۔ شدید خانہ جنگی کے بعد ان میں سے قسطنطین اعظم (Constantine) شہنشاہ (آگستس)، اور لیسینیس (Licinius) نائب یا قیصر کی حیثیت سے ۳۱۳ء میں تخت نشین ہوئے۔ (حوالہ بالا)

پایہ تخت کی منتقلی: ۳۲۴ء میں قسطنطین نے آبائے باسنورس کے شمالی ساحل پر ایک نئے شہر قسطنطنیہ کی

بنیاد رکھی، اور اسے اپنا پایہ تخت بنایا۔ [Edward Gibbon; The Decline and Fall of Roman

(Empire, p.140)۔ رومن شہنشاہ کی روم سے قسطنطنیہ منتقلی، مرکزِ اقتدار کی منتقلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

آہستہ آہستہ سلطنت میں مشرقی اور یونانی اثرات بڑھنے اور رومی اثرات کم ہونے لگے۔ مغرب اس صورت حال کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا، کیونکہ رومن فاتح اور حکمراں قوم تھے اور یونانی مفتوح اور محکوم۔ ملکی معاملات میں جب مغرب کا عمل دخل کم ہونے لگا تو مغرب نے اپنے معاملات میں خود مختاری اختیار کی اور مغربی شہنشاہ کا تقرر سینٹ خود کرنے لگی۔

مغرب سے بے اعتنائی: چوتھی صدی عیسوی (۳۷۲ء) میں ہن قوم نے یورپ پر حملہ کیا۔

(Henry Pirenne, A History of Europe, p.26)۔ دریائے دینیستر (Deniester) کے سوا

پر جرمن قوم 'گوتھ' آباد تھی، جو مشرقی اور مغربی ساحلوں کی مناسبت سے 'آسٹرو گاتھ' اور 'ویزی گاتھ' کہلاتی تھی۔

ہن کے خلاف تاب مقاومت نہ پا کر آسٹرو گاتھ نے پسپا ہو کر مغربی ساحل کے علاقہ میں پناہ لی۔ آسٹرو گاتھ کے

دباؤ نے ویزی گاتھ کو اپنا علاقہ چھوڑنے اور دریائے دینیوب کو عبور کر کے مشرقی سلطنتِ روم کی حدود میں داخل

ہونے پر مجبور کر دیا۔ ویزی گاتھ حکمراں نے شہنشاہِ روم سے مملکتِ روم میں داخلے کا حق طلب کیا۔ یہ سب کچھ اس

سرعت اور افراتفری کے عالم میں ہوا کہ شہنشاہ کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ داخلے کی اجازت دیدے۔ کیونکہ رومن

افواج سلطنت کے دور دراز علاقوں میں بکھری ہوئی تھیں اور دریائے دینیوب کے علاقے میں متعین فوج کے لیے

ویزی گاتھ سے مدافعت ممکن نہیں تھی۔ جلد ہی یہ جرمن قوم سلطنتِ روم کے لیے دروہ بن گئی۔ یہ لوگ نہ تو کسی نہر

یا علاقے میں بسائے جاسکتے تھے اور نہ ہی ان کو منتشر کیا جاسکتا تھا۔ نہ یہ شہنشاہ کے احکام کے پابند تھے اور نہ ہی

رومی تہذیب و تمدن سے آشنا۔ مذہباً پوری قوم بت پرست تھی اور فطرتاً جنگجو۔ شہنشاہ نے اس جرمن قوم کے

حکمران کو 'رومن جزا' کا خطاب بخشا تا کہ وہ اپنی قوم کا بادشاہ بھی رہ سکے اور شہنشاہ کے تابع بھی رہے۔ چھ سال نہ گزرے تھے کہ ۳۷۸ء میں اس بیرونی قوم نے اپنے لیے ایک پسندیدہ علاقے کا مطالبہ کرتے ہوئے بغاوت کردی۔ اس زمانے میں آرکیڈیئس (Arcadius) مشرقی سلطنت روم کا شہنشاہ تھا اور اس کا بھائی ہونوریئس (Honorius) مغربی سلطنت کا قیصر تھا۔ ان دونوں کے درمیان الائیٹرا (Illyra) کا علاقہ متنازع تھا اور اس پر مغربی سلطنت کا قبضہ تھا۔ شہنشاہ نے اپنے علاقے کو محفوظ رکھنے کے لیے اس مصیبت کا رخ مغربی سلطنت کی طرف پھیر دیا۔ گاتھ حکمران کو اجازت دیدی کہ وہ الائیٹرا کے علاقے پر قبضہ کر لے۔

مغربی سلطنت روم کی تباہی: ویزی گاتھ نے الائیٹرا پر قبضہ کرنے کے بعد سرزمین اطالیہ کا رخ کیا۔ مغرب نے اپنی تمام افواج کو مجتمع کر کے ویزی گاتھ کو پے درپے شکستیں دیں۔ ان جنگوں کے باعث مغربی سلطنت کی سرحدیں دفاعی افواج سے خالی ہو گئیں۔ اٹلیا (Attila) کی سرکردگی میں ہن قوم کی یلغار جاری تھی، جس کے باعث مزید جرمن قبائل پسپا ہو کر مغربی سلطنت روم میں داخل ہونے لگے۔ وینڈال قبائل نے گال (موجودہ جنوبی فرانس) کا پورا علاقہ پامال کر کے بحر روم تک قبضہ جمایا۔ انہوں نے اسپین اور شمالی افریقہ کے علاقے بھی مغربی سلطنت سے چھین لیے۔ وینڈال قبائل کی کامیابی نے برگندی قبائل کو شہہ دی۔ انہوں نے شمالی اسپین اور جنوبی فرانس کو آماجگاہ بنایا۔ اس طرح مغربی سلطنت روم اپنے صوبوں سے محروم ہو کر اطالیہ کی سرزمین تک محدود ہو گئی۔ خود اطالیہ پر ایک جرمن لیڈر 'راداگانیسس' (Radagaisus) نے ایک بھرپور حملہ کیا۔ گواسے شکست ہوئی، لیکن اس حملے کے سبب اطالوی قوت مدافعت بھی ختم ہو گئی۔

ویزی گاتھ قبائل اپنی ابتدائی شکستوں کے سبب خاموش تماشائی تھے لیکن اطالوی قوت کے کمزور ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پورے اطالیہ پر قبضہ کر لیا۔ مغربی شہنشاہ ہونوریئس کو محصور ہونا پڑا۔ ۴۱۰ء میں ویزی گاتھ حکمران فاتحانہ شان سے روم میں داخل ہوا۔

مغربی سلطنت روم کا خاتمہ: ۴۱۰ء کے بعد اطالیہ پر عملاً ویزی گاتھ کی حکمرانی تھی لیکن نام کے لیے ہونوریئس بدستور شہنشاہ تھا۔ جرمن فاتحین وحشی تھے اور رومن تہذیب سے اس قدر متاثر تھے کہ ان کے حکمران اٹھاؤلف (Athaulf) نے رومن شہنشاہ کی بہن سے شادی کرنے میں فخر محسوس کیا، اور اس رشتے کے سبب ہونوریئس بدستور شہنشاہ رہا۔ (for details see, Henry Pirenne; A History of Europe)۔

۴۵۳ء میں اٹلیا نے اطالیہ کا رخ کیا، اور پورے شمالی علاقے کو روند ڈالا۔ اسی سال اٹلیا کی موت واقع ہو گئی اور ہن سلطنت جس تیزی کے ساتھ ابھری تھی اسی تیزی کے ساتھ بیٹھ بھی گئی۔ اٹلیا کی موت کے دو سال بعد (۴۵۵ء) میں وینڈال قوم نے اطالیہ کو تہہ وبالا کر ڈالا۔ اطالوی شہنشاہ اپنی تدبیر کا انتقام لینے سے قاصر تھا۔ رومن شہنشاہیت آخری چٹکیاں لے رہی تھی۔ صرف نام باقی تھا۔ یہ نام بھی اس وقت جاتا رہا جب آسترو گاتھ حکمران 'تھیودورک' (Theodoric)، جسے اٹلیا نے بے وطن کیا تھا، اطالیہ پر حملہ آور ہوا اور ۴۸۸ء میں اس

(Fuller, J.F.C.; *The Decisive Battles of the Western World*, p.37)

مغربی سلطنتِ روما کا چراغ آٹھ صدیوں تک صوفشاں رہ کر بجھ گیا۔ مغرب کے حصے بخرے ہو گئے۔ مشرقی سلطنتِ روما بازنطین کے نام سے پندرہویں صدی عیسوی تک قائم رہی، یہاں تک کہ، ترک فاتحین نے ۱۴۵۳ء میں اسے بھی ختم کر دیا۔ (The Concise Encyclopedia of the Living Faiths)۔

مغربی ریاستوں کا قیام

مغرب کی علیحدگی : مغربی رومن ایمپائر کے اختتام کے بعد مغرب حسب ذیل چھ خود مختار سلطنتوں میں بٹ گیا۔

- | | | |
|----|--------------------------|------------------|
| ۱۔ | برطانیہ | اینگلیسکین سلطنت |
| ۲۔ | شمالی گال | فرینک سلطنت |
| ۳۔ | پرانس | برگندی سلطنت |
| ۴۔ | اکویٹائیہ اور ایملین | ویزی گاتھ سلطنت |
| ۵۔ | افریقہ اور جزائر بحر روم | ونڈال سلطنت |
| ۶۔ | اطالیہ | آست و گاتھ سلطنت |

(cf. Henry Pirenne; *A History of Europe*, p.30)

یہ ساری کی ساری جرمن سلطنتیں تھیں۔ ان میں سے کسی سلطنت کے حکمران نے نہ تو اپنی شہنشاہیت کا دعویٰ کیا اور نہ ہی بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار اعلیٰ سے کوئی تعارض کیا۔ روم کا پوپ اب بھی شہنشاہ بازنطین کو مغرب کا آئینی شہنشاہ تصور کرتا تھا۔ کلیسا کی دستاویزات پر شہنشاہ بازنطین کے سبب جلوس کی تاریخ درج ہوتی تھی۔ (حوالہ بالا)۔ تاہم عملاً مغرب کا کوئی شہنشاہ نہیں تھا۔

بازنطینی شہنشاہ جسطینین (Justinian) (۵۲۷ء تا ۵۶۵ء) نے اپنے عہد میں مغربی سلطنت کے علاقوں کی بازیابی کا فیصلہ کیا۔ ۵۲۰ء سے ۵۵۳ء تک بازنطینی افواج نے ایسے تمام علاقے فتح کر لیے جو بحر روم سے متصل تھے۔ تاہم اسے فریجک سلطنت اور اینگلو سکسن سلطنت کو فتح کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ جسطینین کے عہد سے مشرقی رومن سلطنت کو بازنطین کہا جانے لگا تھا۔ گویا اس عہد کے بعد سلطنت روم (مغربی)

بازنطین کا ایک مفتوحہ علاقہ بن گئی۔ اس عہد سے قبل 'روم' مشرقی علاقے پر حکومت کرتا تھا، اب خود روم پر بازنطین کی حکومت قائم ہو گئی۔

یہ الحاق بھی عارضی ثابت ہوا۔ جستینین کی وفات کے بعد بازنطین ایمپائر پر رومی علاقے کی وحشی اقوام 'آوار' (Avar) اور 'سلاف' (Slav) نے دھاوا بول دیا۔ دوسری جانب ایشیا میں ایرانی سلطنت سے بھی جنگ چھڑ گئی۔ مغرب پر فوج کشی نے بازنطین کو اس قدر زیر بار کر دیا تھا کہ خزانہ مزید جنگی اخراجات کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ رہ گیا تھا۔ ان حالات نے بازنطین کو مدافعتی جنگ پر مجبور کر دیا اور مغرب کی طرف سے توجہ ہٹ گئی۔ بازنطین کی کمزوری سے ایک نئے جرمن قبیلے 'لومبارت' (Lombard) نے فائدہ اٹھایا۔ اس قبیلے نے گاتھ قبائل کے نقش قدم پر ترک وطن کیا اور شمالی اطالیہ پر قبضہ کر کے لومبارت سلطنت قائم کر لی۔ اس نئی سلطنت کے قیام کی بدولت فرینک سلطنت بازنطین کی دسترس سے باہر ہو گئی۔ ممکن ہے کہ آئندہ کسی موقع پر بازنطین مغربی علاقوں کی بازیابی میں کامیاب ہو جاتا، لیکن اس درمیان ظہور اسلام نے بازنطین کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کرائی اور مغرب نے اپنے آپ کو بازنطین سے ہمیشہ کے لیے آزاد کرالیا۔

لومبارت اور فرینک ریاستوں کی پیروی کرتے ہوئے مغرب کے دیگر علاقوں نے بھی بازنطینی اقتدار کا جواب اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا۔ اس طرح ساتویں صدی کے وسط میں اس سیاسی وحدت کا خاتمہ ہو گیا جسے تاریخ رومن ایمپائر کے نام سے یاد کرتی ہے۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.41)

فاتحین مغرب اور کلیسا : جرمن فاتحین جنہوں نے مغربی رومن ایمپائر پر قبضہ کر لیا تھا، نیم وحشی تھے۔ انہیں تہذیب و تمدن سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مذہباً وہ بت پرست تھے۔ دریائے دینیوب کے آس پاس کے کچھ قبائل اگرچہ عیسائیت قبول کر چکے تھے، مگر وہ رومن کیتھولک کے بجائے 'ایرین' (Arian) تھے۔ مغرب ایرین فرقے کو بدعتی تصور کرتا تھا اور بدعت مغرب کی نظر میں ناقابل معافی جرم تھا۔ جرمن فاتحین روم کی تہذیبی برتری کے قائل تھے، اور انہوں نے تیزی سے رومی تہذیب کو اپنانا شروع کر دیا، اور آہستہ آہستہ رومن (لاطینی) تہذیب میں رنگ گئے۔ انکے جرمن طور طریقے رومن انداز معاشرت میں گم ہو گئے۔

جرمنوں نے نہ صرف طرز حکومت، اصول سیاست اور انتظامِ مملکت کو قبول کر لیا بلکہ کلیسائے روم کی کوششوں سے انہوں نے رومن کیتھولک مذہب بھی اختیار کر لیا۔ عیسائی ہونے کے بعد کیتھولک چرچ نے انہیں مغرب کے شہری تسلیم کر کے 'عیسائی دولت مشترکہ' (Christian Common Wealth) کا رکن بنادیا۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.32)

اس طرح یہ نیم وحشی جرمن جو بظاہر فاتح تھے، حقیقی فاتح نہ ثابت ہو سکے۔ ان کی تہذیبی موت جلد ہی واقع ہو گئی۔ حقیقی فاتح، رومن چرچ ثابت ہوا جس نے ان وحشیوں کو رام کر کے اپنا تابع فرمان بنالیا۔

(Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. II, p.320)

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

مغرب میں کوئی شہنشاہ نہ تھا۔ بازنطینی شہنشاہ کا اقتدار برائے نام تھا۔ رومن دور کے قانون ساز ادارے 'سینیٹ' کو جرمن فاتحین نے نابود کر دیا تھا۔ اب تمام اقتدار حکمران کی ذات میں مجتمع ہو گیا۔ مغربی ریاستوں کے سارے حکمران عیسائی ہو چکے تھے، اور پوپ کو اپنا روحانی مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتے تھے۔ پوپ کے پاس اسکی اپنی سینیٹ 'کیوریا' (Curia) موجود تھی۔ قریہ قریہ گرجا گھر تھے۔ ہر گرجے کے پادری کا عوام سے قریبی تعلق تھا۔ مذہبی سربراہ کی حیثیت سے پوپ کا حکم بادشاہ پر بھی چلتا تھا، جبکہ پوپ بادشاہ کے حکم کا پابند نہیں تھا۔ پوپ کا ادارہ 'کلیسا' مالی اعتبار سے خود کفیل، اور انتظامی معاملات میں خود مختار تھا۔ اس کے سارے کارکن تعلیم یافتہ، تربیت یافتہ، اور انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جبکہ حکمران ان سہولتوں سے عاری تھے۔ رومن سول ایڈمنسٹریشن تباہ ہو چکا تھا۔ جرمن اسے بحال نہ کر سکے۔ عملاً حکومت کا ہر شعبہ ناکارہ ہو چکا تھا۔ نتیجتاً فاتحین نے بے بسی کے عالم میں کلیسا کی طرف دیکھا۔

رباطی نظم و نسق پر چرچ کی بالادستی : کارولن جینن (Carolingian) خاندان نے فرینک سلطنت کے نظم و نسق کی بحالی کے لیے کلیسا سے کارکن مستعار لیے، اور ایسے تمام عہدے جہاں نوشت و خواند، فہم و فراست، حکمت اور فیصلے کی ضرورت تھی، مجبوراً کلیسا کے حوالے کیے۔ کلیسا نے ان عہدوں کو قبول کر کے مغرب کی سیاست کو اپنے تابع کر لیا۔ (Henry Pirenne; A History of Europe, p. 57)۔

رومن کیتھولک چرچ، رومن ایمپائر میں سات صدیاں گزار چکا تھا۔ اس دوران اس نے انتظامی ڈھانچہ، زبان (لاطینی)، رسم الخط، قانون، رسم و رواج، غرض یہ کہ سب کچھ رومن ایمپائر سے اخذ کیا، اور ایمپائر کے زوال کے بعد، کلیسا نے یہ ساری قدریں محفوظ اور زندہ رکھیں۔ کارولن جینن دور میں کلیسا نے ان تمام قدروں کو پھر سے حکومت کے لیے استعمال کر کے ان کا احیاء کیا۔ چونکہ نئے معاشرے کو یہ سب کلیسا کے توسط سے میسر آئی تھیں، اس لیے کرجینن قدریں کہلائیں، حالانکہ ان میں سے کوئی بھی قدر کرجینن نہ تھی، بلکہ سب کی سب من وعن رومن تھیں۔

کارولن جینن عہد سے قبل چرچ ریاست (State) کے ماتحت تھا۔ شہنشاہ کا حکم چرچ کے معاملات میں بھی حرف آخر تھا، جبکہ چرچ کو حکومت کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس عہد سے مغرب میں یہ کیفیت بالکل بدل گئی۔ اب اسٹیٹ کو چرچ کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں تھا جبکہ چرچ اسٹیٹ کے ہر شعبے میں دخل اور بالادست تھا۔ اس اقتدار اور بالادستی سے مشرقی چرچ بازنطین میں بالکل محروم تھا۔ بازنطینی شہنشاہ کے نزدیک پوپ کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ دوسرے اسقفوں کی طرح پوپ بھی شہر روم کا اسقف تھا، جس کے تقرر اور تزل کا اختیار شہنشاہ کو حاصل تھا۔

مغرب پر جیسے جیسے شہنشاہ بازنطین کی گرفت کمزور ہوتی گئی، پوپ کا اقتدار مستحکم ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ پوپ نے شہنشاہ کی جگہ سنبھال لی۔ وہ مغرب کی عظیم ترین شخصیت بن گیا۔ وہی مغربی حکمرانوں کا رہنما تھا۔ اسی کے دم سے مغرب کا نظم و نسق قائم تھا۔ وہی قانون ساز تھا۔ وہ بوقت ضرورت سیاسی مدد کی حیثیت کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

سے معاہدات کرتا تھا۔ اس کے توسط سے حکمرانوں کے قبضے طے ہوتے۔ وہ حملہ آوروں سے صلح کی شرائط طے کرتا۔ علاقوں کی مدافعت کرتا اور بادشاہوں کے تنازعات طے کرتا۔

بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار کا خاتمہ : مغرب کے نئے معاشرے میں پوپ نانچ عیسیٰ تھا، جس کے تقدس کی نظیر روئے زمین پر نہیں تھی۔ مغرب کے عوام و خواص سب پر ہی اس کا حکم چلتا تھا۔ ہر حکمران پوپ کی قدم بوی کو اپنی سعادت تصور کرتا تھا۔ ان حالات میں پوپ کے لیے یہ ممکن نہ رہ گیا تھا کہ بازنطینی شہنشاہ کا اقتدار مغرب میں باقی رہنے دیتا۔ پوپ اگر بازنطینی شہنشاہ کے اقتدار کو باقی رہنے دیتا تو خود اس کا اقتدار مجروح ہوتا۔ چونکہ ابھی تک پوپ کے وسائل اتنے نہ تھے کہ شہنشاہ سے بغاوت کر کے اس کی دسترس سے محفوظ رہتا، لہذا وہ موقع کی تلاش میں تھا جو اسے جلد ہی مل گیا۔

مسلمہ بن عبد الملک نے ۱۷۱ء میں قسطنطنیہ پر حملہ کیا۔ دو سال شہر کا محاصرہ جاری رکھنے کے بعد ۱۷۸ء میں اس نے مراجعت اختیار کی۔ [Bury J. B.; History of the Later Roman Empire, Vol. II, p.405] اس واقعے نے بازنطینی شہنشاہ لیو سوم (Leo III) کے وقار کو عالم عیسائیت میں خاصا بلند کر دیا۔ [Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p. 241] اس نے نہ صرف فوجی اور ملکی معاملات میں اصلاحات کیں بلکہ مذہبی معاملات میں بھی اصلاحات کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ چرچ کی قوت میں کمی کر سکے اور عوام کو کلیسا کی ذہنی غلامی سے نجات دلا سکے۔ (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. III, p.276) نیز (حوالہ بالا صفحہ ۲۴۲)۔

چنانچہ ۲۶۱ء میں اس نے [غالباً اسلام سے متاثر ہو کر] شیعہ پرستی (Incanoclast) کی ممانعت کرتے ہوئے حکم دیا کہ کلیساؤں کو ہر قسم کی تصاویر اور مجسموں سے پاک کیا جائے۔ شہنشاہ کے اس حکم نے پوپ کو چراغ پا کر دیا اور اس نے شہنشاہ کو ملعون و مردود قرار دے دیا۔ (ملاحظہ کیجیے فلر حوالہ بالا، صفحہ ۲۷۶) نیز (Henry Pirenne; A History of Europe, p.65)۔ پوپ کا یہ عمل آزمائش تھا۔ اس سے قبل کسی کلیسا کے سربراہ نے شہنشاہ کے ساتھ اس قسم کی گستاخی کی جرأت نہیں کی تھی۔ شہنشاہ بازنطین اس بے عزتی کو برداشت کرنے پر مجبور ہو گیا، کیونکہ مغرب پر اس کا اقتدار برائے نام تھا۔ اطالیہ اس کے قبضے سے نکل کر لومبارت حکمرانوں کے زیر تسلط تھا۔ (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. II, p.431)۔ فرینک حکمران، اسپین کے مسلم حکمرانوں کا مقابلہ فرانس میں کامیابی سے کر رہے تھے۔ شہنشاہ بازنطین کی بے بسی اور فرینک حکمرانوں کی روز افزوں قوت پوپ کے لیے حوصلہ افزا ثابت ہوئی۔

مغرب خود مختاری کی جانب : ابتدائی آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلمانوں نے اسپین کو فتح کرنا شروع کیا، اس وقت فرینک سلطنت پر جو خاندان حکمران تھا اسے میر وڈینین (Merovingian) گھرانہ کہا جاتا ہے۔ ابتدا یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی، مگر مسلم حملے کے وقت تک اس کی حدود اسپین سے لیکر دینیوب تک وسیع ہو چکی تھیں۔ فرینک حکمران اطالیہ پر یلغار کر کے قدم بقدم لومباردوں کو شکست دے رہے تھے۔ لیکن مسلم حملے نے

انکو جہاں تھے وہیں روک دیا۔ آہستہ آہستہ ان پر زوال آتا گیا۔ میرودنجین بادشاہ آخر وقت میں بالکل بے دست و پا تھے۔ اصل قوت شاہی محل کے حاجب (Mayor of the Palace)، پپاں (Pippin) کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ شخص ایک نیم جرمن-نیم رومن گھرانے 'کارولن جین' سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی کے دور میں اس کے بیٹے چارلس مارٹل (Charles Martel) نے کئی جنگیں جیتیں۔ امیر عبدالرحمن الغافقی نے جب ۳۲ھ میں اسپین سے فرانس میں پیش قدمی کی تو یہی چارلس ان سے 'ٹورس' (Tours) میں مد مقابل ہوا۔ حالات کی ستم ظریفی نے اس جنگ میں فتح کا سہرا چارلس کے سر پر باندھ دیا، جبکہ امیر کی شکست مسلم قبائل کی اندرونی رقابت کا نتیجہ تھی۔ [Cesare Folingo; The Legacy of Rome, article 'The Transmission of the Legacy', pp.14-15]۔ اس مفروضہ فتح نے چارلس کو پوری سلطنت کا ہیر و اور آقا بنا دیا۔

چارلس کے بعد اس کا بیٹا 'پپاں دی شارٹ' (Pippin the Short) ۷۵۱ھ میں جانشین ہوا۔ اس نے ارباب کھیس سے تعلقات پیدا کیے اور 'سینٹ بونی فیس' کے توسط سے اس نے پوپ تک رسائی حاصل کی۔ حالات ایسے تھے کہ پپاں اور پوپ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت تھی۔ پپاں عملاً حکمران تھا جبکہ آئینی حکمران میروونجین گھرانہ تھا۔ اسے ایسے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جو اسے آئینی حکمران کی حیثیت دے سکے۔ وہ خود اتنی جرأت نہ رکھتا تھا کہ اپنی قوم کے قانونی تاجدار سے تاج چھین کر اپنے سر پر رکھ لے، اور پوپ میں اتنا یار نہ تھا کہ قابل اعتماد دفاعی قوت کے بغیر شہنشاہ بازنطین کے اقتدار اعلیٰ سے منحرف ہو سکے۔ پپاں اس جنگ سے خوفزدہ تھا جو غاصبانہ تاجپوشی کے سبب قوم میں برپا ہوتا اور پوپ اس فوج سے لرزاں تھا جو شہنشاہ کے اقتدار سے تعارض کی صورت میں بازنطین سے اطالیہ پر نازل ہوتی۔ ہردو کے مقاصد کی تکمیل ایک دوسرے سے ہوتی تھی اور دونوں نے ہی فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

انتقال اقتدار: جب راہ ہموار ہوگئی تو ۷۵۱ھ میں پپاں نے پوپ کی خدمت میں ایک سفارت روانہ کی جس نے پوپ سے یہ درخواست کی کہ،

”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ القاب شاہی ایک ایسے شخص سے منسوب کیے جائیں جو حقیقی معنوں میں اقتدار کا حامل ہو اور عملاً اختیارات کو روکا رکھتا ہو، نہ کہ ایسے شخص سے (منسوب رہیں) جو صرف نام کا بادشاہ ہو۔“

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.77)

اس درخواست پر پوپ نے نہایت ہمدردی سے غور کیا، اور چند ہفتوں کے بعد پپاں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے قانونی بادشاہ کو اپنے باقی ماندہ ایام ایک خانقاہ میں گزارنے کے لیے روانہ کر دیا۔ اس طرح پپاں یا کارولن جین گھرانے کو اقتدار منتقل کر کے پوپ نے مغرب کو بازنطینی حلقہ اثر سے ہمیش کے لیے جدا کر دیا اور مغرب کی ایک ایسی آزاد ریاست کا سبب بنیاد رکھ دیا جس کی تمام توانائیاں پوپ کی خدمت کے لیے وقف تھیں۔

ریاست کلیسا کا قیام : پپاں نے پوپ سے یہ عہد کیا کہ وہ اطالیہ کے لومبارت حکمرانوں پر فوج کشی کرے گا اور انہیں شکست دیکر وہ تمام علاقہ کلیسا کی نذر کرے گا جو مقدس شہر روم کے مضافات میں ہے۔ حسب وعدہ ۵۲۹ء میں لومبارت سلطنت پر فوج کشی کی گئی اور انہیں شکست دیکر شہر روم اور اسکے مضافات کا علاقہ پوپ کو بطور نذرانہ پیش کر دیا گیا۔ اس علاقے پر مشتمل ایک ریاست قائم کی گئی جسے چرچ اسٹیٹ (Church State) کا نام دیا گیا۔ (Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p.243)

قدیم رومن ایمپائر کا پایہ تخت روم اب بلا شرکت غیرے پوپ کا پایہ تخت بن گیا۔ اس ریاست کی حفاظت کی ذمہ داری بھی پپاں پر عائد ہوئی اور اسے اس ذمہ داری کا پابند بنانے کے لیے 'نائب قیصر روم' (Patricius Romanorum) کا خطاب بخشا گیا۔

اقتدار اور مذہبی تقدس : پپاں کی تاج پوشی کے موقع پر جو مذہبی رسوم ادا کی گئیں ان کا اس سے قبل کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا۔ اس مذہبی عنصر کی شمولیت نے بادشاہ کے اقتدار کو ایک مذہبی تقدس بخشا۔ بادشاہ نے اعلان کیا کہ وہ خدا اور اسکے نائب (پوپ) کا وفادار رہے گا۔ حلیب کونشان سلطنت مقرر کیا گیا اور پپاں کو 'شاہ بفضل رب' (Gratia Dei Rex) / (King by the Grace of God) کا خطاب عطا ہوا۔ (Henry Pirenne; A History of Europe, p.78)

حکم کی پابند ہوئی۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۹)۔ یہ پابندی بعد کے حکمرانوں کو وراثت میں ملی اور اب مذہب ریاست کا لازمی جزو بن گیا۔ اب صرف عیسائی ہی مغربی معاشرے کے 'شہری' رہ گئے تھے، غیر عیسائی یا عیسائیت سے خارج کردہ، 'مردود' (Excommunicated)، لوگوں کی حیثیت باغیوں کی تھی، جنکی سرکوبی حکومت اور معاشرے کا فرض تھی۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۹)

مغرب شہنشاہیت کی جانب : ۲۶۱ء میں پوپ نے بازنطینی شہنشاہ کو مردود و ملعون قرار دیکر بازنطینی اقتدار کا مذاق اڑایا۔ پچیس [۲۵] سال بعد ۵۸۶ء میں کلیسا کی کاہنہ لیس حکومت قائم کر کے بازنطین کے متوازی ایک رقیب سلطنت کھڑی کر دی۔ اب اس کا نظر شہنشاہیت تھا۔ پپاں کے بعد اس کا بیٹا شارلمین تخت نشین ہوا۔ شارلمین اعظم کو جو شہرت میسر آئی وہ اس سے قبل صرف رومن شہنشاہ 'سیزر' کو یا اسکے بعد 'نیپولین' کو ہی مل سکی۔ ۸۱۸ء میں جب شارلمین تخت نشین ہوا تو مذہب اس معاشرے کی سب سے بڑی قدر بن چکا تھا۔

شارلمین کے عہد میں کلیسا کے احکامات کو ملکی قوانین کی حیثیت ملی۔ عیسائیت کو بزورِ شمشیر جرمن قوم کیسٹن میں پھیلایا گیا۔ (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. II, p.167)۔ رومن کتھولک معاشرے کی حدود دریا، میوب، رین، سیو، بوکس، دینیوب کے علاقے میں بسنے والی قوم 'آوار' (Avar) کا نام و نشان صفحہ ہستی سے منڈالالیا۔ 'پہلے سلاف' (Slav) کی شامت آئی۔ انہیں بری طرح سے منتشر کیا گیا، اور اس کثرت سے غلام بنایا گیا کہ یورپ میں 'سلاو' (Slav) کے معنی ہی غلام کے ہو گئے۔

شارلمین نے جس علاقے میں بھی فتح حاصل کی وہاں کے لوگوں پر رومن عیسائیت بزرگوار شمشیر مسلط کی گئی، اور ان لوگوں کے لیے جو عیسائیت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے موت کی سزا مقرر کی گئی۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.80: also Bernard Shaw; Shaw on Religion, edited by Warner S. Smith, p.143)

شارلمین نے مسلم اسپین پر بھی حملہ کیا اور ابتدائی کامیابیوں کے بعد ناکامی کا داغ لیکر لوٹا۔ اسکی تمام مہمات کلیسا کے مفاد میں تھیں، خصوصاً لوہار قوم پر حملے، اسپین کی مہم اور سیکسن (Saxon) قوم کی تباہی میں صرف کلیسا کا مفاد تھا۔ ان مہمات کے نتیجے میں پورا مغرب رومن کیتھولک چرچ کے حلقہ اقتدار میں آ گیا اور یہی خدمات تھیں جن کے باعث کلیسا نے شارلمین کو شہرت دوام بخشی۔ یہ شارلمین ہی تھا جس نے مغرب کی سیاست کی باگ ڈور کلیسا کے ہاتھ میں دیدی۔

شارلمین کی خدمات ملک اور مذہب کے لیے کچھ کم نہیں تھیں، سونے پر سہاگہ، اس نے پوپ کی ذات پر بھی ایک احسان کیا۔ اپریل ۷۹۹ء میں پوپ 'لیوسوم' (Leo III) پر زنا کی تہمت لگائی گئی۔ نیز دروغ گوئی اور دروغ حلفی کے الزامات بھی عائد کیے گئے۔ [Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p.245]۔ پوپ نے فرار ہو کر شارلمین کے دربار میں پناہ لی۔ شارلمین نے اسے دوبارہ تعینات کر کے روم واپس کیا۔ اس پر پوپ کے مخالفین مشتعل ہو گئے۔ چنانچہ ۸۰۰ء میں شارلمین اس قضیے کو نمٹانے خود روم پہنچا اور معاملات رفع دفع کیے۔ ۸۰۰ء میں ہی کمرس کی عبادت میں شرکت کے لیے وہ سینٹ پیٹر کے گرجا گھر میں حاضر ہوا۔ ابھی وہ قربان گاہ پر دوڑا تو ہوائی تھا کہ لیو نے قربان گاہ پر سے ایک تاج اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نعرہ بلند کیا،

"Hail to Charles, the Augustus Crown of God, the Great and the Peace Bringing Emperor of the Romans"

(Fuller J.F.C., The Decisive Battles of the Western World, p.245)

”زندہ باد چارلس، مکرم تاج خداوند، معظم، داعی امن، شہنشاہ روم“

تاج پوشی کے بعد لیو نے ان آداب شاہی کے ساتھ اس کی شہنشاہیت کا اعلان کیا جو صرف بازنطینی شہنشاہ کے لیے ہی مختص تھے۔ اس طرح حضرت عیسیٰ کا [مہینہ] یوم پیدائش 'مغربی شہنشاہیت' کا یوم تاسیس بن گیا۔ چونکہ یہ رومن شہنشاہیت سینٹ پیٹر کے مقدس جانشین کے ہاتھوں قائم ہوئی تھی اس لیے اس کا نام مقدس رومن سلطنت مغرب (Holy Roman Empire of the West) رکھا گیا۔

(Sir Thomas Arnold; The Legacy of Islam, p.41)

اس طرح کلیسا نے مغرب کو بازنطینی سلطنت سے علیحدہ کیا۔ مغربی معاشرے کی نشوونما اپنی نگرانی میں کی، اسے ایک شہنشاہیت کا درجہ دیا اور اسے رومن ایمپائر کا جانشین بنایا۔ یہ ایسی ایمپائر تھی جسکا شہنشاہ پوپ کی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

قد مبوی کرنے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ جو کلیسا کی حفاظت اور اس کے مقاصد کی تکمیل کے لیے وقف تھی اور جسکی باگ و درپوپ کے ہاتھوں میں تھی۔

مغرب کا معاشرہ

مغربی معاشرہ مذہباً کیتھولک عیسائی تھا اور اس نے عیسائیت کو رومن دور میں قبول کیا تھا۔ لیکن یہ عیسائیت خالص رومن عیسائیت تھی، اور سر تاپا ہیلینک (Hellenic) اثرات کی حامل تھی۔

(Toynbee A.J.; 1956, A Study of History, 7th ed., London, Vol. I, p.95)

ہیلینک سوسائٹی دیویوں و دیوتاؤں پر یقین رکھنے والی تھی۔ ہر دیوی اور دیوتا ایک 'انسان-خدا' (Man-God) تھا، جسے معاشرے نے الوہیت کے مقام پر فائز کر دیا تھا۔ یہ دیوتا کسی نہ کسی الہ کا فرزند ہوتا تھا۔ [انسان کی حیثیت سے] مرتبا تھا اور پھر زندہ جاوید ہو جاتا تھا۔

صرف ہیلینک سوسائٹی ہی میں نہیں، بلکہ اس سے قبل 'مینوئی' (Minoan) معاشرے میں بھی یہی تصور رات اور عقائد پائے جاتے تھے۔ مینوئی معاشرے کا مقدس نشان دوہری کلباڑی تھی، اور ا۔ کا دیوتا 'زیگزیوس' (Zagrieus) فرزند الہ تھا جو مکر پھر زندہ ہوا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۹۹)۔ مغربی معاشرے کے عیسائیت کا دامن تھام لینے کے بعد فرق صرف یہ پڑا کہ قدیم دیوتاؤں کی جگہ یسوع مسیح نے لے لی۔ [اور دوہری کلباڑی صلیب بن گئی۔] مغربی معاشرہ اپنے آپ کو مجموعی عیسائی دنیا کا ایک حصہ تو مانتا ہے مگر بقیہ عیسائی دنیا کو اپنے سے کمتر، اور ایک جداگانہ معاشرہ بھی تصور کرتا ہے۔ احساس برتری اس کے رگ و پے میں گردش کر رہا ہے۔ وہ خود کو نوع انسانی کا ممتاز و افضل ترین حصہ سمجھتا ہے۔ مختلف نوعیت کی فتوحات میسر آنے کے سبب ساری دنیا مغرب کے بیچ در بیچ جال میں پھنس گئی ہے۔ مغربی معاشرہ خود کو (Civilized Lord of the World) (متمدن آقائے عالم) کہتا ہے اور اب مغربی تہذیب کو عالمی تہذیب کہا جانے لگا ہے، حالانکہ یہ کیفیت سطحی، اور صرف معاشی اور سیاسی حد تک ہے۔ بقیہ دنیا کا حقیقی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی نقشہ اب بھی ویسا ہی ہے جیسا مغربی سوسائٹی کے معاشی اور سیاسی غلبے سے پہلے تھا۔ مغرب نے عالمی تہذیبوں کو ممکنہ حد تک پامال کیا، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ نیم مہذب معاشرے تک ان کے دہ و میں آ کر ف نہیں ہو سکے، اور آج بھی دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہیں۔

مغربی معاشرے کی نگاہ میں غیر مغربی معاشرے کے لیے کوئی احترام موجود نہیں ہے۔ رنگ و نسل کا جس قدر شدید امتیاز اس کے اندر چھپا جاتا ہے، تاریخ عالم اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ ہر غیر مغربی

انسان اس کی نظر میں جانور یا چلتا پھرتا درخت ہے، جو جذبات اور عقل و فہم سے عاری ہے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۵۲)۔ مغرب کا مشہور مقولہ ہے، 'Niggers have no Souls'، یعنی 'نیگرو یا رنگی میں روح نہیں ہوتی'۔ اس معاشرے میں ہر غیر مغربی کے لیے، خواہ وہ مہذب ہو یا غیر مہذب، لفظ 'مقامی' (Native) استعمال ہوتا ہے۔ صرف اس ایک لفظ میں حقارت اور تذلیل سمٹ کر جھسم ہو گئی ہے۔ یہ تو مغربی معاشرے کی ذہنی کیفیت ہے۔ عملاً دنیا کی جس قوم سے بھی انکا سابقہ پڑا، انہوں نے مکر و فریب، کشت و خون، تباہی و غارتگری، معابدات و اعداد، غرضیکہ کسی نہ کسی طور پر نہ صرف اسے محکوم کیا بلکہ اسے تباہیوں کی انتہا تک پہنچا کر ہی دم لیا، اور دنیا کے جن علاقوں کو اپنی رہائش کے لیے منتخب کیا، وہاں کے اصل باشندوں کا جینا حرام کر دیا، بلکہ بعض اقوام کا تو وجود ہی صفحہ ہستی سے منادیا۔

موسولینی (Benito Mussolini, 1883-1945) کے ایک اطالوی سینیٹر کو نیوا انگلینڈ یونیورسٹی کا پریزیڈنٹ، لائبریری کا معائنہ کروا رہا تھا۔ اس لائبریری کی سب سے نادر کتاب بائبل کا وہ نسخہ تھا جو سترہویں صدی عیسوی میں ان 'سرخ ہندیوں' (Red Indians) کی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا تھا، جو کسی زمانے میں 'نیوا انگلینڈ' کے اصل باشندے تھے۔ سینیٹر اس نسخے کو دیکھ کر بے حد مسرور ہوا۔ اس نے پوچھا کہ کیا یہ کتاب بھید نایاب ہے؟ یونیورسٹی کے پریزیڈنٹ نے نہایت فخر سے جواب دیا کہ روئے زمین پر اب اس کے چھ نسخے بھی نہیں مل سکتے۔ سینیٹر نے یہ سن کر کہا کہ تب تو ریڈ انڈین اس کتاب کو نہ پڑھ سکتے ہونگے۔ پریزیڈنٹ نے روانی میں کہا کہ اب ریڈ انڈین ہی نہیں رہے تو پڑھے گا کون؟ اطالوی سینیٹر نے پوچھا کیوں؟ ریڈ انڈین کیا ہو گئے؟ پریزیڈنٹ ٹیٹا گیا۔ پھر سنبھلا اور کہنے لگا کہ بس ناپید ہو گئے۔

صرف ریڈ انڈین ہی نہیں، انگریز فاتحین نے شمالی امریکہ کے دیگر قدیم باشندوں کی بھی نسلیں کی نسلیں مٹا ڈالیں۔ اسپین کے فاتحین نے جزیرہ کیریبین (Caribbean) کے تمام کے تمام مقامی باشندوں کو نابود کر دیا۔ آسٹریلیا اور فلپائن کے اصلی باشندے آخر قدیم بن گئے۔ جنوبی افریقہ میں مقامی آبادی اپنے حشر سے دوچار ہے۔

یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے کہ ساری دنیا اسی مغربی معاشرے کی جاگیر بنی۔ امریکہ (شمالی اور جنوبی)، افریقہ، آسٹریلیا، ایشیا، جہاں دیکھیے، صرف مغربی سوسائٹی کی یلغار اور یورش نظر آتی ہے۔ برطانیہ، فرانس، اسپین، جرمنی، اطالیہ، پرتگال اور ولندیز، یہی تو تین جنہوں نے اپنی کٹی حد و دست بہرہ دنیا کو غلامی کا تختہ دیا۔ اور یہ سب کے سب مغربی سوسائٹی کے ارکان ہیں۔ اس دن میں یورپ نے کسی غیر مغربی لیبرے کے لیے کوئی گنجائش نہیں پیدا ہونے دی۔

مغرب اپنی تہذیب اور اپنی تاریخ کو عالمی روایت کا درجہ دیتا ہے جو صرف ایسی خوش فہمی ہے۔ اگر وہ اپنی تہذیب و تاریخ کے سوا باقی تہذیبوں اور تاریخوں کو عالمی ہے تو اس بات میں شہر و زمین پایا جائے گا۔

(Toynbee A.J., 1956, A Study of history, 7th edition, London, Vol. I, p.156)

اپنی تہذیب کو دوسروں پر فوقیت دینا محض احساس برتری کا اظہار ہے، ورنہ دنیا کی زندہ تہذیبوں میں سے کون سی تہذیب ہے جو باعث افتخار نہیں ہے۔ ہر تہذیب اعلیٰ اور ارتقائی خطوط کی حامل ہے۔ مشرقی آرٹ، فلسفہ، چین، قہر اسلام اور حکمت ہند، سب اپنی اپنی تہذیبوں کے سر بلند مینار ہیں۔ لیکن مغرب بیک جمش لب ان سب کو افوقیت قرار دیتا ہے۔ یونانی معاشرے کا احترام بھی ان کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے، حالانکہ مغرب کے لیے یونانی تہذیب عرصے تک سرمایہ افتخار رہی ہے۔ مغرب اگر کسی غیر مغربی تہذیب کا ذکر کرتا ہے تو تمسخر کے ساتھ، اور اگر اپنی تہذیب پر آنچ آتے دیکھتا ہے تو دنیا کی دوسری اقوام کو تباہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

مغرب کی تمام اقوام ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں، جنہیں اگر ایک مشترک نام دیا جائے تو وہ 'ناروک مین' (Nordic Man) کہے جاسکتے ہیں۔ ناروک لوگ شمالی یورپ کے اصل باشندے تھے۔ بحورے بال اور نیلی آنکھیں۔ زمانہ قبل از تاریخ سے یہ لوگ اپنے ناروک علاقے سے منتقل ہو ہو کر جنوب کی طرف آتے رہے۔ انہوں نے بحر روم کی کمزور اقوام پر اپنی حکومت قائم کی۔ قدیم رومی، قدیم یونانی، جرمن، فریک، سب کے سب ناروک تھے۔ یہ جسمانی ساخت اور زبان کے اعتبار سے ہندوستانیوں سے مشابہ ہیں، اس لیے انہیں 'ہند-اروپائی' (Indo-European) کہا گیا ہے۔

”چونکہ ہند-اروپائی فرزندوں نے فاتحین کی حیثیت سے مشرق و مغرب ہر طرف ساری دنیا کو زیر نگین کیا تھا، اس پر حکمرانی کی تھی، اور یہی وہ نسل تھی جس نے زرتشت، مہاتما گوتم بدھ، سقراط، افلاطون، ارسطو جیسے مفکر پیدا کیے تھے، سکندر، دارا، سیزر اور آگستس جیسے فاتحین اس میں گزرے تھے، اسی نے رومہ الکبریٰ کی سیاسی عظمت کی تشکیل کی تھی، اسی نسل کے طفیل دنیا کو سائنس اور صنعت ملی، اس لیے یہ نسل انسانی باقی تمام نوع انسان سے افضل ہے۔“ یہ تو ایسی تعریف تھی جس پر سارے یورپ کو اتفاق تھا لیکن جب قومیت کے جذبے نے جنم لیا تو مختلف اقوام نے اور خصوصاً جرمنوں نے حدت کے ساتھ اس میں جذبہ باتیت بیدار کی۔ اندو-اروپائی اصطلاح کو 'اندو-جرمانک' اصطلاح بنادیا۔ یکے بعد دیگرے ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنہوں نے اس نظریے کی دیوانگی میں اضافہ کیا اور بالآخر یورپ مغربی معاشرہ اس نسلی احساس برتری کا شکار ہو گیا۔

ہوسٹن اسٹوارٹ چیمبرلین (Houston Stuart Chamberlain) کی فعال قوت منتحیہ نے ہر عظیم تہذیب، ہر عظیم کارنامے اور ہر عظیم شخصیت کو 'ناروک مین' سے منسوب کر ڈالا۔ وہ صرف شارلمین اور دانٹے کو ناروک مین بنانے پر مطمئن نہ ہو سکا، بلکہ اس نے حضرت عیسیٰ کو بھی اس میں شریک کر کے ہی دم لیا۔ (Toynbee, A.J.; A Study of History, 7th ed. Vol. I, p.219)۔ غرض یہ کہ ناروک مین کا نظریہ ایسا پارس تھا جو ہر سفید آدمی کو کندہ بنا دیتا ہے۔

نسلی برتری کا یہ تصور مغرب کو دیگر سفید فام اقوام پر کوئی خصوصی برتری نہیں دیتا تھا۔ اس نے انسان کو سفید فام اور رنگدار گروہوں میں تقسیم کر دیا اور تقسیم کا یہ نظریہ وسط انیسویں صدی میں عام ہوا۔ پندرہویں صدی تک مغرب میں انسان کی تقسیم ایک دوسرے انداز میں کی جاتی تھی۔ یہ تقسیم کرکچین اور بے دین

(Christians and Heathen) کی تھی۔ یہ قدیم تقسیم، جدید کے مقابلے میں قدرے بہتر تھی کہ اس میں دیگر نسلوں کو عیسائی ہونے کے طفیل کچھ نہ کچھ عزت میسر تھی۔ [اور کوئی بھی شخص پتسمہ لیکر عیسائی بن سکتا تھا۔] مغرب میں تقسیم کی یہ شراب دوا تشہ ہو گئی۔ نسلی تفاخر نے کردار، اخلاق اور مذہب کی قید اٹھا کر صرف رنگ کو معیار برتری بنا دیا۔ کیتھولک عیسائی کی قدیم شرط نے مغرب کو دیگر سفید فاموں پر اپنی برتری جتانے کا موقع دیا۔ قدیم عیسائیت کی نظر میں عالم عیسائیت کے سوا باقی دنیا بے دین اور گمراہ تھی، مگر ایسی نہ تھی جسے راہ راست پر نہ لایا جاسکے۔ ایسی اچھوت نہ تھی جسے پوتر نہ کیا جاسکے۔ ان گمراہوں کو راہ پر لانے کی امید اور توقع تھی، لیکن نسلی تفاخر نے بقیہ دنیا کو اچھوت سے بدتر بنا ڈالا۔ تاہم اس تفاخر میں فرانس وہ واحد نسل اور قوم ہے جس نے دیگر مغربی ممالک کا ساتھ نہ دیا۔ وہاں معیار تفاخر رنگ و نسل و مذہب کی جگہ صفات انسانی کو تسلیم کیا گیا۔ فرانس میں انسانیت کی تقسیم صاحب صفات اور محروم صفات دو گروہوں میں کی جاتی ہے۔

(Taylor Griffith; 1927, Environment and Race, Oxford Univ. Press, p. 33)

رنگ صرف نار دک مین کا معیار ہے جو اسے دنیا کے دیگر انسانوں سے تمیز کرتا ہے۔ ورنہ دیگر معاشروں میں رنگ معیار مفاخرت نہیں۔ ہندوستان میں ذات پات معیار مفاخرت ہے۔ برہمن اور چھتری چاہے جس رنگ کے ہوں ممتاز ہیں۔ جاپان میں لوگوں کے رنگ زرد، سرخ، سفید ہر طرح کے ہیں مگر وہاں بھی رنگ معیار مفاخرت نہیں۔ نیز نسل بھی عالمی معیار افتخار نہیں۔ یہ معیار بھی بدلتا جاتا ہے۔ چین اور جاپان میں نسلی نجابت کا معیار جسمانی بال ہیں۔ جس کے جسم پر جتنے کم بال ہوں گے وہ اتنا ہی نجیب تصور کیا جاتا ہے، اور بالوں کی زیادتی کمتر نسل کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک اور معیار تمیز انسانی جسم کی بو ہے۔ دور وحشت میں انسانی جسم سے شیر اور چیتوں جیسی بو آ کر تھی۔ اس قسم کی بو کا ہونا بھی دور وحشت سے قربت کی دلیل ہے۔ مغربی افراد کے جسم کی یہ بو غیر مغربی انسان بے آسانی محسوس کر لیتا ہے، جبکہ مغربی فرد خود اپنی یہ بو نہیں محسوس کر سکتا۔ غرض یہ کہ مغرب کی نسل پرستی میں جو بھونڈی، سنگدلانہ اور سستی خود پرستی پائی جاتی ہے وہ اس سے قبل کسی اور تہذیب میں نہیں پائی گئی۔ عصر حاضر نے اسکی مضرت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی مذمت شروع کر دی ہے۔ یونانیوں کو کبھی نسلی برتری کا سہارا لینا پڑا تھا لیکن ان کے نسلی برتری کے فلسفے میں عقلیت، اخلاق، مروت اور بے تعصبی کی شان بھی پائی جاتی ہے۔

رنگ و نسل کے امتیاز کے ساتھ مغرب کو روم سے ایک عقیدہ دوام بھی ملا۔ رومن دنیا، اپنی تہذیب، اپنے ملک و قوم نیز مذہب کو لافانی تصور کرتی تھی۔ قدیم شعراء، مثلاً تائبلس (Tibullus 54-18 B.C.) لافانی شہر روم کے قصائد پڑھتے چلے آئے ہیں، جبکہ درجل نے کہا،

"I give you the Empire without end."

"میں تجھے سلطنت ابدی عطا کرتا ہوں۔"

(cited by Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. IV, p.4)

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

لیوی نے اسی یقین کے ساتھ روم کو ابدی شہر لکھا۔ (The City founded for Eternity)۔ (حوالہ بالا)۔ اس معاملے میں مسیحی اہل فکر بھی بت پرستوں سے پیچھے نہ تھے۔ وہ بھی روما کو لافانی تھوکر کرتے تھے۔ جب ۳۱۰ء میں روم کو شکست فاش ہوئی تو یہ لمحہ عیسائیت کے لیے نہایت اندوہناک تھا۔ اس شکست کی ذمہ داری بت پرستوں نے دین مسیحی پر ڈالی اور کلیسا نے اپنا پورا زور قلم اسکی تردید میں صرف کر دیا۔ سینٹ آگسٹائن نے مشہور کتاب 'سٹی آف گاڈ' (City of God) تحریر کی جس میں روم کے سقوط کی یہ توضیح کی کہ روم کا مشرک دور ختم ہو گیا اور اب ایمان کا نیا دور شروع ہوا ہے۔ اسے مسیحی شہر ہونے کا جواز مزید میسر آیا ہے، وہ ابد تک قائم رہے گا۔ یہی وہ مفکر تھا، جس نے آسمانی بادشاہت کی تاویل چرچ سے کی۔ (Nick Earl; 1967, Culture and Creed, London)۔ گویا رومن ایمپائر کی جگہ چرچ نے لیکر انجیل کی آسمانی بادشاہت قائم کر دی۔ اسی عقیدہ دوام کا یہ اثر تھا کہ مغرب کی ہمیشہ یہ تمنا رہی کہ سلطنتِ روما کے کھوئے ہوئے علاقوں کو از سر نو عالمِ عیسائیت میں شامل کیا جائے۔ [Grunebaum, G.E.; 1953,] (Mediaeval Islam, Chicago, 2nd ed., p.6)۔ صلیبی جنگیں، ہسپانیہ سے مسلمانوں کا اخراج، مسلم ممالک پر حملے، اور اس صدی میں ترکی پر یونان کی یورش، یہ سب واقعات اسی جذبے کی پیداوار ہیں۔ مغرب کے احساسِ برتری کے عناصر میں ایک عنصر مذہبی برتری کا بھی تھا۔ سلطنتِ روما کے خاتمے کے بعد نشاۃ ثانیہ تک مغرب کی اہم ترین قدراں کا مذہب ہی تھا۔ اس دور میں پورا مغرب چرچ کی گرفت میں تھا۔ مغرب پر شمالی وحشی قبائل کی یلغار عہدِ وسطیٰ میں مسلسل جاری رہی، لیکن ان سب کو چرچ بتدریج عیسائیت میں ضم کرتا رہا۔ عیسائیت قبول کرنے کے بعد ان حملہ آوروں کو مغربی عیسائی دنیا کا شہری تسلیم کر لیا جاتا تھا۔ گویا نسل، وطن اور قومیت کا یہاں کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ سب عناصر مذہب کے آگے لائے جاتے تھے۔ صرف عیسائیت ہی وہ معیار تھا جس کی بناء پر مغرب کی شہریت مل سکتی تھی۔ مغرب میں عیسائیت کے قیام اور دیگر مذاہب کو ختم کرنے کی منظم کوشش کی گئی۔ رومن عہد میں جبری تبدیلی مذہب کا لامتناہی سلسلہ ملتا ہے۔ بت پرستی کو چوتھی صدی عیسوی میں قسطنطین نے قانوناً ممنوع قرار دیا۔ ۴۱۵ء میں تھیودوس نے پورے مغرب میں ہر قسم کے مشرکانہ مذاہب پر پابندی لگائی۔ تھیودوس ثانی نے غیر عیسائیوں کو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کیا۔ لیونے غیر عیسائیوں کے لیے قانون کا پیشہ ممنوع قرار دیا۔ جستینین نے تعلیم کے عہدے صرف عیسائیوں کے لیے مختص کیے، اور آخر ۵۲۹ء میں اس نے یہ حکم جاری کیا کہ ہر مشرک یا تو پتھر لے یا پھر اسکا مال و متاع ضبط کر کے اسے ملک بدر کر دیا جائے۔

چھٹی صدی عیسوی کے اواخر میں پوپ گریگوری نے اطالیہ اور سسلی میں کچھ غیر عیسائی آئینیٹیں پائیں جو گورنروں کو اپنی مذہبی آزادی قائم رکھنے کے عوض باقاعدہ سالانہ جزیہ پیش کیا کرتی تھیں۔ (Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.323)۔ اسے مغربی مورخین

(Douchey) کا مانتے ہیں۔

رومن عہد کے بعد مغربی عہد میں اس جبری تبدیلی مذہب میں مزید شدت نظر آتی ہے۔ شارلمین کے عہد میں غیر عیسائی کے لیے دو ہی صورتیں تھیں۔ عیسائیت یا موت۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۳۲۲)۔ اس جبری تبدیلی میں صرف حکومت ہی ملوث نہیں تھی بلکہ کلیسا بھی برابر کا شریک تھا۔ اسی کے ایماء پر حکومتوں نے یہ اقدامات کیے۔ پوپ گریگوری اول نے غیر عیسائیوں کو جنگ کے ذریعے عیسائی بنانے کے لیے تحریک چلائی۔

(Grunebaum, G.E., 1969, Islam, Oxford, p.129)

چرچ کے دور اقتدار میں کسی فرد کے لیے عیسائیت سے انکار، یا پسماندہ لینے کے بعد کلیسا کے قانون سے گریز ممکن نہ تھا۔ ایسا کرنا نہ صرف کلیسا بلکہ حکومت اور معاشرے سے بغاوت کے مترادف تھا۔ کلیسا سے سرکشی کا نام بدعت تھا، اور بدعت اس دور کا سب سے بڑا جرم تھا۔ بدعت کا احاطہ نہایت وسیع تھا۔ اس کا اطلاق مذہب، فکر، رسم و رواج، علم و عمل ہر شے پر تھا۔

بدعت کے نام پر مغرب نے انسانی معاشرے پر جو مظالم کیے ہیں وہ عدم رواداری کی بدترین مثال ہیں۔ سیکسن قوم کا قتل عام صرف اس سبب سے ہوا کہ وہ عیسائی نہیں تھے۔ دو سو سال تک حروب صلیبی لڑی گئیں، جن میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ انابپٹسٹ (Anapablist) فرقے کا قتل عام، پروٹسٹنٹ فرقے کا قتل عام، فرانس میں سینٹ بارتھولومیو (Saint Bartholomew) کا قتل عام، فرانس میں فرانس اول کے دور سے آئے چہارم کے دور تک ہونے والی چالیس سالہ خونریزی، اسی کا شاخسانہ تھے۔ اس پر مذہبی داروغہ کے نام پر صدیوں لوگوں کو کلیسا کی [نام نہاد] عدالت نے قانون بدعت کی آڑ میں موت کے گھاٹ اتارا۔ بیس سال تک پوپ کے خلاف پوپ کے نتیجے میں خونریزی، نئی دنیا (شمالی اور جنوبی امریکہ) میں صلیب کے سائے تلے ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کا قتل عام، اسپین میں ایک ایسی قوم کا قتل عام جو وہاں آٹھ سو سال سے بس رہی تھی، جس نے ملک کی حالت ہی بدل دی تھی، جو عہدِ حاضر کی اولین معمار تھی اور جس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ عیسائی نہیں تھی۔

(H. Pirenne; 1967, A History of Europe, 9th Imp. London)

جرمنی میں کسانوں کا قتل عام، اور البی جنسس (Albigensis) یا کتھارس (Cathars) فرقے

کا قتل عام، غرض کہ مذہب میں جبر و قوت کا استعمال ایک عام دھڑلہ رہا ہے۔ [Bernard Shaw; Shaw]

[on Religion, London, edited by Warner S. Smith, p.155]۔ پانچویں صدی سے لیکر سولہویں صدی تک عیسائیت کے عقائد کی ترویج اور حفاظت دونوں کے لیے قوت اور جبر کا بے دریغ استعمال کیا گیا۔ یہاں تک کہ مغرب میں سوائے رومن کیتھولک کے اور کوئی عقیدہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مغرب میں، جہاں کسی غیر کیتھولک کا وجود نہیں پایا جاتا تھا، رواداری کے عدم وجود کو اس دور کے بیشتر اصحاب قلم تسلیم کرتے ہیں۔

اسپین کی تباہی اسی عدم رواداری کی داستان ہے۔ [Trend J.B.; 1960, Legacy of Islam, article]

[- 'Spain, Portugal', Oxford University Press, p.4]

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

مغرب کی خود ستائی صرف تاریخ، معاشرت و تمدن کے شعبوں تک ہی محدود نہیں، بلکہ اس سے مذہب بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ ان کی نظر میں رومن کیتھولک ہی حقیقت عظمیٰ کا حامل ہے۔ مغرب سے باہر کے تمام مذاہب حقانیت سے بیگانہ، باطل اور چربہ ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انہیں مذہب کا شرارہ ایشیا کی سرزمین فلسطین سے ملا ہے۔ اسے بھی نہ صرف اپنی ہی تہذیب کا جزو تصور کرتے ہیں بلکہ ہر وہ حقیقت جو ان کے دعوے کے منافی ہو اسے جھٹلاتے اور اس سے گریز کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا مجبوری تھی کہ مغرب نے عہد نامہ قدیم کو اپنی دینی کتاب تسلیم کر لیا اور نہ عہد نامہ قدیم تو پورا کا پورا شاہی تمدن ہے۔ اسکا ہر کردار، تمام مقامات اور سارا ماحول شاہی ہے۔ اس کے تصورات، تعلیم اور اخلاق سب ہی کچھ غیر مغربی ہے۔

حیرت ہے کہ مغرب نے اپنی کوئی 'گاہل' مدون نہیں کی۔ مغرب کے مروجہ کیتھولک مذاہب اور عیسائی مذہب میں کس قدر بعد ہے اسکا اندازہ اسی امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ مغرب صرف اپنی عیسائیت کو ہی عیسائیت تصور کرتا ہے اور دنیا کے دیگر عیسائیوں، مثلاً نسطوریوں، مونوفیزائٹ (Monophysites) اور آرتھوڈوکس کرچین کو وہ بدعتی سمجھتا ہے۔

پس رنگ و نسل کے ساتھ، بدعتی ہونا ایک امتیاز ہے۔ دور جدید میں ان میں سب سے بڑی جواہک اور قدر سرمایہ داری نظام نے پیدا کی ہے وہ قومیت ہے۔ قومیت نے عالم عیسائیت کو قومی خطوں میں بانٹ دیا۔ اب کرچین کا من و پیچھ نام کی کوئی شے باقی نہیں رہ گئی ہے۔ قومیت کا تصور حال کی ہی پیداوار ہے جو ایک ہی نسل، ایک ہی رنگ اور ایک ہی مذہب کے ماننے والوں میں تفریق پیدا کر کے انہیں علاقائی وحدتوں میں بانٹ دیتا ہے۔ اس قومیت نے نہ صرف خطے، زبان، اور آبادی کو ایک دوسرے سے جدا کیا بلکہ کلیسا کو بھی تقسیم کر کے مختلف چرچوں کی بنیاد ڈالی۔ اسی سبب مغرب کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور وہ جنگ برادر کشی کے دور میں داخل ہو گیا۔

متذکرہ بالا اقسام کے احساس ہائے برتری کے سبب مغرب کی نظر میں دنیا کی کسی قوم کے لیے کوئی احترام نہیں پایا جاتا۔ اس نے دیگر اقوام کو کمتر قرار دینے کی حسب ذیل چار وجوہ مقرر کی ہیں۔ [Toynbee,]

[A.J.; 1956, A Study of History, Oxford University Press, Vol. VI, p.226]

۱۔	بت پرست	(Heathen)
۲۔	غیر مذہب	(Barbarian)
۳۔	مقامی	(Native)
۴۔	کم نسل	(Racially Inferior)

ان چاروں کی آلیکڑوہ دنیا کی ہر قوم کو کسی نہ کسی طرح کمتر قرار دے لیتا ہے، جبکہ انسانی حقوق سے اس طرح سے انکار کرنے سے انسانیت کی تمام اقدار مجروح ہوتی ہیں۔ غرض یہ کہ مغربی خصوصیات میں رنگ و نسل کا امتیاز، مغربی وطنیت، اور دیگر مذاہب کو برداشت نہ کرنا پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہیں۔ دور وسطیٰ میں چرچ کی بالادستی کے تحت ہر قدر سے زیادہ اہم مذہب تھا۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا مقصد صرف مذہب کے

تقاضوں کی تکمیل تھی۔ ریاست کی تعریف اس دور میں یہ تھی کہ حقیقی ریاست وہ ہے جہاں سچے مذہب کی تعلیم دی جاتی ہو اور عقائد کی حفاظت ہوتی ہو۔

'The Christian Fathers, and with special forcefulness Augustine, insisted that a Just State is one, in which the True Religion is taught, i.e. since the advent of Christianity, only a Christian State can be Just. The chief purpose of the government must be contributing to Human Salvation by preserving the Purity of the Faith.'

(Grunebaum, G.E.; 1969, Islam, Oxford University Press, p. 130)

اس طرح فرد، ریاست اور حکومت سب ہی صرف مذہب کے لیے وقف تھے، اور مذہب سے مراد آفاقی حقائق نہیں تھے بلکہ رومن کیتھولک عقیدہ تھا۔ مغرب اپنے مذہب کو سارے ادیان عالم سے برتر تصور کرتا تھا۔ صرف ان ہی کا مذہب حق تھا اور اسکے سوا سارے باطل۔ صرف اسی میں روحانیت تھی، جس کا شائبہ کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا تھا۔ صرف رومن کیتھولک ہی مذہب نجات تھا جو روحانی تزکیہ کرتا تھا، اور یہ خصوصیت کسی اور مذہب، یہاں تک کہ کسی اور کلیسا میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ مغرب سے باہر کی دنیا غیر متہذبن اور وحشی تھی جسکی کوئی قدر قابل احترام نہیں تھی۔

مغرب صرف ایک علاقہ اور معاشرہ ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب بھی ہے۔ اس کی تعمیر میں ماضی کی کئی تہذیبوں کا حصہ ہے۔ یہودی تہذیب سے مذہب لیا گیا۔ یونانی تہذیب سے معاشرتی اور فکری عناصر، رومنہ الکبریٰ سے نسلی تفاخر، سیاست و قانون اور فوجی نظام، اطالیہ سے عدم رواداری اور خونریزی، اور اسلام سے عہد حاضر کے سارے علوم کی بنیاد۔ ان تمام مستعار عناصر کے ساتھ مل کر ٹیکنیکی ترقی، سیاسی کامیابی اور عالمی استحصال نے مغرب کو ایک اعلیٰ اور بلند مقام عطا کیا، جہاں پہنچ کر انسانیت کو اس نے اپنے سے حقیر اور کمتر تصور کیا، انسان کو غلام بنایا، اس کا قتل عام کیا۔ دوسروں کے اقتصادی ذرائع اپنے لیے وقف کیے، اور ساری دنیا کا استحصال کر کے صرف مغرب کی تعمیر کی۔ اپنی قدروں کو ارفع و اعلیٰ ثابت کرنے کے لیے دوسروں کی اقدار کی تذلیل کی۔

باشندے

بحر روم کے جنوبی ساحلوں سے تہذیبی دور شروع ہوا۔ عظیم سلطنتیں اور تہذیبیں ابھریں۔ آہستہ آہستہ انکا مرکز تبدیل ہوتا گیا۔ مصر سے بابل، وہاں سے سیریا (نینوا) منتقل ہوتا ہوا یونان پہنچا۔ پھر یونانی تہذیب کے کھنڈروں پر رومی تہذیب اور عظیم سلطنت روم قائم ہوئی، جس نے عملاً متذکرہ تہذیبوں کے وسیع علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت روم میں بسنے والے باشندے مثلاً مصری، بربر، عراقی، فلسطینی، شامی، آرمینی، یونانی، اطالوی، جرمن اور ہسپانوی وغیرہ، سب کے سب ایک دوسرے سے مختلف تھے جن میں رنگ و نسل، بود و باش، تہذیب و ثقافت، فکری، لسانی اور مذہبی اختلافات موجود تھے۔ ان میں اگر کوئی قدر مشترک تھی تو صرف یہ کہ ان پر رومن شہنشاہ حکومت کرتا تھا، جس کے گورنر صوبوں پر حکومت کرتے تھے۔

نیکس : صوبائی باشندوں پر بھاری نیکس عائد تھے، جبکہ رومن شہری (اطالوی) نیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔ سلطنت کی حدود میں داخل ہونے والے مال پر دہصد [۲۰۰] فی صد درآمدی ڈیوٹی لی جاتی تھی۔ اہم ترین نیکس، جو صوبائی باشندوں کو ادا کرنا پڑتا تھا وہ 'پول نیکس' (Poll Tax) تھا، جسکی شرح مختلف صوبوں میں مختلف ہوتی تھی۔ مصر میں یہ نیکس ہر دو مرد ادا کرتا تھا جس کی عمر ۱۴ سال سے ۶۵ سال تک ہوتی تھی، جبکہ سیریا (شام) میں یہ مردوں اور عورتوں دونوں سے وصول کیا جاتا تھا۔

پول نیکس کے بعد دوسرا اہم نیکس لگان تھا۔ سیریا میں یہ زمین کی کل قیمت کا ایک فی صد [سالانہ] وصول کیا جاتا تھا۔ اسی طرح جائداد نیکس بھی ادا کرنا پڑتا تھا۔ [cf. Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, pp.21-22]۔ پول نیکس کی وصولی کے لیے باقاعدہ مردم شماری ہوا کرتی تھی اور نیکس دہندگان کے رجسٹر تیار رکھے جاتے تھے۔ رومن شہری (اطالوی) اگر کوئی نیکس ادا کرتے تھے تو وہ صرف وراثت نیکس تھا، جسکی شرح پانچ [۵] فی صد تھی۔ اس سے راست وارث، یعنی بیٹے بیٹیاں، مستثنیٰ تھے۔ صوبائی باشندوں پر جرائم کی پاداش میں بھاری جرمانے ہوتے تھے۔ قیدی سزا کی صورت میں انہیں غلام بنا کر اطالیہ بھیج دیا جاتا تھا۔

جستجین کے عہد کے اعداد و شمار کے مطابق، مصر سے آٹھ لاکھ [۸,۰۰۰,۰۰۰] 'سولیدی' (Solidi) کا غلہ اور تقریباً اسی قدر زر مبادلہ نیکس کی صورت میں وصول ہوتا تھا۔ نو میدیا اور ماریطانیہ سے علی الترتیب [۷۸۰,۰۰۰] اور [۶۰۰,۰۰۰] سولیدی خراج وصول ہوا کرتا تھا، جبکہ دیگر نوے [۹۰] صوبوں کے اعداد و شمار کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ (حوالہ بالا صفحہ ۸)۔

سولیدی [تقریباً نصف تو لے سونے کے وزن کا] طلائی سکہ تھا جسے جستینین نے [۷۳۱ء] سکے فی پونڈ سونے میں بنوایا تھا۔ اسکی قوت خرید کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ایک فوجی کا مشاہرہ ۴ تا ۵ سولیدی سالانہ تھا، جبکہ ایک عام آدمی کا گھرانہ [۳] سولیدی سالانہ پر سال بھر گزر بسر کر سکتا تھا۔ [آجکل یعنی ۲۰۰۵ء کے حساب سے ایک سولیدی تقریباً پانچ ہزار روپے پاکستانی مالیت کا ہوتا تھا۔ آٹھ لاکھ سولیدی، جو مصر سے وصول کیا جاتا تھا، اس حساب سے تقریباً چار ارب [۴,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰] روپے کے برابر بنتا ہے، جبکہ انسانی آبادی آجکل کے مقابلے میں بیسواں حصہ بھی نہیں تھی۔]

شہریت: سلطنت روم میں انتظامی امور شہری کونسلروں کے ذمے تھے۔ شہر اور اسکے آس پاس کے علاقے کی سڑکوں کی تعمیر، پانی کی فراہمی و نکاسی، منار اور سرکاری عمارتوں کی تعمیر، کھیلوں اور مذہبی تقاریب کا انعقاد اور شہری دفاع، یہ سب شہری کونسل کی ذمہ داری تھی۔ کونسل سلطنت کے لیے اہم خدمات انجام دیتی تھی۔ ٹیکس کی وصولیابی، فوج کی بھرتی، سرکاری عہدیداروں کے قیام کے انتظامات، برید (ڈاک) کے لیے گھوڑوں کی فراہمی وغیرہ، ان کے فرائض میں شامل تھے۔

قانون سازی اور شہنشاہ کے انتخاب کا حق سینیت کو تھا۔ مملکت کے اہم مسائل بھی سینیت کے فیصلے کے مطابق طے ہوتے تھے۔ لیکن شہری کونسل ہو یا سینیت، اسکی رکنیت صرف رومن شہریوں کے لیے مخصوص تھی۔ رومن شہریت صوبہ اطالیہ، ناربوں (جنوبی فرانس) اور اسپین کے باشندوں کو حاصل تھی۔ خود مغربی نو مفتوحہ صوبوں مثلاً گال (بقیہ فرانس)، برطانیہ، چوینیہ اور سویسیہ (شمالی بلقان) کو یہ شہریت میسر نہیں تھی۔

رومی شہریت حاصل کرنے کی دو صورتیں تھیں۔ یا تو وہ فرد اطالوی نسل سے ہو، خواہ مقبوضہ صوبوں میں رہائش پذیر ہو، یا پھر کوئی ایسا فرد ہو جو نسلًا تو اطالوی نہ ہو لیکن ایسے صوبائی باشندے کی اولاد ہو جسے خصوصی رومی شہریت حاصل رہی ہو۔

فوجی خدمت اور سرکاری ملازمت کے لیے رومن شہری ہونا لازمی تھا۔ فوج دو قسم کی تھی۔ ایک 'لیجن' (Legion) یا مرکزی فوج، دوسری 'کوہورت' (Cohort) یعنی علاقائی فوج۔ مرکزی فوج ہر صوبے میں آتی جاتی اور قیام کرتی تھی، لیکن علاقائی فوج کا اطالیہ میں قیام ممنوع تھا۔

فوجیوں کو دوران ملازمت شادی کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن صوبوں میں قیام کے دوران وہ عام طور پر صوبائی عورتوں سے شادیاں کر لیتے تھے۔ ان کی اولاد کو شہریت صرف فوجی ملازمت اختیار کرنے کی صورت میں دی جاتی تھی۔ تیسری صدی عیسوی میں صوبوں کے باشندوں کو بھی رومی شہری تسلیم کیا گیا، جس کے باعث قانوناً علاقائی تفاوت ختم ہو گیا، لیکن نسلی، لسانی، تہذیبی، مذہبی اور معاشرتی تفاوت برقرار رہا۔

یہ شہریت صرف آزاد افراد کو میسر تھی، جبکہ غلام اس سے محروم تھے۔ خود روم میں غلاموں کی تعداد آزاد افراد سے کہیں زیادہ تھی۔ قانون کی نظر میں تمام شہری برابر تھے لیکن شہری طبقات میں تقسیم تھے اور انکا طبقاتی تفاوت قانون پر اثر انداز ہوتا تھا۔ بالائی طبقے کے فرد کو اگر کسی جرم کی پاداش میں سزائے موت تو جرمانے یا کسی

غیر آباد جزیرے میں جبری قیام تک محدود ہوتی، جبکہ نچلے طبقے کے شہری کو جسمانی اذیت، عمر قید، گردن زدنی، کانوں میں جبری مشقت، زندہ جلانا، اور اکھاڑوں میں چیر پھاڑ کے لیے درندوں کے حوالے کرنا، سب کچھ شامل تھا۔

کلمچر: مشرقی رومن ایمپائر کے باشندوں اور مغربی رومن ایمپائر کے باشندوں میں تمدنی یکسانیت مفقود تھی۔ مشرق میں قطبی، سیر یائی اور یونانی زبانوں کا رواج تھا، جبکہ مغرب میں لاطینی زبان رائج تھی۔ مشرق کا رجحان موسیقی، شعر و ادب، علم و حکمت اور صنعت و حرفت کی طرف تھا تو مغرب سپہ گری اور اکھاڑوں میں درندگی کا شائق تھا۔ مغرب علم کے میدان میں یونان کا شاگرد تھا۔ فریق تعمیر میں اس نے یونان کی پیروی کی۔ لباس، غذا اور فرنیچر میں اس نے یونانی انداز اختیار کیے۔ طبقہ امراء اپنی اولاد کے لیے یونانی انداز کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتا تھا۔

مذہب: ایمپائر کے مختلف علاقوں میں مختلف مذاہب رائج تھے۔ اطالیہ اور رومی نوآبادیات میں رومی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی تھی۔ یونان اور ایشیائے کوچک میں یونانی دیوتا پوجے جاتے تھے۔ روم اگر بلیک (رومی یونانی) تہذیب اور شہنشاہیت کا وارث تھا تو اس نے یونان کے رسوم و عقائد، یہاں تک کہ خداؤں کو بھی اپنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ رومی اور یونانی دیومالائیس تقریباً مشترک ہیں۔ صوبوں میں مقامی دیوی دیوتاؤں کی عبادت ہوتی تھی۔

قدر مشترک: رومن ایمپائر کے باشندوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے ایک ایسے عقیدے کی ضرورت تھی جس پر سب لوگ متفق ہو سکیں، مصر، بابل، نینوا، ایران میں شاہ پرستی عام تھی۔ یونان کے تمام دیوتا ان کے قومی مشاہیر تھے، جن کی پرستش زمانہ قدیم سے ہوتی چلی آتی تھی۔ سکندر کے بعد اسکے جانشینوں کی پرستش کے ثبوت ملتے ہیں۔ (cf. Kirk G.S.; The Nature of Greek Myths, p.76)۔ چنانچہ مقامی مذاہب سے تعارض کیے بغیر رومن ایمپائر میں شاہ پرستی کے عقیدے کو عام کیا گیا۔

ہر صوبائی مستقر میں تقریبات منعقد ہوتیں۔ ان میں مذہبی رسومات برائے نام ہی ادا ہوتیں۔ رومن انداز کے اکھاڑوں اور کھیل تماشوں پر زیادہ زور ہوتا۔ روم کے مشاہیر پوپائی، سیزر اور آگستس کے مجسمے مندروں میں نصب کر کے انہیں الہ قرار دیا گیا۔ انہیں نجات دہندہ، خدا کا فرزند، خوش خبری دینے والا، باعث امن و شادابی، وغیرہ القاب [وہی سارے القاب جو مسیحی حضرت عیسیٰ کو دیتے ہیں] دیے گئے۔ [Earnest]

[Barker; Legacy of Rome, essay 'The Conception of Empire', pp.50-62]

رومی باشندوں نے اپنے شہنشاہوں کو الہ بنانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے وطن کو بھی دیوی کا درجہ دیا اور وطن پرستی کو بھی رائج کر دیا۔ شاہ پرستی کی ترویج ایک سیاسی ضرورت تھی جس نے کسی حد تک رومۃ الکبریٰ کے باشندوں میں ایک قدر مشترک کی کمی کو پورا کیا، لیکن جلد ہی شاہ پرستی پر زوال آ گیا۔ اس زوال کا سبب ایک طرف تو خود رومن شہنشاہوں کی بے راہ روی تھی، دوسری طرف فلسفہ یونان نے بھی اس کی توجہ کھنی کی۔

تیسری صدی قبل مسیح میں ایران میں زرتشتیت کو سرکاری مذہب کی حیثیت ملی، جس کے اقا نیم خلاش 'اہورہ مزدہ' (آقائے حکمت)، 'امہرن' (آقائے تاریکی) اور 'مہرہا' (آقائے نور) تھے۔ جلد ہی مہرہا نے منفرد مذہب کی حیثیت اختیار کر لی۔ یزدان اور اہرن پس منظر میں چلے گئے اور مہرہا کو رب اعلیٰ کی حیثیت ملی۔

اس مذہب نے ایران کی سرحدیں عبور کر کے رومن ایمپائر میں مقبولیت حاصل کی۔ رومن افواج کے لیے یہ مذہب نہایت دلکش تھا۔ فوجی اپنے ساتھ اس مذہب کو ایمپائر کے مختلف گوشوں میں لے گئے۔ تیسری صدی عیسوی تک مقررہ رومی باشندوں کا مقبول مذہب بن گیا۔

اس مرحلے پر ایک نئی قدر مشترک کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ ایک نیا مذہب شہنشاہوں کی کوششوں سے ابھرنے لگا۔ 'مسیح پرستی' رومن باشندوں کا سرکاری مذہب قرار پایا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۷)۔ اور شہنشاہیت کے تمام باشندوں کو حکم دیا گیا کہ شہنشاہ کو 'ناقابلِ تسخیر سورج' کا نائب تسلیم کر لیں۔ یہ نیا مذہب اگرچہ مقررہ رومی تھا تاہم مقررہ رومی سے بڑی حد تک مماثل تھا اور اصلاً یہ عقیدہ بھی شامی تھا۔ اس عقیدے کی بدولت شہنشاہ کی عوام پر گرفت ایک مرتبہ پھر مضبوط ہو گئی۔ سورج دیوتا کا نائب ہونے کی حیثیت سے شہنشاہ کو حکومت کرنے کا آسمانی حق مل گیا، جسے مشرق اور مغرب دونوں نے ہی قبول کیا۔ شہنشاہ کی ذات مقدس ہو گئی اور ہر فرد پر اس کا سجدہ واجب ہو گیا۔

عیسائیت: اسی دور میں، جب رومن ایمپائر کے باشندوں میں ایک قدر مشترک پیدا کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں، ایشیا کے گہوارہ تہذیب سے ایک نیا مذہب 'عیسائیت' ابھرا۔ حضرت عیسیٰ کے بعد ایک سرگرم داعی پال نے علمِ عیسائیت بلند کیا۔ یہ شخص سلاوی یہودی تھا اور علومِ متداولہ کا ماہر۔ [Encyclopedia Americana, (essay 'Paul')]۔ یونانی اور عبرانی زبانوں سے واقف تھا۔ اسے وہی شہریت بھی ملی ہوئی تھی۔ اس دور کے مروجہ مذاہب اور مکاتبِ فکر سے پوری طرح واقف تھا۔ ابتداءً اسے عیسائیت سے شدید نفرت بلکہ دشمنی تھی۔ (James M.R.; Apocryphal New Testament, p.20)۔ لیکن بعد میں وہ پر جوش مبلغِ عیسائیت بن گیا۔ یہ پال تھا جس نے رومن ایمپائر کے باشندوں کے لیے ایک حقیقی قدر مشترک فراہم کی۔ پال کی کوششیں جو دیہ (یہودیہ) [ارضِ فلسطین کی ایک یہودی ریاست] میں بار آور نہ ہوئیں کیونکہ وہاں یہودیوں کی اکثریت تھی اور وہ پال کے عقائد کو صحیح آسمانی (تورات و زبور) کی تعلیمات کے منافی قرار دیتے تھے۔ اس نے جو دیہ کی رہائش ترک کی اور بحرِ روم کے جزائر، یونان کے ساحلی شہروں، ایشیائے کوچک اور روم کو اپنا مرجع بنایا۔ یہاں کے سکونت پذیر ایشیائی باشندوں، غلاموں اور نچلے طبقے کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنایا۔ جگہ جگہ چرچ قائم کیے۔ سلطنتِ روم کی انتظامیہ کی طرز پر چرچ کی انتظامیہ قائم کی۔ اسی نے انہیں بائبل دی اور اس کے مقاصد کی تشریح کی۔ رومن باشندوں نے اس نئے مذہب کو اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک پال نے ان کے عقائد، ان کے دیوتاؤں کا نعم البدل اور ان کی رسوم کی گنجائش نہیں پیدا کر دی۔ [For details see Brandon, (S.G.F.; Man and his destiny, p.202)]۔ جب یہ گنجائش پیدا ہو گئی اور تثلیث نے ان کے سارے دیوتاؤں کو سولیا، صلیب نے ان کے نشان سورج کی جگہ لے لی، ہتھمہ، عشانے ربانی، کرسس اور ایسٹرنے ان کے تہوار اور رسوم کی کمی پوری کر دی تو چوتھی صدی عیسوی تک شہنشاہیت کی جانب سے شدید مخالفت کے باوجود ایک تہائی باشندوں کا مذہب عیسائیت ہو گیا۔

اس مذہب کی مقبولیت کے پیش نظر چوتھی صدی عیسوی میں اسے سلطنتِ روم کا سرکاری مذہب قرار دیا گیا، کیونکہ عیسائیت صحیح معنوں میں سلطنت کی قدر مشترک بن چکی تھی۔ مغرب جب بازنطین سے علیحدہ ہوا تو اسے اپنی شیرازہ بندی کے لیے نئی قوت کی ضرورت پڑی۔ یہ نئی قوت اسے مذہبی ادارے کلیسا کی صورت میں ملی۔ قسطنطین کے دور سے ہی کلیسا ہر اعتبار سے مستحکم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ علیحدگی کے وقت چرچ نہایت منظم اور خود مختار تھا۔ معاشی استحکام کے باعث سیاسی ابتری اسے متاثر نہ کر سکی۔

کلیسا نے اپنی تنظیم رومۃ الکبریٰ کی بیوروکریسی کے انداز پر کی تھی۔ پورے ملک میں اس کے نمائندے حکومتی عہدیداروں کی مانند موجود تھے، جس کے باعث ملک کے قریہ قریہ تک عوام سے اس کا راست رابطہ قائم تھا۔ عوام کو کلیسا پر پورا اعتماد تھا۔ کلیسا میں عوام کی رہنمائی اور ان کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ مغرب کی علیحدگی اور سیاسی ابتری کے باعث جو انتظامی خلا پیدا ہوا، اسے کلیسا نے پر کیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ نہ گزرا تھا کہ کلیسا نے حکومت کی ساری ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

کلیسا سے وابستگی : باشندوں کی وہ وفاداریاں جو رومن دور میں شہنشاہیت کے ساتھ وابستہ تھیں، کلیسا کی جانب منتقل ہو گئیں۔ شہنشاہ پرستی نے عوام میں شہنشاہ کے لیے جو تقدس، احترام اور وقار پیدا کیا تھا، وہ سب کچھ پوپ کے لیے مخصوص ہو گیا۔ شمس پرستی کے عقیدے نے شہنشاہ کو خدا کا نائب بنادیا تھا اور اسے حکومت کا آسمانی استحقاق عطا کیا تھا، جب شمس پرستی کی جگہ عیسائیت نے لی اور شہنشاہ کی جگہ پوپ نے سنبھالی تو پوپ زمین پر خداوند یسوع مسیح کا نائب قرار پایا، اور حکومت کا حق خداوند کے نائب پوپ کو پہنچا۔

رومن باشندوں کی زندگی کا محور ریاست تھی۔ ریاست کے لیے جیتے تھے اور اسی کے لیے مرتے تھے۔ ریاست پر مرنا، اسے عظیم تر بنانا، اسکی عظمت کو قائم رکھنا، اس کی حرمت پر آنچ نہ آنے دینا، رومن باشندوں کا عظیم ترین مقصد تھا۔ جب ریاست پر یونانی اثرات بڑھے اور اس کا نام رومن ایمپائر کی جگہ بازنطینی ایمپائر ہوا تو رومن باشندوں کی وابستگی ریاست سے کم ہونے لگی۔ عیسائیت نے ترک دنیا کی تعلیمات دیکر انہیں دنیا اور اس کے معاملات سے کنارہ کشی پر آمادہ کیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں ریاست و سلطنت سے بھی بیزاری اور نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ دیندار کتھولک کے لیے دنیا کی خدمت گزاری گناہ کے مترادف ہو گئی۔ نجات کے تصور نے ایک ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ ریاست اور اسکی خدمت انہیں نجات نہ دلا سکتی تھی۔ نجات زندگی کا حاصل تھی جو صرف کلیسا کے توسط سے میسر آ سکتی تھی۔ اس نظریہ کی بدولت آنے والی صدیوں، بلکہ کم و بیش ایک ہزار سال تک، مغربی باشندوں کا منظرِ نظر مذہب اور صرف مذہب رہا۔ جس کے باعث ہر شعبہ حیات کلیسا اور بالخصوص پوپ کے اختیار میں آ گیا۔ ریاست، شہنشاہ اور شہنشاہیت اب بھی تھے، مگر کلیسا اور پوپ ان سب سے افضل تھے۔ چرچ کو لوگوں کا اس قدر اعتماد و تعان حاصل تھا کہ وہی مغرب کا اقتدارِ اعلیٰ تھا۔ ہر شے چرچ کے اختیار و اقتدار میں تھی۔ یہاں پوپ ہی شہنشاہی عطا کرتا تھا۔ شہنشاہوں کی شہنشاہی پوپ کی حبشِ ابرو سے زیر و زبر ہو جاتی تھی۔ اس ہزار سالہ دورِ کلیسا میں جس منربی طاقت نے بھی کلیسا سے ٹکری، عوام نے اسے پاش پاش کر ڈالا۔

چرچ

مغربی عیسائیت : مغربی چرچ کی بنیاد پال نے رکھی۔ ارض مقدّس میں حضرت عیسیٰ کے حواریوں اور دیگر صحبت یافتہ شاگردوں نے کلیسائے یروشلیم قائم کر رکھا تھا۔ پال کی تبلیغ کو اس چرچ نے ناپسند کیا، جس کے سبب پال، جان اور برناباس نے ہلینک علاقے کو اپنی سرگرمیوں کے لیے منتخب کیا۔ پال کو ان علاقوں میں یہود سے مایوسی ہوئی تو اس نے یونان اور روم کے مشرکین کو اپنے عقائد پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ جان نے پال کو مشرکین روم میں تبلیغ کرنے سے باز رکھنا چاہا کہ متی کی انجیل میں اس کی واضح ممانعت موجود تھی۔

”غیر قوموں (Gentiles) کی طرف نہ جانا۔ سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا۔ بلکہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھینروں کے پاس جانا۔“ (میتھیو، ۱۰، ۵-۶)

یہاں سے جان نے بھی پال کا ساتھ چھوڑا۔ پال نے انطاکیہ میں ایک نئے چرچ کی بنیاد ڈالی۔ اس کی تبلیغ کے مخاطب غیر یہود و غیر عیسائی، یونانی اور رومی تھے۔ یونان اور روم کی اپنی رسوم، اپنے اعتقادات، اپنے علومِ الہیات (Theology)، اور اپنے فلسفیانہ نظریات تھے۔ انہوں نے پال کی تعلیمات کا موازنہ اپنی قدروں سے کیا اور جو اختلافات پائے، پال سے انکی وضاحت طلب کی۔ اگر پال قابلِ قبول وضاحت پیش نہ کرتا تو رومی اور یونانی اسے رد کر دیتے۔ لہذا اسے کسبِ مقدّہ کی تعلیمات سے ہٹ کر مغربی ذہن کی مناسبت سے عقائد کی تدوین کرنی پڑی۔ اس نے اپنے چرچ کو درپیش مسائل کے حل اپنے خطوط کے ذریعے بھیجے، جو بائبل کا جزو لاینفک بن گئے۔

پال کے ان خطوط سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اناجیل اور اپنی پوری سادگی کے ساتھ اس کے دور میں رائج تھیں۔ اور ان ہی سادہ تحریروں کی روشنی میں پال موشگافیاں کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن عہد حاضر کے محققین یہ باور کرتے ہیں کہ اناجیل اربعہ پال کے وضع کردہ اعتقادات کی روشنی میں دورِ مابعد کی پیداوار ہیں۔

(Brandon S.G.F.; Man and his Destiny in the Great Religions, article 'Christianity')

اس نظریے کو تسلیم کرنے کے بعد کہ اناجیل اربعہ پال کی تعلیمات کی روشنی میں مدوّن ہوئیں، حقائق اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ مغرب میں عیسائیت کے نام پر ایک ایسے مذہب کو رائج کیا گیا جو مغربی دنیا

کے عقائد پر مشتمل تھا، اور جسے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور کردار سے کوئی مناسبت نہیں تھی۔ پال کے خطوط کے دقیق مطالعے سے اس نظریے کی تردید نہیں بلکہ تائید ہوتی ہے۔

پال کے خطوط، 'گلٹیون کے نام' (باب-۱۰) اور 'کرنٹیون کے نام' (باب-۱۱، دوسرا خط) کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود پال کے اپنے چرچ میں کوئی مخالف اور متضاد تحریک چل رہی تھی۔ دوسری تحریک کسی مخالف گروہ یا شخص کی تھی اور دونوں میں نظریاتی کشمکش ہو رہی تھی۔ ہر دو تحریکیں چرچ سے وابستہ عیسائیوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان خطوط میں استعمال کردہ الفاظ، جیسے 'کوئی' اور 'گاسپل'، 'دوسری گاسپل'، 'دوسرا یسوع' یہ واضح کرتے ہیں کہ تضاد نہایت شدید تھا۔ دونوں گروہ گاسپل (انجیل) کے نام پر متضاد کتب پیش کر رہے تھے، جو ایک دوسرے کے لیے ناقابل قبول تھیں۔ دونوں گروہ یسوع مسیح کی شخصیت اور سیرت کو اس طرح پیش کر رہے تھے کہ دو متضاد شخصیتیں نظر آنے لگی تھیں۔ پال کے خطوط سے مترشح ہے کہ دوسری گاسپل اور دوسرا یسوع پال کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ 'کرنٹیون کے نام' خط میں پال نے اس مخالف تحریک کو سانپ کی مکاری سے تشبیہ دی ہے۔

پال مخالفین کا نام نہیں لیتا۔ اس کے مخاطب اچھی طرح جانتے ہو گئے کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔ وہ لوگ جن کے خلاف پال [غصے میں] کھول رہا تھا غیر عیسائی نہ رہے ہو گئے، کہ انہیں چرچ کے عقائد، گاسپل اور سیرت عیسیٰ سے کیا مطلب ہو سکتا تھا۔ اول تو دشمن کلیسا کو ارباب کلیسا اہمیت کیوں دیتے، پھر اس باب میں پال سے رجوع کیوں کرتے۔ یہ گروہ یا شخص اتنا بااثر تھا کہ اس کا نام تک نہ لیا جاسکا۔

پال کے خطوط میں کئی ایسے مقامات ملتے ہیں جہاں پال نے کلیسائے یروشلم اور برادر خداوند (جیمس) کے بارے میں گہری تشویش کا اظہار کیا ہے۔ یہ مخالفین کوئی اور نہیں بلکہ کلیسائے یروشلم اور جیمس کے نمائندے تھے، (cf. Nock A.D.; Saint Paul, pp.110-111)، جو چرچ کے با اختیار مبلغین تھے۔ لہذا یہ باور کرنے کی پوری گنجائش ہے کہ پال مغربی کلیسا کو جو عقائد اور مذہب مسیحیت کے نام پر دے رہا تھا، جو انانجیل اور سیرت عیسوی وہ اپنے چرچ کو پیش کر رہا تھا وہ برادر جیمس کی نظر میں وضعی تھے اور وہ ان پر سختی سے معترض تھے، جن کے تقدس اور حضرت عیسیٰ سے نسبت کے باعث وہ لب کشائی کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

کلیسائے یروشلم نے کلیسائے مغرب کی کن نکات پر مذمت کی ہوگی، اس پر بریڈن اور دیگر اہل قلم نے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اولاً یسوع صرف مسیح تھے۔ وہ ثانوی خداوند نہ تھے، کہ عہد نامہ قدیم صرف یہوواہ کی وحدانیت کی تعلیم دیتا ہے اور حضرت عیسیٰ نے اس کے ہر لفظ کی تصدیق کی۔ اس سے نہ خود انحراف کیا اور نہ اپنے پیروؤں کو انحراف کی اجازت دی۔

مسیحا کی آمد کا مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل کو قعر مذلت سے نکال کر قوت و عظمت عطا کرے۔ اُس قوت (رومۃ الکبریٰ) کو پاش پاش کرے جس نے بنی اسرائیل کو مغلوب کر رکھا تھا۔ [Brandon]

علمائے بائبل کو اعتراف ہے کہ مرقس (باب ۷، ۲۵-۲۷) میں مسیح نے غیر یہود، خصوصاً جینا کل (رومیوں اور یونانیوں) کو کتوں سے مشابہت دیکر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ [Taylor; Gospel according to Mark, p.340]۔ وہ [مسیح] اسرائیل کے نجات دہندہ اور اسرائیلی حکومت کے قہر تھے۔

(Strecker B.N., The Four Gospels, p.221)

پس ایسا مسیح جو روم کا دشمن ہو، خدا نہ ہو صرف انسان ہو، بنی اسرائیل کو خدا کی منتخب قوم اور رومن کو کتا سمجھتا ہو، اسے رومی شہری کیونکر اپنا خداوند مان سکتا تھا۔ اس شخصیت کو رومیوں کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے اس میں رومی کردار پیدا کرنا ضروری تھا۔ یونان اور روم کے مشابہت مافوق الفطرت ہوتے تھے۔ انہیں الوہیت میسر ہوتی تھی۔ انکا کوئی مذہب بلا دیوتا کے نہیں ہوتا تھا اور یہ دیوتا ہمیشہ انسان کے قالب میں آیا کرتے تھے۔ پال نے حضرت عیسیٰؑ میں یہ ساری مطلوبہ صفات پیدا کر دیں۔

یہاں دقت یہ پیدا ہوئی کہ یسوع مسیح کا رومی اقتدار اور یہودی سازش کے سبب مصلوب ہونا بیان کیا جاتا تھا، جس کے باعث دیوتائی صفات اور المیہ صلیب میں کوئی مناسبت پیدا نہ ہو پاتی تھی۔ ان دونوں کیفیتوں کا تضاد دور کرنے کے لیے پال کی جولانی طبع نے اس [مہینہ] حادثے کو 'قربانی' قرار دیکر ایک مستقل نظریے اور عقیدے کی بنیاد ڈالی۔ یہ سارے نظریات پال کے اپنے تھے۔ پال جس انداز سے بائبل کا ذکر کرتا ہے اس سے یہ مترشح ہے کہ بائبل خود اسکی اپنی تصنیف تھی۔ اس نے لکھا،

”اے بھائیو، میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ جو خوشخبری (گاسپل) میں نے سنائی وہ انسان کی سی نہیں، کیونکہ وہ مجھے کسی انسان کی طرف سے نہیں پہنچی اور نہ مجھے سکھائی گئی، بلکہ یسوع مسیح کی طرف سے مجھے اسکا مکاشفہ ہوا۔

(بائبل، گلتیوں کے نام، پولس رسول کا خط، باب ۱-۱۱، ۱۳)

اس واضح اقرار کے بعد یہ امر بیان کرنے میں کوئی باک نہیں رہ جاتا کہ پال نے جو مذہب مغربی کلیسا کو دیا اس کا تعلق اسکی اپنی فکر سے تھا۔ اسکے عقائد، اسکے دور کے مسلمہ عیسائی عقائد کے منافی تھے۔ اس سے اسکے عقائد کی سند طلب کی گئی تو اس نے اپنی بے بنیاد تعلیم کے جواز میں مکاشفہ کا حوالہ دیا جس کی رو سے اسے غیر یہودی اقوام میں تبلیغ کا حق ملا، جس سے کہ خود یسوع مسیح نے اجتناب کیا تھا۔

اختلائی عقائد : پال نے ایسے بے شمار عقائد اپنے چرچ کو دیے، جو یروشلم کے کلیسا سے مختلف اور عہد نامہ قدیم (تورات و زبور) کی تعلیم میں نہیں ملتے۔ انکی تفصیل کا محل نہیں لیکن اجمالاً چند کا ذکر ناگزیر ہے۔

مثلیت عہد نامہ قدیم کی توحید کے منافی ہے۔

الوہیت مسیح انسان کی الوہیت کا تصور تک عہد نامہ قدیم میں نہیں۔ وہاں یہوہ خدا کے واحد ہے، کسی اور کی الوہیت کی گنجائش نہیں۔

مصلوبیت تورات کی رو سے مصلوبیت ایک لعنت تھی۔

[Gal, 2-13, 'Cursed is everyone that hangeth a tree)

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

پال نے [مبتدئہ] مصلوبیت کو تاریخی سانچے سے بلند کر کے تقدیرِ ازل بنادیا۔ بیٹے کی قربانی قبول کر کے آدم کے گناہ معاف کر دیے۔

گناہ آدم: توریت نے آدم کے گناہ کا ایک سادہ سا واقعہ بیان کیا کہ آدم اور حوا نے سانپ کے بہکانے پر شجر ممنوعہ کو کھالیا جس کے نتیجے میں،

”خداوند خدا نے کہا، دیکھو انسان نیک و بد کی تمیز میں ہم میں سے ایک کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت میں سے بھی کچھ لیکر کھائے اور ہمیشہ جیتا رہے، اس لیے خداوند خدا نے اس کو باغِ عدن سے باہر کر دیا۔“ (پیدائش، باب-۳، ۲۲-۲۳)

توریت کے اس بیان سے، کہ یہ ٹوٹا ہوا تارِ مہِ کامل نہ بن جائے، کا تاثر ضرور ملتا ہے، لیکن گناہ کی پاداش میں زمین پر بھیجے جانے کا تصور نہیں پایا جاتا۔ گناہ کی ایک سزا دیدی گئی تھی، کہ سانپ کو ملعون ٹھہرایا گیا اور پیٹ کے بل ریٹلنا مقدس رہوا، (بائبل، پیدائش، باب-۳، ۱۴)، عورت کو دردِ وزہ اور مرد کی ناحق کی سزا ملی، (بائبل، پیدائش، باب-۳، ۱۶)، اور آدم کے سبب زمین لعنتی ہوئی اور آدم کو اپنے منہ کے پسینے کی روٹی کھانے کی سزا دی گئی، (بائبل، پیدائش، باب-۳، ۱۹)۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ بائبل کے مطابق آدم سے جس وقت گناہ سرزد ہوا، اسکی روح اپنے بدن میں موجود تھی۔ نیز یہ کہ اس گناہ کے سبب نہ تو وہ ملعون ہوا نہ اسکی پاداش میں زمین پر اتارا گیا، بلکہ وقوعِ گناہ سے پہلے ہی وہ زمین کے ایک حصے، باغِ عدن میں موجود تھا۔

قبل عیسائیت الوہیت کے بارے میں مختلف تصورات تھے۔ عقل الوہیت کی معترف ہو چکی تھی تاہم مقام الوہیت کے تعین میں سرگرداں تھی۔ فکرِ یونان نے روح انسانی کو بھی شریک الوہیت کیا، جس کے سبب سوال یہ پیدا ہوا کہ وہ روح جو پاک تھی، خالقِ اعظم کی روح کا جز تھی، جسم کی قید میں کیسے آگئی؟ شر نے خیر کو گرفتار کیسے کر لیا؟ کیا شر زیادہ طاقتور تھا؟ مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ پھر کوئی اور وجہ رہی ہوگی۔ شاید اپنی ہی کسی غلطی کی وجہ سے پھنس گئی ہوگی۔ (cf. Earl, Nick; Culture and Creed, p.66)۔

یہ تھا پال کے دور کا اندازِ فکر۔ وہ یونانی فلسفیوں سے اس نظریے پر بحث کرتا نظر آتا ہے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۵۶)۔ جس طرح گوتم کو، جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، اس کے گیان دھیان نے یہ نکتہ بھجایا کہ ساری دنیا کے مصائب کا سبب خواہش یا ہوس ہے اور اس نے، اس نکتے پر، اپنا فلسفہ نروان استوار کیا، اسی طرح فکرِ یونان نے پال کو یہ نکتہ بہم پہنچایا کہ آدم کا زلی گناہ ان تمام مصائب کی جز تھا۔ اس نکتے پر اس نے فلسفہ نجات کی بنیاد رکھی۔ فکرِ یونان اور توریت کے قصہ آدم میں کوئی تعلق اور ربط نہیں تھا لیکن پال نے دونوں کو ایک دوسرے سے منسلک کر کے فلسفہ اور مذہب میں ہم آہنگی پیدا کی۔

فکرِ یونان اس امر میں غلط تھی کہ روح کیسے قید ہوئی؟ قصہ آدم کے مطابق گناہ اس وقت سرزد ہوا جب روح بدن میں پھنس چکی تھی۔ پال نے ان دونوں میں مطابقت یوں پیدا کی کہ بدن گناہ سے قبل پاک تھا۔

گناہ کے بعد جسم ’شر‘ میں تبدیل ہو گیا۔
کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

”کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جسم (Soma)، روح (Sima) کا مقبرہ ہے۔ گویا دورانِ حیات روح کو دفن کر دیا گیا ہے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ یہ اصطلاح آریس کے متبعین نے اس مفہوم کے اظہار کے لیے استعمال کی ہے کہ روح اپنی مقرّرہ سزا بھگتنے کے لیے قید خانے میں بحفاظت بند ہے۔ لہذا جسم ایک حفاظت گاہ (Soma) ہے، جہاں روح اس وقت تک محبوس رہے گی جب تک مقرّرہ میعاد سزا پوری نہ ہو۔“

(Quoted by Grutheric, W.K.C.; The Greeks and their Gods, p.113)

اس تصور نے خود آزاری اور دنیا سے بیزاری کی تعلیم دی۔ اسے عہد نامہ قدیم کی بنیادی کتب، تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ خالصتاً مغربی عقیدہ تھا جسے عیسائیت میں اس لیے شریک کیا گیا کہ مغرب کے لیے عیسائیت قابل قبول ہو سکے۔

کفارہ: گناہ آدم نے ایک گتھی سلجھائی کہ روح بدن میں کیونکر قید ہوئی تو سوال یہ پیدا ہوا کہ اب اس کی رہائی کیسے ہو؟ پال نے یہاں کفارے کا عقیدہ وضع کیا۔ یہ نظریہ بھی یونانی عقائد سے ہم آہنگ تھا۔ قدیم یونانی گناہ کے کفارے میں جانور قربان کیا کرتے تھے۔ پال نے کہا کہ

”اسے خدا نے اس کے خون کے باعث ایسا کفارہ ٹھہرایا جو ایمان لانے سے فائدہ مند ہو۔“

(رومیوں کے نام۔ پال کا خط، باب-۳، ۲۵)

گناہ آدم اتنا بڑا تھا کہ اس کا کفارہ انسان کے بس کی بات نہ تھی۔ انسان شر کے باعث ناپاک تھا۔ ناپاک قربانی قابل قبول نہ تھی۔ انسان بھڑکا ہوا تھا۔ وہ راہِ نجات تلاش کرنے کے قابل نہ تھا۔ اب تو صرف یہ صورت تھی کہ خدا خود آئے۔ خدا کا انسانی بنیت میں آنا بلیک سوسائٹی کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ خدا، خدا کے فرزند، انکی بیویاں، نہ صرف یونان، بلکہ ساحلِ روم کے ہر معاشرے میں انسانی بنیت میں پیدا ہوتے، مرتے، پھر زندہ ہوتے اور اپنا مشن پورا کر کے آسمان پر چلے جاتے۔ جس طرح اور بہت سے آئے، اسی طرح یسوع مسیح، خداوند خدا کا بیٹا بھی زمین پر آیا، اپنی جان صلیب پر دیکر اس نے آدم کے ازلی گناہ کا کفارہ ادا کیا اور خالق نے اس کفارے کو قبول کر لیا۔ اب انسان کے لیے یسوع مسیح پر فقط ایمان لانے سے نجات میسر ہو گئی۔

اس نظریے نے ایک طرف یسوع مسیح کی بچا رگی، بے بسی اور مسکینیت کی توضیح کی، دوسری طرف مغربی ذہن کو اس کے تصورات کے عین مطابق عقیدہ فراہم کیا۔ اس عظیم کفارے سے قبل انسان کو اپنے گناہ سے نجات حاصل کرنے کے لیے مختلف مجاہدے کرنے پڑتے تھے، مگر اب صرف یسوع پر ایمان لانا ہی کافی تھا۔ صدیوں پرانی ذہنی کشمکش کو آخرا یک حل مل گیا۔ آسان، سادہ اور اطمینان بخش۔ نہ قدیم فکر سے گریز کی حاجت رہی اور نہ کسی مزید فکر کی حاجت۔

پال کے نظریہ گناہ و کفارہ کو چوتھی صدی عیسوی میں اس طرح استوار کیا گیا کہ یہ نظریہ عیسائی ایمان و عقائد (Faith) کی بنیاد بن گیا۔ خدا اور بندے کے مابین اور حیثیت کا تعین ہوا۔ نجات (Salvation)،

فضل (Grace)، کفارہ وغیرہ جیسی اصطلاحات کی بسیط تعریفیں متعین ہوئیں۔ اس موضوع پر آگسٹائن کی تعلیمات تقریباً سات صدیوں تک ناقابلِ تقید رہیں۔

(cf. Earl, Nick, Culture and Creed, p.56)

نظریہ موت و حیات : پال نے موت و حیات کا اپنا نظریہ پیش کیا جس کی رو سے موت کا ذمہ دار بھی آدم ہی ٹھہرا۔ اس نے توجہ یہ کی کہ ایک انسان کی بدولت زندگی میں گناہ داخل ہوا اور گناہ کی بدولت موت۔ اگر آدم گناہ نہ کرتا تو لازماً زوال ہوتا۔ ایک دوسرا آدمی (یسوع) نیکی کی خاطر قربان ہوا۔ اس نے انسان کو گناہ سے نجات دلائی اور ابدی زندگی سے ہمکنار کیا۔ (بائبل، کرنٹیوں کے نام۔ پال کا پہلا خط، باب ۱۵، ۲۲)۔ اور آخرش یہی انسان (یسوع) موت کو بھی نابود کرے گا۔ بائبل، کرنٹیوں کے نام۔ پال کا پہلا خط، باب ۱۵، ۲۵)

انسان نے ہر دور میں موت و حیات کے مسئلہ پر غور و فکر کیا ہے۔ میسوپوٹامیہ (۱۳۰۰ ق م) میں یہ تصور تھا کہ دیوتاؤں نے ایک دیوتا کے خون سے مٹی گوندھ کر انسان کی تخلیق کی، مگر ان سے غلطی یہ ہوئی کہ جسے انہوں نے دیوتا سمجھ کر ذبح کیا تھا وہ درحقیقت راکھشش تھا۔ یہی تصور یونانی علم الاضام میں منتقل ہوا۔ ان کے تصور کے مطابق 'زیس' دیوتا کے فرزند 'زوگرس' (Zogris) کو ایک راکھشش 'تیتن' (Titon) نے نگل لیا۔ اس راکھشش کی راکھ سے انسان پیدا ہوا۔ 'مردوک' کے پرستاروں کا خیال تھا کہ انسان کو پیدا کرنے کے لیے مردوک نے اپنے خون سے مٹی کا خیر کیا۔ (Brandon; Man and his Destiny, p.19)۔

پیدائش کے اس تصور میں خاک اور خون مشترک عناصر ہیں، جن میں گناہ کا تصور مستور ہے۔ پال نے خاک اور خون کی جگہ راست گناہ کا لفظ استعمال کیا اور اس طرح پیدائش کے مغربی نظریے کو تسکین پہنچائی۔

مصر میں موت ایک ایسی کیفیت تھی جو اعمال کے اعتبار سے خوشگوار یا کرب ناک ہو سکتی تھی۔ بائبل تہذیب میں موت نہایت خوفناک شے تھی جس کے بعد رحوں بھوت پریت کی شکل میں آوارہ پھرتی رہتی تھیں۔ مصر اپنے اسلاف کی رحوں سے تعلق پیدا کرنے کا خواہاں تھا تو بائبل ان سے خوفزدہ اور گریزاں تھا۔ یہودیت، بقول انجیل اس مسئلے پر خاموش تھی۔ اس کا خدا زندوں کا خدا تھا مردوں کا نہ تھا۔ (انجیل، مرقس، باب ۱۲-۲۷)۔ صدوقی قیامت کے منکر، پس سزا و جزا سے بیگانہ تھے۔ بزرگانِ اسرائیل صرف یہوہا کی خدمت کرتے نظر آتے تھے۔ عہد نامہ قدیم اس بارے میں ساکت ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ آیا موت کے بعد یہوہا سے کوئی تعلق ہوگا بھی کہ نہیں، گویا معاد اور نجات کا کوئی تصور نہ تھا۔

(cf. Brandon; Man and his Destiny, p.19)۔ قدیم تصور یہ تھا کہ موت کے بعد ارواح پاتال (Sheth) میں پہنچ جاتی ہیں جہاں نیک و بد کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ دورِ مابعد میں پاتال کے تین حصے کیے گئے، اور ان میں سے ایک کو جہنم کی حیثیت دی گئی۔ (Book of Enoch, xxii-9.13)۔ اور سزا و جزا کا تصور پیدا ہوا۔

حیات بعد الممات : گناہ کے نظریے نے قربانی اور کفارہ طلب کیا تو اس کے بعد نجات کا مسئلہ طے ہوا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی معارف کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے کوششیں کر رہے ہیں۔

بارے میں ایک مخصوص نظریہ رکھتی تھی۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ پال نے مغرب کو یہ نظریہ کس انداز سے پیش کیا۔ غالباً ابتدا میں اس نے معاد کا ایسا تصور پیش کیا جس میں روح اور بدن دونوں کو حیات میسر آتی تھی۔ غیر شعوری طور پر اس نے تھسلیکیوں کے نام پہلے خط میں تحریر کیا کہ،

”اے بھائیو ہم نہیں چاہتے کہ جو سوتے ہیں (فوت ہو چکے ہیں) انکی بابت تم ناواقف رہو۔ کیونکہ جب ہمیں یہ یقین ہے کہ یسوع مر گیا اور جی اٹھا تو اسی طرح خدا ان کو بھی جو سو گئے ہیں، یسوع کے ویسے سے اسی کے ساتھ لے آئے گا۔ چنانچہ ہم تم سے خداوند کے کلام کے مطابق کہتے ہیں کہ ہم جو زندہ ہیں اور خداوند کے آنے تک باقی رہیں گے، سوئے ہوؤں سے ہرگز نہ آگے بڑھیں گے۔“ (باب ۴، ۱۳-۱۵)

اس حوالے کے بارے میں مسیحی علماء اس امر کی توثیق کرتے ہیں کہ یہاں معاد مع بدن مراد ہے۔ (Lake K.; Earlier Epistles of St. Paul, pp.91-93) اس مرحلے پر دقت یہ پیش آئی کہ یونانی اس نظریے سے متفق نہ ہو سکے، کیونکہ آرٹک (Orphic) اور فیثاغورث (Pythagoras) کے اس نظریے کے مطابق، جسے پچھلے صفحات میں پیش کیا جا چکا ہے، یونانی اس بات کے قائل تھے کہ روح ایک ازلی، لافانی اور الہیاتی عنصر ہے، جو زندانِ بدن میں قید ہے۔ موت کے بعد اسے رہائی اور اتصالِ الہی میسر آتے ہیں۔ اب اگر حیات بعد الموت میں پھر وہی جسم کا نفس موجود تھا تو کہاں کی نجات اور کیسا اتصال؟ یہ تو ایک تضاد تھا جو کسی سے چھپا نہ رہ سکتا تھا۔

پال نے چونکہ خود بھی فلسفہ گناہ میں اس نظریے کو تسلیم کر رکھا تھا اس لیے اس تضاد کی تشریح میں وہ خاص احتیاط نظر آتا ہے۔ یہودی اور یونانی نظریات میں بعد المشرقین تھا۔ اگر بدن کا تصور نہ ہو تو روحانی معاد بے معنی ہو جاتا ہے، کیونکہ موت تو بدن پر طاری ہوتی ہے، روح تو ویسے ہی لافانی ہے۔ پال کی فطانت نے یہاں بھی کام دیا۔ اس نے ایک ایسی تشریح کی جو دونوں نظریات کے بین مین تھی۔ اس نے جسم کی دو اقسام بیان کیں۔ ایک مادی اور دوسرا روحانی۔ جسم کی تقسیم پال سے قبل ناپید تھی۔ اس نے کرنٹیوں کے نام پہلے خط میں بڑی تفصیل سے موت کے بعد جی اٹھنے کے عقیدے پر روشنی ڈالی اور آخر میں لکھا،

”اے نادان! تو خود جو کچھ بوتا ہے جب تک وہ نہ مرے زندہ نہیں کیا جاتا۔..... آسمانی بھی جسم ہیں اور زمینی بھی، مگر آسمانیوں کا جلال اور ہے زمینوں کا اور..... مردوں کی قیامت بھی ایسی ہی ہے۔ جسم فنا کی حالت میں بویا جاتا ہے اور بقا کی حالت میں جی اٹھتا ہے۔..... نفسانی جسم بویا جاتا ہے اور روحانی جسم جی اٹھتا ہے۔ جب نفسانی جسم ہے تو روحانی جسم بھی ہے۔“ (باب ۱۵، ۳۶-۳۵)

یہ تبدیلی مغرب کے مزاج کے عین مطابق تھی۔ اس کے مطابق مغرب کے مڑ وجہ عقائد کو تسلیم کرنے کی گنجائش پیدا ہو گئی۔ روحانی اور جسمانی ثنویت کا اثبات ہوا۔ دین اور دنیا کے علاقے بٹے، زندگی کی تقسیم ہوئی۔ ہر شعبہ حیات میں روحانی اور جسمانی تفاوت، آسمانی حکومت اور زمینی حکومت، مادی اور روحانی دنیا، دنیا اور سیاست،

کتاب اللہ اور اللہ کی تفریق، جسمانی اور روحانی، آسمانی اور زمینی، دنیا اور دنیا، دنیا اور سیاست،

جیسی صفات کو سند قبولیت حاصل ہوئی۔ یہ تفریق، یہ گریز اور یہ صفات، بلیک دنیا میں عیسائیت سے قبل بھی مستحسن نظروں سے دیکھی جاتی تھیں۔ ہیرودوٹس نے ایسے تارک الدنیا لوگوں کا ذکر کیا ہے جن کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

(cf. Toynbee A.J.; A Study of History, Vol II, p.28)

ثنویت اور متھرائیت : جس طرح ترک دنیا مقدس اور مستمرک عمل تھا، خود آزاری کو عبادت کا درجہ حاصل تھا، اسی طرح ثنویت بھی بلیک معاشرے کا پسندیدہ عقیدہ تھا۔ ثنویت اپنی پوری شدت کے ساتھ پارسی مذہب میں پائی جاتی ہے۔ جہاں انہوں نے نور اور تاریکی سے دو الہ متصف کیے ہوئے ہیں۔ پوری کائنات اسی نور اور تاریکی کے اعتبار سے دو حصوں میں بانٹ دی گئی ہے اور تمام اعمال انسانی نیکی، نور اور بدی، رتار کی کی مناسبت سے یزدانی اور اہرنی رشیطانی میں منقسم کیے جاتے ہیں۔

ایران میں ثنویت کے اس عقیدے پر مبنی مذہب متھرائیت (Mithraism) استوار ہوا۔ قدیم زرتشتی مذہب میں اور اس نے مذہب میں فرق یہ تھا کہ تاریکی اب ایسی شیطانی قوت نہ رہ گئی تھی جس نے فطرت کی توانائیوں پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہو بلکہ ایسی ناگزیر قوت تخریب بن گئی تھی جو ہر شے میں فطری ضعف، بوسیدگی اور موت پیدا کرتی ہے۔ گویا یہ قوت زمانے کی اس صفت کے مترادف ہو گئی جو ہر جاندار اور بے جان کو اس کے انجام تک پہنچاتی ہے۔ زمانے کی تعمیری اور تخریبی پہلوؤں کے امتزاج کی تجسیم کر کے اس کا نام متھرا رکھا گیا۔ متھرا ازم میں اہرن کی پرستش کے شواہد ملتے ہیں، جبکہ زرتشت کے یہاں وہ مردود ہے۔

(Brandon, Man and his Destiny, p.292)

اس طرح متھرا کو معبودِ اعلیٰ تسلیم کر کے اہرن و یزداں کی تفریق ختم کر دی گئی۔ تاہم وہ ثنویت جو اہرن و یزداں سے متھرا کو ملی تھی بجنہم باقی رہی۔ متھرا کی ذات میں نور و ظلمت دونوں ہی مجتمع ہو گئے تھے۔ متھرائیت جب ایران سے نکل کر بلیک دنیا میں پہنچی تو یونان میں اس کے عقائد کو فلسفیانہ مباحث کا موضوع بنایا گیا۔ جبکہ روم نے اسے تحشیث مذہب قبول کیا۔ اس طرح ثنویت فکری اور نظری اعتبار سے پوری بلیک دنیا میں عام تھی، جبکہ عبرانی مذہب اور اسکی شاخوں میں ثنویت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

عہد نامہ متیق میں روح اور بدن کا نام آدمی ہے۔ وہاں روحانی اور بدنی معاملات میں مکمل اشتراک ہے۔ محققین بائبل کو اعتراف ہے کہ ثنویت کا تھو رقدیم اسرائیلی تعلیمات اور عقائد سے قطعاً مختلف ہے۔ عہد نامہ قدیم میں صرف امثال سلیمان ایسی کتاب ہے جس میں جسم کو معتبر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اور یہ تشبیہ بھی محض یونانی اثرات کا نتیجہ تھی۔ یہودی مفکر فائلو سلفا یونانی تھا۔ اس نے فکر یونان کو یہودیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی۔ پس پال کے لیے فائلو کے نقش قدم موجود تھے۔ اس نے ثنویت کو اپنے مذہب کا جزو بنا دیا۔ اب عیسائیت بلیک دنیا میں مروجہ مذاہب، خصوصاً متھرائیت، کی ہم رنگ، ہم عقیدہ اور ہم خیال تھی۔ ہرمزد کی جگہ گاڈ، اہرن کی جگہ شیطان، اور متھرا کی جگہ کرائسٹ نے لے لی۔ متھرا کی طرح

کرائسٹ کی موت اور پھر سے جی اٹھنے کی حکایت، وہی روح و بدن کی ثنویت، وہی قربانی اور رسوم اور قربانی کے عوض حیات نو، جب عیسائیت میں ہر چیز موجودگی تو متحرکیت نے اپنی جگہ عیسائیت کے لیے خالی کر دی۔

رسوم: عیسائیت کی مذہبی رسوم اور تہواروں کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ انہیں بھی حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ۲۵ دسمبر کا دن سورج کی پیدائش کا دن تصور ہوتا تھا۔ [Earnest Barker; Legacy (Constantius) نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا دن متعین کیا، اور اس طرح سورج دیوتا کی پیدائش کے جشن کو کرسمس کا نام دیا گیا۔ سردیوں کے اس رومن جشن کو، عیسائیت سے پہلے، 'فینیول آف دی ساترنا بیا' (Festival of the Saturnalia) کہا جاتا تھا۔

(Cyril Bailey; Legacy of Rome, essay 'Religion and Philosophy')

اسی طرح عشاءِ ربانی (Sacrament) کی رسم ہے، جس میں شرکاء یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ یسوع مسیح کے ہمراہ ضیافت میں شریک ہیں۔ اس ضیافت میں روٹی اور شراب کا استعمال کیا جاتا ہے جسے یسوع کا گوشت اور خون تصور کیا جاتا ہے۔ یہ عیسائی رسم حقیقتاً پرست رومیوں کی ایک رسم تھی جو فوج میں بھرتی ہونے والے نگر وٹوں کی حلف برداری کے موقع پر ادا کی جاتی تھی۔

(cf. Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. VI, p.III)

پتہ بھی بت پرست مغرب کی ایک مقدس رسم تھی۔ مقررہ ازم میں ہر رکن کو برادری میں شامل کرنے کے لیے تیل کے گرم خون سے پتہ دیا جاتا تھا۔ (Nick Earl; Culture and Creed, p.61)۔ اس رسم کا بنی اسرائیل کے مذہب میں کوئی وجود نہیں ہے۔ بائبل میں ضرورتاً ذکر ملتا ہے۔ لیکن اناجیل کا تعلق چونکہ پال کی تحریک سے ہے اس لیے شبہ ہے کہ اس رسم کی سند ہم پہنچانے کے لیے انجیل میں چند الفاظ داخل کر دیے گئے ہیں۔ اسی طرح ایسٹریک رسم بھی عیسائیت سے قدیم تر رسم ہے جو موسم بہار کا جشن منانے کے لیے ادا کی جاتی تھی۔

صلیب: صلیب کو مذہبی نشان مقرر کرنا سورج پرستوں کے غلبے کی واضح نشانی ہے۔ اس نشان کا وجود عہد نامہ قدیم میں نہیں ملتا۔ یہ نشان عیسائیت سے قبل عہد قدیم میں مستعمل تھا اور سورج کی نمائندگی کرتا تھا۔ گویا یہ راست زندگی کا مظہر تھا۔ (Encyclopedia Britanica; Vol. 6, article 'Cross', p.812)۔ مقررہ ازم کو سورج دیوتا مانا جاتا تھا، اس لیے یہ مقررہ ازم کا مذہبی نشان تھا۔ قسطنطین نے اس نشان کو اپنے جھنڈے پر اس وقت جگہ دی جب وہ بت پرست تھا۔

(cf. Gibbon; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol. II, Chap. XX)

سبت: عہد نامہ قدیم کی رو سے سبت کا دن 'سنیچر' (Saturday) ہے، لیکن چونکہ مغرب سورج پرست تھا اور سورج کا دن 'اتوار' (Sunday) مقرر تھا، اس لیے عیسائیت میں سبت بھی اتوار کا دن مقرر ہوا۔

آلتار : قبل عیسائیت بھی مغرب کے صنم کدوں کا رخ مشرق کی سمت ہوتا تھا تا کہ سورج کی عبادت اس کے نکلنے وقت اس کی جانب رخ کر کے کی جاسکے۔ عیسائیت نے بھی اپنی قربان گاہ یا التار کا رخ مشرق کی جانب برقرار رکھا۔

تثلیث : کئی مذاہب ایسے بھی ہیں جنہوں نے اپنی تعلیمات کے مطابق معاشرے کو استوار کیا، اور ایسے بھی ہیں جو مستحکم معاشرے میں مقام پانے کے لیے معاشرے کے ذہن کے سانچے میں ڈھل گئے۔ دور اور معاشرے کے ساتھ مصالحت کی سب سے بڑی مثال تثلیث ہے۔ پال، جو یہودی تھا اور توریت کی توحید کا دعویدار، جب ہلینک معاشرے کو دعوت دینے پہنچا تو یہ معاشرہ اپنی رسوم، رواج، عقائد اور دیوتاؤں کو ترک کر کے حضرت عیسیٰ کی توحید کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ یہ معاشرہ متمدن دنیا کا آقا تھا۔ اپنی مرضی تسلیم کر دانے کا عادی۔ پال کو معلوم تھا کہ اس معاشرے کے ذہنی تقاضے کیا ہیں۔ پال نے اس معاشرے کو اپنے پاس بلایا اور جب یہ معاشرہ غیر متحرک رہا تو وہ خود آگے بڑھ کر اس میں شامل ہو گیا۔

پال کے دور میں رومی باشندوں میں کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ہر علاقے کا مذہب جدا جدا، اور ان کے دیوی دیوتا مختلف تھے، لیکن شعوری یا لاشعوری طور پر ہر جگہ کسی نہ کسی شکل میں تثلیث پائی جاتی تھی۔ رومن ایمپائر کے ہر حصے میں کسی نہ کسی طرح سورج یا اسکے اوتار کی پرستش ہوتی تھی۔ ان اوتاروں (Incoronate Gods) کے نام ضرور مختلف تھے لیکن کوائف اور کردار میں عجیب مماثلت پائی جاتی تھی۔ تفصیلات سے گریز کرتے ہوئے ایک اجمالی خاکہ بے محل نہ ہوگا۔

رومن ایمپائر کے دیوتا

ملک	دیوتا کا نام	دیوتا کی ماں	جنم دن	کوائف
۱۔ فریجیا	اطس (Attes)	کنواری نانا	-	تثلیث: سورج، اٹش اور نانا القاب: اکلوتا فرزند خدا، نجات دہندہ، ۲۴ مارچ کو مرنے کے بعد دوسرے دن زندہ ہوا۔
۲۔ تمود (سیریا)	ادونس (Adonis)	کنواری مادرِ خداوند	-	تثلیث: خداوند، ادونس اور مادرِ خداوند؛ مرنے کے بعد جی اٹھا۔
۳۔ یونان	بکس (Baccus)	کنواری دیمیتیر	۲۵ دسمبر	تثلیث: جیو پیٹر، بکس، دیمیتیر القاب: آقائے حیات، نجات دہندہ، مقتول، آزاد کنندہ؛ مرنے کے بعد زندہ ہوا۔
۴۔ بابل	بل یا بعل	مادرِ خداوند	-	تثلیث: سورج، بعل اور مادرِ خداوند؛ یسوع کے ساتھ مقدس، مصلوبیت، موت کے وقت طوفان، دوبارہ زندہ ہونے کی تفصیلات میں حیرت انگیز مشابہت
۵۔ مصر	اوسائرس (Osiris)	جگت کنواری (Virgin of the World)	دسمبر کے آخری ہفتے میں	تثلیث: ہورس، اوسائرس اور جگت کنواری القاب: آدم خدا (Man God) مرنے کے تین دن بعد زندہ ہوا
۶۔ روم	متھرا (Mithra)	کنواری اناہتا (Anaheta)	۲۵ دسمبر	تثلیث: یزداں، اہرمن اور متھرا القاب: رب اعلیٰ، مقدس نجات دہندہ تہوار: کرسمس اور ایسٹر
۷۔ اطالیہ	جیو پیٹر	مزدا	-	تثلیث: جیو پیٹر، مزدا، جونو

[ان مذاہب میں کنواری ماں سے مراد عموماً زمین ہوتی ہے، جسے مادرِ گیتی، دھرتی، ماتا، یا مدر لینڈ کا خطاب دیا جاتا ہے، اور یہ تصور کیا جاتا ہے کہ سورج زمین کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔]

(For details see:

1. Frazer G. B. Sir; Golden Bough; 'Adonis, Attis, Isis, Osiris', Vol. I, pp. 6-12
2. Ansari F. R.; Islam and Christianity in the Modern World, chapter 'Christianity and Modern Religions'

For 'Trinity' in 'Italy',

cf. Asquith H.H.; Legacy of Rome, article 'Introduction')

نظریاتی تثلیث : مندرجہ بالا عقائد تثلیث کے علاوہ، ایک نظریاتی تثلیث یونان کے علمی حلقوں میں مسئلہ تھی۔ افلاطون نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے تین صدی قبل اپنی فکر کو الوہیت پر مرکوز کیا اور یہ نظریہ پیش کیا کہ الوہیت کے تین اجزاء ہیں۔ علتِ اولیٰ (First Cause)، حکمت یا کلام (Logos or Reason)، اور روح کائنات (Spirit of the Universe)۔ اسکی طبع رسا نے ان تینوں اجزاء کی تجسیم کی بھی کوشش کی۔ ان کو اس نے تین قوتیں قرار دیا جو ایک دوسرے سے پراسرار طور پر متعلق تھیں۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ کچھ عرصے کے بعد اس کی فکر ایک عالمی مذہب کی بنیاد بننے والی ہے تو شاید وہ اپنی فلسفیانہ اصطلاحات کی مکمل تعریف کر جاتا تاکہ آئندہ اختلافات کی گنجائش نہ رہ جاتی۔

افلاطون کا یہ نظریہ ہلینک معاشرے میں نہایت مقبول تھا۔ مصر میں اسے شاہانِ بطلیموس کی سرپرستی حاصل تھی۔ مصر سے اسے یہود نے قبول کیا۔ پہلی صدی قبل مسیح میں اسے اتنا عروج دیا گیا کہ امثالِ سلیمان کے نام سے کتابِ مقدس کا جزو بنا دیا۔ [cf. Gibbon E.; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol. II, p.337]۔ یہی وجہ ہے کہ پرنسٹن فرقی نے اسے صحیفہٴ سادوی کی حیثیت سے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

افلاطون کے بیان کردہ تین الوہی اجزاء کے دوسرے جزو 'لوگس' یا 'کلام' کو حضرت عیسیٰ سے متصف کیا گیا۔ یوحنا کی انجیل کی ابتدا ہی اسی 'لوگس' یا 'کلام' کی تعریف سے ہوتی ہے اور یسوع کو کلام قرار دیتی ہے۔ [واضح رہے کہ قرآن میں بھی حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔] اس طرح مغربی چرچ نے پال سے ایک ایسا مذہبی آمیزہ حاصل کیا جو کسی طور سے حضرت عیسیٰ کی ذات، انکی تعلیمات اور انکے عقائد سے تعلق نہ رکھتا تھا، بلکہ اس کی بنیاد اس دور کے مزاج و مذہب، عقائد اور فلسفیانہ فکر پر تھی۔

اس آمیزے کے لیے اس نے بابل اور اسرائیل سے خالق کائنات کا تصور لیا، ایران سے شویت، بت پرستوں کے مرکز جی اٹھنے والے دیوتاؤں سے مافوق الفطرت پیدائش اور موت، فریجیا سے مادرِ اعظم ازمین کی پرستش، یونان اور روم سے تثلیث کی نظریاتی بنیاد، مشرکوں ربت پرستوں سے پتسمہ، عشائے ربانی، کرسمس اور الیستر، قدیم مصر سے اقرارِ گناہ، متھرائیت اور یونانی دیومالا سے تصورِ کفارہ و قربانی، ہندومت

سے حلول، ہلینک دنیا سے جسم و روح کی دوئی، سورج پرستوں سے صلیب اور متزک ایام، بدھ مت، یہودیت اور فلسفہ یونان سے الہیاتی بنیادیں حاصل کر کے ایک رومن عیسائیت ترتیب دی، جسے رومن کیتھولک کہا گیا۔ ان اجنبی عناصر کے لیے عبدنامہ قدیم، یا یروشلیم کی عیسائی بائبل میں گنجائش نہیں تھی۔ انہیں ضم کرنے کے لیے ایک نئی بائبل ترتیب دینا ضروری تھا۔ اس پر بھی کام نہ بن سکا تو پال نے اپنے فتوؤں سے کام لیا، اور جو کام حضرت عیسیٰؑ نے نہیں کیا تھا وہ کر ڈالا، یعنی بزم خود شریعت (قانون موسوی) کو لغت قرار دیکر منسوخ کر ڈالا۔ ”اور یہ بات ظاہر ہے کہ شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راست باز نہیں ٹھہرتا کیونکہ لکھا ہے کہ راست باز ایمان سے جیتا رہیگا۔ اور شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں۔ مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لیکر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔۔۔۔۔“ (بائبل، گلتیوں کے نام۔ پال کا خط، باب-۳، ۱۱ تا ۱۳)

اس نے توریت کی تعلیمات کو لغت گردانا اور مسیح پر ایمان کو ذریعہ نجات ٹھہرایا تاکہ اسکی راہ میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اس طرح پال کے رومن کیتھولک عقیدے کی روشنی میں اناجیل مدون ہوئیں۔ خود عیسائی محققین کو اعتراف ہے کہ مرقس، لوقا اور متی کی اناجیل علی الترتیب ۸۰ء، ۹۰ء اور ۱۰۰ء کے لگ بھگ تحریر کی گئیں۔ یوحنا کی انجیل دوسری صدی عیسوی کی تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

(cf. James Westfall; History of Historical Writings, Vol. I, p.12)

اس میں شک نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کے اس دنیا سے جانے کے سو سال کے اندر اندر عیسائیت ہلینک دنیا میں اپنے قدم جما چکی تھی۔ استحکام حاصل کرنے کے بعد، وہاں کی علمی فضاؤں میں عیسائیوں کو اپنی اناجیل تحریر کرنے کا خیال آیا۔

چرچ کی تنظیم

چرچ کی کئی تعریفیں کی گئی ہیں۔ مثلاً چرچ آسمانی بادشاہت ہے۔ [Nick Earl; Culture]۔ چرچ کرائسٹ کا بدن ہے۔ چرچ کرائسٹ کی دلہن ہے۔ چرچ نیا اسرائیل ہے۔ [and Creed, p.88]

(cf. Concise Encyclopedia of Living Faiths. p.19)

عام زبان میں چرچ ایک مذہبی ادارہ ہے جو عیسائیوں کے مذہبی معاملات کی نگرانی، رسوم کی ادائیگی، عبادت، روحانی رہبری، اور مقدس عمارتوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ روح اور بدن کی ثنویت کے پیش نظر تمام روحانی معاملات چرچ سے اور تمام بدنی معاملات حکومت سے متعلق سمجھے جاتے ہیں۔ ابتدائی رومن دور میں جب شہنشاہ پرستی اور وطن پرستی کا رواج سلطنت روم میں عام تھا، ریاست نے چرچ کے فرائض بھی سنبھال لیے تھے۔

(cf. The Legacy of Rome; essay 'Conception of Empire', by Earnest

Barker, p.65)

اس کی سول سروس کے عہدیدار ملک بھر کے مندروں کے نگراں اور منتظم تھے۔ جب مغربی چرچ قائم ہوا تو اس نے نہ صرف اپنی تنظیم رومن دور کی انتظامیہ کے انداز پر کی بلکہ اسکے طور طریقوں اور اسکی اصطلاحات کو بھی اپنایا۔
ذیلی جدول دونوں کے درمیان مماثلت کو اجاگر کرنے میں مدد و معاون ثابت ہوگا۔

چرچ کی تنظیم

شعبہ	رومن ایمپائر	رومن چرچ
عہدے اور مستقر		
سربراہ	ایمپیرر	پوپ
سربراہ کا مستقر	روم	روم
نائب	صوبائی گورنر	پیٹری آرچ بشپ
نائب کا مستقر	صوبائی مرکز	صوبائی مرکز
عمال	حکام	پریسٹ
فوج		
نشان	کراس	کراس
رکنیت کی تقریب	حلف برداری	بپتسمہ
خلاف ورزی کی پاداش	سزا	کفارہ
غذاری کی سزا	موت	موت
ادارے		
عوام کا نمائندہ ادارہ	چرچ (سیاسی ریاست)	چرچ (روحانی ریاست)
انتظامیہ	سول سروس	آرڈر
قانون سازی و انتخاب	سینیٹ	کیوریا

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اجتماعی نمائندگی	جزل اسمبلی	چرچ
سیاسی تنظیم	اگلیسیا (Ecclesia)	اگلیسیا (مذہبی تنظیم)
اصطلاحات		
رعایا (حلقہ اثر)	لائٹی (Laity)	لائٹی
تظم وراثت و اختیارات	ہیئر آرکی (Hierarchy)	ہیئر آرکی (چرچ کی تنظیم)
حکومتی موروثی اعمال	کلر جی (Clergy)	کلر جی
منصب یافتہ لوگ	آرڈر (Order)	آرڈر
مالیہ کے نوشتے [رجسٹر]	اسکرپچر (Scripture)	اسکرپچر (مقدس تحریر)
قانونی ہدایات	ٹسٹامنٹ (Testament)	ٹسٹامنٹ
جسمانی ریاضت	ایسٹیک (Ascetic)	ایسٹیک - روحانی ریاضت
ایوان تجارت	کونونٹ (Convent)	کونونٹ (ایوان کلیسا)
رنگروٹ بھرتی کا جشن	سیکرامنٹ (Sacrament)	سیکرامنٹ - عشاءِ ربانی
عام سیاسی اجتماع	کمیونین (Communion)	کمیونین (مذہبی اجتماع)

(for details see Toynbee A.J., A Study of History, Vol VI, pp.65, 109-111)

چرچ کی مختصر تاریخ

بقا کی جدوجہد: کلیسا نے رومن ایمپائر میں اپنی تنظیم اس وقت کی جب اسے سرکاری حیثیت نہیں ملی تھی۔ ابتدائی مغربی چرچ نے اپنے اعتقادات اس انداز سے ڈھالے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہوں۔ یروشلیم کے لاکھوں تارکین وطن بحر روم کے ساحلی شہروں میں آباد تھے۔ جب پال اور اسکے نمائندے اسکے پاس عیسائیت کا پیغام لیکر پہنچے تو انطاکیہ، اسکندریہ، کورنٹھ، اور روم کے تارکین نے عیسائیت قبول کی۔ ان کاوشوں سے دوسرے لوگ بھی متوجہ ہونے لگے۔ تاہم ابتدائیں جن لوگوں نے اس مذہب کو قبول کیا وہ زیادہ تر محنت کش طبقہ کے لوگ اور غلام تھے۔ شہروں سے یہ مذہب دیہاتوں کی طرف بڑھا۔ اس کی توسیع باقاعدگی سے اور منظم طریقے پر ہونے لگی۔ ۳۰۰ء تک رومن ایمپائر کی ایک تہائی آبادی عیسائی ہو چکی تھی۔

(Kennith Neill; Humanity and Society, p.271)

ابتدائی تین صدیاں چرچ کے ابتلاء کا دور تھا۔ عیسائیت حضرت عیسیٰ سے موسوم تھی جو مسیحائے اور مسیحائے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ رومن ایمپائر کا خاتمہ کر کے عالمی یہودی حکومت قائم کریں گے۔ اولین عیسائی (سارکین وطن اور معاشرے کا نچلا طبقہ) رومی جارحیت کا شکار تھے۔ ان میں فطرتاً روم کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔ مزید برآں، ابتدائی عیسائی تعلیمات میں بھی روم کے خلاف مواد موجود تھا۔ عیسائیت کے نزدیک روم تارکی کا فرزند تھا۔

۱۳۲ء میں یہود نے رومی اقتدار کا جواب اتار پھینکنے کے لیے ایک بار پھر مسلح جدوجہد کی تو عیسائی بھی اس میں شریک ہو گئے۔ ان حالات میں رومی حکمرانوں کو اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا کہ یہ نیا فرقہ مذہب کی آڑ میں ایک منظم سیاسی تحریک ہے جس کا مقصد رومن ایمپائر کا ختم کرنا ہے۔ حکومت کی طرف سے سختی شروع ہوئی۔ قید و بند اور دارورسن کا سلسلہ شروع ہوا۔ مذہبی اجتماعات پر پابندیاں لگیں۔ گر بے اور جائیدادیں ضبط ہوئیں۔ کتابیں جلائی گئیں۔ عیسائیت سے برأت کے حلف نامے لیے گئے۔ مقدمات سے صرف وہ لوگ محفوظ رہ سکتے تھے جو فرار ہو جاتے یا کسی نہ کسی طرح رومی حکومت سے یہ صداقت نامہ حاصل کر لیتے کہ یہ شخص ملکی قانون کا پابند ہے۔

(Gibbon E.; Decline and Fall of Roman Empire, Vol.II, pp. 106-107)

ان کارروائیوں سے بے چینی بڑھ جاتی۔ یہ بے چینی تحریک میں شدت پیدا کرتی، جس کا نتیجہ مزید تشدد ہوتا۔ یہ ایک لامتناہی سلسلہ تھا جو صدیوں چلتا رہا۔ ۲۳۹ء میں سلطنت روم پر بیرونی حملہ ہوا تو عیسائیوں نے رومی افواج کے خلاف حصہ لیا۔ نصف صدی بعد سلطنت میں زوال کے آثار پیدا ہوئے تو عیسائیوں نے اس پر کاری ضرب لگائی، جس کی پاداش میں ہزاروں عیسائی تہ تیغ کیے گئے۔ چرچ کی سربراہی میں شدید مظاہرے اور تحریکی کارروائیاں ہوئیں۔ اس وقت تک چرچ رومن ایمپائر میں مستحکم ہو چکا تھا اور ایک منظم و فعال قوت بن چکا تھا۔

استحکام اور ابتلاء : تیسری صدی کے اختتام تک عیسائیت ملک کے ہر خطے اور معاشرے کے ہر طبقے میں پہنچ چکی تھی۔ چرچ اور سلطنت میں کشمکش جاری تھی۔ غیر عیسائی رومن باشندے جن کی اب بھی اکثریت تھی، چرچ کو اپنے دیوتاؤں کا باغی قرار دیتے تھے۔ چرچ کے بارے میں ان میں شدید غلط فہمیاں تھیں۔ اسے انسانیت کا ظالم ترین ادارہ تصور کیا جاتا تھا۔ عام طور پر مشہور تھا کہ چرچ میں ہمیشہ [ہر عبادت کے موقع پر] ایک انسانی بچہ (Son of Man) ذبح کیا جاتا ہے۔ شرکاء اس کا خون پیتے ہیں۔ پھر ایک جشن پڑھتا ہے، جس کے دوران روشنیاں گل کر کے داؤد عشرت دی جاتی ہے۔

(Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.25)

ایک طرف عوام میں بدگمانی اور دوسری طرف حکومت کے مخالفانہ رویے نے چرچ کو اپنی بقا کی شدید جنگ لڑنے پر مجبور کر دیا۔ عیسائی ہونا ہی ایک جرم تھا۔ اقبال جرم کی صورت میں لرزہ انگیز سزائیں ملتی تھیں۔ مظالم کی انتہا تو یہ ہوئی کہ جب قتل و خونریزی اور انسانیت سوز سزائیں انہیں مذہب سے برگشتہ نہ کر سکیں، جب جان دینا موجب وقار ہو گیا، تو روم نے انکے ساتھ 'مذہب یا عصمت' کا معاملہ کیا، کہ عصمت بجا لو کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

یاد مذہب بچالو۔ یہ سلسلہ رومی نوجوانوں کے لیے نہایت دل خوش کن تھا۔ حد تو یہ ہے کہ نوجوان عیسائی مردوں کی عصمت دری کا فرض رومن خواتین نے ادا کیا۔

(Gibbon E.; Decline and Fall of Roman Empire, Vol. II, p.96)

ابتلاء کا یہ دور نیزہ کے عہد سے ٹیکر دو یوگاتین کے عہد تک رہا۔ اس کے بعد چرچ کے نمائندوں کو دربار میں جگہ ملنے لگی۔ انہیں عوام میں عزت میسر آئی۔ اب چرچ و امرا نے دربار کے غلاموں، کثیروں، دانشمندیوں اور خادموں کی پناہ کی ضرورت نہیں رہ گئی۔ چرچ کے عہد یدار حصول اقتدار میں کوشاں ہوئے۔ چرچ کے عہد سے اتنے اہم ہو گئے کہ انکی خرید و فروخت ہونے لگی۔ چرچ کی بڑھتی ہوئی قوت کے سبب روم کے بت پرستوں کو اپنے مذہب کے بچاؤ کی فکر ہونے لگی۔

رومن فوج کو سلطنت روم میں ہمیشہ ایک خاص اہمیت اور عظمت حاصل رہی۔ سلطنت کے دور تزلزل میں فوج بھی چرچ کی طرف مائل ہونے لگی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ فوج میں عیسائیوں کی تعداد، ملک کی آبادی میں عیسائیوں کے تناسب سے بھی بڑھ گئی۔ اسی طرح فوج میں ایک ایسا عنصر بھی پیدا ہو گیا جس کے نزدیک پاپا کا حکم شہنشاہ کے حکم سے برتر تھا اور روم کا فوجی پرچم چرچ کے صلیبی پرچم سے کمتر تھا۔ اب فوج کی وفاداریاں حکومت اور چرچ میں تقسیم ہو گئیں۔ جگہ جگہ حکم عدوئی اور بغاوت کے واقعات پیش آنے لگے۔ شہنشاہ گلیرینس (Glarius) نے فوج سے عیسائی عنصر خارج کیا۔ فوج میں بے چینی بڑھی۔ شہنشاہ نے چرچ ڈھانے اور ہر عیسائی کو قتل کرنے کا حکم جاری کیا۔ کتاب مقدس قبضے میں رکھنا جرم قرار دیا گیا۔ جائدادیں ضبط ہوئیں۔ ایک سال تک یہ تشدد پوری قوت سے جاری رہا اور پھر اس شرط پر امان دی گئی کہ آئندہ ملکی قوانین کا پورا احترام کیا جائے گا۔ (حوالہ بالصفحہ ۲۶)

سرکاری سرپرستی : چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا چرچ کے لیے سرکاری سرپرستی کا پیغام لائی۔ اس دور میں شہنشاہیت کے دعویداروں میں شدید خانہ جنگی شروع ہوئی۔ قسطنطین فاتح کی حیثیت سے ابھرنے لگا۔ ۳۰۰ء میں اس نے چرچ آف روم کو امان دی، جس کے سبب اسے افواج کی مکمل وفاداریاں میسر آ گئیں۔ چرچ نے پوری سلطنت میں فقہ کالم کا کردار ادا کیا۔ ہر عیسائی قسطنطین کے صلیبی پرچم کا شیدائی بنا، اور آخر کار آنے والے چند برسوں نے قسطنطین کو، بلا شرکت غیرے، سلطنت روم کا شہنشاہ بنادیا۔

قسطنطین کی شخصیت متنازع ہے۔ چرچ اسے عیسائی شاہ قرار دیتا ہے۔ موزخ اسے شہنشاہ تو تسلیم کرتا ہے لیکن عیسائیت سے لاتعلق قرار دیتا ہے۔ شہنشاہ خود عیسائی ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن چرچ کا پشت پناہ ضرور تھا۔ شہنشاہ نے چرچ کو مذہب المثال خدمات اور معاونت کے عوض اس پر مراعات کی انتہا کر دی۔ چرچ کو دولت، عزت اور عظمت بخشی، چرچ کی حفاظت مدلیہ کا فرض قرار پائی۔ رومن کیتھولک چرچ نے بھی شہنشاہ کے اعزازات میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔

اس سرپرستی نے چرچ کو ایک نہایت طاقتور، خود مختار ادارہ بنادیا، جس کا اپنا تخت تھا، اپنے جھنڈے، اپنے معاشی وسائل اور اپنا خزانہ، اپنے قوانین اور اپنی عدالت، اپنی پولیس اور اپنے قید خانے تھے۔ اس طرح چرچ، سلطنتِ روما کے اندر ایک متوازی سلطنت بن گیا جس کی حدود میں ملکی طاقت داخل نہیں ہو سکتی تھی اور جہاں دنیاوی قانون کا گزر نہیں تھا۔

چرچ اس قدر طاقتور ہو گیا کہ صرف شہنشاہ اور اسکے افرادِ خاندان اس کی دسترس سے باہر تھے، ورنہ ہر صاحبِ اقتدار اس کے رحم و کرم پر تھا۔ چرچ اگر کسی کو مذہب سے خارج کر دیتا تو شہنشاہ بھی کچھ نہ کر سکتا تھا۔ چرچ کے مخالفین کی فہرست مشہور ہوتی تو عوام اس کا جینا دوہر کر دیتے، یہاں تک کہ جنازے میں بھی کوئی شرکت نہ کرتا۔ چرچ کے اس آمرانہ تسلط کے سبب ہر شخص اس کے آستانے پر سجدہ ریز ہونے پر مجبور ہو گیا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۳۲۳)

پھر چرچ کا اقتدار بڑھتا ہی گیا۔ اس کی مسند کا وقار تختِ شاہی کے مرتبے سے بھی بڑھ گیا۔ آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر سے شہنشاہیت چرچ کی کاسہ لیس بن گئی۔ چرچ شہنشاہی عطا کرتا، شہنشاہی چھین لیتا، علاقوں میں امن قائم کرتا اور امن ختم کرتا۔ ایک ملک کو دوسرے پر حملہ کرنے کا پروانہ عطا کرتا۔ شاہی دربار چرچ کے نمائندوں سے رونق پاتا، اور چرچ میں شاہانِ مغرب جہیں سائی کرتے۔ چرچ نے ہی مغربی معاشرہ قائم کیا تھا اور وہ وہاں مسیحی قانون و اخلاقی نظام نافذ کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اگر معاشرتی امن و سکون کسی غیر عیسائی آواز سے ذرا سا مرتعش ہوتا تو چرچ مغرب کی ساری قوت اس کے خلاف صف آرا کر دیتا۔

چرچ میں فکری انتشار : جب عالمِ عیسائیت شہنشاہِ قسطنطنیہ کی پناہ میں آیا تو شہنشاہ کو عیسائی دنیا میں فکری ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، کیونکہ مصری، شامی، یونانی اور رومن چرچ ایک دوسرے سے سنگین اختلافات رکھتے تھے۔ ہر چرچ کے اپنے اعتقادات تھے جو جزوِ ایمان بن چکے تھے۔ ان کو شعور سے جدا کر دینا ممکن نہ تھا۔ ہر چرچ صرف خود کو مسیحی سمجھتا تھا اور باقی ساری دنیا کو کافر۔ اگر اتفاق سے کسی اور چرچ کا کوئی گرجا قبضے میں آ جاتا تھا تو اس کی تطہیر اس انداز سے کی جاتی تھی جیسے کوئی بکنڈہ پاک کر کے گرجا بنایا جا رہا ہو۔

اختلافات میں شدید ترین اختلاف، عقیدہٴ تثلیث کی نوعیت اور عیسویت (Christology) پر تھا۔ یونان و مصر فلسفے کے گہوارے تھے، اور شام مذاہب کا مولد، جبکہ روم کا مزاج سپاہیانہ تھا جہاں فلسفہ تو کجا، فلسفی کا گزر نہیں تھا۔ ۱۶۱ ق م سے فلسفیوں کا روم میں قیام قانوناً ممنوع تھا۔

(Legacy of Rome; 'Introduction' by Asquith H.H.)

پس ہر چرچ کی فکر کے انداز جدا تھے۔ ہر علاقے میں فرقہ بندی تھی۔ 'ایبائی' (Ebionite) اور 'نازاریائی' (Nazarenes) فرقے حضرت عیسیٰ کو صرف نبی مانتے تھے، ابن اللہ تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ناستک (Gnostic) فرقہ مسیح کی الوہیت کا سختی سے قائل تھا، دو سبطی فرقے کا عقیدہ تھا کہ مسیح کسی کنواری ماں کے لپٹن سے پیدا ہونے کے بجائے آسمان سے اترے تھے۔ مصر کے مقلد آریوس (Arius) نے تثلیث کا جو کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

عقیدہ دیا تھا چرچ آف روم اسے کسی قیمت پر تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ آریوس نے فرزند کو مخلوق کہا۔ سبیلیزم (Sabillianism) کے نزدیک فرزند اور خداوند پدر میں فرق تھا۔

سرکاری عقیدہ: اس ذہنی انتشار کو دور کرنے کے لیے قسطنطین نے عالم عیسائیت کے تمام بپش طلب کیے اور ہتھانیہ کے علاقے میں نيقہ (Nica) کے مقام پر ۳۲۵ء میں عظیم مذہبی اجلاس منعقد کیا۔ یہ اجلاس تقریباً دو ماہ جاری رہا۔ اکثر و بیشتر خود شہنشاہ اس اجلاس کی صدارت کرتا۔

جب اعتقادات زیر بحث آئے تو پتہ چلا کہ تثلیث کی تین اہم شکلیں تھیں، اور ہر ایک ناقص و نامکمل۔ فرسٹ کا ز اور اسپرٹ آف یونیورس پر اختلاف اتنا شدید نہ تھا، جتنا لوگس (کلام، فرزند یا مسیح) کی نوعیت پر۔

۱۔ کلیسائے مصر کے مطابق لوگس قائم بالذات نہ تھا۔ کلام کی حیثیت سے مخلوق تھا۔ پس قائم بالغیر اور صرف اس وقت تک لافانی تھا جب تک پدر خالق کا منشاء ہو۔

(The Concise Encyclopedia of the Living Faiths, p.70)

۲۔ شامی چرچ کے مطابق فرسٹ کا ز، اسپرٹ اور فرزند، سب کے سب لافانی، ازلی اور لامکانی تھے۔ ان میں یگانگت کی حد تک ہم آہنگی تھی، ورنہ ہر ایک اپنا اظہار جداگانہ کر سکتا تھا۔ اس نظریے نے تثلیث کے اقامت کو ذات سے صفات میں بدل دیا۔ گویا پدر و فرزند ایک ہی ذات کے دو مظہر تھے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۸)۔

۳۔ تیسرا نظریہ مغربی اور یونانی چرچ کا تھا۔ جس کے مطابق لوگس میں الوہیت کی تمام صفات وراثتاً موجود تھیں۔ وہ کامل ازلی اور لافانی تھا۔ تثلیث کے تمام اقامت ہم رتبہ تھے۔ ان کے اجتماع سے الوہیت مکمل ہوتی تھی۔ ان کے اشتراک کا نام تو حیدر رکھا گیا۔

قسطنطین نے فلسفیانہ تھیولوجی میں وہ بنیادی طور پر ایک رومن جنرل تھا۔ اسے فلسفیانہ موشگافیوں، الہیاتی مباحث کی صحت اور علم کلام کی گہرائیوں سے زیادہ ملک کے امن و امان سے دلچسپی تھی۔ جب ان شدید اختلافات کے پیش نظر انہام و تفہیم کی توقع نہ رہ گئی تو رومن جنرل کا کردار ادا کرتے ہوئے اس نے رومن چرچ کے عقیدہ تثلیث کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ عالم عیسائیت پر رومن جنرل نے رومن قوت کے ذریعے رومن عقیدہ مسلط کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ شہنشاہ کا یہ فیصلہ پوری طرح چرچ آف روم کے اثرات اور دباؤ کا نتیجہ تھا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۱)۔

چرچ کا غلبہ: قسطنطین نے عقیدے کو قوت کے زور پر نافذ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ وہ لوگ جو اس مقدس کونسل کے آسمانی فیصلے سے متفق نہ ہوں، جلا وطنی کے لیے فوراً تیار ہو جائیں۔

(Gibbon E.; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol II, p.356)

رومن چرچ اپنے رقیب کلیساؤں پر غالب ہو گیا۔ مخالفین کو تختی کے ساتھ پکالا گیا۔ غیر متفق بپش معتبوب ہوئے۔ آریوس جلاوطن ہوا۔ جن مشکوک حالات میں اسکی موت واقع ہوئی اس سے شبہ ہوتا کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ہے کہ اسے عمداً راہ سے ہٹایا گیا۔ قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا۔ قسطنطنیہ کی شاہراہوں پر مقتولین کی لاشوں کی نمائش کی گئی اور اس طرح رومن چرچ کے غلبے کی راہ ہموار کی گئی۔

چرچ کو جو قوت قسطنطین کے زمانے میں ملی تھی اس میں ہر روز اضافہ ہوتا گیا۔ جیسے جیسے سلطنت روم پوزوال آتا گیا، چرچ کا غلبہ اسی مناسبت سے بڑھتا گیا۔ چرچ کے مخالفین کو اس طرح ختم کیا گیا کہ اس کے خلاف ایک ہزار سال تک کوئی آواز اٹھانے والا نہ پیدا ہو سکا۔ روم کی تاریخی آزادی گفتار یہاں آ کر ناپید ہو گئی۔ ایک وقت آیا کہ چرچ اور سلطنت ایک دوسرے کے حریف ہو گئے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ سلطنت چرچ کی کنیز بن گئی۔ مغرب کے شہنشاہ چرچ کے بندہ بے دام ہوئے۔ عہد وسطی کے چرچ کے قبضے میں مغرب کا ہر شعبہ حیات آ گیا۔

آٹھویں صدی کے اواخر میں چرچ مغرب کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ وہ شہنشاہی عطا کرتا تھا اور چھین لیتا تھا۔ امن قائم کرتا اور امن کو برباد کرتا تھا۔ ملکوں کو تقسیم کرتا، ان پر حملوں کے پروانے جاری کرتا، سرکش شہنشاہوں کو قدموں میں جھکنے پر مجبور کرتا، قانون بناتا اور قانون کی دھجیاں اڑاتا تھا۔ مغرب چرچ کا قائم کردہ معاشرہ تھا۔ اگر وہاں کا معاشرتی سکوت کسی غیر عیسائی آواز سے ذرا بھی متاثر ہوتا تو چرچ مغرب کی ساری توانائیاں مجتمع کر کے اس کے خلاف صف آرا کر دیتا تھا۔

فکر پر تسلط : مغربی معاشرہ اپنے ابتدائی دور میں علم و فکر سے بے نیاز تھا۔ فیوڈل معاشرے میں علم کے میدان میں ترقی کے امکانات بہت کم تھے۔ اس دور میں مغربی معاشرے نے جو کچھ کیا وہ صرف ایشیا اور افریقہ کی

نقلی تھا۔ (cf. Christopher Hill; The Century of Revolution, p.76)

علم و فکر پر کلیسا کا تسلط تھا۔ تاریخ نویسی صرف چرچ نے کی، جو اس کے اپنے نقطہ نظر کی آئینہ دار تھی۔ فکر کا محور مذہب اور چرچ تھا۔ اس دور میں جس چیز کو فلسفہ کہا جاتا تھا وہ صرف الہیاتی مباحث (Theology) تھے۔ علوم سے مراد صرف کلیسا کی تعلیمات تھیں۔ ہر وہ علم جس کا سرچشمہ کلیسا نہ ہوتا ممنوع تھا۔ علوم پر چرچ کی اجارہ داری، نشاۃ ثانیہ کے بعد بھی قائم رہی۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک مغرب کی تمام درسگاہیں، کالج اور یونیورسٹیاں چرچ کے زیر نگرانی رہیں۔ کوئی فرد کسی درسگاہ میں یا نجی طور پر چرچ کے لائسنس کے بغیر تعلیم نہیں دے سکتا تھا۔ (cf. Kenneth Neil Cameron; Humanity and Society, p.227)

کتابیں تختی کے ساتھ سنسکر کی جاتی تھیں۔ سنسکرپ کا اختیار صرف چرچ کو تھا۔ [Christopher Hill; The Century of Revolution, p.76]۔ لوگوں کی فکر کا رخ چرچ متعین کرتا۔ وہ کیا سوچیں اور کیسے سوچیں، کسے اچھا کہیں اور کسے برا کہیں، یہ چرچ بتلاتا۔ ان حالات میں مغرب کا تعلیم یافتہ طبقہ، ذہنی اور فکری اعتبار سے چرچ کا نمائندہ تھا، جو غیر تعلیم یافتہ طبقے کی رہنمائی کرتا تھا۔ اس تسلط کا نتیجہ یہ تھا کہ پورے مغرب میں غیر عیسائی فکر، کیتھولک علاقے میں پروٹسٹنٹ فکر اور پروٹسٹنٹ علاقے میں کیتھولک فکر کا وجود نہیں تھا۔

مغربی چرچ کی تقسیم: چرچ نے بڑی کاوشوں سے مغربی معاشرہ استوار کیا تھا۔ بڑی قربانیوں کے بعد مغربی خطے کو شمال اور مشرق کی جانب وسعت دی گئی تھی۔ ان میں فکری ہم آہنگی پیدا کی تھی۔ انہیں ایک صلیبی پرچم تلے مجتمع کیا تھا۔ انکی ہر میدان میں رہبری اور قیادت کی تھی۔ لیکن جب معاشرے نے چرچ کے قائم کردہ نظام کو ارتقائی تناظروں کی تکمیل میں مدد نہ پایا تو اصلاحات کا مطالبہ کیا۔ چرچ خود کو تنقید سے بالاتر تصور کرتا تھا۔ اس نے ان مطالبات اور مطالبات کرنے والوں کو سختی سے دبایا۔ اس سختی نے مذہبی اصلاح کی تحریکوں میں شدت پیدا کی۔ حقیقت یہ ہے کہ بدعنوانی چرچ کے ہر شعبے اور ہر طبقے میں پائی جاتی تھی۔ ان بدعنوانیوں کے پیش نظر مذہبی اصلاح سے زیادہ چرچ کی اصلاح پر زور دیا جانے لگا۔ جب چرچ نے اپنی اصلاح نہ کی تو مغرب میں ایک نیا پروٹسٹنٹ چرچ قائم ہو گیا، جس نے پاپا کے خطہ اقتدار کو تقسیم کر ڈالا۔ اس تقسیم میں مختلف طبقوں مثلاً سرمایہ داروں، حکمرانوں، سیاستدانوں اور تاجروں کا بھی مفاد تھا کہ وہ اپنے اپنے میدان کار میں چرچ کی بالادستی اور گرفت سے نجات چاہتے تھے۔ ان طبقوں نے پروٹسٹنٹ چرچ کی پشت پناہی کی۔

نشأۃ ثانیہ (Renaissance) [چودھویں صدی عیسوی تا سترہویں صدی عیسوی] کے بعد مغربی معاشرے کا مطلق نظر تبدیل ہونے لگا۔ قومی نظریات ابھرنے لگے۔ قومی ریاستیں اور قومی چرچ قائم ہوئے۔ قدیم بین الاقوامی تصور ختم ہوئے۔ ابھی تصور تھا جس کے سبب عہدِ وسطیٰ میں مغرب کو مسیحی جمہوریہ مغرب (Western Republica Christiana) اور ہولی رومن ایمپائر [cf. Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. II, p.341] کے نام دیے گئے اور اسی سبب سے مغرب کا ابتدائی قانون 'مسیحی قانون' (Christian Law) کہلاتا تھا۔ [cf. Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p.247]۔ اس تبدیلی نے چرچ کو سیاسی میدان سے خارج کر دیا۔

سائنس کی ترقی نے چرچ کو علم کے میدان سے بھی پسپا کر دیا۔ چرچ کا دائرہ علم صرف بائبل کی حد تک سمٹ کر رہ گیا۔

چرچ نے معاشرے میں طبقاتی تفاوت کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اس نے خود بھی ایک استحصالی طبقے کی حیثیت اختیار کی۔ مظلوم طبقوں کو چرچ کے پروپیگنڈے کی بدولت یہ توقع تھی کہ چرچ کے اقتدار میں آنے کے بعد ان پر جبر و استبداد، اور استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا، لیکن غلاموں، کسانوں اور مزدوروں کے غول کے غول چرچ کے قبضے میں آئے تو شب یہ کہنے لگے کہ انکی آزادی کا زمانہ ابھی نہیں آیا، شاید یہ زمانہ صدیوں کے بعد آئے۔

[cf. Gibbon E.; The Decline and Fall of Roman Empire, Bury J.B. edition, Vol. V, App. II by Bury, p. 526]

اب وہ اس مسئلے میں بائبل اور قدیم بزرگوں کے اقوال کا حوالہ دینے کی جگہ ارسطو، سسرو اور دیگر فلاسفہ کے حوالے سے یہ کہتے تھے کہ فطرت نے کچھ افراد کو حکمرانی کے لیے اور بقیہ کو فرماں برداری کے لیے پیدا کیا ہے۔ جو لوگ حکمرانی نہ کر سکیں انہیں اطاعت کرنی چاہیے۔ (Dozy R.; Spanish Islam, p.225)۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

چرچ نے استحصالی نظام کو برقرار رکھا۔ اسکا جواز پیش کیا۔ خود بھی استحصالی میں شریک ہوا۔ جب انیسویں صدی میں کارل مارکس اور اینگلس نے شدید طبقاتی جدوجہد شروع کی تو محنت کش طبقوں نے چرچ کو بھی اپنے دشمنوں میں شمار کیا۔ اس کی تعلیمات کو کمزور فریب قرار دیا اور اس سے بھی وہی سلوک کیا جو سرمایہ داروں، جائیداد داروں اور امرائے سلطنت سے روا رکھا۔

چرچ نے صدیوں تک فکر انسانی پر پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد آزادی فکر کے حامیوں نے چرچ پر شدید حملے کیے۔ پاسکل اور میکیاولی نے معاشرے کی تمام بدعنوانیوں کا ذمہ دار چرچ کو ٹھہرایا۔ چرچ کے عظیم ترین مفکر تھامس اکویناس پر الزام عائد کیا کہ اس نے انسان کی آزادی فکر کو بے معنی اور لغو بنا دیا ہے۔

(The Concise Encyclopedia of the Living Faiths; pp.156-157)

لاکس (Locks)، ہیوم (Hume)، وولتیر (Voltaire)، اور کانت (Kant) نے عقل و خرد کو کسوٹی بنا کر چرچ کے ازلی اقتدار پر اتنے سخت حملے کیے گویا اسے مٹا کر ہی دم لیں گے۔ دیگر مفکرین نے مکاتب تشکیک قائم کیے، جن سے کیتھولک چرچ کے خلاف شکوک عام ہوئے۔

موور (Moore) اور ارکس (Erasmus) نے چرچ کی ہر قدر پرکڑی تنقید کی۔ خانقاہی نظام، رہبانیت، تجرد، تبرکات کی پرستش، کلیسا، پوپ، عیسائی عقائد، غرضکہ سب ہی کچھ تنقید کی زد میں آیا۔ کلیسا کو یکسر تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ [Henry Pirenne; A History of Europe, p.542]۔ بالآخر ہابز (Hobbes) کے نظریات کے تحت سترہویں صدی میں چرچ کو سیاست سے جدا کیا گیا۔ (Christopher Hill; The Century of Revolution, p.181)۔

دوہر انظام اقتدار

پوپ اور شہنشاہ

عالم عیسائیت کے بڑے چرچ اسکندریہ، انطاکیہ، قسطنطنیہ اور روم میں قائم تھے۔ اول الذکر تین کلیساؤں کے سربراہ اسقف اعظم (Patriarch) کہلاتے تھے۔ ان کا تقرر شہنشاہ روم کرتا تھا۔ جبکہ رومن چرچ کے سربراہ کو پوپ کہا جاتا تھا۔ اس کا تقرر انتخاب کے ذریعے خود چرچ آف روم کرتا تھا اور شہنشاہ اس تقرر کی رسمی منظوری عطا کرتا تھا۔ پوپ کو دیگر اساقفہ پر کوئی برتری حاصل نہیں تھی۔

پوپ کے اقتدار کی ابتداء : رومن تثلیث کے جبری نفاذ نے دیگر اساقفہ پر پوپ کو ایک برتری دلا دی کیونکہ اس کو منظور کروانے میں پوپ کی کوششوں کا بڑا دخل تھا۔ [The Concise Encyclopedia of] (the Living Faiths, p.71)۔ تاہم ساتویں صدی کی ابتدا تک پوپ کا اقتدار برائے نام تھا، گواسکا احترام بید تھا۔ جب گریگوری اعظم (۵۹۰ء تا ۶۰۴ء) پوپ ہوا، تو اس نے سیاسی اقتدار کے حصول کی جانب پہلا قدم بڑھایا۔ اس کے عہد میں اطالیہ پر لومباردوں نے حملہ کیا۔ شہنشاہ چونکہ شام اور دینیوب کی سرحدوں پر جنگوں میں الجھا ہوا تھا اور لومباردوں کی یلغار روکنے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے پوپ نے روم کے دفاع کی ذمہ داری سنبھالی اور اس سے بخوبی عہدہ برآ ہوا۔ گریگوری ایک زبردست منتظم تھا اور چرچ کا حصہ بننے سے قبل رومن ایمپائر کی سول سروسز کا رکن تھا۔ (cf. Toynbee A.J., A Study of History, Vol. VI, p.73)۔ اس نے نہ صرف چرچ کے نظم و نسق کو منظم کیا بلکہ چرچ میں ایک نئے عنصر کا اضافہ بھی کیا۔ یہ اضافہ راہبوں (Monks) کی چرچ میں شمولیت اور ان کی خانقاہوں کا انضمام تھا۔ اس سے قبل راہبوں کی خانقاہیں نہ تو شیرازہ بند تھیں اور نہ ہی چرچ سے متعلق تھیں۔

راہب مخلص، ویندار اور تارک الدنیا لوگ تھے، جو انفرادی خانقاہوں میں گوشہ نشینی کی باعزت زندگی گزارتے تھے۔ انہیں معاشرے کے ہر طبقے میں وہ احترام اور تقدس میسر تھا جو کلیسا کے کارکنوں کو نصیب نہ تھا۔ ان کی شمولیت کے طفیل پوپ کو مذہبی کارکنوں کی ایک ایسی رضا کار فوج میسر آ گئی جو مالی اعتبار سے خود کفیل تھی، اور معاشرے میں ایک ممتاز مقام رکھتی تھی۔ گریگوری کے عہد میں ہی انگلستان نے رومن چرچ میں شمولیت اختیار کی۔ اس شمولیت نے پوپ کے حلقہ اثر میں بڑی وسعت پیدا کی۔

آٹھویں صدی کی ابتدا میں (۱۷۷۷ء) جب مسلمان اسپین کو فتح کر رہے تھے، پوپ بونی فیس (Boniface) دریائے رائن (Rhine River) پار کے جرمنوں کو بھی روٹن چرچ کا شیع بنانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس طرح، اس کے علاقے سے اگر اسپین کم ہوا تو اس کی کوشاں کی جانب وسعت نے پورا کر دیا۔ ان نئے عیسائیوں میں پوپ کا جو احترام تھا اس کی مثال روئے زمین پر نہ تھی۔ مغرب میں اس وقت جو عظمت پوپ کو میسر تھی وہ خود شہنشاہ روم کو حاصل نہ تھی۔ عیسائیوں کے نزدیک شہنشاہ ایک فانی گناہگار تھا، اس کا حکم انسانی حکم تھا جبکہ پوپ خداوند کا نمائندہ تھا، اور اس کا حکم آسمانی حکم تھا۔ [cf. Warner Stark; The sociology of Religion, p.53]۔ حکمران کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ چرچ کی حفاظت کرے اور پوپ کا کام یہ تھا کہ ان پر خدائی برکتیں نازل کرے۔ (cf. Mourret F.; A History of the Catholic Church, p.374)

شہنشاہ کی ہمسری : آٹھویں صدی میں شہنشاہ روم مسلمانوں سے مستقل شکست کھا رہا تھا۔ یہ شکستیں اس کے لیے باعث رسوائی تھیں، جبکہ پوپ بلا جگہ و جدال ان علاقوں پر اپنا اقتدار قائم رکھنے میں کامیاب تھا جنہوں نے کبھی رومن ایمپائر کا تسلط برداشت نہیں کیا تھا۔ پوپ نے مغرب میں اعلیٰ ترین مقام حاصل کر لیا تھا اور اسے معاشرے میں ہمہ جہتی اختیار حاصل ہو چکا تھا۔ (Michael Hill; The Sociology of Religion, p.54)۔

شہنشاہ کی اطاعت اب پوپ کے لیے موجب عار ہو چکی تھی۔ وہ رسمی برتری جو شہنشاہ کو پوپ پر حاصل تھی، اب جلد یا بدیر ختم ہونے والی تھی۔ جب ۷۲۶ء میں شہنشاہ لیو سوم نے شبیہ پرستی کی ممانعت کے احکامات جاری کیے، تو پوپ نے نہایت تحقارت سے اس کے احکامات رد کر کے اس پر بدعت کا الزام لگایا، جبکہ دیگر اساتذہ نے حکم کی تعمیل کی۔ [cf. Fuller; The Decisive Battles of Western World, p.241: &]

[Toynbee A.J., A Study of History, Vol. II, p.430]

شہنشاہ کو بدعتی قرار دینے کے معنی یہ تھے کہ پوپ نے شہنشاہ کو اپنے حلقہ اقتدار سے بے دخل کر دیا تھا۔ شہنشاہ بے بس تھا۔ کڑوے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اب مغرب میں شہنشاہ کی جگہ پوپ نے لے لی۔

فوج : پوپ کے پاس روحانی تقدس، علاقہ، جائداد اور خزانہ سب کچھ تھا، لیکن مسلح افواج نہیں تھیں، جس کی وجہ سے وہ شہنشاہ کی تادبی کارروائی سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ دوسری جانب ہسپانیہ کی جانب سے مسلمانوں کی پیش قدمی کے خطرے نے بھی فوج کی موجودگی کو ناگزیر بنا دیا۔ مغرب کے حکمران بے دست و پا تھے۔ ان میں کسی طاقتور فوج کے اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہیں تھی۔ بحر روم پر مسلمانوں کے قبضے نے مغرب کی اقتصادیات کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ معیشت کا دار و مدار زمین پر تھا۔ زمین بادشاہ کی ملکیت ہوتی تھی جو اس کے حکم سے فوجی خدمات کے عوض دی جاتی تھی۔ اس وقت تک ساری زمین اس طرح تقسیم ہو چکی تھی کہ بادشاہ کے پاس کسی فوجی خدمت کا معوضہ ادا کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ان حالات میں پوپ نے فیصلہ کیا کہ بے بس حکمرانوں کو ہٹا کر کسی ایسے فرد کو مغرب کا حکمران بنایا جائے جو معقول فوج قائم کر سکے۔ چنانچہ اس نے موروثی فرینکیش بادشاہ کو معزول کر کے 'کارلن جینن' گھرانے کے

اقتدار کی بنیاد رکھی۔ اس طرح مغرب میں شہنشاہ کی جگہ عملًا پوپ نے لے لی اور مغرب کے حکمران پوپ کے نمائندے ہو گئے۔

اس طرح آٹھویں صدی کے وسط سے مغرب میں دوہرا نظام اقتدار رائج ہوا۔ دونوں اقتدار نشاۃ ثانیہ تک ایک دوسرے کے متوازی چلتے رہے۔ اولاً ان متضاد قوتوں میں کسی قدر توازن قائم رہا، لیکن جلد ہی ان میں شدید رستہ کشی ہونے لگی۔ کبھی کبھار شہنشاہ بھی پاپا کے اقتدار پر غالب آیا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یا تو وہ شہنشاہیت ہی صفحہ ہستی سے مٹ گئی یا پھر اپنی بقا کے لیے شہنشاہیت کو اپنی پیچھے پر پاپائیت کے کوڑے سنبھ پڑے۔ دونوں فریقین کے دائرہ کار اور حدود اختیار متعین نہ ہو گئے۔ تاہم پورے عہد وسطیٰ میں مغربی معاشرہ مکمل طور پر پوپ کی گرفت میں تھا اور کوئی حکمران یا شہنشاہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں تھا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۳۱)

پوپ اور مسیحی جمہوریہ مغرب: حالات جیسے جیسے پوپ کے قابو میں آتے گئے، اس کے عزائم ویسے ویسے بلند ہوتے گئے۔ مغربی بادشاہت کے قیام کا منصوبہ کامیاب ہو چکا تھا۔ اب پوپ نے اسے شہنشاہیت کا درجہ دیدیا۔ ۸۰۰ء کے کرسس کے موقع پر پوپ 'لیو' نے شارلمین کے سر پر تاج شہنشاہی رکھا اور اس شہنشاہیت کا نام مسیحی جمہوریہ مغرب رکھا۔

اس نئی جمہوریہ کے پاس کوئی مؤثر انتظامی مشینری نہیں تھی۔ کلیسا نے اپنی تنظیم، سلطنت کے انتظامات سنبھالنے کے لیے مستعار دی۔ اس طرح مغربی ایمپائر، مغربی امپیرر (Emperor)، مغربی انتظامیہ اور مغربی چرچ، سب کے سب پوپ کے تھے۔ اب سارے اختیارات پوپ کی ذات میں مجتمع تھے۔ وہ مغرب کا مقتدر اعلیٰ تھا۔ شہنشاہیت کا قیام پوپ کا عظیم کارنامہ تھا۔ یہ نئی شہنشاہیت تلوار کے بل پر نہیں بلکہ صرف پروپیگنڈے کے زور پر قائم ہوئی تھی۔

پوپ اور شہنشاہ: شارلمین کے عہد تک پوپ اور شہنشاہ کے مراسم نہایت خوشگوار رہے۔ شہنشاہ ملکی امور میں بڑی حد تک خود مختار رہا، لیکن اس کے جانشین اس خود مختاری کو قائم نہ رکھ سکے۔ وہ پوپ کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئے۔ شارلمین کے تین بیٹے تھے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا 'لونیس' شہنشاہ ہوا۔ جرمن دستور کے مطابق یہ تینوں سلطنت کے وارث تھے۔ سلطنت کو ان تینوں میں تقسیم ہونا چاہیے تھا، مگر رومن دستور اس کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ جانشینی کا مسئلہ نزاعی ہو گیا۔ دو متقابل گروہ بن گئے۔ ایک سلطنت کی تقسیم کے حق میں تھا، دوسرا مخالف۔ ان میں تقسیم کا خواہاں گروہ زیادہ طاقتور تھا۔ لونیس کو تقسیم کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ یہ فیصلہ پوپ کی مرضی کے خلاف تھا۔ ولی عہد لو تھر نے پوپ کی خدمت میں استغاثہ دائر کیا اور پوپ گریگوری چہارم ۸۳۳ء میں بذات خود، ولی عہد کی افواج کے ہمراہ شہنشاہ کے خلاف نکلا۔ جنگ میں ولی عہد کو فتح ہوئی، جو حقیقتاً پوپ کی فتح تھی۔

(cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.117)

پوپ نے شہنشاہ پر عالم عیسائیت کے امن کو بر باد کرنے کے الزام میں کفارہ عائد کیا۔ اس موقع پر لوئیس جو خود شہنشاہ تھا اور عظیم شہنشاہ شارلمین کا جانشین فرزند تھا، پوپ کے آگے محض ایک حقیر مجرم کی حیثیت رکھتا تھا۔ پاپائیت اور شہنشاہیت مغرب کی ایسی متضاد قوتیں جن میں توازن برقرار رہنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ ایک کی کمزوری دوسرے کی طاقت تھی۔ لہذا کشمکش ناگزیر تھی۔ لوئیس کے جانشینوں کو اپنی شہنشاہیت برقرار رکھنے کے لیے پوپ کی جنبش ابرو کا پابند ہونا پڑا۔

پوپ بحیثیت محتسب: ابھی شہنشاہیت کو قائم ہوئے صرف نصف صدی گزری تھی کہ پوپ 'نکولاس' (۸۵۸ء تا ۸۶۷ء) نے یہ دعویٰ کیا کہ پاپائی اقتدار کو شہنشاہی اقتدار پر وہی فوقیت حاصل ہے جو روح کو بدن پر ہے۔ (Warner Stark; The Sociology of Religion, p.54)۔ پوپ مقدس نائب خدا تھا اور شہنشاہ محض ایک گناہگار انسان۔ گناہگار کو سیدھے راستے پر گامزن رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ شہنشاہیت کی زمام پوپ کے مقدس ہاتھوں میں رہے۔ زمین پر نائب خدا کی حیثیت سے پوپ لوگوں کی ہدایت اور باز پرس کو اپنا فرض منصبی سمجھتا تھا۔ ہر فرد خواہ بادشاہ ہو یا شہنشاہ، اس کے آگے جواہدہ تھا۔

گریگوری نے اگر منصف کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے شہنشاہ لوئیس کو سزا دی تھی تو اسکے جانشینوں نے احتساب کے فرائض سنبھال لیے۔ پوپ نکولاس بے جھجک اس راہ پر چلا۔ اور اسکی بیروی گریگوری ہفتم، الگنڈر ثانی، اور انوسنت سوم و چہارم نے کی۔ جب مغرب پوری طرح پوپ کے تسلط میں آ گیا تو پوپ نکولاس نے کوشش کی کہ مشرقی کلیسا (یونان) کو بھی اپنی برتری تسلیم کرنے پر مجبور کر دے۔ قسطنطنیہ کے اسقف اعظم نے نکولاس کے احکام کی پروا نہ کی تو اس نے بے دریغ اسقف اعظم کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔

شہنشاہ کے جانشین کے تقرر کا حق: شہنشاہ لوئیس ثانی نے ۸۷۵ء میں وفات پائی۔ اس نے اپنی زندگی میں اپنے ایک قریبی رشتہ دار 'کارلومان' (Carloman) کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ پاپائیت کو شہنشاہیت پر بالادستی کے اظہار کا ایک اور موقع میسر آیا۔ پوپ جان ہشتم (۸۷۲ء تا ۸۸۲ء) نے اس کی جانشینی کو مسترد کرتے ہوئے چارلس (Charles the Bald) کو روم طلب کر کے اس کی تاجپوشی کی۔

مغرب میں بادشاہت وراثتی نظام کے تحت تھی۔ بادشاہ کا بیٹا خود بخود بادشاہ ہو جاتا تھا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۳۵)۔ لیکن پوپ نے شہنشاہ سے جانشین کے تقرر کا حق بھی چھین لیا۔ جانشینی ایک انتخابی کمیٹی کے ذمہ کی گئی، جس میں پوپ کے علاوہ متعدد بپش اور علاقائی حکمران شریک تھے۔

(cf. Henry Pirenne; A History of Europe, pp.455-456)

نویں صدی کا پوپ شہنشاہ گر تھا۔ اس کی جانب آنکھ اٹھا کر دیکھنا تک گناہ تھا۔ کسی فریک حکمران میں اتنی سکت نہ تھی کہ سرتابی کر سکے۔ اگرچہ پوپ کے پاس اپنی فوجی طاقت نہیں تھی لیکن اسکا اقتدار ہر جگہ سے افواج کو متحرک کر سکتا تھا۔ اگر کوئی سرکشی کرتا تو پوپ دیگر حکمرانوں کو اس کے خلاف کھڑا کر دیتا، اس لیے ہر حکمران اس قسم کی حرکت کو خود کشی کے مترادف سمجھتا تھا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

یہ کیفیت نویں صدی کے اختتام تک قائم رہی اور اس کے بعد شہنشاہیت کا ڈھونگ بھی ختم ہو گیا۔ نارمن حملوں، مسلم اسپین کے دباؤ، ہنگری کی شورشوں، ذاتی مفادات، سازشوں اور پوپ کی بالادستی نے شارلمین کی عظیم سلطنت کے تار و پود ایک ہی صدی میں بکھیر دیے۔ اسکے جانشین خود کو شاہ کہتے یا شہنشاہ، سب کے سب بے دست و پا تھے۔ تاج شہنشاہی پوپ کے قبضے میں تھا، وہ جس کے سر پر تاج رکھ دے وہی شہنشاہ ہوتا تھا۔ وہ وقت بھی آیا کہ بعض من چلے پوپ کی رضا کا انتظار نہ کر سکے اور انہوں نے خود بڑھ کر پوپ کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کی تاج پوشی کرے۔ چنانچہ چارلس دی بالڈ کے بعد چارلس دی فیٹ (Charles the Fat)، ۸۸۱ء میں روم پر چڑھ دوڑا اور اس نے پوپ جان اٹھم کو مجبور کر دیا کہ وہ تاج شاہی اسکے سر پر رکھ دے۔

چارلس مذکور کے بعد شہنشاہیت کے دو دعویدار اٹھے۔ ان میں سے ہر ایک نے تاج کے لیے روم پر حملہ کیا اور تاج شاہی بزرگ شمشیر حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ۸۸۱ء تا ۸۹۶ء یہ تاج کم از کم پانچ حکمرانوں نے زیب سر کیا۔ چھٹے حکمران نے پوپ کی لاش پر سے گزر کر یہ تاج حاصل کیا۔ ۹۰۰ء میں شاہ برگندی نے اس پر قبضہ کیا۔ پانچ سال بعد برگرنے اسے شکست دیکر اسکی آنکھیں نکوا لیں۔ ۹۱۹ء میں بھی تاج جان دہم کے سر کی زینت بنا۔ اس طرح جیسے نویں صدی عیسوی میں پوپ نے شہنشاہوں کو رسوا کیا تھا، ویسے ہی دسویں صدی عیسوی میں شہنشاہیت کے دعویداروں نے پاپائیت کے قرضے چکائے۔ (حوالہ بالا، صفحات ۱۲۰-۱۲۳)

پوپ سے بے نیاز شہنشاہ : دسویں صدی عیسوی میں مغرب میں سیکسن اقتدار قائم ہوا۔ ان کا حکمران 'اوٹو' (Otto) شاہ جرمنی کی حیثیت سے تاریخ میں ابھرا۔ جلد ہی اس نے جرمن اقتدار کو مستحکم کر لیا۔ ۹۵۵ء میں اس نے ہنگری کو شکست دی۔ اس کے نتیجے میں ہنگری بھی عیسائیت قبول کر کے مغربی مسیحی جمہوریہ کا رکن بن گیا۔ ۹۶۸ء میں پولینڈ اور ڈنمارک کو بھی عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ 'اوٹو' نے سیاسی مصلحت کے پیش نظر یہ منصوبہ تیار کیا کہ جنگجو قوموں کو عیسائی بنا کر سرحدی علاقوں میں آباد کیا جائے تاکہ ملک بیرونی حملہ آوروں سے محفوظ رہ سکے۔ اس مقصد کے لیے اسے پوپ سے رجوع کرنا پڑا تاہم وہ پوپ کے انداز تسلط سے پوری طرح آگاہ تھا لہذا محتاط رہا کہ پوپ اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال نہ کر سکے۔

اوٹو کے لیے یہ بے نیازی صرف اس لیے ممکن ہوئی کہ اس کا کوئی سیاسی حریف نہ تھا۔ ثانیاً اس کا اقتدار بھی پوپ کا رہین منت نہ تھا۔ نیز شہنشاہیت اور پوپ کی کشمکش نے اگر کارولن جینن شہنشاہیت کو ناپید کر ڈالا تھا تو خود پوپ کا اقتدار بھی اتنا مجروح ہو چکا تھا کہ وہ اوٹو کے خلاف بے بس تھا۔

اوٹو نے پوپ کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی سلطنت میں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو جیسا میں بٹپ بنایا۔ انہیں بڑی جوی جاگیریں دیکر اپنا امنو بنایا۔ اس طرح اس نے چرچ کو سیاسی مفادات کے لیے استعمال کیا۔ اوٹو کے ان اقدامات نے چرچ پر اسکی بالادستی قائم کر دی۔ پاپا کے احکامات پر اوٹو کا حکم رائج ہوا۔

ایک موقع پر پوپ نے کیمبریا (Cambria) کے بپش کو امن خداوندی کے نفاذ کا حکم دیا تو بپش مذکور نے اسے یہ کہہ کر نال دیا کہ امن عامہ کا تعلق امور مملکت سے ہے جس میں وہ (بپش) مداخلت نہیں کر سکتا۔

اوٹو کے مقابلے میں پوپ بے بس تھا۔ اس پر برتری کا دعویٰ نہیں کر سکا۔ پوپ جان وہ از دہم (John XII) اپنے باپ کے جوڑ توڑ کے طفیل صرف اٹھارہ سال کی عمر میں پوپ بن گیا تھا۔ اطالیہ میں اسکے طاقتور مخالفین موجود تھے۔ شہنشاہیت اور پاپائیت کے درمیان ہم آہنگی ختم ہو چکی تھی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اطالوی حکمرانوں نے روم کا رخ کیا۔ پوپ کے لیے اوٹو سے مدد طلب کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے خود مدد کی درخواست کی اور جب معاملات طے ہو گئے تو پوپ نے شہنشاہ سے اپنی وفاداری کا اعلان کیا، اور اوٹو کے سر پر تاج شاہی رکھا۔

(Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, p.247)

پوپ جان کو جو توقعات اوٹو سے تھیں جب وہ پوری نہیں ہوئیں تو اس نے اوٹو کے خلاف سازشیں شروع کر دیں۔ جس کے جواب میں اوٹو روم پہنچا اور اس نے چرچ کونسل (Synod) کا اجلاس طلب کر کے نہ صرف پوپ کو برطرف کر دیا بلکہ کونسل سے یہ حلف اٹھوایا کہ وہ کسی پوپ کا تقرر شہنشاہ کی توثیق کے بغیر نہیں کرے گی۔ اوٹو نے اسی کونسل سے اپنے بیٹے 'لیو ششم' کو پوپ منتخب کروایا۔ اس جبری انتخاب نے کونسل میں بے چینی پیدا کی جسے رفع کرنے کے لیے اوٹو کو کئی بار روم آنا پڑا۔ اوٹو کے جانشینوں نے بھی اپنے بھائی بندوں کو پوپ بنوایا تاکہ اس کے اثر و رسوخ سے شہنشاہیت فائدہ اٹھا سکے۔

بحران کا اختتام : کلیسا پر شہنشاہ کی گرفت دیر پا ثابت نہیں ہوئی۔ اوٹو کے جانشین شہنشاہیت کے وقار کو قائم نہیں رکھ سکے اور آخر کار پوپ کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بحران دور میں کلیسا میں شدید متزل پیدا ہو گیا تھا۔ پوپ کا انتخابی ادارہ حکومت کے زیر اثر آ چکا تھا۔ پوپ کے عہدے کی خرید و فروخت کے واقعات بھی ہوئے۔ تاج شہنشاہی بطور رشوت بھی پیش ہونے لگا۔ [cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.165]۔ بیک وقت کئی کئی پوپ مقرر ہونے لگے۔ بااقتدار طبقے کی مرضی سے پوپ مندرجہ ہوئے، معزول ہوتے، قتل کیے جاتے، یا جیلوں میں اڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے۔

گیارہویں صدی عیسوی میں پوپ نے ایک زبردست تحریک چلائی جس کے ذریعے عام لوگوں کو مذہب کا والد و شہید بنایا گیا۔ چرچ کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ چرچ کے عہدیداروں کے لیے ضابطہ اخلاق مرتب کیا گیا۔ ان کے لیے تہذیب کو لازمی قرار دیا گیا۔ درویش صفت راہبوں کو چرچ کے بست و کشاد میں زیادہ سے زیادہ حصہ دیا گیا۔ یہ تحریک کلونیٹ (Cluniac) کہلائی اور اس تحریک کے نتیجے میں جو نیا طبقہ ابھرا اسے پاپائی (Papist) کہا گیا۔ اس تحریک نے پوپ اور اس کے ادارے کے مذہبی وقار کو بحال کر دیا۔

پوپ کے اقتدار کی بحالی : اوٹو نے شہنشاہیت کو مقتدر کرنے کے لیے چرچ کو اپنے تحت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس اقتدار کو مستقل کرنے کے لیے اس نے پورے اطالیہ کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا، مگر جنوب میں عربوں اور

بازنطین کی موجودگی سہ راہ ثابت ہوئی۔ اوتو ثانی نے عربوں کو بیدخل کرنے کے لیے اقدام کیا، لیکن ۹۸۲ء میں روزانو (Rossano) کے مقام پر اس نے ایسی تباہ کن شکست کھائی کہ پھر کبھی ایسا منصوبہ بنانے کی جرأت نہ کر سکا۔ اگر عرب نہ ہوتے تو شاید مغرب کی تاریخ سے پوپ کے اقتدار کا وجود ختم ہو جاتا۔ اس شکست نے شہنشاہیت کے وقار کو سخت نقصان پہنچایا اور پوپ کے وقار کو بلند کیا۔

سکلی پر نارمن حکمرانوں نے قبضہ کیا تو سکلی کے قدیم حکمران گھرانے نے پوپ کی خدمت میں اپنے حق حکومت کا دعویٰ کیا۔ پوپ 'لیو نہم' نے ۱۰۵۳ء میں جرمن فوجوں کو لیکر سکلی کے نارمن حکمرانوں پر چڑھائی کی اور شکست کھائی۔ سکلی کے معاملے میں مداخلت نے پوپ کے لیے ان علاقوں میں مداخلت کی راہ ہموار کر دی جو اسکے حلقہ اقتدار سے باہر تھے۔ ۱۰۵۹ء میں پوپ نے ان علاقوں کی تقسیم کی جن کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا، مثلاً رابرٹ گسکارٹ کو اپولیا، کلابریا اور سکلی کا علاقہ بخشا۔

جگ مسند نشینی: پوپ کے انتخاب کی توثیق کا حق شہنشاہ کو قدیم رومن دور سے حاصل تھا۔ مغربی شہنشاہیت کے قیام کے بعد اس حق کو اوتو کے سوا اور کوئی شہنشاہ استعمال نہ کر سکا تھا۔ ہنری کے دور میں چرچ کی ساکھ بحال ہو چکی تھی لیکن پوپ کا انتخاب سیاسی دباؤ سے آزاد نہیں ہو سکا تھا۔ شہنشاہ چاہتا تھا کہ اسے پوپ کے تقرر اور برطرفی کے اختیارات حاصل ہوں تاکہ پوپ کو اس کے خلاف کارروائی کی جرأت نہ ہو سکے۔ جبکہ پوپ کے نزدیک شہنشاہ کو اس عہدے پر تقرر کرنے یا تقرر کی توثیق کرنے کا کوئی حق نہ تھا، بلکہ پوپ کو یہ حق حاصل تھا کہ شہنشاہ کا تقرر کرے اور اسکی برطرفی عمل میں لائے۔

اس اصول کو منوانے کے لیے شہنشاہ اور پوپ کے درمیان ایک طویل جنگ ہوئی، جسے جگ مسند نشینی کہا جاتا ہے۔ پوپ نے ۱۰۵۹ء میں رچرڈ اور رابرٹ کو جو بیرونی علاقے بخشے تھے، اسکا مقصد یہ تھا کہ بوقت ضرورت ان علاقوں سے فرانس کے شہنشاہ ہنری کے خلاف مدد میسر آ سکے۔

ہنری نے چرچ کونسل سے پوپ کو برطرف کر دیا۔ یکے بعد دیگر کئی پوپ منتخب کروائے۔ جب اس نے نکولاس ثانی کو پوپ منتخب کر دیا تو اس پوپ کا ضمیر اس جانبدارانہ انتخاب سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے روم میں شاہی دباؤ سے آزاد از سر نو انتخاب کروایا۔ اس عمل کے باعث اسے زبردست اخلاقی تائید حاصل ہوئی۔ اس نے چرچ کی نئی پالیسی مرتب کی، اور چرچ کو ہر قسم کے سیاسی دباؤ سے آزاد کروانے کا فیصلہ کیا۔ پوپ کے انتخاب کا حق خفیہ رائے شماری کے ذریعے صرف کالج آف کارڈینلز (College of Cardinals) کے لیے مختص ہوا۔ آئین کلیسا میں بھی ضروری دفعات کا اضافہ کیا گیا۔

ان اقدامات نے شہنشاہ کے لیے گنجائش نہ چھوڑی کہ وہ پوپ کے انتخاب پر اثر انداز ہو سکے۔ چنانچہ نکولاس کے بعد جو انتخابات ہوئے وہ سیاسی دباؤ سے آزاد تھے۔ نکولاس کے بعد الیگزینڈر اور اس کے بعد گرےگوری ہفتم نے بحیثیت پوپ تخت پیٹر کو زینت بخشی تو گرےگوری اور شہنشاہ ہنری کے درمیان گویا اعلان جنگ ہو گیا۔ گرےگوری نے تخت کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا جو یا تو جنگ پر منتج ہوا یا پھر شہنشاہ کو پوپ کی بالادستی تسلیم کرنے پر مجبور کرے۔

شہنشاہ سے پوپ کے تقرر کا اختیار چھین چکا تھا، لیکن بشف کے تقرر کا اختیار اسی کے ہاتھ میں تھا۔ گریگوری بشف کے تقرر کا اختیار بھی شہنشاہ سے واپس لینا چاہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں بشف کی وفاداریاں شہنشاہ سے پوپ کی طرف منتقل ہو جاتیں۔ ہنری اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ گریگوری کو بھی اس حق کی منتقلی کے اثرات و نتائج کا پورا علم تھا، لیکن اسے شہنشاہ کی قوت و ضعف سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے صرف چرچ کا مفاد عزیز تھا۔ وہ ایک طاقتور بین الاقوامی پایائیت کے قیام کا خواہاں تھا۔ [cf. Michel Hill; The Sociology of Religion, p.55] اس کی اسی پالیسی کی بدولت اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے پوپ کی عظمت کی خاطر ریاست کو قربان کر ڈالا۔

گریگوری نے کلیسا کے کارکن حکومت سے واپس لے لیے، جس کے نتیجے میں شہنشاہ کی انتظامیہ مفلوج ہونے لگی۔ ہنری کھل کر پوپ کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ خود اس کے امراء اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے۔ اس کے لیے صرف یہی چارہ کار رہ گیا تھا کہ چرچ کے اندر پوپ کے مخالفین سے کام لے۔ چنانچہ ملکی معاملات استوار کرنے کے بعد اس نے ایسے بشپوں کو وارم (Worm) میں جمع کیا، جو شہنشاہ کا دم بھرتے تھے اور پوپ سے مطمئن نہیں تھے۔ ۲۴ جنوری ۱۷۷۶ء کو اس نے انہیں یہ اعلان کرنے پر اکسایا کہ گریگوری پوپ کے منصب کا اہل نہیں تھا۔

شہنشاہ پوپ کے قدموں میں: بیس سال پہلے اسی طرح ایک پوپ برطرف کیا جا چکا تھا، مگر اب حالات شہنشاہ کے موافق نہیں تھے۔ پوپ شہنشاہ کو چرچ کا مقتدر اعلیٰ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے جوابی کارروائی کے طور پر شہنشاہ کو مذہب سے خارج (Ex-Communiante) کرنے کا فرمان جاری کیا، اور اعلان کیا کہ ہنری چونکہ اب کریمین نہیں رہ گیا تھا اس لیے وہ تمام افراد اور قوتیں جو ہنری سے وفاداری کی پابند تھیں، اب اپنے حلف اور ہنری کے اتباع سے آزاد تھیں۔

پوپ کے اعلان نے پورے ملک میں بے چینی پیدا کر دی، اور ایک عام بغاوت کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ ان حالات نے ہنری کو مجبور کر دیا کہ وہ ایک مجرم کی حیثیت سے خود کو پوپ کے سامنے پیش کر کے معافی طلب کرے۔ ۲۸ جنوری ۱۷۷۶ء کو ہنری نے عاجزی کے ساتھ پوپ سے معافی طلب کی۔ (cf. Warner Stark; The Sociology of Religion, pp. 58-59) پوپ نے شہنشاہ کو معاف کر دیا، لیکن یہ حق بھی تسلیم کر لیا کہ پوپ حسب ضرورت شہنشاہ اور دیگر حکمرانوں کے معاملات میں مداخلت کر سکتا ہے۔

بعض وجوہات کی بنا پر امراء سلطنت ہنری کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے ایک اور شخص 'رودولف' (Rodolph) کو تخت شاهی کے لیے پیش کر دیا۔ جب ہنری نے محسوس کیا کہ بے عزتی اور جہہ سائی کے باوجود سلطنت جاری ہے تو اس نے پوپ کے خلاف دوبارہ کارروائی کا فیصلہ کیا اور ایک چرچ کونسل (Synod) کے ذریعے پوپ کو بے دخل کر کے راوینا (Ravenna) کے آرج بشپ کو پوپ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

منتخب کرادیا۔ جواب میں پوپ نے دوسرے سخت فتوے کے ذریعے ہنری کو ایک بار پھر مذہب سے خارج (Ex-Communitate) کر دیا۔ ہنری نے اپنے حریف 'رودولف' کو شکست دے کر روم کا رخ کیا۔

شای افواج اس سے پہلے کبھی پوپ کو زیر کرنے میں ناکام نہیں ہوئی تھیں، مگر اس بار شارلین کا جانشین، جرمن افواج کے ساتھ، اپنے ماتھے پر ناکامی کا ٹیکہ لگانے کے لیے روم میں داخل ہوا تھا۔ گریگوری قلعہ بند ہو گیا جو ناقابلِ تسخیر ثابت ہوا۔ اسی درمیان ایک اور شخص نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ نیزسلی کی رومن افواج نے روم کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ ہنری بسرعت مراجعت پر مجبور ہوا۔ پوپ نے حالات کے پیش نظر روم کی سکونت ترک کر کے سسلی میں پناہ گزینی اختیار کی اور وہیں انتقال کیا۔ گریگوری جب تک زندہ رہا، عوام اسی کو پوپ تسلیم کرتے رہے۔ شہنشاہ کے مقرر کردہ پوپ کو محض ایک نام نہاد پوپ کی حیثیت حاصل رہی۔ اب دو پوپ تھے۔ ایک وہ پوپ تھا جسے کلیسا کے کارڈینل کالج نے چنا تھا، اور دوسرا وہ تھا جسے شہنشاہ کے خیر خواہ ہشپ نے منتخب کیا تھا۔ شای پوپ روم میں متمکن تھا جبکہ کلیسا آکینی پوپ خانہ بدوش تھا۔ گریگوری کے بعد پوپ ار بن دوم (Urban II) خانہ بدوش پوپ بنا جسکی ایک آواز پر پورا پوپ حروب صلیبی کے لیے ایشیا پر چڑھ دوڑا تھا۔

پوپ اگر ملک بدر ہوا تو شہنشاہ بھی چین سے نہ بیٹھ سکا۔ بغاوتوں، سرکشیوں اور خانہ جنگیوں نے اسے بھی خانہ خراب ہی رکھا۔ خود اسکے بیٹوں نے اسکے خلاف علم بغاوت بلند کیا، جن سے اسے لڑنا پڑا۔ آخری ایام میں اسے بھی ملک بدر ہو کر غرب الوطنی میں جان دینی پڑی۔

ہنری کے انتقال کے بعد بھی نام نہاد پوپ منتخب ہوتے رہے۔ لیکن حروب صلیبی کی ابتدائی کامیابیوں نے ۱۱۲۲ء میں یہ اصول تسلیم کر دیا کہ پوپ کو صرف کارڈینل کالج ہی منتخب کرے گا۔ شہنشاہ کو پوپ کے حق انتخاب سے دستبردار ہونا پڑا۔ یہی وہ تاریخ ہے جب مذہب اور سیاست ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

نئی کشمکش: پوپ اور شہنشاہ کی کشمکش بارہویں صدی میں پھر سے شروع ہوئی۔ تاج شای اب بھی پوپ کے اختیار میں تھا۔ کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ پوپ سے اسکا مطالبہ کرتا۔ ہاں اگر منتخب شہنشاہ پوپ کے معیار کا نہ ہوتا تو پوپ تاج شہنشاہی عطا کرنے سے انکار کر سکتا تھا۔ اس طرح اسکا انتخاب ہی کا عدم ہو جاتا تھا۔ پوپ کے حق تاج بخشی سے کسی کو انکار نہ تھا جبکہ شہنشاہ یہ چاہتا تھا کہ پوپ کے تقرر کا حق اسے ملنا چاہیے۔ ہنری کی ناکامی نے شہنشاہ کو اس حق سے محروم نہیں کیا تھا۔

جرمنی کے فریدرک بار برسہ نے اقتدار میں آنے کے بعد توسیع سلطنت کے لیے ہر شے کا بے دریغ استعمال کیا۔ اس کے سر میں قدیم رومن امپیرور، سیزر اور آگستس کا ہمسربنے کا سودا سایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے مخالفین کی قوت توڑی۔ امراء کے مقابلہ میں طبقہ اشرافیہ (Nobles) کو ابھارا۔ انہیں سیاسی آلہ کار بنایا۔ روم پر قبضہ کرنے کے لیے شمالی اطالیہ کی جنگجو قوم لومبارت کو شکست دی۔ سرمایہ دار طبقہ پوپ کی حمایت کے طفیل، شہنشاہ سے آزاد تھا۔ فریدرک نے اس طبقے کو بے دردی سے کچلا۔ ان کے شہر کے شہرتاہ کر ڈالے۔

روم پہنچ کر فریدرک نے بزرگ شمشیر پوپ سے تاج شاہی حاصل کیا۔ ۱۱۵۹ء میں شہنشاہ کی واپسی کے بعد اطالیہ میں بغاوت ہو گئی، جسے شہنشاہ نے بے دردی سے چل دیا۔

پوپ 'ادریئن' (Adrian) کے بعد کارڈینل کالج کسی ایک پوپ کے انتخاب پر متفق نہ ہو سکا۔ دو افراد 'الیکزنڈر سوم' اور 'وکتز سوم' پاپائیت کے دعویدار تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مردود قرار دیا۔ شہنشاہ نے مذہبی اجتماع (Synod) طلب کیا جس میں 'وکتز' پوپ منتخب ہوا۔ گویا شہنشاہ کو پوپ کے انتخاب کی توثیق کا حق مل گیا۔ لیکن انگلستان اور فرانس نے شہنشاہ کی اپیلوں کے باوجود، وکتز کو پوپ تسلیم نہیں کیا۔ وکتز کے بعد شہنشاہ نے پاسکل سوم کو پوپ بنوایا، اور اس طرح اپنی ہٹ کو طول دیتا رہا۔ پوپ الگزنڈر فرار ہو کر فرانس پہنچا۔ اس کے حامیوں نے ۱۱۷۴ء میں شہنشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اور آخری ۱۱۷۶ء میں ایک گھمسان کی جنگ کے بعد شہنشاہ کو عبرتناک شکست دی۔ اس طرح ایک بار پھر پاپائیت نے شہنشاہیت کو خاک میں ملا دیا۔ الیکزنڈر کو پوپ تسلیم کر لیا گیا، اور شہنشاہ فریدرک نے اس کے سامنے دوزانو ہو کر اس کی قدم بوسی کی۔ بے عزتی اور ناکامی کا داغ دھونے کے لیے اس نے تیسری صلیبی جنگ میں حصہ لیا اور ۱۱۹۵ء میں گھوڑے سے گر کر جان دی۔ اس کا رومن ایمپائر کی از سر نو تعمیر کا خواب شرمندہ تعبیر ہی رہ گیا۔

پوپ کا مکمل تسلط : آٹھویں صدی عیسوی سے بارہویں صدی عیسوی کے اختتام تک پوپ نے ہر شہنشاہ کو تاج پہنایا اور اسی نے ہر شہنشاہیت کو پارہ پارہ بھی کیا۔ تاہم پوپ کی اپنی ریاست اور "شہنشاہیت کلیسا" بلا شرکتِ غیر قائم رہی۔ تیرہویں صدی عیسوی سے پوپ مغرب کی مقتدر ترین شخصیت بن گیا۔ اب سارے بشپ پوپ کے وفادار تھے۔ کوئی نیا مذہبی سلسلہ (Order) پوپ کی اجازت کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام اہم معاملات کے فیصلے پوپ کی عدالت کرتی تھی۔ اس کے نمائندے پورے ملک میں نگرانی کرتے تھے کہ پوپ کے احکام کی مکمل تعمیل کی جا رہی ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی میں الہیات کو عقل و خرد کی بنیادوں پر استوار کیا گیا۔ جس کی روشنی میں مذہبی عقیدے میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ بندہ، خدا سے براہِ راست تعلق قائم کر سکتا تھا، لیکن اب عقیدہ یہ بنا کہ راست تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے پوپ کا رابطہ یا توسط ضروری ہے۔ لوگوں نے راست کوشش ختم کر دی۔ نجات حاصل کرنے کے لیے پوپ کا وسیلہ لازمی ہو گیا۔

(for theological development, see Warner Stark; The Sociology of Religion, pp.60-88)

اس تبدیلی نے پوپ کو روحوں کا آقا بنادیا۔ روح کی نجات کے لیے، ہر فرد کو خود کو اس کی خدمت میں پیش کرنا لازمی ہو گیا۔ یوں مغرب کا ہر فرد اور اس کی زندگی کا ہر شعبہ پوپ کے تابع ہو گیا۔ شادی بیاہ ہو یا موت و حیات، سیاسی جرائم ہوں کہ تجارتی بددیانتی، ہر مقدمہ پوپ کی عدالت میں پیش ہوتا تھا۔ اس طرح پورا معاشرہ

پوپ کے مکمل تسلط میں آ گیا۔ علم، فکر، تحریر و تقریر، تالیف و تصنیف، درس و تدریس، تحقیق و تدوین، فقہ اور فلسفہ، ہر شعبہ پوپ کی پالیسی پر گامزن ہوا۔

پوپ کی مخالفت کا نتیجہ: شہنشاہیت پر فتح کے بعد پوپ کے اقتدار کا کسی شعبے میں کوئی مد مقابل نہیں رہ گیا۔ اسے اگر کسی مقاومت کا سامنا کرنا پڑا تو صرف چرچ کی اندرونی کشمکش تھی۔ اس اندرونی کشمکش کو 'بدعت' کا نام دیا گیا۔ صدیوں تک رومن کیتھولک دنیا میں ایمان و عقائد میں کوئی اختلاف نہیں پیدا ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ مغرب کی فلسفے سے بیگانگی تھی۔ اس کے علم کی انتہا کلیسا تھی۔ لیکن جب مغربی معاشرے کا تعلق گرد و پیش کے معاشروں سے قائم ہوا، تو بیرونی اثرات نے تعلیم یافتہ طبقے میں بے چینی پیدا کی۔ نامعلوم ذرائع سے شمالی اطالیہ میں مالکیت کے اثرات پہنچنے لگے۔ وہاں سے فرانس اور اسکے بعد جرمنی پہنچے۔ ان اثرات کا اظہار آؤٹا فرانس کے علاقوں 'ٹولوس' اور 'البی' میں ہوا۔ اس مقام البی کی مناسبت سے ایک فرقہ البی جنیسس (Albigensis) ابھرا۔ ان لوگوں کو کتھارس (Cathars) بھی کہا گیا۔ جہاں یہ لوگ نیکی کی تلقین کرتے، وہیں چرچ کی مخالفت اور پوپ سے دشمنی کی ترغیب بھی دیتے۔ ان کا یہ جرم اس قدر شدید محصور ہوا کہ پوپ انوسنت سوم نے ان کے خلاف بھی 'جنگ صلیبی' (Crusade) کی اپیل کی۔

جبر و استبداد کے ذریعے اس فرقے کو نابود تو کر دیا گیا لیکن اس کے نظریات رہ رہ کر کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتے رہے۔ اس کے بعد جتنے فرقے بدعتی قرار دیے گئے، مثلاً 'اپوسٹولکس' (Apostolics)، 'برادرز آف دی فری اسپرٹ' (Brothers of the Free Spirit)، 'بگارد' (Begard)، وغیرہ، سب میں کتھاری تھو رات و نظریات حدت کے ساتھ موجود تھے۔ کلیسا کی نظر میں بدعتی کا وجود کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ آسمانی حکومت کے غدار تھے۔ روح کی آلودگی کے بعد جسم کا ختم کر دینا ضروری سمجھا گیا، اور جسم کو تباہ کرنے کی ذمہ داری حکومت کو سونپی گئی۔

روگردانی کی سزا: پوپ گریگوری نهم نے ۱۲۳۳ء میں چرچ کی پولیس فورس قائم کی۔ اس کی رسائی پورے عالم عیسائیت میں تھی اور اس کا اہم ترین فریضہ بدعتیوں کی تفتیش تھا۔ بدعتی صرف وہی نہیں تھا جو کج عقیدہ ہو بلکہ وہ بھی تھا جو پوپ کا ہم نوا نہ ہو۔

سلی کے نارمن بادشاہ فریدرک ثانی کو پوپ سے عقیدت نہیں تھی۔ اس کی بڑھتی ہوئی قوت پوپ کے لیے خطرہ بن گئی اور پوپ نے اسے خطرناک دشمن قرار دیا۔ فریدرک نے پوپ کی پرواہ کیے بغیر اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ اطالیہ پر قبضے اور آئینی حکمرانی کے لیے پوپ کا اعلان ضروری تھا، پس اس نے شہنشاہی کا تاج وصول کرنے کے لیے پوپ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کیا، لیکن پوپ سے گریزاں ہی رہا۔ پوپ ہنور لیس سوم نے تو تحمل سے کام لیا لیکن جب اسکی جگہ گریگوری نهم پوپ ہوا تو اس نے فریدرک سے حروب صلیبیہ میں حصہ لینے کا مطالبہ کیا۔ فریدرک جنگ میں حصہ لینے کے لیے روانہ ہوا مگر راستے ہی سے لوٹ آیا۔ پوپ نے اس پر بے دینی کا الزام لگا کر اسے عیسائیت سے خارج کر دیا۔ فریدرک نے حالات درست کرنے کے لیے ارض مقدس

(فلسطین) کا رخ کیا اور سلطان ملک الکامل سے معاہدہ کر کے ہلاکت و خون ۱۲۲۶ء میں یروشلم میں داخل ہوا۔ لیکن پوپ کے طرزِ عمل میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔ پوپ کا فتویٰ ہراس قریہ اور ہراس شہر میں مشتہر کیا گیا جہاں جہاں فریدرک پہنچا۔

فریدرک کی عبادتوں کو مقاماتِ مقدسہ کی بے حرمتی کا سبب ٹھہرایا گیا۔ یروشلم میں فریدرک کو ایک بھی پادری میسر نہیں آیا جو اس کے سر پر یروشلم کی حکومت کا تاج رکھتا۔ اس کے عتاب میں پوپ نے لومباردوں سے سسلی پر حملہ کروایا۔ [cf. Fuller J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, pp.288-290]۔ فریدرک بسرعت لوٹا تاکہ پوپ کے اقدام کا مقابلہ کر سکے۔ آخر ۲۸ اگست ۱۲۳۰ء کو معاہدہ صلح ترتیب پایا اور شہنشاہ کو پوپ کے آگے جھکنا پڑا، تب کہیں جا کر اسکی شہنشاہیت کی توثیق ہوئی۔ اس کے بعد فریدرک نے حملہ آور لومباردوں کی خبر لی۔ آہستہ آہستہ اس نے اطالیہ کو سرنگوں کر لیا۔ یہاں تک کہ سلطنتِ کلیسا بھی زرخے میں آ گئی۔ اس مرحلے پر پوپ نے ایک بار پھر فریدرک کو بے دین قرار دیکر اسے عیسائیت سے خارج کر دیا، لیکن موت نے پوپ کو مہلتِ انتقام نہیں دی۔

نئے پوپ انوسنت چہارم نے شہنشاہ کے مقدمے کو چرچ کونسل کے سامنے پیش کیا، جس نے نہ صرف فریدرک، بلکہ اس کے حالی موائی سب ہی کو، بے دینی کے الزام میں عیسائیت سے خارج کر دیا۔ فریدرک نے بہت ہاتھ پیر مارے، دیگر شہنشاہوں کی طرح چرچ کونسل (Cynod) کے ذریعے پوپ کو معزول کرنے کی بھی کوشش کی مگر پوپ کو شکست دینا اسکے بھی مقدّر میں نہیں تھا۔ خود پوپ نے اطالوی قوتیں مجتمع کر کے ۱۳ دسمبر ۱۲۵۰ء کو فریدرک کو عبرتناک شکست دی، جسکے کچھ ہی عرصے کے بعد فریدرک راہی ملکِ عدم ہوا۔ پوپ نے اسکی سلطنت فرانس کو بخش دی۔ (cf. Henry Pirenne; A History of Europe, pp.310-319)۔

اقلیت کا عدم وجود: پوپ اپنے روحانی خطے میں کسی غیر عیسائی اقلیت کو بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ ساحل بالٹک پر ایک بت پرست قوم پرشین (Prussian) بہتی تھی۔ یہاں چرچ کی تبلیغی کوششیں ناکام ہوئیں تو انہیں دشمن کرائسٹ اور دشمن دین قرار دے دیا گیا، حالانکہ وہ غریب ان دونوں الفاظ سے بھی ناواقف تھے۔ بس پھر کیا تھا، ۱۲۲۶ء میں ہنگری اور جرمنی کے توتونک نائٹ (Teutonic Knights) (مذہبی جنگجو طبقہ جسے چرچ نے مقدس جنگوں کے لیے قائم کیا تھا)، اپنے بھاری اسلحہ کے ساتھ پریشیا پر ٹوٹ پڑے۔ پریشیا والے لٹھنیوں کی ڈھالوں اور کمانوں کے ساتھ ان کا کیسے مقابلہ کرتے۔ دیکھتے دیکھتے پوری قوم صفحہ ہستی سے مٹادی گئی، اور ان کی سرزمین پر کلیسانی فاتحین کی سلطنتیں قائم ہو گئیں، جو ہنسا (Hansa) اسٹیشن کہلائیں، جن کی آئینی حیثیت کی توثیق پوپ نے کی۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۳۲۹)

بیرونی حملے کے خطرے کے پیش نظر مفتوحہ علاقوں کو ہر ایسے عنصر سے پاک کر دیا جاتا تھا جس کے بارے میں یہ امکان ہو سکتا تھا کہ دشمن کو اس سے کوئی فائدہ ہو سکتا ہے۔ دشمن سلطنت کا نام و نشان مٹا دینا، اس کے تمام اداروں کو برباد کر ڈالنا، اسکی زبان اور مذہب کو ختم کر کے اپنی زبان اور مذہب کو رائج کر دینا، یہ طرزِ عمل مغرب

کا وطیرہ رہا ہے۔ (حوالہ بالا، صفحہ-۳۳۱)، اور پوپ نے اس سے کوئی اعراض تک نہیں کیا۔ یہ عمل یونان نے کریت کے ساتھ کیا، روم نے قرقاطجنہ کے ساتھ کیا، رومیوں نے یروشلم کے یہودیوں کے ساتھ کیا، صلیبیوں نے بیت المقدس کے مسلمانوں کے ساتھ کیا، پوپ نے کھارسوں کے ساتھ کیا، جرمنوں نے پولینڈ، ہالنگ اور روس کے صوبوں کے ساتھ کیا، اور ہسپانیہ میں مسلمانوں کے ساتھ روارکھا گیا۔ بیرون یورپ، امریکہ، افریقہ اور آسٹریلیا میں یہ عمل جاری و ساری ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس عمل پر پوپ نے بھی ہمیشہ میر توشیح ثبت کی ہے۔

پوپ کی سیاست سے پسائی : فریدرک کی موت کے بعد پوپ اور شہنشاہ کی کشمکش کا باب ختم ہو گیا۔

تیرہویں صدی عیسوی میں مغرب عہد وسطیٰ کی آخری منازل میں تھا، اور کچھ ہی عرصے کے بعد نشاۃ ثانیہ کے دور میں داخل ہونے والا تھا۔ انگلستان میں 'میکنہ کارنا' نے پارلیمنٹ قائم کر دی تھی۔ فرانس میں پارلیمان تو نہ تھی، تاہم بادشاہ نے عوامی مفاد و حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر رکھی تھی۔ قومی سلطنتیں قائم ہونے لگی تھیں۔ اسی دور میں انگلستان اور فرانس میں جنگ چھڑی۔ اخراجات پورے کرنے کے لیے ہر ممکن ذریعہ آمدنی پر دباؤ بڑھا، یہاں تک کہ دونوں ممالک نے چارلس مارٹل کے نقش قدم پر چلتے ہوئے، اپنے اپنے علاقائی چرچوں کی جائدادوں پر ٹیکس عائد کیے۔ پوپ بونی فیس نے فوراً اس اقدام کے خلاف حکم امتناعی جاری کیا جو (The Bull Clericis Lolcos) بحریہ ۲۵ فروری ۱۲۹۶ء کہلاتا ہے۔ اس میں سختی کے ساتھ یہ ممانعت کی گئی تھی کہ کسی حکمران کو یہ حق نہیں پہنچتا ہے کہ وہ پوپ کی منظوری کے بغیر کلیسا کی مملوکہ جائدادوں سے کوئی ٹیکس وصول کرے، اور ایسے تمام احکامات کو کالعدم قرار دیا، جن کے تحت یہ ٹیکس وصول کیے جا رہے تھے، نیز یہ دھمکی بھی دی کہ ایسے افعال کے مرتکب شخص یا اشخاص کو عیسائیت سے نکال باہر کیا جائے گا۔

اس صدی سے قبل پوپ کا ہر حکم قابلِ تعظیم تھا مگر اب پوپ کا حکم قومی مفاد کی میزان میں تولنا جانے لگا۔ دونوں قوموں کو اپنی اپنی سلامتی کا مسئلہ درپیش تھا۔ دونوں ممالک نے پوپ کے حکم کو عوام کے سامنے ان کے فیصلے کے لیے پیش کر دیا۔ اب اگر وہ پوپ کے فیصلے کی تائید کرتے تو اپنے اپنے ملک و قوم کو نقصان پہنچاتے۔ دونوں ممالک کے عوام نے پوپ کے اس فیصلے کو اپنے حق میں نا انصافی تصور کیا۔

انگلش پارلیمنٹ نے اس پاپائی بل کی سختی سے مخالفت کی اور 'اڈورڈ' نے اسے ناقابلِ توجیہ قرار دیا۔ اس کشمکش کے دوران فرانسیسی قوم نے بھی پوری طرح اپنے شاہ کا ساتھ دیا۔

(cf. Toynbee A.J.; Change and Habit, p.132)

فرانس کے فلپ نے جوابی کارروائی کے طور پر خود پوپ کے مالیہ کو متاثر کرنے کی دھمکی دی۔ اس نے تمام سامان اور ہنڈیاں جو فرانس سے اطالیہ جایا کرتی تھیں، ممنوع قرار دے دیں۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ پوپ مختلف معاملات، مثلاً سسلی میں فوجی مداخلت اور 'کولونا' کی بغاوت میں الجھا ہوا تھا اور اخراجات کے لیے رقم کی شدید ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ خود اس کے علاقے میں بغاوت کا خطرہ تھا۔ فرانس اور انگلستان جیسی قوتوں کو چرچ کے دائرہ کار سے خارج بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان حالات میں فرانس کی مستقل آمدنی سے محرومی نے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

پوپ کو ان دونوں کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنے بل کو واپس تو نہیں لیا لیکن ایسی ترمیم کر دی کہ اس حکم نامے کی عملی حیثیت ختم ہو گئی۔

یہ معاملہ ابھی دبا بھی نہ تھا کہ ایک نیا مرحلہ پیش آ گیا۔ پوپ بونی فیس ہشتم (Boniface VIII) نے ایک اور جنگِ صلیبی کے لیے مغرب کو متحد کرنا چاہا۔ اس مقصد کے لیے اس نے فرانس اور انگلستان میں صلح کے لیے اپنی ثالثی پیش کی۔ ساتھ ہی ایک بل اور جاری کیا جس میں امن قائم کرنے کا حکم بھی موجود تھا۔

دونوں ممالک نے اس بل کو شاہی اختیارات میں پوپ کی مداخلت بے جا قرار دیا۔ فلپس نے چرچ کے باغیوں کی کھلم کھلا مدد کی۔ باغیوں نے پوپ کو گرفتار کر لیا، لیکن عوامی ردِ عمل کے پیش نظر اسے رہا کرنا پڑا۔ ان ناکامیوں کے صدمے کو پوپ بونی فیس ہشتم برداشت نہ کر سکا اور ۱۳۰۳ء میں چل بسا۔

چودھویں صدی عیسوی میں پاپائیت اندرونی خلفشار کا شکار رہی۔ بیک وقت کئی کئی پوپ منتخب ہوتے۔ عوام ایک کو چختے، کارڈینلز کسی دوسرے کو، اور مذہبی کنسل کسی تیسرے کو چنتی۔ ان میں باہم کشمکش رہتی۔ پاپائیت اخلاقی گراؤ کا شکار بھی ہونے لگی۔ [cf. Henry Pirenne, A Study of Europe, pp. 550-552]۔ جس کے باعث مذہبی اصلاحات کی تحریکوں نے جنم لیا۔ 'وے کلف' کی تحریک، پھر 'جان ہس' کی تحریک ابھی، جس کے سبب جرمن چرچ کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ پھر شدید ترین تحریک لوتھر کی تھی جو کامیاب ہوئی، اور اسکی کامیابی نے پاپا کے خطہ اقتدار کو دو حصوں میں تقسیم کر ڈالا۔ پندرہویں صدی عیسوی کے وسط سے سولہویں صدی عیسوی کے وسط تک نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کا دور ہے۔ نشاۃ ثانیہ نے پوپ اور کلیسا دونوں کو سیاست اور دیگر تمام سماجی شعبوں سے خارج کر کے انہیں مذہب تک محدود کر دیا۔

دوہرے نظامِ اقتدار نے بعض نہایت دور رس اثرات مرتب کیے۔ مغربی معاشرے پر آٹھویں صدی عیسوی سے سولہویں صدی عیسوی تک پاپائیت مسلط رہی۔ اس تمام عرصے میں اگر شہنشاہ پوپ سے متحارب ہوا تو اس کا مقصد صرف سیاسی اقتدار و اختیار کا حصول تھا۔ [cf. Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. X, p.131]۔ دیگر تمام شعبہ ہائے حیات، خصوصاً اندازِ فکر و نظر، ہمیشہ پاپائیت کے رہن منت رہے۔ اس کی تعمیر و ارتقاء میں کسی اور قوت کا ذرا بھی دخل نہیں رہا۔ اسلام کے بارے میں پاپائیت نے جو نیچ روزِ اول اختیار کی، صدیوں کے پروپیگنڈے نے اسے مغرب کا ایمان بنا ڈالا۔ مغرب کا ذہن سلاسلِ بعد سلاسل اس قدر مملکت رہا کہ وہ آج بھی عہدِ وسطیٰ کی روایات سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔

باب دوم

ریاستِ اسلامیہ کی توسیع اور عہدِ وسطیٰ کا مغرب

- ۱۔ اسلام کا عالمِ عیسائیت میں نفوذ اور علاقائی نقصانات
- ۲۔ مغرب پر مسلم فتوحات کے دور رس اثرات
- ۳۔ نفوذِ اسلام کے معاشی نتائج اور معاشرتی اثرات
- ۴۔ اسلام کے ثقافتی اثرات

اسلام کا عالمِ عیسائیت میں نفوذ اور علاقائی نقصانات

ساتویں صدی عیسوی کی دنیا (ہند و چین سے قطع نظر) دو عظیم طاقتوں پر مشتمل تھی۔ بازنطین (رومن ایمپائر) اور پرشیا (ایران) جس میں موجودہ ایران، عراق، افغانستان اور بلوچستان شامل تھے۔

(cf. Sir John Glubb; The Lost Centuries, p.21: for details see

Phillips K. Hitti; History of Arabs: and Nicholson R.; History of Arabs)

یہ دونوں طاقتیں مکمل تہذیبیں تھیں، جن کی اپنی ثقافت، اپنی تاریخ، اپنی زبان اور اپنی قدیم شہنشاہیت تھی۔ خلیفہٴ اول حضرت ابوبکرؓ کے عہد حکومت (۶۳۲ء تا ۶۳۴ء) میں مسلمانوں نے بیرونِ عرب اقدام شروع کیا تو یہی دونوں طاقتیں مدِّ مقابل ہوئیں۔ مسلمان ان دونوں سے بیک وقت نبرد آزما ہوئے اور جزیرہ نماے عرب کے شمال میں دو متوازی محاذ کھل گئے۔ مسلمانوں نے مشرقی محاذ پر ایرانیوں کو پے در پے شکستیں دیں اور حضرت عثمانؓ کے دورِ خلافت (۶۳۴ء تا ۶۵۶ء) میں ہی صرف چوبیس [۲۴] سال کے اندر اندر پوری سلطنتِ ایران کو مملکتِ اسلامیہ کا جزو بنالیا گیا۔

سلطنتِ روم کے صوبوں کی فتح: مغربی محاذ پر رومن ایمپائر (بازنطین) یا عیسائی دنیا مسلمانوں کے مدِّ مقابل تھی۔ ۶۳۲ء میں شام پر مسلمانوں کے حملوں کی ابتداء ہوئی۔ ۶۳۵ء میں شام کا صوبائی مستقر دمشق فتح ہوا۔ ۶۳۶ء میں رومن شہنشاہ ہرقل (Heraclius) نے بذاتِ خود اپنی باقاعدہ افواج کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف وسیع پیمانے پر اقدام کیا۔ یرموک کے مقام پر خونریز معرکہ ہوا۔ حضرت خالد بن ولید نے رومیوں کو فیصلہ کن شکست دی۔ سات سال کے مختصر عرصے میں پورا شام اور فلسطین رومیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ (حوالہ بالا، نکلسن)

مصر کی فتح: شام کے بعد عرب فاتحین نے مصر کی طرف رخ کیا۔ ۶۴۱ء میں حضرت عمروؓ ابن العاص نے مصر کے گورنر سائرس (Cyrus) کو بالونیہ (Babylon) یا موجودہ قاہرہ کے گرد و نواح میں شکست فاش دی اور اس کے ساتھ ہی مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پر قبضہ کر لیا۔ ان دونوں شہروں کے سقوط کے ساتھ ہی رومن ایمپائر صوبہ مصر سے بھی محروم ہو گئی۔

شام کے سقوط نے اگر روم کی سیاسی عظمت کو نقصان پہنچایا تھا تو مصر سے محرومی سے اسے سخت معاشی دھچکا لگا، کیونکہ اس دور میں بازنطین کے غلے کی درآمد کا انحصار مصر پر تھا۔

-(Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.25)

افریقہ کی فتح : فتوحات کا سلسلہ حضرت عثمانؓ کے آخری ایام میں عارضی طور پر رک گیا۔ انکی شہادت کے بعد خود عالم اسلام خانہ جنگیوں میں الجھ کر رہ گیا۔ لیکن جب اموی دور شروع ہوا تو فتوحات کا سلسلہ ایک بار پھر چل پڑا۔ حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں (۶۶۱ء تا ۶۸۰ء) نامور سپہ سالار عقبہ بن نافع نے شمالی افریقہ کی بربر ریاستوں کو فتح کر کے اسلامی مملکت میں شامل کر لیا، جس کے نتیجے میں رومن ایمپائر اپنی تمام افریقی نوآبادیوں سے محروم ہو گئی۔

ایک طرف رومن ایمپائر کے مقبوضہ جات یکے بعد دیگرے ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے، تو دوسری طرف اموی افواج رومن ایمپائر کے پایہ تخت قسطنطنیہ کے دروازوں پر دو بار دستک دے آئی تھیں۔ [قسطنطنیہ پر پہلی بار فوج کشی، ۵۰ھ میں یزید بن معاویہؓ کی سربراہی میں کی گئی۔ اس لشکر کے شرکاء کے لیے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مغفرت کی بشارت کی وجہ سے نامور انصاری صحابی، میزبان رسول اللہ ﷺ حضرت ابوالؤبؓ نے بطور خاص، اس مہم میں شرکت کی تھی۔ اسی مہم میں انکا انتقال ہو گیا۔ انہوں نے وصیت فرمائی کہ مجھے دشمن کے علاقے میں جتنی دور تک لے جا کر دفن کر سکو دفن کرنا، چنانچہ انہیں شہر قسطنطنیہ کی شہر پناہ کی دیوار کے ساتھ دفن کیا گیا۔ یزید نے رومیوں کو یہ پیغام بھجوایا کہ یہ ہمارے انتہائی محترم بزرگ کی قبر ہے، جو ہمارے نبی ﷺ کے ساتھی تھے، اگر اس قبر کی بے حرمتی کی گئی، تو پورے عالم اسلام میں کوئی گرجا سلامت نہیں رہنے دیا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ اسلامی لشکر کی واپسی کے بعد رومیوں نے اس قبر پر مستقل فوجی پہرا جمع کر دیا تھا، مبادا کسی نا سمجھ کی شرارت کی وجہ سے یزید کو اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانا نہ پڑ جائے۔ حضرت ابوالؤبؓ انصاری کا مزار مبارک آج بھی استنبول (قسطنطنیہ) میں مرجع خاص و عام ہے۔ ان کے علاوہ اس لشکر میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ بن خطاب اور حضرت حسینؓ بن علیؓ، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے بزرگوں نے بھی شرکت فرمائی تھی۔

قسطنطنیہ پر دوسری بار فوج کشی، ۹۵ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور حکومت میں کی گئی۔ اس لشکر کے سپہ سالار خلیفہ کے بھائی مسلم بن عبدالملک تھے۔ یہ لشکر تقریباً ایک سال تک شہر کا محاصرہ کرنے کے بعد لوٹ آیا، جس کے لیے مغربی موزخین بازنطینی شہنشاہ 'لیوسوم' کی تعریفوں کے پل باندھتے نہیں تھتے۔]

اسپین کی فتح : فتوحات کا جو سلسلہ حضرت معاویہؓ نے شروع کیا تھا، وہ انکے جانشینوں عبدالملک بن مروانؓ اور ولید بن عبدالملک کے دور حکومت (۵۰ء تا ۷۵ء) میں اپنی انتہائی عظمتوں تک پہنچا۔ ولید کے نامور گورنر موسیٰ بن ثنیر نے افریقہ سے ایک مختصر فوج طارق بن زیاد کی سرکردگی میں اسپین کی طرف روانہ کی۔

طارق ۷۱۱ء میں اسپین کی سرزمین پر اترے۔ ایک گھمسان کی جنگ میں انہوں نے اسپین کے شاہ رادرک (Roderic) کی فوج کو فیصلہ کن شکست دی۔ اس شکست نے اسپین میں ویزی گتھ سلطنت کا کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

چراغ بجھا دیا۔ جلد ہی موسیٰ بن نصیر خود بھی اسپین پہنچ گئے اور صرف دو سال کے عرصے میں اندلس مسلمانوں کے قبضے میں تھا۔ ولید بن عبد الملک نے موسیٰ بن نصیر کو مزید پیش قدمی کی اجازت نہیں دی، جس کے سبب ۱۵۳ء میں یورپ میں پیش قدمی کا سیلاب رک گیا۔

فرانس میں پیش قدمی : ولید بن عبد الملک نے ۱۵۱ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد مسلمانوں نے ۱۵۱ء-۱۵۲ء میں کوہ پائیرینیز (Pyrenees) عبور کر کے فرانس میں پیش قدمی کی۔ انہوں نے ناغوں (Narbonne) پر قبضہ کرنے کے بعد باندو (Bardeaux) کو فتح کیا۔

۱۵۳ء میں اسپین کے سرحدی گورنر عثمان بن ابی نذرہ نے فرینک حکمران اودو (Eudo) کے ساتھ معاہدہ کر کے علم بغاوت بلند کیا تو اسپین کے اموی حاکم امیر عبد الرحمن الغافقی نے اس باغی کی سرکوبی کی۔ اس کے بعد وہ، اس کے حلیف اودو کی خبر لینے کے لیے اکیٹانیہ میں داخل ہوئے اور اودو کا تعاقب کرتے ہوئے ۱۵۳ء میں طورس (Tours) (موجودہ پیرس کے نواح) تک اقدام کیا۔

اودو اور فرینک حکمران چارلس میں ناچاقی چلی آ رہی تھی۔ پسپائی نے اودو کو چارلس مارٹل سے صلح پر مجبور کیا۔ (چارلس اس زمانے میں میر وئجن بادشاہ کا درباری تھا۔ اسی چارلس کا پوتا شارلمین تھا جو پوپ کی عیسائی سلطنت کا اولین شہنشاہ بنا۔) عبد الرحمن الغافقی کے مقابلے پر چارلس اپنی پیدل فوج لیکر آیا۔ کئی دنوں تک معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخر امیر عبد الرحمن نے بھرپور حملہ کیا، جس میں ان کو کاری زخم آئے اور وہ جاں بر نہیں ہو سکے۔ اس سانحے کے باعث مسلم افواج اسی شب میدانِ جنگ سے واپس ہو گئیں۔

دوسرے دن چارلس مارٹل نے میدانِ جنگ میں اپنی افواج کی صف بندی کی لیکن جب مسلم افواج مد مقابل نہیں آئیں تب اسے یہ پتہ چلا کہ مسلم افواج بلا جگہ فیصل کیے لوٹ گئی ہیں۔

(cf. Gibbon, E.; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol. IV, pp.14-15)

یہ تھی وہ جگہ عظیم جسے مغرب کا ہر مورخ مغرب کی عسکری تاریخ کا نہایت اہم باب قرار دیتا ہے۔

جگہ طورس کے بارے میں فلر نے لکھا،

”جنگ کے بارے میں تفصیلات کا ہمیں بہت ہی کم علم ہے۔ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ جنگ کس مقام پر لڑی گئی۔ تاہم معلومہ تاریخ اکتوبر ۱۵۳ء ہے۔ طورس کے قریب فوجیں ایک دوسرے کے مد مقابل ہو گئیں۔“

(Fuller, J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World, pp. 236-238)

فلپس کے ہمتی نے تحریر کیا،

”..... کئی دنوں تک جھڑپیں جاری رہیں..... آخر عرب جنرل نے یورش کی اور کاری زخم کھایا۔ رات کے ستانے میں اس کے آدمیوں نے اپنے خیمے تہ کیے اور چوری چھپے لوٹ گئے۔ یہ تھی وہ فتح جسے مغربی مورخ، عسکری تاریخ کی فیصلہ کن جنگ قرار دیتا ہے۔“ (Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.65)

حقیقت تو صرف اتنی ہے کہ رومن ایمپائر اس وقت تک کسی جنگ میں مسلمانوں کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔ اس غیر متوقع مراجعت کو مغرب نے متعدد مفروضات کی بنیاد پر اپنی فتح بنا ڈالا۔ وہ مفروضات ان اندیشوں پر مبنی ہیں [اور یقیناً بجا ہیں، کہ اگر امیر اس معرکے میں جاں بحق نہ ہو جاتے تو اغلباً] کہ اگر چارلس مسلمانوں کے قدم نہ روکتا تو کلیسا ختم تھا، مغربی تہذیب دم توڑ دیتی، ہیٹ کی جگہ فیئر کا چلن ہوتا، بائبل کی جگہ آکسفورڈ میں قرآن کا درس ہوتا۔ یہ وہ مفروضات ہیں جو طورس کی جنگ کی اہمیت بڑھانے کے لیے گھننے بیان کیے، ورنہ طورس کا واقعہ ایک مقامی جھڑپ سے زیادہ کچھ نہیں۔

۳۲ء میں وصال نبوی ﷺ کی صدی پوری ہوئی۔ اس ایک صدی میں مسلمانوں نے ایک ایسی عظیم مملکت قائم کر دی تھی جو اسپین سے چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی عظیم مملکت سے تاریخ کے اوراق اس وقت تک ناواقف تھے۔

بحری فتوحات: حضرت عثمانؓ کے عہد حکومت میں حضرت امیر معاویہؓ نے اسلامی بحری قوت کا سنگ بنیاد رکھا۔ متعدد دارالضلع قائم کیے، اور حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بحری قوت کو اس قابل بنادیا کہ ۶۵۲ء میں جب رومی بحری بیڑے نے اسکندریہ پر حملہ کیا تو اسے ناکام بنادیا۔ صرف دو سال کے عرصے میں یہ بیڑہ اتنا طاقتور ہو گیا کہ ۶۵۴ء میں بصر بن ابی ارطاة کی سرکردگی میں اس نے عظیم رومی جنگی بحری بیڑے سے بحر روم میں ٹکری۔ یہ بحری جنگ فینکس یا فنیقہ (Phoenix/Finike) کے ساحل لیقیہ (Liclan Coast) پر لڑی گئی۔ عرب تاریخوں میں اس جنگ کو ذوالسوار یا ذات السواری کہا جاتا ہے۔

شہنشاہ کانستانتین (ہیر ہرقل) بذات خود رومی بیڑے کی کمان کر رہا تھا۔ عرب بحری بیڑے نے رومی بحری بیڑے کے پانچ سو جہاز تباہ کر ڈالے اور شہنشاہ بمشکل اپنی جان بچا کر بھاگا۔ یہ بحری معرکہ جنگ یرموک ثانی ثابت ہوا۔ بازنطینی بحری قوت پاش پاش ہو گئی۔

(Phillips K. Hitti; History of Arabs, pp.167-194)

بحر روم پر رومیوں کا مکمل اقتدار طاجنہ کی تباہی (۶۳۶ ق م) کے بعد قائم ہوا تھا۔ ۶۵۴ء میں آٹھ سو سال کے بعد پہلی بار اس تسلط کو ختم کر دیا گیا۔

(Earnest Barker; The Legacy of Islam, article 'The Crusades', p.44)

جزائر بحر روم: فینکس کی شکست نے رومن دنیا کو بحر روم سے بھی محروم کر دیا۔ بحر روم کے تمام چھوٹے بڑے جزائر یکے بعد دیگرے مسلمانوں کے قبضے میں آ گئے۔ جزیرہ قبرص حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں فتح کیا گیا۔

عباسی عہد میں کریت پر ۸۲۷ء تا ۹۶۱ء ایک عرب امارت قائم رہی۔ [Gabrieli Francesco; 1960, 1]

[The Legacy of Islam, article 'Islam in the Mediterranean World' p.72]

سسلی پر بنو اغلب نے ۸۲۷ء سے حملے شروع کیے اور ۸۸۷ء تک پورے جزیرے کو قبضے میں لے لیا۔

(حوالہ بالا صفحہ ۷۴-۷۵)۔ اس جزیرے کو مستقر بنا کر مسلم افواج نے اطالیہ پر تاخت و تاراج کی۔ گیارہویں صدی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

میں جنوبی اطالیہ کے علاقے اپولیا میں دو مسلم امارتیں مختصر عرصے کے لیے قائم ہوئیں۔ (حوالہ بالا)۔ عرب حملوں کی زد میں نہ صرف جنوبی اطالیہ اور نیپلز تھے، بلکہ خود روم بھی ۸۴۶ء میں انکے زلغے میں آیا۔ بحر روم کے جزائر ساردینیا اور کارسیکا پر بھی اسی دور میں قبضہ کیا گیا۔

موجودہ تحقیقات سے یہ بات بھی پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ خود یونان میں بھی مسلمان کافی عرصے تک مقیم رہ چکے ہیں۔ مائلز کی صبر آزما تحقیقات کے مطابق یونان کے مختلف شہروں مثلاً اٹیکا (Attica)، کورنٹھ (Corinth)، اور ایتھنز (Athens) میں عربوں کے مستقل قیام کے آثار ملتے ہیں۔ ایک مسجد کے آثار قسطنطنیہ کے قریب ساحل باسفورس پر بھی پائے گئے ہیں۔ [Miles G. C.; The Circulation of]

[Islamic Coinage from 8th to 12th Century in Greece, Vol II, pp.485-498]

اس طرح دسویں صدی عیسوی تک عیسائی دنیا کا نصف رقبہ مسلم فاتحین کے قبضے میں جا چکا تھا۔ Sir John Glubb; The Lost Centuries, p.483)۔ بحر روم جس پر ساتویں صدی عیسوی تک صرف رومی پرچم لہراتا تھا اب مسلمانوں کے زیر نگین تھا۔

بحر روم پر مسلم برتری نے عیسائی دنیا کو سمندر سے بے دخل کر دیا۔ عیسائی طاقتوں کی بحری نقل و حرکت محض ساحلوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ (Henry Pirenne, A History of Europe, p.95)۔ مکمل تین صدیوں تک مغرب سمندری رابطوں سے محروم رہا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۹۶)

فتوحات کا دوسرا دور

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی کی مسلم فتوحات سے عیسائی دنیا جس بحران سے دوچار ہوئی، دسویں صدی کے بعد اس نے سمیٹنے لگی تو اس نے اپنے علاقوں کی بازیابی کی کوشش شروع کی۔ ابھی طاقت کا توازن تبدیل نہیں ہوا تھا کہ عالم اسلام پر بحران طاری ہونے لگا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں تاتاریوں کے قبیلہ غز (Ghuzz) نے پورے ایران کو روند ڈالا۔ ۱۰۵۵ء میں انکے سردار طغرل بیگ سلجوقی نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ سلجوقیوں کی قوت سے بازنطین بھی سراسیمہ ہونے لگا۔ شہنشاہ بازنطین نے اس خطرے کو دور کرنے کے لیے ۱۰۷۱ء میں سلجوقی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے ملازگرد (Malaz Kirt) کے مقام پر شہنشاہ بازنطین کو عبرتناک شکست دیکر عیسائی دنیا کو ایشیائے کوچک سے بھی محروم کر دیا۔ ایشیائے کوچک کے قبضے میں آنے کے بعد یونان کی سمت سے یورپ میں مسلمانوں کی پیش قدمی کے امکانات پیدا ہو گئے۔

جب ملازگرد میں شکست نے مشرقی عیسائی دنیا کو ہراساں کر دیا۔ مجبوری کے عالم میں اس نے اپنے دیرینہ رقیب مغرب سے مدد طلب کی۔ شہنشاہ بازنطین الیگ سیس (Alexius) نے پوپ ابن سے اپیل کی۔

پوپ نے عالمِ عیسائیت کی بقا کے لیے ایشیائے کوچک کی بازیابی کو لازمی گردانا۔ اس سیاسی ضرورت میں اس نے مذہبی عنصر شامل کر کے حروبِ صلیبیہ کا اعلان کیا۔ حروبِ صلیبیہ نے یورپ میں مسلم پیش قدمی کئی صدیوں کے لیے ملتوی کر دی۔ (cf. Sir John Glubb; The Lost Centuries, p. 27)۔

سلطنتِ عثمانیہ اور یورپ

تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام پر مفتوحہ ایشیائے کوچک میں بازنطینی سرحدوں سے متصل اناطولیہ کے علاقے میں ترکوں نے ایک چھوٹی سی ریاست قائم کی۔ اس ریاست کے بانی عثمان (۱۲۹۹ء تا ۱۳۲۶ء) تھے، جنکے نام سے موسوم یہ ریاست سلطنتِ عثمانیہ کہلائی۔

ترک اور بازنطین : چودھویں صدی میں بازنطین پر ترکوں کا دباؤ شدید ہونے لگا۔ بازنطین کے مختلف علاقوں پر ترکوں کا قبضہ ہونا شروع ہوا۔ ۱۳۲۶ء میں بروساء ۱۳۳۰ء میں نکومیدیا اور تھریہ ترکوں کے قبضے میں آیا۔ سلطان مراد نے ۱۳۵۲ء میں ادریانوپل فتح کیا۔ پلوپولس [Plovidiv] (Philippopolis) کی تسخیر ۱۳۶۴ء میں ہوئی۔ ۱۳۷۱ء میں سرب قوم کو شکست دیکر انہیں مقدونیہ فرار ہونے پر مجبور کر دیا، اور ۱۳۸۱ء میں صوفیہ کو سرنگوں کیا۔

مراد کے بیٹے بجازت نے (۱۳۸۹ء تا ۱۴۰۳ء) میں بوسنیو، دلاشیو، بلغاریہ اور تھیسالیہ کو فتح کیا۔ اس طرح چودھویں صدی کے اختتام تک سارا بلقان ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔

(cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p. 494)

صرف قسطنطنیہ باقی رہ گیا جو اپنی قلعہ بندی کے طفیل مزید نصف صدی تک فتح ہونے سے بچا رہا۔ اسی درمیان جب ترک ہنگری کی سرحدوں پر تھے، مغرب اپنے دفاع کے لیے اپنی قوتیں مجتمع کر رہا تھا اور پوپ بونی فیس نیم ترکوں کے خلاف صلیبی جنگ شروع کرنے کی مہم چلا رہا تھا، مغلوں نے عالمِ اسلام پر حملہ کیا۔ تیمور لنگ کی افواج قاہرہ، بے پناہ سیلاب کی طرح ایشیا اور مشرقی یورپ پر چھا گئیں۔ ترکوں کے یورپ میں بڑھتے ہوئے قدمِ قہم گئے۔ بجازت کو قسطنطنیہ کا محاصرہ چھوڑ کر ایشیائے کوچک پہنچنا پڑا تاکہ مغل افواج کی بلغار سے سلطنتِ عثمانیہ کو بچا سکے۔ ۱۴۰۳ء میں مغلوں اور ترکوں کا مقابلہ انگورہ میں ہوا جس میں بجازت کام آئے۔ تیمور نے ۱۴۰۵ء میں انتقال کیا اور پھر ترکوں نے اپنی قوت مجتمع کی۔

بازنطین کا خاتمہ : سلطان مراد ثانی (۱۴۲۱ء تا ۱۴۵۱ء) نے ازسرنو سالونیکا کو فتح کیا، اور جب بلقان پر دوبارہ قبضے کے لیے یورپ میں اقدام کیا تو وہاں یورپ کی اجتماعی قوت مقابلے کے لیے موجود تھی۔ سلطان نے ۱۴۴۴ء میں جنگِ ورنہ (Verna) میں اس اجتماعی قوت کو فیصلہ کن شکست دیکر بلقان پر بارِ دگر

قبضہ کیا۔ قسطنطنیہ کا سقوط آج اور کل کی بات تھی۔ شہنشاہ قسطنطنین یازدہم (Constantine XI) عالم عیسائیت سے مدد حاصل کرنے کی خاطر کلیسائے یونان کو کلیسائے روم میں ضم کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس کے باوجود اسے مغرب سے خاطر خواہ امداد میسر نہیں آئی، اور آخر کار سلطان محمد فاتح ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء کو فاتحانہ شان سے قسطنطنیہ میں داخل ہوئے اور اس طرح رومن ایمپائر کی آخری نشانی بھی نیست و نابود ہو گئی۔ شہنشاہ قسطنطنین، کشندگان وطن کے ساتھ، خاک و خون ہو گیا اور سینٹ صوفیہ کے گرجا گھر سے تکبیر کی آواز گونج اٹھی۔

بحری اقتدار : مشرق میں ترک فتیاب ہو رہے تھے تو مغرب میں اسپین میں عرب پسپا ہو رہے تھے۔ سقوط قسطنطنیہ کے چالیس سال بعد ۱۴۹۲ء میں اسپین میں غرناطہ کا سقوط ہوا اور مغربی یورپ سے مسلم اقتدار کا چراغ گل ہو گیا۔ الحمراء کے درو دیوار تکبیر کی گونج سے محروم ہو گئے۔ اسپین کے سقوط نے مغربی بحر روم سے مسلم برتری ختم کر دی۔ بحر روم سے مسلم برتری کا زوال گیارہویں صدی عیسوی سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ عیسائی بحریہ اس قدر مضبوط ہو چکی تھی کہ اس کے ذریعے افریقہ، مصر اور شام پر قبضے کی متعدد کوششیں ہو چکی تھیں۔ شام اور مصر پر صلیبی عہد میں ایک صدی تک عیسائی قبضہ اسی بحریہ کی قوت کے طفیل برقرار رہا۔ ترکوں نے بحر روم پر بھی اپنا اقتدار مضبوط کیا، اور مشرقی بحر روم سے انہیں بیدخل ہونے پر مجبور کر دیا۔ تاہم مغربی بحر روم میں عیسائی بحری قوت برقرار رہی۔

قچاق سلطنت : روس کو چنگیز خاں کے پوتے، باتو خاں نے فتح کر کے وہاں ایک مضبوط سلطنت قائم کر لی تھی، جسے روس اور مغرب گولڈن ہورڈ (Golden Horde) کا نام دیتے ہیں۔ تاریخ اسلام میں اس سلطنت کو قچاق سلطنت کہا جاتا ہے۔ ابتدائی چودھویں صدی عیسوی میں ان منگول حکمرانوں نے اسلام قبول کر لیا، اس طرح پورے مشرقی عالم عیسائیت پر اسلام کا غلبہ ہو گیا۔ [Lewis Bernard; The Legacy of Islam, 1975 ed., article 'Politics and War']۔ باز نطین سلطنت پر قبضے اور قچاق سلطنت میں اسلام کے غلبے کی بدولت رومن ایمپائر کا تین چوتھائی رقبہ عیسائیت کے قبضے سے نکل کر اسلام کی پناہ میں آ چکا تھا۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p. 48)

مغرب پر مسلم فتوحات کے دور رس اثرات

سیاسی اثرات

آٹھویں صدی عیسوی تک مسلمانوں نے عیسائیوں کے جن علاقوں پر قبضہ کیا تھا، پندرہویں صدی عیسوی تک اس میں کوئی خاص تبدیلی نہ آ سکی۔ درمیانی دور میں عارضی طور پر حدود آگے پیچھے ہوتی رہیں، لیکن مجموعی طور پر نقشے میں مستقل رد و بدل نہیں ہو سکا۔ پندرہویں صدی میں عیسائیوں نے اسپین کی بازیابی کر لی تو اس کی جگہ اسپین سے کہیں بڑا رقبہ مشرقی یورپ سے نکل گیا۔

اس طرح مغربی معاشرہ کم و بیش ایک ہزار سال تک مسلم دنیا سے محصور رہا۔ اس دوران مغربی معاشرہ نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی طور پر دباؤ کا شکار رہا۔ محصور معاشرے کے لیے دو ہی طریقہ کار رہ جاتے ہیں۔ یا تو وہ غالب فریق کے ساتھ مصالحت کر لے یا پھر اس کا اپنی پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے۔ مغربی معاشرہ جو رومن معاشرے کا وارث اور کیتھولک چرچ کا پروردہ تھا، اپنی اعتبار سے رومن تھا۔ پس دباؤ، سیاسی ابتری اور اقتصادی بد حالی، سب کچھ برداشت کر گیا، لیکن مصالحت پر آمادہ نہیں ہو سکا۔ بحر روم اور اسکے ارد گرد کے مقبوضہ جات سے محرومی، بجائے خود بہت بڑا سیاسی نقصان تھا۔ پندرہویں صدی میں بازنطین پر قبضے نے اس محرومی کو اپنی انتہا پر پہنچا دیا۔ مغرب بقیہ دنیا سے کٹ گیا۔

رومن غرور کے لیے یہ امر ناقابل برداشت تھا کہ وہ ان لوگوں سے زچ ہو رہا تھا جن پر اس نے ہزار سال حکومت کی تھی۔ عرب تو وہ بد و تھے جن پر ان کے ماتحت نیم خود مختار حکمران قابو رکھا کرتے تھے۔ وحشی اقوام کی متدن علاقوں پر یلغار کو کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن یہ ہمیشہ عارضی ہوتی تھی۔ اور مرور زمانہ کے ساتھ یہ وحشی فاتح، متمدن ہو کر رومن ایمپائر میں ضم ہو جایا کرتے تھے۔ متمدن دنیا کا آقا روم اور صرف روم ہوا کرتا تھا۔ لیکن یہ نئے فاتح نرالے تھے، ابدی آقا کو زیر کرنا چاہتے تھے۔

فتوحات کی پہلی لہر نے ابھی سنبھلنے بھی نہ دیا تھا کہ دوسری جانب سے ایک دوسری لہر اٹھی۔ یورپ کے نقشے پر ایک نظر ڈالنا ہی یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہوگا کہ سیاسی اعتبار سے دوسرا مسلم اقدام آٹھویں صدی کے اقدام کی بہ نسبت مغرب کے لیے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ ہسپانیہ ایک ایسی مسلم مملکت تھا جو مرکز سے جدا تھا۔ اسے پورے عالم اسلام کی حمایت حاصل نہ تھی۔ اس کے وسائل محدود تھے جو مغرب کے وسائل سے کسی طور بہتر نہیں تھے۔ لیکن مشرقی اقدام فروغی نہیں بلکہ عالم اسلام کا مرکزی اقدام تھا، جس کے وسائل محدود نہیں تھے۔

ترکان عثمانی کے قبضے میں مشرقی یورپ، ایشیائے کوچک، شام اور مصر تھے۔ شام اور مصر ایسے تاریخ ساز خطے تھے کہ جس کے قبضے میں آگئے اسے عظمت کی باندیوں پر پہنچا دیا۔ رومن ایمپائر، بائبل، یونان، ایران اور مملکت اسلامیہ، سب ہی کو اسی وقت عروج میسر آیا جب یہ دونوں علاقے ان کے قبضے میں آئے۔ اسپین کی فتح بھی اسی دور میں ہوئی جب ان دونوں کے وسائل سلطنت اسلامیہ کو میسر تھے۔ جب ہسپانیہ جدا ہوا اور ان دونوں علاقوں کے مسائل سے محروم ہو گیا تو اسکی ساری کوشش یہ رہی کہ کسی طرح اپنے آزادانہ وجود کو برقرار رکھے، جو بالآخر ختم ہو گیا۔

۱۶۰۰ء میں ترکان عثمانی جرمنی کی سرحدوں پر کھڑے تھے۔ ان کے مزید اقدام کا خوف مغرب کو متوجش کیے دیتا تھا۔

(R.W.Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.12)

مغرب کی سیاسی ابتری : آٹھویں صدی کا مغرب رومن ایمپائر کا حصہ تھا، لیکن طوائف الملوکی کا شکار شہنشاہ بازنطین نہ تو اس پر قبضہ برقرار رکھ سکا، نہ ہی مسلمانوں سے اسکا دفاع کر سکا۔ مصر و شام پر قبضے کے خاتمے اور بحر روم سے بیدخلی نے مغرب کی تجارت ختم کر دی۔ مغرب بنیادی طور پر تجارتی معاشرہ تھا۔ (Kenith Neil Cameron; Humanity and Society, p.165) حکومت کے مالیہ کا انحصار تجارت پر تھا۔ (Henry Pirenne; A History of Europe, p.69) تجارت کے خاتمے کے باعث مغرب کے لیے سیاسی ادارے قائم رکھنا ناممکن ہو گیا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۷)۔ فوج، سینٹ، عدلیہ، کیوریا، 'سول سروس'، تعمیرات، رسل و رسائل اور بلدیہ، ہر ادارہ تحلیل ہو گیا۔ (حوالہ بالا، صفحات ۱۱۰ تا ۱۱۵)۔ یہ ایک ایسی سیاسی ابتری ہے جس کی نظیر کسی مہذب ملک میں نہیں پائی جاتی۔

صرف ایک غیر سیاسی ادارہ، کلیسا باقی رہ گیا، کیونکہ اس کے اپنے اقتصادی وسائل تھے۔ اس سیاسی خلا کو اسی ادارے نے پُر کیا۔

سیاست کلیسا : ابتدا کلیسا نے سیاسی ادارے کی ذمہ داری رضا کارانہ طور پر سنبھالی۔ لیکن جب اقتدار اسکے قبضے میں آ گیا تو کسی صورت اس سے دستبردار ہونے پر رضامند نہیں ہوا۔ رومن دور میں مذہبی ادارے ہمیشہ ریاست کے تحت ہوا کرتے تھے۔ ریاست کے سرکاری مذہب کی منظوری قیصر دیتا تھا۔ جس مذہب کو سیاسی پشت پناہی حاصل ہوتی تھی وہ پروان پڑھتا، اور جسے سیاسی قوت نظر انداز کرتی وہ آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتا۔ خود عیسائیت بھی سیاسی قوت کے تحلیل پر ان چڑھی تھی۔ عیسائیت کی تاریخ میں کوئی دوسری مثال ایسی نہیں ملتی، جہاں ریاست کلیسا کے تحت رہی ہو۔ پس کلیسا سیاسی قوت کی اہمیت سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے مغرب پر مسلم اقدام سے پیدا ہونے والے انتشار سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک زبردست قیہو کر لسی قائم کر دی، جس نے اسٹیٹ اور معاشرے کو پوری طرح اپنے منہ کے لیے استعمال کیا۔

رومن طرز حکومت کو اگر ہم قیصری یا پاپائیت کہیں تو مغربی طرز حکومت کو پاپائی قیصریت کہا جاسکتا ہے۔ پاپائی قیصریت نے مسلمانوں کی نظریاتی ریاست کی طرز پر مغرب میں ایک ایسی عیسائی نظریاتی ریاست کی تعمیر کا کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

منصوبہ بنایا جو قدیم رومن ایمپائر کے تمام علاقوں پر مشتمل: (cf. Toynbee: A Study of History, [Vol. II, p.347])۔ اسی منصوبے کے تحت شہنشاہِ بازنطین سے علیحدگی اختیار کر کے مغربی جمہوریہ مسیحی (Western Republica Christiana) قائم کی گئی، جس نے شمالی یورپ میں ممکنہ حد تک اپنی حدود کو وسیع کیا، اور عیسائی دنیا کے قدیم علاقوں کی بازیابی کے لیے صدیوں عالمِ اسلام پر متواتر حملے کیے۔

سیاسی نظریات: عیسائیت کے مذہبی عقائد کی روشنی میں سیاست ملکی چرچ کے فرائض میں شامل نہیں تھی۔ عیسائیت کے ابتدائی دور میں ریاست کو دشمنِ عیسائی، قبرِ خداوندی جیسے خطابات سے نوازا جاتا تھا، اور اسکی تعظیم کی تعلیمات منفی وجوہات کی بنا پر دی جاتی تھیں۔ (cf. Nick Earl; Culture and Creed, p.65)۔ سیاست میں حصہ لینے یا سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی تعلیم کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ چرچ عملی طور پر سیاست سے بیگانہ تھا، اسکا اپنا کوئی سیاسی نظریہ نہیں تھا۔

(The Concise Encyclopedia of the Living Faiths; p.166)

پاپائی فیصلہیت نے بوقتِ ضرورت، کلیسا کے مذہبی نظریات کو سیاسی نظریات کا نعم البدل بنا دیا۔ اگر کلیسا کے مذہبی نظریات اور سیاسی معاملات میں تضاد پایا گیا تو باوجودِ جھجک ضروریات کے مطابق مذہبی جواز پیدا کیے گئے۔ اسٹیٹ اور معاشرے کا مقصد مذہب اور اسکی ترویج و توسیع قرار پایا۔ اسٹیٹ کی تعریف یہ کی گئی کہ: ”صحیح اسٹیٹ وہی ہے جس میں سچے مذہب کا چلن ہو۔ چونکہ صرف وہی اسکی ہی سچا مذہب ہے لہذا اسکی ریاست (Christian State) ہی حقیقی معنوں میں ریاست ہے، اور اس ریاست کی حکومت کا یہ فرض اولین ہے کہ مذہبی اخلاص (Purity of Faith) کی حفاظت کے ذریعے بنی نوع انسان کی نجات میں مدد و معاون ہو۔“

(G.E. Grunebaum; Islam, p.130)

کلیسا کی سیاسی بالادستی کے جواز میں یہ نظریہ پیش کیا گیا کہ: ”کلیسا کا اور دنیا کا حقیقی شہنشاہ مسیح ہے۔“

(W.Stark; The Sociology of Religion, A Study of Christianity, Vol. III, p.51)

”مسیح کے پیرو اس حقیقی بادشاہ کی بدولت بادشاہ ہیں۔“ (حوالہ بالا صفحہ ۱۹)

اس طرح چرچ نے دربارِ عیسوی کی حیثیت اختیار کی۔ سیاسی نظام سے دنیاوی بادشاہ کو بیدخل کر کے آسمانی بادشاہ کو اس کی جگہ دی گئی اور پوپ کو شاہوں کا شاہ (King of Kings) قرار دیا گیا۔

(J.C. Fuller; The Decisive Battles of the Western World, p.283)

اس تبدیلی نے فطری طور پر اربابِ سیاست کو براہِ مہم کیا، اور ایک شدید سیاسی کشمکش پیدا ہوئی۔ جو صدیوں حکمرانوں اور پاپا کے درمیان جاری رہی، جس میں بالآخر پاپا کا پتہ بھاری رہا۔ پاپا نے شہنشاہ کو محض ایک گناہگار انسان قرار دیکر اسے سیدھا رکھنے کے لیے اس کی زمام اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اس پالیسی نے مغرب میں ایک جابر مذہبی ڈکٹیٹر شپ قائم کر دی۔

چرچ کی بنیادی پالیسی کیتھولک مذہب کی اشاعت، حفاظت اور توسیع تھی۔ عہدِ وسطیٰ کی پوری سیاسی تاریخ اس پالیسی کی آئینہ دار ہے۔ داخلی اور خارجی امورِ مملکت، سب کے سب، اسی پالیسی کے مطابق طے ہوئے۔

داخلی امور: ”چرچ نے مغربی معاشرے کے ہر فرد کی روح اور جسم کو اپنا غلام بنالیا۔ اس عظیم غلامی کی مثال ماضی کے خاتمہ برین حکمران کے دور میں بھی نہیں ملتی۔“ (Toynbee; A Study of History, Vol. III, p.91) ادنیٰ کسان سے لیکر شہنشاہ تک، سب ہی اس ظالم تھیو کریسی سے لرزاں و ترساں تھے۔ بے چینی ہر طبقے میں موجود تھی، جس کا اظہار مختلف مواقع پر سیاسی اور مذہبی تحریکوں کی صورت میں ہوتا جنہیں نہایت سختی سے کچلا جاتا۔ اس دور میں احتجاج ایک قبیح جرم تھا، اور کلیسا کی پالیسی سے انحراف کا نام ارتداد تھا، جسکی سزا موت تھی۔ شہنشاہ کو دم مارنے کا بارانہ تھا۔ سلطنتیں اسی وقت تک مستحکم تھیں جب تک وہ تھیو کریسی کی پالیسی پر گامزن رہتیں۔ شہنشاہ اسی وقت تک شہنشاہ تھے جب تک وہ تھیو کریسی کے وفادار کمانڈر کا رول ادا کرتے۔

پاپائی قیصریت نے مغرب کے گرد ایک ایسا حصار قائم کر دیا تھا جس نے اسے صدیوں بیرونی دنیا سے منقطع رکھا۔ معاشرے پر ایک جمود طاری ہو گیا جو کہیں سترہویں صدی عیسوی میں جا کر ٹوٹ سکا۔ (cf. Christofer Hill; The Century of Revolution, p.171) اس حصار کو توڑنے کے لیے مغربی معاشرے نو کلیسا کے خلاف شدید سیاسی اور مذہبی جدوجہد کرنی پڑی۔ اس کے بعد ہی مغربی دنیا کا بیرونی دنیا سے رابطہ قائم ہو سکا۔

یہ اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں کہ مغرب میں پاپائی ڈکٹیٹر شپ کا قیام اسلام کے اقدام کے سبب سے ہوا۔ **خارجہ پالیسی:** مغرب کی داخلہ پالیسی کو اگر ہم کلیسائی امن (Peace of the Church) کا نام دے سکتے ہیں، جس کے تحت صرف وہ فرد، گروہ یا قوم زندہ رہ سکتی ہے جو کلیسا کی وفادار ہو تو خارجہ پالیسی کو ایک لفظ سرد جنگ (Cold War) میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کے آپس میں داخلے (الاسےء) سے لیکر، ان کے آپس میں سے اخراج (۱۲۹۲ء) تک کا عہد مغرب کا عہدِ وسطیٰ کہلاتا ہے۔ اس عہد کے متفقہ مین ہوں کہ متاخرین، سب ہی دشمنی اور نفرت کے داعی نظر آتے ہیں۔ مسلم دشمنی ایک عقیدہ اور قانونی فریضہ تھا۔

سینٹ برنارڈ نے بارہویں صدی میں حکم جاری کیا،

”ہم اس امر کی قطعاً ممانعت کرتے ہیں کہ مسلمانوں سے کسی صورت میں اس وقت تک کوئی تعلق قائم کیا جائے، خواہ وہ مالی منفعت کے لیے ہو یا خراج حاصل کرنے کے لیے، جب تک خدا کی مدد سے ان کا دین یا ان کی قوم بالکل تباہ نہ ہو جائے۔“ (Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p.252)

عیسائی دنیا میں مسلمانوں کا وجود ناقابلِ برداشت تھا۔ سسلی اور نیپلز کے حکمران پوپ کے حلقہ اقتدار سے باہر تھے۔ ان کے سیاسی تعلقات مختلف عرب امارتوں کے ساتھ قائم تھے، اور وہ اپنی عرب رعایا کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتے تھے۔ پوپ جان نیشتم نے انہیں نہ صرف عربوں کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کا

حکم دیا بلکہ ان کے علاقے میں موجود عربوں کو گرفتار کر کے روم روانہ کرنے کا حکم بھی دیا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۶)۔ اس نے عربوں کو دشمن عیسائیت اور فرزندانِ تاریکی قرار دیا۔ اس نے ایسے منصوبے مرتب کرنے کے لیے بشپوں کو مدعو کیا، جن پر عملدرآمد کر کے اس 'نا بکا رقوم' کو اپنے علاقے سے نکالا جاسکے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۷)۔ چرچ کی اسی پالیسی کے تحت سسلی، نیپلز اور اسپین میں مسلمانوں کے قتل عام ہوئے۔

مسلم سلطنتوں سے تعلقات : مغربی جمہوریہ مسیحی کے قیام سے قبل، مغربی سلطنتوں میں عربوں سے سیاسی تعلقات پیدا کرنے کی چند کوششوں کا ذکر ملتا ہے۔ نارمن ڈسٹنیل نے متعدد عرب سفارتوں کا تذکرہ کیا ہے جو پٹیاں، چارلس اور شارلمین کے درباروں میں پہنچیں۔ لیکن شارلمین کے عہد کے بعد سیاست پر کلیسا کی گرفت مضبوط ہو گئی، اور مسلم ریاستوں کو دشمن قرار دے دیا گیا، (حوالہ بالا، صفحہ ۷۸)۔ تو مغرب نے سیاسی مصالحت کی جانب کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ اگر کسی مسلم ملک نے کبھی ایسا کوئی اقدام کیا بھی تو کلیسا نے اس کوشش کو عہدِ انا کام بنادیا۔ اسپین کے عبدالرحمن الناصر نے سیاسی تعلقات پیدا کرنے کے لیے جرمن شہنشاہ اوتو کے دربار میں اپنے سفیر بھیجے۔ اوتو کے درباری پادریوں نے عبدالرحمن کے مراسلے کی نہایت شدت سے مذمت کی اور عبدالرحمن پر الزام عائد کیا کہ اس نے کرائسٹ کی شان میں متعدد گستاخیوں (Blasphemies) کا ارتکاب کیا ہے۔ جوابی مراسلے میں انہوں نے نہ صرف خلیفہ الناصر کی، بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کی (نعوذ باللہ) اہانت میں کوئی کسر اٹھانہیں رکھی۔ (حوالہ بالا، صفحات ۱۵۰-۱۵۲)

وہ تو خیر گزری کہ جو پادری جواب لیکر گیا تھا اس نے خوف یا مصلحت کے سبب اس جواب کو پیش کرنے کی جرات نہیں کی۔ بہر حال الناصر کی یہ کوشش مغرب کی خارجہ پالیسی کے سبب کامیاب نہیں ہو سکی۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, pp.65-67)

بازنطین سے تعلقات : سرد جنگ کی پالیسی کے تحت صرف عالم اسلام سے ہی تعلقات کشیدہ نہ تھے بلکہ مشرقی عالم عیسائیت بھی اسی پالیسی کا شکار رہا۔ بازنطین نے بار بار تعلقات استوار کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش کبھی کامیاب نہ ہو سکی، کیونکہ ہر مرتبہ مغرب نے مشرقی عالم عیسائیت سے اپنی برتری تسلیم کروانے پر اصرار کیا۔ جس عہد میں خلیفہ الناصر کے سفیر اوتو کے دربار میں پہنچے، تقریباً اسی عہد میں اوتو کے سفیر بشپ لیوت پرانت (Liut Prand) نے بازنطینی شہنشاہ 'انسفورس فوکاس' [Nicephorus Phocas] کے دربار میں حاضری دی۔ بشپ مذکور نے مشرقی کلیسا کے عہدہ داروں کی جنگ اور توہین میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی، درباریوں سے

تلخ کلامی کی اور شہنشاہ سے نہایت تنگ آمیز رویہ اختیار کیا۔ [A] (For details confer Toynbee; A Study of History, Vol. VI)۔ اسی قسم کی ایک سفارت پوپ کی جانب سے ۱۰۵۴ء میں شہنشاہ بازنطین کے دربار میں پہنچی تاکہ نارمن خطے کے خلاف مشترکہ دفاع کیا جاسکے۔ سفارتی وفد کے سربراہ کارڈنیل ہمفرت نے واضح طور پر قسطنطنیہ کے اسقف اعظم پر الزام تراشی کی۔ پوپ کا اسی دوران انتقال ہو گیا۔ بشپ مذکور نے متوفی پوپ سے منسوب ایک حکمنامہ قربان گاہ پر رکھ دیا جس کی رو سے اسقف اعظم اور اسکے پیروؤں کو کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جاتے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

انکی بدعتیگی کی بنا پر انکے عہدوں سے برطرف قرار دیا گیا۔ جو با اسقف اعظم نے پوپ کے نمائندے کو جعلاز ٹمبرا کر مزید گفت و شنید سے انکار کر دیا۔

صلیبی جنگوں کے دوران مغربی اور مشرقی عالم عیسائیت میں کشیدگی اپنی انتہا پر پہنچ گئی۔ رومن کیتھولک چرچ نے مشرقی عالم عیسائیت کے خلاف بھی اتنا پروپیگنڈہ کیا تھا کہ مغربی افواج اس علاقے کو مسیحی نہیں بلکہ بے دینوں کا علاقہ تصور کرتی تھیں اور اس علاقے سے گزرتے ہوئے ایسی ہی کارروائیاں کرتیں، جیسی دشمن کے علاقے میں کرنے کا رواج تھا۔ صلیبی افواج کی اس بے راہروی کے باعث شہنشاہ ہارنٹین کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ انہیں اپنے علاقے سے دور رکھا جائے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۹۴)

مغرب کی اس سیاسی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ چوتھی صلیبی جنگ، بجائے مسلمانوں کے، خود مشرقی مسیحی دنیا سے لڑی گئی۔ صلیبی افواج نے ۱۲۰۳ء میں قسطنطنیہ فتح کر ڈالا۔ اس کے علاقے بھتھیاے قتل اور غارتگری کا طوفان برپا کیا، اور ۱۲۰۴ء میں ہارنٹین شہنشاہیت کی جگہ لاطینی شہنشاہیت کا اعلان کر دیا۔

(cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.194)

سیاسی عزائم: مغرب کی آزادی کے بعد اس کے دو عظیم مقاصد تھے۔ اول یہ کہ مغرب کا کھویا ہوا علاقہ بازیاب کیا جائے۔ (cf. Grunebaum; Mediaeval Islam, p.6)۔ اور ثانی یہ کہ دنیا کو کیتھولک بنایا جائے۔

یہ دونوں عزائم بلا جارحیت اور تند و تیز پروپیگنڈے کے پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے مغربی جارحیت کو مذہبی جواز عطا کیا گیا۔ (cf. Henry Pirenne; A History of Europe, p.194)۔ عیسائیت میں خوزیزی کی گنجائش نہیں تھی۔ کلیسا نے 'مقدس جنگ' کا نعرہ بلند کر کے جنگ کو مذہبی فریضہ بنایا۔ کلیسا کے اس نعرہ جنگ نے رومن جارحیت اور جرمن اقوام کی فطری جنگجوئی کو ہوا دیکر شعلہ بنادیا۔

توریت نے بنی اسرائیل میں احساس برتری پیدا کرنے کے لیے انہیں خدا کی محبوب قوم ٹھہرایا تھا۔ پوپ اربن نے مغربی نسل پرستی اور احساس برتری کو پناہ دینے کے لیے یہ لقب فرینک (Franc) قوم کو منتقل کر دیا، اور فرینکس کو مسیحی دنیا کی قیادت سونپتے ہوئے انہیں خدا کی پسندیدہ قوم (Chosen People) قرار دیا۔

(cf. Toynbee; A Study of History, Vol. I, p.212)

کھوئے ہوئے علاقوں پر استحقاق اور انکی بازیابی کی ترپ زندہ رکھنے کے لیے ارض مقدس (فلسطین) کو پاچا خداوندی (Terra Sua) کہا گیا۔ رومن کیوریا (Roman Curia) ہر اس خطہ کو جو بھی عیسائیوں کے قبضے میں رہ چکا ہو سینٹ پیٹر کا علاقہ (St. Peter's Land) کہتا۔ سینٹ پیٹر کا مقبرہ چونکہ روم میں واقع ہے، لہذا اس کے حوالے سے یہ تمام علاقے مغرب کی ملکیت ٹھہرائے گئے۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p.115)

ان علاقوں کی بازیابی کو ہر عیسائی کے لیے مقدس فریضہ قرار دیا گیا۔ چونکہ ان علاقوں پر مسلمان قابض تھے لہذا وہ دشمن مسیح، دشمن عیسائیت یا سیاسی زبان میں دشمن قرار پائے۔ ان کو اور انکے دین کو تباہ کرنا تو قوم مقدس کا فریضہ تھا۔ (حوالہ بالا صفحہ ۱۱۵)۔ عیسائیوں کو مسلمانوں کے مکمل ہلاک کا حکم دیا گیا۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

پوپ کلیمنٹ پنجم نے عیسائی حکمرانوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے علاقوں میں اذان کی آواز نہ بلند ہونے دیں کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کا نام نامی بلند کیا جاتا ہے جسے عیسائی بھی سنتے ہیں۔ اسی پوپ کے نزدیک غرناطہ میں مسلمانوں کا وجود خالق کی توہین کے مترادف تھا۔ (حوالہ بالا صفحات ۲۵۲، ۲۵۵، ۲۵۶)

ابتداءً سرد جنگ کی یہ پالیسی دفاعی مقصد کے لیے وضع کی گئی تھی، لیکن چونکہ سیاسی پالیسی کو مذہب کا رنگ دیا گیا تھا اور مذہب جس چیز کو ایک بار عقیدے کی حیثیت سے اپنالے اسے ترک کرنا پھر ممکن نہیں رہ جاتا، لہذا سرد جنگ مغرب کی ناقابلِ تبدیل پالیسی بن گئی۔ اسی سرد جنگ کا شکار بازنطین بھی ہوا۔

مختصراً اسلامی اقدام کے باعث اولاً مغرب سخت سیاسی انتشار کا شکار ہوا۔ رومن ایمپائر ختم ہوئی، عیسائی دنیا اپنے بڑے حصے سے محروم ہو کر دھڑوں میں بٹ گئی اور اسے صدیوں سرد جنگ میں گرفتار رہنا پڑا۔

سرد جنگ کی بدولت اقتدار رومیوں سے جرمنوں کو منتقل ہو گیا۔ رومن معاشرے پر جمود طاری ہو گیا، اور وہ دورِ تہذیب سے دورِ بربریت میں لوٹ گیا۔ مغربی سیاست کے افق پر نیم وحشی اقوام، فریک، جرمن، سیکسن، تارمن، برگندی اور ولندیزیوں کی سیادت قائم ہو گئی۔

مذہبی اثرات

قدیم رومن معاشرے کی اجتماعی عصبيت کا مرجع روم اور شہنشاہ تھے، جنگی پرستش ہوتی تھی۔ مذہب کے معاملے میں یہ معاشرہ روادار تھا اور ہر مذہب کو آزادی تھی۔ نئے عقائد اور نئے مذاہب کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا تھا۔

(cf. Cyril Bailey; The Legacy of Rome, article 'Religion and Philosophy')

عیسائیت کا بھی رومیوں نے حسب دستور خیر مقدم کیا۔ تاہم من و عن تسلیم کرنے کے بجائے اپنے قومی مزاج کے مطابق ڈھال کر، رومن کیتھولک کے نام سے قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت کو اپنے حلقہ اثر کی توسیع میں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اگر مزاحمت تھی تو سیاسی تھی۔ جب کلیسا نے شہنشاہ سے یہی مصالحت کر لی تو یہ مزاحمت بھی ختم ہو گئی، اور عیسائیت کو ملک کے سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوئی۔

جب مغربی کلیسا نے کیتھولک اقتدار کے لیے رومن ایمپائر کو ختم کیا اور مغربی معاشرے کو اس کے اپنے

نظریاتی خطوط پر استوار کیا، (cf. Kenith Neil Cameron; Humanity and Society, p.271)

تو کلیسا اچھی طرح جانتا تھا کہ رومن ایمپائر کی جگہ مسیحی مغرب کا قیام صرف نظریاتی قوت کی بدولت ممکن ہو سکا تھا۔ اس لیے ناقابلِ عبور نظریاتی خطوط پر سرحدوں کا قیام، اور انکی حفاظت کی اہمیت کلیسا کی نظروں سے ہٹتی نہیں تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے مذہبی رواداری ختم کی۔ وطن اور شہنشاہ سے وابستگی اور عصبيت کو مذہب

کی جانب منتقل کیا۔ انسان کی تقسیم صرف دو طبقات مسیحی اور غیر مسیحی میں کی۔ [Hankle L.; Aristotle and the American Indians, p.IX]۔ رنگ اور نسل کی برتری کو کیتھولک عقائد میں جگہ دی، جس کے باعث کیتھولک عیسائیوں کو دیگر عیسائیوں پر اور مغرب کو تمام نسل انسانی پر برتری کا تھوڑا ملا۔

(Pollard G.E.; Objections to the Roman Catholicism, p.162)

نظریاتی سرحدوں کی حفاظت : کلیسا نے مغربی معاشرے کو رومن کیتھولک نظریات کا تختی سے پابند کیا۔ یہ نظریات بنیادی طور پر لاطینی تھے، جو مغرب کی حدود سے باہر خود عیسائی دنیا کے لیے اجنبی اور ناقابل قبول تھے۔ ان نظریات کی خلاف مصر اور شام میں وقتاً فوقتاً بڑی شدید قسم کی تحریکیں اٹھ چکی تھیں۔ [For details, (Millman; Latin Christianity, Vol. I, Introduction)]۔ خود مغرب میں بے شمار فرقے ابھرے جو رومن کیتھولک نظریات سے متفق نہیں تھے، اور انہوں نے رومن کیتھولک نظریات کے خلاف تحریکیں چلائی۔ مثلاً سوسائٹی آف جیسس (Society of Jesus)، جسے لویولا نے قائم کیا، تھیٹین تحریک (Theatines Movement)، جسے ویرونا (Verona) نے رومی کلیسا کے خلاف چلایا، انابپٹسٹ (Anabaptist)، سینٹ ہارتھولمیو اور الہی جنس تحریکیں، بوہیمیا میں ہس کی تحریک، انگلستان میں وے کلف کی، اور بالآخر لوٹھریکی تحریک، جن میں سے صرف لوٹھریکی تحریک سازگار ماحول کے سبب بار آور ہوئی، ورنہ ہر تحریک کو شعلہ و شمشیر سے ختم کر دیا گیا۔ (Henry Pirenne; A History of Europe, pp.297, 404, 415, 561, 565)

یہ ساری کارروائی کلیسا کے نظریات کی حفاظت کے لیے کی گئی، کیونکہ نظریاتی اختلافات کے لیے مغربی

کلیسائیں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ (Mayer F.E.; The Religious Bodies of America, p.107)

نظریاتی اختلاف کلیسا سے بغاوت کے مترادف تھا۔ اس اختلاف کا نام بدعت (Heresy) رکھا گیا۔ یہ ایک ایسا لفظ تھا کہ اگر کسی فرد یا گروہ پر اسکا اطلاق ہو جاتا تھا تو زمین اس پر تنگ ہو جاتی۔ اسکا خون مباح ہو جاتا۔ بدعتی کو ’زمین کی پلگ‘ (Land Plague) اور ’عوام پر وبال‘ (Public Nuisance) کہا جاتا۔ (W. Stark; The Sociology of Religion, Vol.III, p.328)۔

بدعتیوں کے محاسبے کے لیے صدیوں داروغہ گیر (Inquisition) جاری رہی، جس میں لاکھوں افراد کی روح کو مردود قرار دیکر چرچ نے حکومت کے حوالے کیا تاکہ انکا بدن تباہ کر دیا جائے۔

(Henry Pirenne; A History of Europe, p.298)

بدعت کے نام پر جن مسائل کا سامنا تھا وہ سب ایسے تھے جو مغرب میں نہ سہی لیکن مسیحی دنیا میں کہیں نہ کہیں مسئلہ تھے۔ یہ مسائل ایسے تھے جن کو برداشت کر لینے سے مذہب پر تو کوئی آنچ نہیں آتی تھی، لیکن کلیسا ان کے ساتھ گزارا نہیں کر سکتا تھا۔ جب ان معمولی اختلافات پر قتل و غارتگری ہو سکتی تھی تو وہ عقائد جو اسلام پیش کر رہا تھا کیتھولک دنیا کی نظریاتی حدود میں کیسے برداشت کیے جاسکتے تھے۔

عیسائیت کو اسلام سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ یہ ان کے طاقتور دشمنوں کا مذہب تھا۔ ہلینک اور رومن معاشروں سے جداگانہ، سامی معاشرے سے ابھرا تھا، جو مسیحی تہذیب سے برسر پیکار تھا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اسلام اور عیسائیت کے متضاد عقائد

اسلام میں پیشہ ور مذہبی طبقے یا چرچ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہاں ہر فرد بلا کسی چنڈت، ربی، قنسیس یا پادری کے اپنا تعلق پروردگار سے قائم کر سکتا تھا۔ عالم اسلام کا ارتقاء اور معاشرتی امن یہ ثابت کر رہا تھا کہ معاشرہ بلا چرچ بھی قائم رہ سکتا ہے۔ رہبانیت بھی اسلامی عقائد سے یکسر خارج تھی۔ اسلام کے نزدیک ترک دنیا ذمہ داریوں سے گریز کا نام تھا۔ دنیا کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کے ساتھ ساتھ دین کی خدمت کی جاسکتی تھی۔

اسلام کا یہ قوی تصور کہ انسان پروردگار سے راست تعلق پیدا کر سکتا ہے، مغربی مفکرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں ناکام نہیں رہا۔ عہدِ وظیفی میں اس کے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ سسلی کے نارمن حکمران فریڈرک ثانی نے مسلم اثرات کے سبب ہمیشہ پوپ سے ٹکری۔ فرانس کے ہنری نے پوپ کے خلاف بارہا اقدام کیا۔ مغرب میں کلیسا کے تسلط کے خلاف بارہا بے چینی پھیلی۔ یورپ کے عوام نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ مذہب کلیسا کے اندر پیشہ ور گروہ (Clergy) کا قیدی بن گیا ہے۔ [The Concise Encyclopedia of the Living Faiths]۔ عوام میں ایک تحریک پیدا ہوئی جسے پائٹیزم (Pietism) کہا جاتا ہے، جس نے مذہبی زندگی کا مرکز کلیسا کو بنانے کے بجائے گھر کو بنادیا۔

اسی قسم کی ایک تحریک انگلستان میں چلی جسے میتھوڈسٹ (Methodist) کہا گیا۔ یہ لوگ اپنے عبادتی اجتماعات گھروں یا کھلے میدانوں میں کرتے تھے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۲۱)۔ چرچ اور رہبانیت دونوں کی سلامتی کا تقاضہ تھا کہ اسلام کے مذہبی اثرات کے نفوذ کو ہر قیمت پر روکا جائے۔ یہی وہ خطرہ تھا جو گلبن کے اس مشہور تبصرے میں جھلکتا ہے کہ جنگِ طورس میں اگر مسلمان جیت جاتے تو شاید آکسفورڈ کی درسگاہوں میں قرآن اور حدیث کا درس جاری ہوتا۔

(cf. Gibbon; The Decline and Fall of Roman Empire, Vol VI, p.15)

توحید : اسلام توحیدِ مطلق کا قائل تھا جس میں تثلیث کی کسی شکل میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ یہاں کسی دیوی، دیوتا، خدا کے بیٹے یا آدم-خدا کا وجود نہیں تھا۔ توحید اسلام کا منفرد عقیدہ تھا، جس کی کوئی نظیر یہودیت یا عیسائیت میں نہیں ملتی تھی۔ یہودیت کا تصور الہ عیسائیت میں اور بھی مسخ ہو چکا تھا، جبکہ اسلام نے نہ صرف عیسائیت کے تصور الہ کی نفی کی بلکہ یہود کے تصور الہ کو بھی اپنی گرد بنادیا۔ (M. Watt; What is Islam, p.17)

عیسائی عقیدہ تثلیث صدیوں کی جدوجہد اور خونی کشمکش کے بعد پروان چڑھا تھا۔ لاکھوں انسانی جانوں کو قربان کر کے مسیح کی الوہیت استوار کی گئی تھی۔ اسلام نے توحید کا نعرہ لگا کر مسیح کو از سر نو محض انسان اور پیغمبر بنا دیا، جس کے باعث کلیسا کے لیے پھر سے وہی مسائل پیدا ہونے کا خطرہ سامنے آ گیا، جن سے وہ اپنی ابتدائی صدیوں میں دوچار ہو چکا تھا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

توحید کے منفرد عقیدے نے ارباب فکر کو اپنی طرف متوجہ کرنا شروع کیا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ایک ایسا عیسائی فرقہ بھی پیدا ہوا جس کے عقائد میں وحدت الوجود کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ فرقہ اپنے بانی الماریک (Almaric) سے منسوب ہو کر المورین (Almaurian) کہلایا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ،
 ”خدا ہر شے میں ہے۔ پس ہر شے خیر ہے۔ لہذا گناہ کا وجود نہیں۔ پس انسان جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔“

(Warner Stark; The Sociology of Religion, Vol. III, p.318)

توحید اسلام کی ایک ایسی داخلی قوت تھی جو عیسائیت کے بنیادی عقائد سے متصادم تھی۔ توحید اور تثلیث کی کشمکش سے عیسائیت کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ ماضی میں اس طاقت نے عالم عیسائیت کے امن کو بار بار تباہ کیا ہے۔ یہ مسئلہ اس لیے اور بھی سنگین ہو گیا کہ تورات کے احکام عشرہ کا اولین حکم توحید تھا۔ عیسائیت کے دل میں یہ ایسا کمزور مقام تھا، جہاں یہود کے تیر و نشتر داخل ہو کر عیسائیت کے ضمیر کو ہمیشہ مجروح کرتے تھے۔
 (The Consice Encyclopedia of the Living Faiths, p.70)۔ چونکہ یہود عیسائی معاشرے کی ایک بے دست و پا اقلیت تھے، اس لیے انکی آواز کو بادی نامشکل کام نہ تھا۔ لیکن اسلام کے نعرہ توحید کے آگے کلیسا بے بس تھا۔ یہ نہ کسی عجمی کی آواز تھی کہ کلیسا کا حکم یا تلوار اسے خاموش کر دے، نہ یہ کسی مجبور اقلیت کی مذہبی حیثیت کا اظہار۔ یہ ایک ایسی عظیم خارجی قوت تھی جسکی حمایت کے لیے عظیم ملت اسلامیہ اور اسکے جید علماء کی فکر موجود تھی۔ نہ یہ قابل قبول تھی نہ اسکے قوی اثرات کو روکا جاسکتا تھا۔ چارہ کار صرف یہ تھا کہ اسلام سے لوگوں کو اس قدر متفرق کیا جائے کہ اس کا ہر عقیدہ اس نفرت کی نذر ہو جائے۔

ذات عیسیٰ: توحید کے بعد دوسرا اختلافی مسئلہ حضرت عیسیٰ کی ذات کا تھا۔ یہود کی نگاہوں سے عیسائیت اور موسویت کا تعلق پوشیدہ نہ تھا۔ ان کے نزدیک عیسائیت، یہودیت کی ایک گمراہ شاخ تھی، جس نے ناجائز طور پر اپنی چند تحریریں انکی مقدس کتب کے ساتھ منسلک کر دی تھیں۔

انکی نگاہ میں ایک یہودی ربی (Rabbi) کی پرستش، جسے عیسائیت نے ابن اللہ بنالیا تھا، جو بطن انسانی سے پیدا ہوا، انسان کی حیثیت سے زندہ رہا اور انسان ہی کی طرح اٹھ گیا، ایک طحانہ، بت پرستانہ اور کافرانہ عمل تھا۔ (Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. X, p.257)۔ یہود کے انداز فکر کو ختم نہ کیا جاسکتا تھا کہ اس کی تائید اسلام سے ہونے لگی۔ گو اسلام نے یہود کے برخلاف حضرت مریم کے تقدس کا اقرار کیا تھا، حضرت عیسیٰ کو برگزیدہ ترین پیغمبروں میں شامل کر کے بلند ترین انسانی مرتبہ دیا تھا، انکی رفعت کا اقرار کیا تھا، لیکن انکی الوہیت اور انکی مصلوبیت کا انکار کیا تھا۔

ایک مصلوبیت سے انکار کی بنیاد پر ہی عیسائیت کے بے شمار عقائد پر ضرب پڑتی تھی۔ جب مصلوبیت نہیں تو دوبارہ جی اٹھنا، آدم کے ازلی گناہ کے کفارہ میں قربان ہونا، شفاعت کے عقاید وغیرہ، گویا سب کے سب رد ہو رہے تھے۔ الوہیت، مصلوبیت اور حیات ثانی، دو دنیاوی عنصر ہیں جن کے بغیر عیسائیت قائم ہی نہیں رہ سکتی۔

ذاتِ عیسیٰ کے بارے میں اسلامی عقائد عیسائیت کی بنیادیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ یہ عقائد مغربی کلیسا کے لیے سم قاتل تھے۔

مہمیت : اسلام ایک دین ہے۔ ایک مکمل نظامِ حیات جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ انسان کی روح اور اس کا بدن دونوں ایک وحدت کی حیثیت سے دین کے احکامات کے تحت آتے ہیں۔ اسلام نفس اور بدن دونوں کے حقوق تسلیم کرتا ہے۔ یہاں نہ قوت کی ممانعت ہے نہ اقتدار کی مخالفت۔ زندگی کی نعمتیں اور مسرتیں بھی ممنوع نہیں، بشرطیکہ یہ سب اللہ کی قائم کی ہوئی حدود سے تجاوز نہ کریں۔ اسلام نے جنس کو فطری تقاضے کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہوئے تزویج کو ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن عقیدہٴ ثنویت کے تحت عیسائیت ان تمام کیفیات میں اسلام سے قطعاً مختلف تھی۔ یہاں روح ناپاک بدن میں مقید تھی۔ روحانی معاملات پاک اور بدنی معاملات ناپاک اور قابلِ نفرت تھے۔ اسی اعتبار سے روحانی اور دنیاوی دائرے جدا جدا تھے۔ زندگی اور دنیا کے دو حقدار تھے، 'خدا' اور 'قیصر'۔ دین اور دنیا میں بعد تھا۔ جسم کو فنا کرنا، خود آزاری، لذتوں اور نعمتوں سے گریز، نہ صرف اپنی ذات بلکہ ساری دنیا سے نفرت، ترک دنیا، اور دنیاوی معاملات سے بے تعلقی، یہ سب عیسائی کے کام تھے۔

(cf. Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. VI, p.77-78)

یونانی نظریات کی رو سے بدن کی تذلیل، اور اسے ہر قسم کی آسائش سے محروم رکھنا تزکیہٴ روح کے لیے ضروری تھا۔ (Montgomery Watt; What is Islam, p.230)۔ نیز اتفاقاً حضرت عیسیٰ مجرد، محصور اور غیر متاثر تھے، لہذا جنس کو عیسائیت نے ہر صورت میں ایک سلفی جذبہ تصور کیا۔

(Radha Krishnan; Religion in a Changing World, pp.114-115)

اس نے تہذیب کی اہمیت میں اس قدر مبالغہ کیا کہ شادی کرنے، گھریلو سنبھالنے، اور بچوں کی پرورش کو بھی پاکبازی کے خلاف قرار دیا۔

(Jones A.N.M.; The Decline of the Ancient World, p.121)

عیسائیت میں دنیاوی کاروبار کو بھی گناہ کا درجہ حاصل تھا۔ میدانِ جنگ میں دشمن کو مارنے والا سپاہی قاتل تھا۔ قتل کے مقدمے میں ملزم کی بیرونی کرنے والا ذلیل بھی قاتل گردانا جاتا تھا۔ بارہویں صدی میں ایک پوپ نے اعلان کیا کہ،

”یہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے دنیاوی عہدے حاصل کیے ہیں، وہ گناہ سے بری نہیں ہو سکتے۔“

(The Consice Encyclopedia of the Ancient World, p.121)

ایرانی عقائد اور یونانی فکر کے سہارے کلیسا نے بڑی جدوجہد کے بعد معاشرے کو دو جدا گانہ دائروں میں تقسیم کر کے انہیں سے ایک پر تسلط حاصل کیا تھا۔ اسی غمِ نیست کے طفیل کلیسا کی روحانی حکومت قائم تھی۔ اس کا

دائرۂ اقتدار عوام، حکومت اور ریاست کی دسترس سے باہر تھا۔ اسی کے طفیل اسے ان سب پر برتری حاصل تھی۔ اسی حیثیت کو اسلام سے خطرہ تھا۔

گناہ آدم اور نجات : اسلام میں گناہ آدم ایک انفرادی فعل تھا جو مشیت ایزدی کے تحت انجام پایا۔ اس کے اثرات اس کے فاعل تک ہی محدود رہے، اور استغفار کرنے پر یہ گناہ بخش دیا گیا۔ اس سے نسل انسانی متاثر نہیں ہوئی۔ اسلام کے نزدیک انسان پیدائشی گناہگار نہیں بلکہ پیدائش کے وقت یہ بے گناہ اور معصوم ہوتا ہے۔ دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اپنے اعمال کے مطابق یا تو نیکو کا رہتا ہے یا گناہگار بنتا ہے۔

عیسائیت نے گناہ آدم پر مبنی اپنا ہی ایک فلسفہ نجات ترحیب دیا۔ اس کے نزدیک آدم کے گناہ کے سبب ہر انسان گناہگار پیدا ہوتا ہے۔ زوال آدم نے انسانی فطرت کو اس طرح مسخ کر دیا تھا کہ اس سے سوائے گناہ کے کچھ اور سرزد ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس ازلی گناہ سے انسان کو بری کرنے کے لیے خدا نے پہلے تو ایک فرزند پیدا کیا، پھر اس کو زمین پر بھیجا تا کہ وہ صلیب پر چڑھ کر قربانی دے جو بنی آدم کے گناہوں کا مجموعی کفارہ بن سکے۔ پھر اس کفارے کے سبب انسان کو راہ نجات ملی۔

اسلام نے گناہ آدم کو غیر موروثی قرار دیکر عیسائی نظریہ نجات کے تار و پود بکھیر دیے۔ نہ انسان پیدائشی گناہگار رہا نہ اسکی مفروضہ آلودگی کے کفارے کی کوئی ضرورت رہ گئی۔ قربانی کا نظریہ ایک کہانی بن گیا، جو باعث نجات نہ بن سکتی تھی۔

اس منجی عقیدے کی رو سے نجات کا انحصار حضرت مسیح کی الوہیت تسلیم کرنے پر تھا۔ جس نے انکی الوہیت تسلیم کی وہ بلا شرط عمل نجات کا مستحق بن گیا۔ (cf. G.E. Grunebaum; Islam, p.139)۔ جس نے روگردانی کی وہ نجات سے محروم ہوا۔ اسلام میں نجات کا انحصار ایمان لانے کے بعد نیک اعمال کرنے پر تھا یا پھر اللہ کی رحمت پر کہ وہ اپنے فضل سے جسے چاہے بخش دے کہ وہ غفور الرحیم ہے۔

اسلام کا منطقی نظریہ نجات مغرب کے لیے خاصا پرکشش تھا۔ اس نے مغربی مفکرین کو خاصا متاثر کیا۔ سولہویں صدی کے مفکرین مسئلہ نجات پر بڑی سرگرمی سے بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ کلیسا کے قدیم عقیدہ نجات میں وہ نیک اعمال اور خدا کی رحمت کی شمولیت کو بھی ضروری قرار دینے لگے۔

لو تھر (Martin Luther) کے مطابق نجات کا انحصار ایمان کے بعد رحمت خداوندی پر تھا۔

اس نے دعویٰ کیا،

”انسانی فطرت زوال آدم کے سبب اس قدر مسخ ہو چکی تھی کہ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہ تھا کہ انسان شر کے سوا کچھ اور کر سکے۔ لہذا نجات کے حصول کے لیے صرف یہی رہ گیا تھا کہ مسیح (کے کفارہ) کی بدولت نجات پر پختہ یقین رکھے۔ اور نہ صرف خود کو اپنے اعمال ناجیہ کے ساتھ خدا کے سپرد کر دے بلکہ یہ اعتراف بھی کرے کہ کسی انسان کے لیے اس معاملے میں عملی حصہ لینا ممکن ہی نہیں۔ کیونکہ پوری نوع انسانی مردود ہو چکی تھی اور

محکم دلائل سے مزین و متنوع ومنفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

(The Concise Encyclopedia of the Living Faiths; p.154)

لو تھر کے اس نظریے سے کالون (John Calvin) متفق نہ ہو سکا۔ اس کے نزدیک نجات محض ایمان کی بدولت میسر نہیں آ سکتی تھی۔ اس کے لیے اعمال صالحہ ضروری تھے۔ اس نے اعلان کیا، ”کیا ہم یہ یقین کر سکتے ہیں کہ نجات نیک اعمال کیے بغیر محض ایمان کے سبب میسر ہو جائے گی۔ یہ بات ناممکن ہے کیونکہ یسوع مسیح پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہم نے ویسا ہی قبول کیا جیسا اس نے خود کو پیش کیا۔ اب اس کا وعدہ صرف یہی نہیں کہ موت سے ہمیں چھڑائے گا اور اپنی معصومیت کے طفیل خداوند پدر کے سایہ رحمت میں جگہ دیگا بلکہ یہ بھی ہے کہ مقدس زندگی گزارنے کے لیے ہمیں اپنی رحمت سے دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔“ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۵۵)

لو تھر اور کالون دونوں کے ہی نظریات کیتھولک عقیدہ نجات سے متعارض تھے۔ لو تھر کے نزدیک نجات رحمت پر اور کالون کے نزدیک عمل پر منحصر تھی۔ جبکہ کیتھولک عقیدے کی رو سے نجات کے لیے محض مسیح پر ایمان ہی کافی تھا۔ اس اختلافی مسئلے نے اس قدر اہمیت حاصل کی کہ اس پر غور اور حتمی فیصلہ کرنے کے لیے ۱۵۶۳ء میں ارباب کلیسا نے کونسل آف ٹرائنٹ طلب کی، جس نے پھر وہی قدیم فیصلہ دیا کہ ”فطری اعمال خیر اور شریعت موسوی کی پابندی بجائے خود نجات نہیں دے سکتے۔ نجات صرف مسیح کے توسط سے میسر آ سکتی ہے۔“ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۵۵)

کونسل آف ٹرائنٹ (Council of Trient) کے مندرجہ بالا فیصلے نے مسئلے میں اور بھی تندی اور تیزی پیدا کر دی۔ لو تھر ڈٹ کر کیتھولک کلیسا کے مقابلے میں آ گیا۔ پروٹسٹنٹ کلیسا قائم ہوا اور مغرب مذہبی خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔

کتبِ ساوی : عیسائیت اناجیل اربعہ اور یہودی کتب کو صحیفہ ساوی تسلیم کرتی ہے اور ان پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی مدعی ہے۔ جبکہ اسلام اس عقیدے کا حامل ہے کہ یہ کتب ادوار سابق کے لیے تھیں لیکن قرآن کے نازل ہونے کے بعد تمام قدیم کتب ساوی منسوخ ہو گئی ہیں۔ اب انہیں اس حد تک تو تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان ناموں کے صحائف کا نزول ضرور ہوا تھا، مگر رسالت محمدی سے قبل ہی کامل صحت کے ساتھ انکا کوئی نسخہ نہیں پایا جاتا تھا، اور تمام دستیاب نسخے تحریف و تصریف کا شکار تھے۔ اسلام کے مطابق ان ناموں کی کتب کا منزل من اللہ ہونا تو جزو ایمان تھا لیکن مروّجہ نام نہاد صحیفہ ساوی پر عمل پیرا ہونا نشانے الہی کے خلاف تھا۔

عبادت : عیسائیت میں عقائد میں شدید اختلاف کی طرح طریقہ عبادت میں بھی اس قدر اختلاف پایا جاتا ہے کہ ہر فریق دوسرے فریق کی عبادت کو فعل عبث تصور کرتا ہے۔ اسلام میں بندے کا معبود سے راست تعلق ہوتا ہے جبکہ عیسائیت میں ایک درمیانی رابطے کے بغیر یہ تعلق ممکن نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں عبادت کے لیے ساز و آہنگ ممنوع ہیں جبکہ عیسائیت میں انکا شمار عبادت کے لوازمات میں ہوتا ہے۔ اسلام میں شراب

ایسی نجاست ہے کہ اگر کپڑوں میں لگی ہو تو نماز نامقبول ہوتی ہے جبکہ عیسائیت میں شراب ایسی مقدس ہے کہ عشاءے ربانی کی تکمیل بلا شراب کے نہیں ہو سکتی۔

شعرا اور رسوم: عیسائیت کا مذہبی شعار صلیب ہے جبکہ اسلام کا کوئی شعار یا علامت نہیں ہے۔ عیسائیت میں ہفتے کا ایک دن سبت مقرر ہے، کیونکہ تخلیق سے تھک کر اس دن خالق کائنات نے (نعوذ باللہ) آرام کیا تھا۔ جبکہ اسلام خالق کائنات سے اس قسم کی کوئی کمزوری وابستہ نہیں کرتا۔ عیسائیت کے مذہبی تہواروں کو اسلام کوئی اہمیت نہیں دیتا، نہ ہی انکے ایام کے تقدس کا قائل ہے۔

عیسائیت میں ارباب کلیسا کو یہ اختیار ہے کہ وہ گناہگاروں کے گناہ معاف کر سکتے ہیں۔ اسلام اس قسم کا کوئی اختیار کسی کو نہیں دیتا ہے۔ گناہوں سے معافی کے لیے بندے کو صدق دل سے براہ راست اپنے رب کے حضور توبہ کرنی پڑتی ہے اور آئندہ گناہوں سے باز رہنے کا عہد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ صرف توبہ کر کے اللہ تعالیٰ اسکی توبہ قبول کو اس کے گناہوں کو معاف فرما دیں گے۔

ان سب اختلافات سے بڑھ کر یہ کہ اسلام میں قانون کا سرچشمہ صرف اللہ اور اس کا رسول ﷺ ہیں۔ کسی فرد یا جماعت کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ قرآن و سنت کے منافی کوئی قانون بنا سکے۔ لیکن عیسائیت میں پوپ اور اسکی مجلس کو قانون سازی کے مکمل اختیارات حاصل ہیں، اسکا حکم انسانی حکم نہیں بلکہ آسمانی حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ عقائد کے یہ اختلافات ارباب فکر کو موازنے کی دعوت دیتے رہے، جس کے باعث عیسائی معاشرے

میں بے چینی پھیلتی رہی۔ اس (Arrus) جیسے فرقے ابھرے جن کے نزدیک بپتسمہ بے فائدہ ہوتا ہے، نااہل پادریوں سے کوئی مقدس کام نہیں ہو سکتا، عشاءے ربانی ایک فضول رسم ہے، آخر حق کا بدن کتنی روٹیوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ گناہ کے اقرار سے گناہ کی تلافی نہیں ہو سکتی۔ کلمات کا اور فضول ہے، اصل اہمیت تو اعمال کی ہے۔ چرچ سوائے پتھروں کے ڈھیر کے کچھ بھی نہیں ہے۔ صلیب انسانی ہاتھوں کی صنعت کے سوا اور کیا ہے؟ نجات رسوم سے نہیں بلکہ صرف عمل کے ذریعے ہوگی۔ (W. Stark; the Sociology of Religion, p.322)۔

یہ تھے وہ مذہبی اثرات جنہوں نے عہدِ وسطیٰ میں مغربی معاشرے کو متلاطم رکھا۔ کلیسا کے لیے مسائل پر مسائل پیدا کیے۔ کلیسا کے خلاف تحریکوں میں شدت پیدا ہوئی۔ مذہبی اصلاحات کے مطالبات اٹھے۔ کالون اور لوٹھر نے پوپ اور کیتھولک عقیدوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ لوٹھر نے ۱۵۱۷ء میں پوپ کے معافی ناموں کی فروخت کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وٹنبرگ (Wittenberg) کے چرچ کے دروازے پر پینچا نوے [۹۵] اعتراضات کی ایک دستاویز آویزاں کی۔

(cf. George Pearson; Towards One World, p.6)

چرچ نے اسے بدعتی قرار دیکر مذہب سے خارج قرار دیا۔ جب اصلاحات کے مطالبات با اقتدار چرچ نے تسلیم نہیں کیے تو مصیبتیں کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہ گیا کہ جداگانہ حیثیت اختیار کر کے اپنے عقائد کی روشنی میں اپنی روش متعین کریں۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

۱۰۷ باب دوم: ریاست اسلامیہ کی توسیع، عہد وسطیٰ کا مغرب

لو تھر کے پرنسٹن چرچ کے قیام نے یہ واضح کر دیا کہ پوپ کا اقتدار جزو مذہب نہیں، اور عبادت بلا کسی صورت کے بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے لاطینی زبان کی بھی شرط نہیں۔ عقائد تبدیل ہو سکتے ہیں۔ گناہوں کی معافی کا اختیار اب کلیسا کو نہیں ہے اور کفار سے کے بغیر بھی توبہ ہو سکتی ہے۔

تحریک اصلاح میں اسلامی عقائد کے اثرات پوری طرح سے جھلکتے ہیں۔ اس تحریک کی وجہ سے پوپ کا اقتدار مجروح ہوا۔ پرنسٹن چرچ نے صحیفہ ساوی کو مین و عن تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان میں شامل کئی کتابوں کو (مثلاً مقایسوں کی پہلی اور دوسری کتاب) الحاقی [اضافی] کتب قرار دیکر انہیں عہد نامہ قدیم سے خارج کیا۔ (The Concise Encyclopedia of the Living Faiths; p.118)

اس طرح اسلام کی وجہ سے مغربی معاشرے پر اس قدر شدید اندرونی اور بیرونی دباؤ پڑا کہ عہد وسطیٰ کے کیتھولک چرچ کے لیے اپنی بقا کی جنگ لڑنا ناگزیر ہو گیا۔

نفوذِ اسلام کے معاشی نتائج اور معاشرتی اثرات

مغرب کا تائیناک ترین دور یا تو رومن ایمپائر کا زمانہ تھا یا دورِ حاضر ہے۔ رومن ایمپائر بنیادی طور پر ایک فوجی ریاست تھی، جس نے گرد و پیش کے علاقوں خصوصاً سامی تہذیب کے گہوارے پر قبضہ کر کے اسے بہترین استحصال کا شکار کر رکھا تھا۔ (Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. VI, p.202)۔

مقبوضہ صوبوں سے آمدنی : مقبوضہ صوبہ جات سے حاصل ہونے والے ٹیکسوں کے کچھ اعداد و شمار بابِ اول میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ اعادہ کرنا کافی ہوگا کہ مصر سے سولہ لاکھ [۱۶,۰۰,۰۰۰]، نو میدیا سے اٹھتر ہزار [۸,۰۰,۰۰۰] اور ماریطانیہ سے اکتالیس ہزار [۴۱,۰۰,۰۰۰] سولیدی سالانہ ٹیکس وصول ہوتا تھا۔ (cf. Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.8)۔ دیگر ستانوں سے صوبوں کی آمدنی کے اعداد و شمار کا کوئی پتہ نہیں چلتا۔ ان سترہ لاکھ سولیدی سے ساڑھے چار لاکھ فوج کی سالانہ تنخواہ ادا ہو سکتی تھی، تو بقیہ صوبوں، بشمول شام، عراق، فلسطین، اردن، لبنان، آرمینیا، ایشیائے کوچک وغیرہ کی آمدنی سے پوری رومن ایمپائر کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اطالیہ کے باشندے ہر قسم کے ٹیکسوں سے مستثنیٰ تھے۔

پورے ایمپائر میں باقاعدگی سے مردم شماری ہوتی تھی۔ ٹیکس دہندگان کے رجسٹر مرتب ہوتے تھے تاکہ کوئی شخص پول ٹیکس کی ادائیگی سے بچ نہ سکے۔ عیسائی روایات کے مطابق، حضرت عیسیٰ کی پیدائش اسی سال ہوئی جس سال رومن ایمپائرِ یوڈیہ میں مردم شماری کروا رہی تھی۔ اس مردم شماری میں حصہ لینے کے لیے انکی والدہ، مع دیگر افراد خاندان، بیت لحم (Betlehem) تشریف لے گئی تھیں، اور یہیں حضرت عیسیٰ کی پیدائش ایک غار میں ہوئی۔ (Fouard, Abbe Constant; The Christ The Son of God, pp.28-30)۔

دستور کے مطابق حضرت عیسیٰ کا اسم گرامی بھی اس مردم شماری یا اس کے بعد ہونے والی مردم شماری میں درج ہوا ہوگا۔ اور اگر انہوں نے بھی ٹیکس ادا کیا ہوگا تو یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رومن ٹیکس سے (نفوذِ بالذہ) فرزندِ خدا بھی مبرا نہ تھا۔

پول ٹیکس سے زیادہ اہم ذریعہ آمدنی مالِ مزارعی تھا۔ اگر مالِ مزارعی کی شرح ہر صوبے میں یکساں تھے، تو زمین کی تخمینہ قیمت کا ایک فی صد سالانہ مالِ مزارعی کی شکل میں وصول ہوتا تھا۔ زمین اور کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

نفوس کے علاوہ جائیداد ٹیکس، تجارتی مال پر کسٹم اور بکری ٹیکس (Sales Tax) بھی عائد تھے۔ ورثے میں منتقل ہونے والے اثاثوں پر پانچ فیصد وراثت ٹیکس لگتا تھا۔ [for details of taxes confer, Jones] (A.H.M.; The Decline of the Ancient World)۔ غرض یہ کہ رومن ایمپائر کے اخراجات کا بار ایشیائی اور افریقی مقبوضات پر تھا۔ (Keith Neil Cameron; Humanity and Society, p.198)

غلے کی درآمد : رومن نظم و نسق کے ذمہ دار محکموں میں ایک محکمہ (The Praefectus Annonee) کہلاتا تھا۔ اس محکمے کے ذمے افریقہ اور مصر سے غلے کا حصول، اسکی بار برداری، حمل و نقل اور روم میں اسکی تقسیم تھی۔ (Jones A.H.M.; The Decline of the Ancient World, p.17) شہر قسطنطنیہ کی ضروریات کی تکمیل کا انحصار شام کے غلے کی درآمد پر تھا۔ مغرب، بشمول یونان، غلے میں خود کفیل نہیں تھا۔ قدرتی وسائل کی کمی کے سبب، پورا یورپ زیادہ سے زیادہ تجارت کی کوشش کرتا تھا۔ اسلامی دور میں مغرب غلے کی درآمد سے اس وقت تک محروم رہا جب تک مصر سلطنت عثمانیہ کا صوبہ نہیں بن گیا۔ [Cook, M.A.; 1974 ed., Legacy of] (Islam, article 'Economic Development', p.225)

رومن معیشت اور غلام : رومن معیشت کا انحصار غلاموں کی جبری مشقت پر تھا۔ پیداواری لاگت کم کرنے کے لیے زمین پر آزاد کسانوں کے بجائے غلاموں سے مشقت لی جاتی تھی۔ رومن معیشت میں غلام ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے تھے۔ رومن فوج کے لیے ہتھیاروں کی تیاری، کانکنی، کچھ ہاتھوں کا نکالنا، اسے پکھلانا، گڑھنا اور ہتھیار بنانا، سب کچھ غلاموں کا کام تھا۔ مشہور رومی شاہراہیں، جن پر رومی افواج رواں دواں رہتی تھیں، ان ہی غلاموں کی تیار کردہ تھیں۔ روم کی تمام عمارتیں، اکھاڑے، غسل خانے، نہریں اور بدرویں، سب کی سب غلاموں کی محنت کا نتیجہ تھیں۔ روم کی تجارت میں بھی غلاموں کی محنت کو بڑا دخل تھا۔ سڑکوں پر قافلوں کا سامان غلام ہی لیکر چلتے تھے۔ بندرگاہوں میں حمل و نقل، بار برداری اور جہازوں کو کھینے کا کام غلام ہی کرتے تھے۔ لیکن چونکہ غلاموں کی نسل بڑھنے نہیں دی جاتی تھی، اس لیے ملک ان کی مستقل درآمد کا محتاج تھا۔ انکی درآمد زیادہ تر افریقہ اور ایشیا سے ہوتی تھی۔ غلاموں کی تجارت بھی روم کی اقتصادیات کا اہم جزو تھی۔ غلاموں کی بدولت ملک کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا تھا جو بغیر محنت کیے زندگی بسر کرتا تھا۔ امرائے سلطنت، سینیٹرز، ان کے اہل خانہ، فوج، فوجی گھرانے، افسران و ملازمین سرکار، کلیسا کے ارکان، دارالحکومت کے شہری، دلال وغیرہ سب کے سب غلاموں کی محنت پر پلے تھے۔ ہر میدان میں غلاموں کا تناسب آزاد شہریوں کے مقابلے میں نوے فیصد تھا۔

(Keith Neil Cameron; Humanity and Society, p.187)

زراعت، صنعت اور تجارت : مغربی رومن ایمپائر میں قابل کاشت زمین کم تھی۔ جرمنی اور فرانس کا علاقہ محض جنگلات کا ٹھکانہ تھا۔ ساحل بحر روم پر کاشت ہوتی تھی۔ یہ کاشت عام طور پر ان اشیاء کی ہوتی تھی، جو تجارت اور صنعت کے لیے درکار تھیں۔ انگور اور زیتون بنیادی پیداوار تھی، جو اطالیہ کی بندرگاہوں سے مقبوضات (Colonies) کو برآمد کی جاتی تھی جبکہ مقبوضہ جات سے غلہ، کپڑا، دھاتیں، مصالحہ جات خوشبوئیات، روئی،

ریشم، شہد، انجیر، پنیر اور جانور وغیرہ درآمد کیے جاتے تھے۔ اس طرح مغرب کی تجارت خسارے کی تجارت تھی۔ لیکن یہ خسارہ مقبوضات کے ٹیکسوں سے پورا ہو جاتا تھا۔ اس تجارت نے ملک بھر میں سڑکوں کا جال بچھا دیا۔ جہاز رانی کو ترقی دی۔ بارونق بندرگاہیں، تجارتی شہر، کارخانے، بازار، گودام، صرافہ اور ان سے متعلق دیگر عمارتوں کی تعمیر کروائی۔ صنعتوں میں اسلحہ سازی، پارچہ بانی، جہاز سازی، شراب سازی، تعمیرات، رنگریزی، اون اور چمڑے کی اشیاء کی صنعت، ظروف سازی، مجسمہ سازی اور سنگ تراشی کو عروج حاصل تھا۔

اقتصادی دباؤ : رومن اقتصادیات کا انحصار استحصال پر تھا۔ اس استحصال کے تین اہم عنصر تھے۔ فوج، تاجر اور غلاموں کے آقا۔ فوج نے سامی تہذیب کو پنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اس کے بل پر رومن ایمپائر مقبوضات سے کمر توڑ ٹیکس وصول کرتی تھی۔ تاجر اس وصول کردہ مالیہ کو گردش دیتا تھا، اور سامی تہذیب کی پیداوار من مانے داموں پر خرید کر لاتا تھا۔ مغربی تاجر کے پاس تجارت کا توازن برقرار رکھنے کے لیے شراب اور زیتون کے تیل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آقا اپنے غلاموں سے عمر بھر کام لیتا تھا، انہیں جانوروں کی طرح پابہ زنجیر رکھتا تھا اور ان کی نسل کو بڑھنے نہیں دیتا تھا، تاکہ وہ رومن معاشرے میں جذب ہو کر شہریت کا دعویٰ نہ کر سکیں۔ (cf. Cameron; Humanity and Society, p.176)۔ ایک ایک آقا کے پاس غلاموں کی ایک فوج ہوتی تھی، جس کی کمائی کے بل بوتے پر وہ زندہ رہتے تھے۔ ان غلاموں کے انسانی حقوق تو کجا، ان میں روح کی موجودگی کو بھی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ ["Niggers have no Souls", quoted by Toynbee]

[A.J.; 'A study of History', Vol I, p. 152)

نفوذ اسلام سے قبل سامی تہذیب نے ہیللا (Hella) کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد کرانے کی بار بار کوشش کی جو ہمیشہ ناکام ہوئی۔ اسلام نے سامی تہذیب کے علاقوں کی جانب فاتحانہ پیش قدمی کی تو سامی تہذیب نے اسے خوش آمدید کہا اور ہلینک غلامی کا جو اپنے کاندھوں سے اتار پھینکا۔

سامی علاقوں کے گرفت سے نکلنے ہی ہلینک دنیا اپنے ہزار سالہ قدیم استحصالی وسائل سے محروم ہو گئی۔ فوج شکستیں کھا کر اپنے علاقے میں پسپا ہو گئی، جس کے سبب مقبوضات کے ٹیکس ختم ہو گئے۔ مصر و شام کے غلے کے گودام رومن ایمپائر کے لیے بند ہو گئے۔ رومن ایمپائر کے پاس شراب اور زیتون کے سوا برآمد کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ان میں سے شراب مسلمانوں کے لیے مفت بھی قابل قبول نہیں تھی۔ صرف زیتون نہ کسی ایمپائر کو قائم رکھنے کے قابل تھا نہ کسی تہذیب کی مدد کر سکتا تھا۔ نفوذ اسلام کے بعد تجارت کی باگ سامی دنیا کے ہاتھ میں آ گئی۔ مغربی دنیا کا دوسرا رکن تاجر بھی مفلوج ہو گیا۔ ایک نسل کے بعد غلام بھی نایاب ہو گئے۔ مغرب کو اپنے اقتصادی وسائل پر ہی اکتفا کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

مغرب کی اقتصادی بد حالی کی جو کیفیت خود مغرب بیان کرتا ہے، اس میں مبالغہ بھی مان لیا جائے تو بھی حقیقت سے بہت دور نہیں ہو سکتی۔ مسلم فتوحات کے نتیجے میں مغرب کی اقتصادی بد حالی کا نقشہ ہماری پائیرین کے الفاظ میں ملاحظہ ہو۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

”ساتویں صدی کی رومن ایمپائر کا معاشرہ بحرِ روم کا معاشرہ تھا۔ اسلام کے دباؤ کے نتیجے میں یہ معاشرہ بری طرح متاثر ہوا۔ بحرِ روم کا بیشتر علاقہ اس معاشرے کے قبضے سے نکل گیا۔ وہ سمندر جسے ہمارا سمندر کہا جاتا تھا، غیروں کا ہو گیا۔ اس سمندر کے ذریعے جو رابطہ مشرق و مغرب کے درمیان تھا، وہ منقطع ہو گیا۔ وہ برادری جواب تک قائم تھی برباد ہو گئی۔“

ساتویں صدی سے گیارہویں صدی تک اسلام بلا شرکتِ غیرے بحرِ روم کا مالک رہا۔ عیسائی اقوام کی جہاز رانی اٹالیہ اور اریانوپل کے درمیان ساحلی تجارت تک محدود ہو کر رہ گئی۔

..... اس بیدخلی کے باعث یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مغرب کو تہذیب کے دائرے سے خارج کر دیا گیا ہو۔ کیونکہ ابتدائے تاریخ سے مہذب زندگی کے تمام عناصر اور معاشرتی ارتقاء کے تمام لوازم اسے مشرق ہی سے ملے تھے۔ بجا کہ اسپین اور افریقہ کے ساحل پر عربوں کی شکل میں مشرق اس کی دہلیز پر موجود تھا لیکن ماؤی تعلقات کے باوجود مذہبی اختلاف نے عیسائی دنیا اور مسلم مشرق میں اخلاقی ربط ضبط نہ پیدا ہونے دیا۔ رومن ایمپائر کے قیام کے بعد سے پہلی بار مغربی یورپ بقیہ دنیا سے منقطع ہوا تھا۔ بحرِ روم کے، جس کے توسط سے اس کا تعلق مہذب دنیا سے تھا، دروازے مغرب کے لیے بند ہو چکے تھے۔ مغربی عیسائیت کے لیے تاریخِ عالم کے واقعات میں اسلام کا نفوذ انتہائی اہم نتائج کا حامل تھا، کیونکہ اس کے سبب وہ قدیم راہیں مسدود ہو گئیں جن کے توسط سے اس کا تعلق بقیہ دنیا سے قائم تھا۔ مغرب بیرونی دنیا سے منقطع ہو کر صرف اپنے وسائل پر گزر بسر کرنے پر مجبور ہو گیا۔

نصف ساتویں صدی کے بعد بحرِ روم کے مغربی ساحلوں پر تجارت قطعاً ختم ہو گئی۔ مارسیز اپنے بحری بیڑے سے محروم ہو کر حالتِ نزع میں تھا۔ نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ جنوبی فرانس کا ہر شہر تباہی کی انتہا پر پہنچ گیا۔ سمندری راہوں کے مسدود ہوجانے سے پورے ملک میں تجارت قطعاً ختم ہو گئی۔ متوسط طبقہ ناپید ہو گیا اور پیشہ ور تاجروں کا وجود مٹ گیا۔ اشیائے فروخت کی گردش تھم گئی، جس کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ شاہی خزانہ مارکیٹ کی آمدنی سے محروم ہو گیا۔ خزانہ خالی ہوا تو حکومت کے تمام محکمے اور ادارے درہم برہم ہو گئے۔“

(Henry Pirenne; A History of Europe, pp.50-52, 72)

تجارت کے زوال کے باعث ملکی معیشت کا سارا بوجھ زراعت اور زمینی پیداوار پر آ پڑا۔ ملک میں زمیندار اور جاگیردار کی اہمیت اور اس کا اقتدار بڑھنے لگا۔ معاشرے میں مکمل اقتدار زمین کے مالکوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ اب جو طبقہ امراء، ابھرا وہ جاگیرداروں اور زمینداروں پر مشتمل تھا۔ زمین بادشاہ کی مرضی سے تقسیم ہوتی تھی، اور فوجی خدمات کے عوض عطا کی جاتی تھی۔ جب زمینیں ختم ہو گئیں تو بادشاہ کے پاس کچھ بھی نہ رہ گیا۔ جاگیردار زمین کے مالک بن گئے اور ان کے آگے بادشاہ بے بس ہو گیا۔ اس طرح مغرب میں فیوڈل سسٹم کی بنیاد پڑ گئی۔ اسلام کے فاتحانہ اقدام نے مغرب کو ازمنہ قدیم کے معاشی دور میں دھکیل دیا۔

معاشرتی دباؤ: اقتصادی دباؤ نے مغرب میں معاشرتی نکتہ نظر سے جو اہم تبدیلی پیدا کی وہ شہروں کی تیزی سے تحلیل تھی۔ ہنری پائرین نے تو اس قدر غلو کیا کہ میروینجن عہد میں شہری آبادی کے وجود سے ہی انکار کر دیا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

(حوالہ بالا، صفحہ ۴۹)۔ رومن ایمپائر میں شہر ریاست کی بنیادی وحدت تھا۔ شہری بلدیہ اس علاقے کی سیاسی نمائندگی کرتی تھی۔ شہروں کی تحلیل نے اس انتظامی ڈھانچے کو ہلا دیا۔ علاقے کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ مغرب میں سرکاری دفاتر، قانونی ادارے، یہاں تک کہ درس گاہیں تک اجڑ گئیں۔ سرکاری ملازمت اور اداروں کی موروثی رکنیت، جو کسی زمانے میں باعث عزت تھی، آٹھویں صدی میں بے عزتی اور سزا کی صورت و حیثیت اختیار کر گئی۔ (Dozy R.; Spanish Islam, Book II, P.215)۔ لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر فرار ہونے لگے، کیونکہ ملکی معیشت شہری زندگی کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تھی۔

عوام تو عوام، خودمیر و نجمن بادشاہ خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے۔ معاشرے سے متعدد طبقات ناپید ہو گئے۔ صرف دو بڑے طبقے باقی رہ گئے۔ جاگیردار اور کسان (Serf)۔ جب تک مغرب کے قبضے میں ایشیائی اور افریقی مقبوضات باقی تھے، ہر بحران کو بہ آسانی محکوم صوبوں پر منتقل کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ بحران کہیں اور منتقل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مغربی معاشرے کو خود اس کا شکار ہونا پڑا۔

معاشرتی تبدیلی نے مزید اقتصادی مسائل پیدا کیے۔ کاشتکار اپنے ٹیکس اجناس کی شکل میں دینے لگا، کیونکہ اس کی پیداوار ہی صرف اجناس تھیں۔ لین دین صرف اشیاء کی شکل میں (Barter System) ہونے لگا۔ سکہ ناپید ہو گیا۔ (John Bowl; A New Outline of World History, p.188)۔ محنت کی تقسیم کار معطل ہوئی۔ پیداواری رشتے ختم ہوئے۔ خریدار کوئی نہ تھا اس لیے پیداوار گھٹ کر صرف اپنی ضروریات کی حد تک محدود ہو گئی۔ زمین سب کچھ ہو گئی۔ معاشرے میں جوع الارض پیدا ہو گئی۔ بڑے نے چھوٹے کو مزید نچلے طبقے میں دھکیلنا شروع کیا۔ کسان زمین سے قانوناً باندھ دیا گیا۔ کسان کا پیشہ موروثی ہو گیا۔ اگر کوئی زمین چھوڑ کر بھاگنا چاہتا تو اس کے لیے کسی اور جگہ زمین حاصل کرنا ناممکن ہو گیا، اس لیے کسان ہر حالت میں زمین سے چمٹا رہتا۔ زمین بکتی تو وہ بھی بک جاتا۔ اس کی قسمت مالک سے وابستہ ہو گئی۔ مالک اور کسان کے معاملات میں بادشاہ کی مداخلت کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ یہ نیا نظام فیوڈل سسٹم تھا۔ اس نئی اقتصادیات کو علمائے معاشیات نے 'فطری اقتصادی نظام' (Natural Economy System) کا خوبصورت نام دیا۔

اس نظام کے فطری نتائج یہ نکلے کہ فاضل پیداوار بے مصرف ہو گئی۔ فاضل پیداوار نہ ہونے کے باعث ترقیاتی منصوبے نہ بن سکے۔ معاشرہ جامد ہو گیا اور ارتقاء تہذیب تھم گیا۔ صنعتی انقلاب آنے تک مغربی معاشرہ اسی ڈگر پر چلتا رہا۔

اسلام کے ثقافتی اثرات

مغرب کی نمائندگی کلیسا کو حاصل تھی۔ اس کی تشویش گویا مغرب کی تشویش تھی۔ جہاں مسلم ثقافت نے مغرب کے لیے بیشار مسائل کھڑے کیے، وہیں اسے بھرپور انداز میں متاثر بھی کیا، اور اس نے مغرب کے لیے موجودہ ارتقائی منازل طے کرنے کی راہ ہموار کی۔ موجودہ مغربی ثقافت کا ہر گوشہ مسلم ثقافت کا مرہون منت ہے۔ مسلم ثقافت نے اسے آزاد فکر اور غیر مستعار شعور عطا کیا۔ یہ فکر و شعور کلیسا کی نظر میں بغاوت تھا۔ اسی لیے کلیسا مستقلاً مسلم ثقافت کے اثرات سے برسرِ پیکار رہا۔ انہیں مغربی ذہن سے نکالنے کے لیے خود اپنے ہی معاشرے سے دست و گریباں ہوا۔ مغرب نے جب کلیسا کو اپنی راہ میں حائل دیکھا تو اسے پرے دھکیل کر اپنی موجودہ راہوں پر گامزن ہوا۔

زبان : اسلام جہاں جہاں پہنچا عربی زبان بھی وہاں پہنچی۔ عربی اس قدر توانا اور ہمہ گیر زبان ثابت ہوئی کہ اس نے مفتوحہ علاقوں کی مروجہ زبانوں کے علوم کا صحت کے ساتھ احاطہ کر کے ان زبانوں کو بیدخل کر دیا۔ ایران میں اس نے فارسی کی جگہ سنبھالی۔ شام و فلسطین میں اس نے سیریائی (Syriac) اور یونانی زبانوں کی جگہ لی۔ اسی طرح لاطینی مغرب میں جہاں جہاں اسلام پہنچا اس نے لاطینی زبان کو بھی بیدخل کیا۔ سیریائی، یونانی اور لاطینی زبانیں عیسائیت کی علمی اور مذہبی زبانیں تھیں۔ جب تک یہ زبانیں مروج تھیں، یہاں کی ثقافت عیسائی ثقافت تھی۔ علم ان زبانوں کے طفیل عیسائی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ان زبانوں کی بیدخلی نے علم کے شعبے سے عیسائیت کی اجارہ داری ختم کر دی۔ چند صدیوں میں یہاں سے عیسائی اعلیٰ تعلیم ناپید ہو گئی اور اسکی جگہ نئی اعلیٰ تعلیم نے لے لی جو بنیادی طور پر اسلامی تھی، اسکا ذریعہ تعلیم عربی زبان تھی۔

-(cf. Montgomery Watt; What is Islam?, p.181)

زبان کی تبدیلی نے ثقافتی ماحول تبدیل کر ڈالا۔ عرب لٹریچر سے وابستگی اور لاطینی سے بیگانگی، مسلم ممالک کے عیسائیوں میں عام ہونے لگی۔ اربابِ کلیسا کے لیے عربی زبان ایک خطرہ بن گئی۔ عہد وسطیٰ کے ایک پرجوش ہسپانوی عیسائی نے اس کیفیت کے بارے میں تحریر کیا،

”خود ہمارے عیسائی، عربی شاعری اور رومان کے دلدادہ ہیں۔ وہ مسلمان فقہاء اور فلاسفہ کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ لیکن اس لیے نہیں کہ انکا ازالہ کر سکیں، بلکہ اس لیے کہ صحیح عربی اسلوب کو اپنائیں۔ آج ڈھونڈے سے بھی ایسا عام آدمی نہیں ملتا جو مقدس اناجیل کے لاطینی تبصرے پڑھ سکے۔ کوئی نہیں جو بشارتوں اور رسولوں کو پڑھتا ہو۔ افسوس کہ عیسائی نوجوان جو اپنی ذہانت کے لیے ممتاز ہیں، سوائے عربی کے، کسی اور ادب سے

واقف نہیں۔ وہ نہایت ذوق و شوق سے عربی ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اپنے کتب خانے انہوں نے زیرِ کثیر صرف کر کے ان کتب سے بھر رکھے ہیں۔ جگہ جگہ عربی علم و فضل کے ترانے گاتے ہیں۔ طرفہ یہ کہ اگر عیسائی کتب کا ذکر آجائے تو وہ ناخوشگوار انداز میں احتجاجاً کہتے ہیں کہ یہ کتب انکی توجہ کے قابل نہیں ہیں۔ صدمہ تو یہ ہے کہ عیسائی خود اپنی زبان سے نابلد ہو گئے ہیں۔ مشکل سے ہزار میں ایک ایسا ملے گا جو معمولی لاطینی میں اپنے کسی دوست کو خط بھی لکھ سکے۔ لیکن اگر عربی کی بات ہو تو بے شمار ایسے ہیں جو اپنے مافی الضمیر کا اظہار نہایت بلند پایہ انداز میں کر سکتے ہیں، بلکہ ایسے اشعار بھی کہہ لیتے ہیں جو صحت اور اسلوب میں خود عربوں کے اشعار سے بہتر ہوتے ہیں۔“

(Quoted by R. Dozy; Spanish Islam, Translated by F.G.Stokes, p.268)

کیسا نے اس تشویش کو نفرت میں تبدیل کیا اور عربی کو ایک مرتد اور ذلیل نسل کی زبان قرار دیکراس کی تکفیر (Anathematism) کی، اور کارڈینیل زیمینس نے غرناطہ میں اسی ہزار عربی کتب سر عام جلوائیں۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۲۶۸)۔ بہر کیف کیسا کی پالیسی کے سبب یورپ میں عربی زبان اور عربیت سے نفرت عام ہو گئی۔ (Legacy of Islam; 1974 ed., p.35)۔ لیکن عربی علوم کی ضرورت ختم نہ ہو سکی۔ اس پیچیدگی کا نتیجہ یہ نکلا کہ علمی سرفے ہونے لگے۔ عربی زبانوں کے لاطینی اور دیگر زبانوں میں تراجم اصل مصنفین کی جگہ عیسائی پادریوں سے منسوب ہونے لگے۔ (Juan Vernet; Legacy of Islam, article 'Science', p.586)۔

مسلم ثقافت کا نفوذ : مسلم ثقافت مختلف سمتوں سے تاجروں، سیاحوں، علماء، طلباء اور خصوصاً ہسپانیہ اور سسلی کے عوام کے ذریعے مغرب پر اثر انداز ہونے لگی۔ مغرب میں مسلم ثقافت کے اثر و نفوذ کا اندازہ ان عربی الفاظ سے بخوبی ہو سکتا ہے جو لاطینی اور دیگر یورپی زبانوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ سائنس، فلکیات، ہندسہ (Geometry)، کیمیا، طب، عطاری (Pharmacy)، تکنالوجی اور فلسفے میں عربی الفاظ اور اصطلاحات کی بکثرت موجودگی، اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ علمی اور ادبی سطح پر مسلم ثقافت نے بھرپور انداز میں مغرب کو متاثر کیا ہے۔

آداب پر اثر : ہسپانوی مورخ کاسترو (A. Castro) نے بڑی تفصیل سے اپنے ملک پر مسلم اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے مطابق عوامی حمام سے لیکر غسل میت، عورتوں کے نقاب سے لیکر فرش و قالین پر نشست کے آداب، شہسواری کی شائستہ روایات سے لیکر مہمان نوازی اور اپنے گھر کو مہمان کے حوالے کر دینے، خود بھوکا رہ کر اوروں کو کھلانے، دست بوسی کا انداز سوال، انکار کی صورت میں معذرت کے آداب، یہاں تک کہ مسلم لباس خصوصاً زنانہ لباس سے شدید رغبت، یہ سب کے سب وہ طور طریقے ہیں جو بلا شک و شبہ اسلامی ثقافت سے اخذ کیے گئے تھے، اور ہسپانوی عیسائیوں میں مسلمانوں کے بعد عرصے تک قائم رہے۔

(A. Castro; The Structure of Spanish History, p.128)

آرائش و زیبائش : صنعت و حرفت کے خاتمے نے مغرب کو مجبور کر دیا کہ وہ آرائش و زیبائش کے لیے مسلم ممالک سے ضروری اشیاء حاصل کرے۔ ان اشیاء میں قالین اور کپڑے سر فہرست تھے۔ عہد وسطیٰ میں قالین اس قدر مقبول تھا کہ سفراء، تھپنوں کو بدشاہوں اور پادریوں کی خدمت میں تحفہ پیش کرتے تھے۔ شاہی درباروں سے

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

لیکر گر جاگھروں کی مقدس قربان گاہیں تک قالینوں سے مزین ہوتی تھیں۔ یورپ کا قدیم ترین قالین پندرہویں صدی عیسوی کا وہ قالین ہے جو شمالی سوئڈن کے دیہات مارلی (Marly) کے گر جاگھروں میں ہے۔

(Richard Ethnhausen; 1960 ed., The Legacy of Islam, article 'The Impact of Muslim Decoration on the Art of Europe', p.292)

شاہی اور مذہبی تقاریب میں استعمال ہونے والے لباسِ فاخرہ نہ صرف مسلم ممالک کے تیار کردہ ہوتے تھے بلکہ مسلم ثقافت کے غماز بھی ہوتے تھے۔ مقدس رومن ایمپائر (Holy Roman Empire) کے شہنشاہ تخت نشینی کے وقت ایک روایتی عبا زیب تن کرتے تھے۔ یہ عباسلی کے حکمران راجر ثانی کے لیے ۱۱۳۳ء میں ہلمو میں بنائی گئی تھی۔ اسے تخت نشینی کے موقع پر زیب تن کرنے کا رواج ۱۸۰۶ء تک جاری رہا۔ اس پر ایک شیر کی تصویر بنی ہوئی تھی جو ایک اونٹ کو پھاڑ رہا تھا۔ اس کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس عبا کا پورا حاشیہ عربی خطاطی سے مزین تھا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۲۹۹)۔ اسی طرح جرمن شہنشاہوں کی عبائے شاہی بھی عربی خطاطی سے مزین ہوتی تھیں۔

یورپ کا سکہ: حروبِ صلیبیہ میں کامیابی کے بعد مغرب کو سرزمینِ فلسطین میں اپنے سکے کی ضرورت پڑی تاکہ عربوں سے تجارت کی جاسکے۔ مغرب کا یہ اولین سکہ طلائی تھا۔ اس کا دلچسپ ترین پہلو یہ تھا کہ ۱۲۴۹ء تک یہ سکہ عربی رسم الخط میں مضروب ہوتا رہا۔ اس پر قرآنی آیت اور حضور ﷺ کا اسم گرامی (غالباً کلمہ) منقش تھا۔ تاریخِ اجراء سنِ ہجری میں دی جاتی تھی۔ یہ سکہ پوپ انوسنت چہارم کے حکم سے منسوخ کیا گیا۔ اس قبیل کے سکے تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر تک جنوبی فرانس میں رائج تھے۔

(Earnest Barker; 1960 ed., The Legacy of Islam, article 'The Crusade')

برٹش میوزیم میں مرشیا (Mercia) کے عیسائی بادشاہ 'اؤفا' (Offa) کا ایک طلائی سکہ مجریہ ۸۷۷ء محفوظ ہے۔ (Museum, No. Pl-3, No. 1)۔ یہ سکہ عربی دینار سے بیدمشابہ ہے۔ عربی رسم الخط میں ایک جانب اؤفا کا نام اور دوسری جانب کلمہ طیبہ کندہ ہے۔

عجمیہ کی مقبولیت: پندرہویں صدی میں دھات کے منقش گنگا جمنی اور پچی کاری سے مزین طشت، قاب، پیالے، صندوقے، مشعل دان اور دیگر ظروف و ساز سامانِ یورپ میں بید مقبول تھے۔ یہ صنعت یورپ میں ازیمینہ (Azzimina) کہلاتی تھی، اور یورپی صنعت تھوڑی جاتی تھی۔ لیکن اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لفظ 'ازیمینہ'، 'عجمیہ' کا بگڑا ہوا تلفظ ہے۔ [Richard Ethnhausen; The Legacy of Islam,]

[article 'Impact of Muslim Decoration on the Art of Europe', p.303]

علوم و فنون پر مسلم اثرات

مغرب عہد وسطیٰ میں علوم و فنون سے بے بہرہ تھا۔ لکھنا پڑھنا صرف کلیسا کا کام تھا۔ معاشرے کے دیگر طبقات کے لیے اسکی نہ اہمیت تھی نہ ضرورت۔ محنت کش اس سے بیگانہ تھے اور فیوڈل لارڈ قلم کو اپنے شایان شان نہ سمجھتے تھے، جبکہ تمام عالم اسلام علم و فن کی روشنی میں دمک رہا تھا۔ مسلمانوں نے ساری دنیا سے علم و فن کے جواہر چن کر عربی کے خزائنہ علم میں جمع کر دیے تھے۔

مروجہ علوم کی دیگر زبانوں سے عربی زبان میں منتقلی کا کام، ابتدائی عباسی دور (نویں صدی عیسوی) میں مکمل ہو چکا تھا۔ منتقلی کے بعد انہیں جلا بخشے اور ترتیب دینے کا کام صدیوں جاری رہا۔ مسلم تہذیب و تمدن میں ان علوم کا بڑا دخل تھا۔ کلیسا ان علوم سے متعفن اور خائف تھا، انہیں جزو اسلام تصور کر کے اس نے علوم کو شجر ممنوعہ قرار دے دیا تھا۔ ممانعت اور پابندی کے باوجود یہ علوم آہستہ آہستہ روشنی اور خوشبو کی طرح اسپین اور سسلی میں سرایت کرنے لگے۔

پروفیسر الفریڈ گیللاؤم (Alfred Guillaum) نے یہ دعویٰ کیا کہ موجودہ یورپ کا معاشرہ دراصل یہود کا مروجہ منت ہے۔ اور اس دعوے کی دلیل یہ پیش کی کہ اگر یہود صدیوں اسلامی علوم کا مغربی زبانوں میں ترجمہ نہ کرتے تو مغرب میں تیرہویں صدی کا احیائے علوم ہرگز ممکن نہ ہوتا۔ اور احیائے علوم کے بغیر نشاۃ ثانیہ کا وجود بھی نہیں ہوتا۔ [cf. Alfred Guillaum; The Legacy of Israel,]

[article 'The Jewish Factor in Medieval Thought']

پروفیسر گیللاؤم نے ان کتب کی ایک طویل فہرست فراہم کی ہے جنہیں یہودیوں نے عربی سے لاطینی میں منتقل کیا۔ ان میں فلسفہ، سائنس، ریاضی (Mathematics)، نجوم (Astronomy)، فلکیات، جغرافیہ، طب اور قانون کی کتب بکثرت ہیں۔ ریاضی، طب اور جغرافیہ جیسے علوم تو مغربی معاشرے کے لیے سودمند ثابت ہوئے لیکن فلسفہ اور سائنس نے شدید پیچیدگی پیدا کی۔

جیسے جیسے اسپین اور سسلی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلتے گئے، کلیسا کے دباؤ کے تحت مقامی آبادی کو جبراً عیسائیت قبول کرنی پڑی۔ یہ نئے عیسائی اپنے علمی کام عربی میں جاری نہ رکھ سکے اور انہیں علمی زبان کی حیثیت سے لاطینی کو اپنانا پڑا۔ اب یہ اصحاب علم جو عربی مدرسوں کے شاگرد تھے، یورپ کے اساتذہ کی حیثیت سے ابھرے۔ انہیں ان حکمرانوں کی سرپرستی حاصل ہونے لگی جو کلیسا کے دباؤ میں نہیں تھے۔ ان میں فرانس اور سسلی کے حکمران سرفہرست تھے۔

سائنس : کلیسائے مقدس کے نزدیک یہ علوم کالاجادو، شرمناک، ناپاک، شیطانی اور لعنتی تھے اور ان کو حاصل کرنے والے مردود تھے۔ (Inge, W.R. Dean; The Church in the World, p.52)۔

یورپ کے سیکولر طالب علم جو چھپ چھپ کر ان علوم کو حاصل کر رہے تھے، جب ان علوم کی صحت و صداقت کے قائل ہوئے تو انکی صحت ثابت کرنے پر قتل گئے۔ کلیسا نے انکے خلاف سخت کارروائی کی۔ یوں کلیسا اور سائنس کے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی۔ اقتدار کلیسا کے ہاتھ میں تھا۔ علمائے سائنس پر وہ جانکاہ مظالم ہوئے جنکو تحریر کرتے ہوئے مؤرخ کا قلم کانپتا ہے۔

(Hallam; Constitutional History of England, Vol. I, Chapter II, p.62)

چرچ اور سائنس میں اختلافی نکتہ یہ تھا کہ مذہب نے قدیم یونانی نظریاتِ سائنس کو عقائد کا مرتبہ دے دیا تھا۔ سائنس اپنے نظریات میں بے آسانی ترمیم کر سکتی ہے لیکن مذہب کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ انسان کا وجود زمین پر لاکھوں سال سے ہے۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ زندگی ایک ارتقائی عمل ہے۔ علاج حکمت ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ساری باتیں اگر مذہب مان لیتا تو انجیل مقدس کی تعلیمات پر ضرب پڑتی، جسکا ایک نظریہ اگر غلط مان لیا جاتا تو دوسرے عقائد اور نظریات پر سے بھی ایمان اٹھ جاتا۔ اس جنگ میں فتح آخر کار سائنس کی ہوئی۔ [بد قسمتی سے مسلمانوں میں مدرسے کے استادوں نے بھی کچھ اسی قسم کا وپیرہ اختیار کر کے سائنس کی مخالفت شروع کر دی، جو اب بھی جاری ہے۔ انہوں نے بھی عیسائی اور یہودی نظریات کو اسلامی عقائد کی حیثیت دی ہوئی ہے۔]

فلسفہ: جس طرح سائنس نے مغربی معاشرے میں ایک خانہ جنگی برپا کی اسی طرح فلسفے نے خود کلیسا کی صفوں میں ایک فکری بے چینی کی لہر دوڑادی۔ مسلم فلسفے کا وجود عیسائیت کے حق میں عطائے تو بہ لقاے تو کا معاملہ تھا۔ کیونکہ آٹھویں صدی عیسوی میں جب مسلم مملکت کی روز افزوں توسیع، استحکام اور مفتوحہ علاقوں میں بڑے پیمانے پر قبولِ اسلام نے اربابِ کلیسا کو خوف زدہ کیا تو انہوں نے طے کیا کہ اسلام کی بنیادوں پر حملے کیے جائیں۔

(Alfred Guillaum; The Legacy of Islam, article 'Philosophy and Theology')

فلسفہ یونان نے کلیسا کے لیے بہت سارے مسائل پیدا کیے تھے۔ عیسائی کلیسا میں ان مسائل پر صدیوں بحث جاری رہی تھی۔ ان مسائل نے عیسائیت کو دھڑوں میں تقسیم کر ڈالا تھا۔ اربابِ کلیسا نے اس موقع پر ان مسائل کا رخ اطمینان سے اسلام کی طرف موڑ دیا۔ مسائل ذات و صفات، خالق و مخلوق کا تعلق، جبر و قدر، خیر و شر وغیرہ۔ یہ مسائل مسلمانوں کے لیے اجنبی تھے۔ کلیسا کی توقع کے عین مطابق ابتداً فلسفے نے عالمِ اسلام میں بھی انتشار پیدا کیا۔ خلقِ قرآن اور جبر و قدر کے مسائل اس شدت سے ابھرے کہ ملت کو ہتھوڑ کر رکھ دیا۔

ان مسائل کا عقائد سے گہرا تعلق تھا۔ مسلم علماء نے ان پر بھرپور توجہ دی۔ فلسفے کے تخریبی پہلو پر قابو پا کر اسے تعمیری انداز عطا کیا۔ اب تک فلسفے کو کسوٹی تسلیم کر کے اس پر مذہب کو پرکھا جاتا تھا۔ اب وحی الہی کو کسوٹی بنا کر فلسفے کی فضائے سبیط میں پرواز شروع کی گئی۔ [قرآن کا اپنا فلسفہ حیات و کائنات انتہائی مستحکم ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی دشواری بھی پیش نہیں آئی]۔ فلسفے پر مذہب کی گیرائی ایک نیا عنصر تھا جو فکرِ یونانی سے خارج تھا۔ اب مسلمانوں نے فلسفے میں روحانیت شریک کر کے اسے نہ صرف نئی وسعتیں دیں، بلکہ فلسفے کو دین کا محافظ بنادیا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

یہ تھا وہ فلسفہ جو عالم اسلام سے مغرب کا رخ کر رہا تھا۔ فلسفے نے اپنی سادہ شکل میں ہی عیسائیت کو سرگرداں کر رکھا تھا۔ اب یہ دو آتشہ ہو کر حواس پر مسلط ہونے لگا۔ ارباب کلیسا کے لیے اس جانب توجہ دینا لازمی ہو گیا۔ عیسائی تھیولوجی کو تقویت دینے اور متبادل نظریات مرتب کرنے کے لیے مسلم فلاسفہ کے کارناموں کو لاطینی میں منتقل کیا جانے لگا۔ غزالی، رازی اور ابن العربی کلیسا کے لیے مفید نہیں تھے، اس لیے انہیں عمداً نظر انداز کیا گیا۔ (Franz Rosenthal; 1974 ed., The Legacy of Islam, article 'Literature')

جبکہ الکندی، فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کے افکار کو اہتمام کے ساتھ لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ ان میں ابن سینا اور ابن رشد وہ فلاسفہ تھے جنہوں نے صدیوں فکر مغرب کو مرہون منت رکھا۔

ابن سینا: ابن سینا کے افکار میں اشراقیت، تصوف، اور رہبانیت نے عیسائی علماء کو اپنی طرف متوجہ کیا، تاکہ وہ سینٹ آگسٹائن کی تعلیمات کے لیے فلسفیانہ بنیادیں حاصل کر سکیں۔ ان دونوں کی ہم آہنگی سے جو فکر نو وجود میں آئی اسے سینائی آگستریزم (Avecanon Augustinism) کہا گیا۔

تیرہویں صدی کے عیسائی مفکرین مثلاً ولیم آف آرگنٹا، الیگزندر آف ہیلز، جین لاروشلی، سینٹ بوناوچر، فرانسسکن، رابرٹ گراسٹ، جان بیکنہم اور راجر بیکن سب کے سب ابن سینا سے متاثر نظر آتے ہیں۔ البرٹ مینکن نے روح کی تعریف ابن سینا سے مستعار لی، اور تھامس اکویناس بھی ابن سینا کے فکری نظریات اپنائے بنا رہ سکا۔ غرض یہ کہ ان کے اثرات اتنے ہمہ گیر تھے کہ ارباب کلیسا نے ۱۲۱۰ء میں ایک حکمنامہ کے ذریعے ان کے افکار کی درس و تدریس یونیورسٹیوں میں ممنوع قرار دیدی۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۳۸۳)

ابن رشد: عیسائیت کی بنیاد افلاطون کے نظریات پر تھی۔ افلاطون کے نظریے 'نیز' میں فطرت ایک مذہب کے استوار ہونے کی گنجائش تھی۔ رواقیت (Stoicism) نے اسے جلا بخشی اور خیر کو مقصد حیات قرار دیکر راحت و الم کے جذبات سے بے نیاز ہونے کی تعلیم دی۔ رواقیت کا مذہب فکر زینو نے چوتھی صدی قبل مسیح میں قائم کیا تھا۔ عیسائیت کی ابتدائی شکل اسی فلسفے پر مبنی تھی۔ (M. Watt; What is Islam?, p.189)۔

عیسائیت نے صرف لفظ لُذ (Good) کو گاڈ (God) سے بدل دیا۔ (Nick Earl; Culture and Creed) ارسطو مذہب اور سیاست میں بہت کم دلچسپی لیتا ہے۔ اس نے ہر اس شے کو 'خوب' قرار دیا جس کے نتائج خوب ہوں۔ اسکی فکر کا ہر موضوع خواہ وہ سائنس ہو یا مابعد الطبیعات، علل و نتائج کا تابع تھا۔ اس اعتبار سے ارسطو کی فکر عیسائیت کے لیے بے فائدہ تھی۔

ابن رشد کا تعلق ارسطو کے مکمل فکر سے تھا، جس کے باعث ارباب کلیسا ان کی فکر کو عیسائی نظریات کے استحکام کے لیے استعمال نہ کر سکتے تھے۔ پھر وہ اس جانب کی بنی مائل ہوئے، اسکی توضیح نہیں ملتی۔ شاید اس لیے کہ ان کی فکر عالم اسلام میں غیر مقبول تھی اور خطرہ سمجھی جا رہی تھی۔ ان کے افکار کی تردید میں امام غزالی بیسی جلیل القدر شخصیت کو قلم اٹھانا پڑا تھا، شاید اس لیے انہیں اپنے مطلب کے لیے مفید سمجھا گیا ہو، یا شاید اس لیے کہ ان کے افکار میں رواقیت سے زیادہ کشش تھی۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ابن رشد وہ واحد مسلم مفکر ہیں جن کے افکار صدیوں مغرب پر ایک طلسم بن کر چھائے رہے۔ اطالیہ میں انکا اثر سولہویں صدی عیسوی تک رہا۔ موجودہ سائنسی دور تک، فلسفے پر انہیں سند تسلیم کیا جاتا رہا۔

(Alfred Guillaum; 1966 ed., The Legacy of Islam, article 'Philosophy and Theology')

ایک طرف تو ارسطویت کے نام سے وہ عیسائی چرچ کی تھیولوجی پر مسلط ہوئے تو دوسری طرف چرچ کے مخالفین کو انکی ذات نے مستحکم قوتِ فکر و استدلال عطا کی۔

(Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. X, p.248)

مغربی معاشرے کو یہ قوت نہ تو رومن تہذیب دے سکی تھی نہ عیسائی کلیسا۔ جلد ہی ابن رشد کلیسا کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن گئے۔ اربابِ قلم نے انکے اثرات زائل کرنے کی کوشش کی۔ ابن رشد سے فرضی نظریات منسوب کیے گئے۔ ان فرضی نظریات کا کلیسا اور یونیورسٹیوں نے سختی کے ساتھ احتساب کیا۔ نہ صرف نظریات کو رد کیا گیا، بلکہ ان کے سہارے ابن رشد کو بھی ملعون و مردود قرار دیا گیا۔ (Rdshdall; Unversities, Vol. I, p.368)۔ پیرس یونیورسٹی نے ان کے افکار کی درس و تدریس پر پابندی لگائی۔ عیسائی دنیا کے عظیم ترین مسیحی عالم سینٹ تھامس اکویناس نے ابن رشد کے افکار کے بطلان اور ازالے کا بیڑہ اٹھایا اور مشہور کتاب 'سومہ' (Summa) تحریر کی۔ سینٹ تھامس کو جو عظمت میسر آئی، وہ اس لیے نہیں کہ اس نے ابن رشد سے کچھ سیکھا، بلکہ اس لیے کہ اس نے ابن رشد کے افکار کی تردید کی بلکہ انہیں ذلیل کرنے کی کوشش کی۔

(Southern R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.73)

ابن رشد کلیسا کے اعصاب پر کس قدر چھائے ہوئے تھے، اسکا اندازہ چودھویں صدی کی ان تصاویر سے ہوتا ہے جنکا موضوع سینٹ تھامس کی ابن رشد پر فتح ہے۔ ان میں سب سے مشہور وہ پینٹنگ ہے جو چلسی میں واقع سینٹ کیتھرائن کے گرجا کی دیوار پر ۱۳۶۵ء میں بنائی گئی۔ اسکا فوٹو کتاب 'لیکسی آف ازرائیل' اسکفورڈ ۱۹۵۳ء (Legacy of Israel) میں شامل ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ،

”سینٹ تھامس کو علم و حکمت آسمان سے خداوند مسیح اور تمام عیسائی بزرگوں نیز یونانی فلسفیوں سے مل رہی ہے جس کی بدولت انکے قدموں میں ایک عرب خنجر چل پڑا ہوا ہے۔“

یہ عرب کوئی اور نہیں ابن رشد ہیں۔ اس تصویر کا عنوان ہے،

'Saint Thomas Triumphs Over Averraes'

یہ تصویر ابن رشد کی ہمہ گیری کے ردِ عمل اور اعتراف کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اثراتِ مابعد

مسلم علوم کے ثقافتی اثرات نے مغربی معاشرے کو آزادانہ غور و فکر کا راستہ دکھایا، جبکہ کلیسا انکی اجازت نہیں دیتا تھا۔ مغرب نے ان ہی خطوط پر سوچنا شروع کر دیا جن پر مسلمان سوچتے تھے۔ اس فکری تبدیلی کی بدولت مغربی معاشرے میں ایک ایسی سرد جنگ پرورش پانے لگی جس نے بالآخر انقلابی شکل اختیار کر کے قومی ریاستوں کو جنم دیا اور کیتھولک چرچ کو منقسم کیا، جس سے عیسائی چرچ کلیساؤں میں بٹ گیا۔ نہ نظریاتی عیسائی جمہوریہ رہی، نہ ہی یونیورسل چرچ باقی رہا۔ دوہرے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ چرچ ریاست سے دست بردار ہو کر گر جا کی چار دیواری میں پناہ گزیں ہوا، اور چرچ سے تعلق فرد کا انفرادی معاملہ بن گیا۔

•

باب سوم

مغرب کا ردِ عمل

- ۱۔ اسلامی اثرات کے خلاف اقدامات
- ۲۔ چرچ کا کردار
- ۳۔ نظریاتی محاذ
- ۴۔ انیسویں صدی عیسوی اور نظریاتی حملے

اسلامی اثرات کے خلاف اقدامات

اسلام کے باعث مغرب پر جو سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور معاشرتی دباؤ پڑا اس نے شدید ردِ عمل پیدا کیا۔ زرتشتیت، بدھ مت اور دیگر مذاہب کو اس قدر تہمتوں اور ملامتوں کا ہدف کبھی بھی نہیں بنایا گیا جتنا اسلام کو۔ دیگر مذاہب سے مغرب کو نہ تو مسابقت کا سامنا کرنا پڑا نہ ہی کبھی وہ عہدِ وسطیٰ کے مغرب کے لیے خطرہ بنے۔ لہذا اذلاً خوف، اور پھر دشمنی اور تعصب وہ عناصر تھے جنہوں نے مغربی تصورِ اسلام میں رنگ بھرے اور طرزِ عمل کا تعین کیا۔ اسلامی عقائد دشمن کے عقائد تھے پس غلط نہ بھی تھے تو مشکوک ضرور تھے۔

(Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.49)

ابتدائی میروئجین عہد تک یہ ردِ عمل اس قدر شدید نہیں تھا۔ چنانچہ کارونجین عہد کی تحریروں میں مغرب کی روایتی تلخی اور نفرت کا وجود نہیں پایا جاتا۔ [Southern R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.18]۔ جب آلِ اغلب نے سسلی کو فتح کر کے (۸۲۷ء تا ۸۳۱ء) اٹالیہ پر حملے شروع کیے، وہاں اپنی امارتیں قائم کیں، ۸۳۶ء میں عیسائیوں کے مقدس شہر روم کو زغے میں لیا اور اسکے نزدیک ایک پہاڑی قلعے گاری گلیانو (Gari Gilliano) کو اپنا مستقر بنالیا تو اربابِ کلیسا میں شدید بے چینی پیدا ہوئی۔ ۸۷۵ء میں جب عربوں نے دوسری بار روم پر حملہ کیا تو حقیقی معنوں میں اسلام دشمنی شروع ہوئی۔ (Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, pp.57-58)۔ کلیسا نے دانستہ اور ارادی طور پر اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا آغاز کیا۔ ابتدا یہ ہم دفاعی نوعیت کی تھی لیکن کچھ عرصے کے بعد ہی اس میں جارحیت پیدا ہو گئی۔

پروپیگنڈہ: عیسائیت ایک تبلیغی مذہب ہے۔ جس دور میں اسلام مہذب اور متمدن علاقوں کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا، اسی دور میں عیسائیت غیر متمدن نیم وحشی جرمن اقوام کو حلقہِ گوش کر رہی تھی۔ یہ اقوام علم و فکر سے بیگانہ تھیں۔ جس سرعت کے ساتھ انہوں نے اپنی آبائی بت پرستی ترک کر کے کیتھولک مذہب کو قبول کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پروپیگنڈے سے بہ آسانی متاثر ہو سکتی تھیں۔

پروپیگنڈے کی طاقت سے رومن کلیسا ناواقف نہ تھا۔ اس لیے کہ پروپیگنڈے کے موجود ہی مذہبی مبلغین تھے۔ (Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. II, p.216)۔ یہ پروپیگنڈہ ہی تھا جس نے بائبل اور آشوری فوجی تہذیبوں کو نیست و نابود کیا تھا، (حوالہ بالا)۔ خود عیسائی معاشرے کا قیام اور مغرب کا وجود پروپیگنڈے کا مرہونِ منت تھا۔ پروپیگنڈہ ایک جنگی ہتھیار ہے جو کمزور اور محصور معاشروں کو کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ثقافتی شعور عطا کر کے ان میں قوت اور مقاومت پیدا کرتا ہے۔ کلیسا نے اس ہتھیار کا استعمال نہایت موثر انداز میں کیا۔ مغربی ذہن کو اس انداز سے متاثر کیا کہ آئندہ ہزار سال اس سے اسلام کی مخالفت دور نہ ہو سکی۔ اس کا نعرہ تھا کہ، ”بیرون کلیسا نجات نہیں“۔ (EXTRA ECCLESIAM NULLA SALUS)۔

(Montgomery Watt; What is Islam, p.198)

نجات کو کلیسا سے مختص کر کے کلیسا نے دیگر ادیانِ عالم کو بیک جنبشِ قلم اس صفتِ عالیہ سے محروم گردانا، جن میں اسلام بھی شامل تھا۔ انہوں نے باور کرایا کہ کائنات میں حق و باطل کا وجود ہے، جس میں حق عیسائیت تھی اور باطل اسلام تھا۔ جس طرح حق و باطل کا میل نہیں اسی طرح عیسائیت کسی اور مذہب کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی۔ (Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, p.46)۔

کلیسا نے اسلام کو بے دینی اور دشمنِ عیسائیت قرار دیا۔ مسلمانوں کی کامیابی کو حضرت عیسیٰ کی بے حرمتی اور عیسائیوں کی کامیابی کو انکی سر بلندی سے تعبیر کیا۔ (حوالہ بالا)۔ اسلام کے فرضی اضماع گھڑے۔ بے شمار ایسے مقدس پادریوں کا فرضی قتل مسلمانوں سے منسوب کیا، جنکا [میتھ] جرم یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کے بت توڑ ڈالے تھے۔ (cf. Southern R. W.; Western Views of Islam, pp.23-24)۔ جوشِ بیان میں ایسے پادری بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل کر دیے جو طووع اسلام سے صدیوں پیشتر گزرے تھے۔

(Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, p. 59)

انہوں نے بانی اسلام کے اسمِ گرامی کا تلفظ اس طرح بدلا کہ اس کے اعداد کا مجموعہ کسی طرح سے [۶۶۶] بن جائے۔ یہ عدد دانیال نبی کے خواب کے اس درندے (Beast of Revelation) کے تھے، جسے دشمنِ عیسیٰ یعنی دجال (Anti-Christ) تصور کیا جاتا تھا۔ (Henry Stubb; Rise and Fall of Muhammadanism, p.143)۔ مسلمانوں کے لیے نفرت انگیز الفاظ مثلاً میکین (Pagan)، انفذل (Infidel)، فرزندِ تاریکی، شیطان، شیطان کے پجاری، وحشی، دشمنِ عیسیٰ و عیسائیت، ناپاک جہنمی، وغیرہ استعمال کیے۔ شدتِ جذبات میں پوپ جیسی مقدس ہستی کی زبان سے ان کے لیے ’ولد الحرام‘ (Sons of fornication) کے الفاظ ادا ہوئے۔ [Attributed to Pope John VIII, by]

[Norman Daniel in 'The Arabs and the Mediaeval Europe', p.76]

پروپیگنڈے نے جوشِ دینِ نفرت پیدا کی اس کا اندازہ اس مقولے سے ہو سکتا ہے کہ ”صرف ایک مردہ سراسن [مراد مسلمان] ہی ایک اچھا سراسن ہے“۔ (The only good Saracen is a dead Saracen)۔ (حوالہ بالا صفحہ ۹۶)۔ اسلام اور داعی اسلام سے متعلق عہدِ وسطیٰ کی تحریروں کا جائزہ آنے والے ابواب میں تفصیلاً لیا جا رہا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ پروپیگنڈے کی اس مہم میں پوپ اور سپاہی، شاہ و گدا، فلسفی اور گپ باز، مؤرخ اور افسانہ نویس، اساتذہ اور مبلغین، غرضکہ ہر کہہ و مہم نے حسبِ توفیق حصہ لیا۔ یہ ایک ایسا سلی رواں تھا جو تمام اقدارِ عالیہ کو بہالے گیا۔ اس مہم میں صحت و صداقت یا علمی دیانت نام کی کسی چیز کو کوئی دخل نہیں تھا۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

یہ حقیقتاً صرف جنگی پروپیگنڈہ تھا، جس کے ذریعے مغربی معاشرے کے گرتے ہوئے حوصلوں کو نفرت کے سہارے بحال کیا گیا۔ اس میں دفاعی قوت پیدا کی گئی، اور اسی پروپیگنڈے کی بدولت مغرب کو جارحیت کی راہ پر گامزن کیا گیا۔ اور اس جارحیت کے لیے مغربی عقائد میں دور رس تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔

عقائد و الہیات میں ترامیم: شنیّت کے زیر اثر کلیسا اور ریاست دو جداگانہ ادارے تھے۔ حکومت کے عہدے قبول کرنا، فوج میں شامل ہونا، معاشرتی ذمہ داریاں اٹھانا، بال بچوں کی پرورش، یہاں تک کہ خود اپنی ذات کی فلاح و بہبود، یہ سب ناپسندیدہ اور ممنوعہ امور تھے۔ نویں صدی عیسوی میں خود کلیسائے مقدس ان امور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ حکومت کے ہر شعبے پر کلیسا کے کارکن قابض ہوئے۔ عیسائیت کے ظہور کے بعد آٹھ سو سال تک نظریاتی ریاست کا تصور تک پیدا نہ ہوا تھا۔ لیکن اب نویں صدی میں اسلام کی نظریاتی مملکت کی پیروی میں ’مغربی جمہوریہ مسیحیہ‘ کا قیام عمل میں آیا۔

عیسائیت عدم تشدد کا مذہب تھا۔ جارحیت اسکی تعلیم کے منافی تھی۔ ایک رخسار پر تھپڑ مارنے والے کو دوسرا رخسار پیش کرنے کا حکم تھا۔ جنگ کا تعلق صرف دنیا دار سے تھا۔ دیندار کے نزدیک یہ ایک گناہ عظیم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ روم پر عربوں کے دوسرے حملے کے بعد جب پوپ جان ہشتم نے ۷۵۸ء میں اپنے حلیفوں سے کلیسا اور عیسائیت کی حفاظت کے لیے فوجی مدد طلب کی، تو خود کلیسا کے بشپ متردد ہوئے۔ اور انہوں نے پوپ سے ان لوگوں کے حشر کے بارے میں سوال کیا جو ”خدا کے مقدس چرچ، عیسائی مذہب اور دولت مشترکہ“ کے دفاع میں کام آجائیں۔ پوپ نے جواب دیا کہ،

”اے یقین ہے کہ وہ لوگ جو بت پرستوں اور بے دینوں سے کیتھولک مذہب کے لیے شدید جدوجہد کرتے ہوئے مارے جائیں گے، انہیں ابدی سکون میسر ہوگا۔“ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۸)

عقیدے میں یہ تبدیلی ”مقدس جنگ“ کے لیے پہلا زینہ تھی۔ یہیں سے عیسائی الہیات میں مقدس جنگوں کا باب کھلا۔ تاہم پوپ جان کافوئی ہمہ گیر نہ تھا۔ یہ صرف ان افراد تک محدود تھا جو اس فوج میں شریک تھے، جسے پوپ کے حلیفوں نے دفاعی مقصد کے لیے کلیسا کو فراہم کیا تھا۔ جان کے جانشینوں نے اس چنگاری کو ایک شعلہ جو الہ بنا دیا۔ سسلی اور اسپین میں عیسائی کامیابیوں نے یہ توقع پیدا کر دی کہ عیسائی دنیا اگر کوشش کرے تو عالم اسلام سے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس حاصل کر سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے بڑے پیمانے پر فوجی کارروائی درکار تھی۔ مغربی اقتصادیات ان جنگوں کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتی تھی، لہذا رضا کار فوج کا منصوبہ بنایا گیا، جس کے لیے ایک معقول نظریے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ کلیسا نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مذہبی جنگ کا نظریہ وضع کیا۔ مختلف عناصر کو آہستہ آہستہ یوں ترتیب دیا کہ عدم تشدد کی جگہ تشدد و جارحیت عیسائیت کا عقیدہ بن گئے۔

جنگی عقیدہ: عہد نامہ قدیم کے مطابق یہوا (خدائے جنگ) صرف اسرائیل کا خدا تھا۔

(Exodus, Chapter 15)۔ اور اسرائیل اسکی پسندیدہ قوم تھی۔ اسی قوم کے ذریعے یہوا عمل پیرا ہوتا تھا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ارض مقدس (فلسطین) یہوا کی پانچواں تھی، جسکی فتح اور بعد ازاں دمار کے لیے خود یہوا ”رب الافواج“ کی حیثیت سے اسرائیل کے ہمراہ شریک جنگ ہوتا تھا۔

یہوا، ارض مقدس میں سوائے اسرائیل کے کسی اور قوم کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ارض مقدس کو غیروں کے وجود سے پاک رکھنا، اور یہوا کے دشمنوں سے انتقام لینا بنی اسرائیل پر فرض تھا۔ یہوا کی منتقم مزاجی کا یہ عالم تھا کہ اگر اسکی محبوب قوم اسرائیل بھی ایسے احکام کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوتی تو اسے بھی تباہ کر دیتا۔ اسرائیل کے گناہوں کی سزا شکست اور تباہی تھی۔

یہ سارے عقائد آہستہ آہستہ عیسائیت میں بھی عام ہو گئے۔ رہی کسپر پوپ اربن نے پوری کر دی۔ اس نے بنی اسرائیل کی جگہ فریٹکس قوم کو ”خدا کی قوم“ (People of God) بنادیا۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, p.112)

”خدا کی قوم“ کا نظریہ فریٹکس قوم کی فطری جنگجویی کے عین مطابق تھا۔ اس نظریہ نے عام آدمی اور کلیسا کے کارکنوں کے درمیان دہنی ہم آہنگی پیدا کر دی۔ خداوند یسوع مسیح بھی، یہوا کی طرح، جنگوں میں حصہ لینے لگے۔ یہاں تک کہ مریم اپنی حریفوں کے ہمراہ مسلح افواج کو نیست و نابود کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ (حوالہ بالا، تفصیلات کے لیے باب چہارم)۔ بنی اسرائیل کی طرح فریٹکس قوم کا بھی یہی فرض ہوا کہ اپنی توانائیاں خدا کی بادشاہی کی وسعت کے لیے وقف کر دیں۔ ارض مقدس کو خداوند یسوع مسیح کی پانچواں (Terra sua) کی حیثیت حاصل ہوئی، جسکا فتح کرنا اور وہاں عیسائی حکومت قائم کرنا فریٹکس قوم کے لیے فرض ٹھہرا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۱۱)۔ اور خدا کے دشمنوں کو تباہ کرنا مذہبی فریضہ قرار پایا۔

شکست و فتح : بنی اسرائیل کی شکست و فتح کا عقیدہ بھی عیسائیت نے من و عن اپنایا۔ چونکہ خدا خود شریک جنگ ہوتا تھا اس لیے فتح تو اسکی خوشنودی کی علامت تھی۔ لیکن اس شرکت کے باوجود اگر شکست ہوتی تو اس شکست کی توضیح اسرائیلی انداز میں یہی کی گئی کہ یہ شامت اعمال کا نتیجہ تھی، جسے خداوند نے شکست کی صورت میں ان پر مسلط کیا۔

غرضیکہ کہ کلیسا نے مغرب کو ایک موثر نظریہ جنگ عطا کیا، جس کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ اسپین میں مغلوب عیسائیوں کی جنونی تحریک چلی اور گیارہویں صدی میں پوپ کی ایک آواز پر صلیبی پرچم کے سائے ایک قیامت صغریٰ مشرق پر ٹوٹ پڑی۔ صلیب کے بادل چھٹے ہی تھے کہ منگول طوفان نے عالم اسلام کو تہہ و بالا کر ڈالا۔ اس طوفان کی آنکھت میں پوپ کی مساعی کو بھی دھل گیا تھا۔

اسپین کی تحریکِ منافرت

علوم کا پتہ: مغرب میں اسپین وہ سرزمین ہے جہاں مسلمانوں کا دور حکومت طویل ترین رہا۔ یہاں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں اسلامی اور عیسائی ثقافتیں آٹھ صدیوں تک پہلو بہ پہلو قائم رہیں۔ یہ معاشرہ چار گروہوں میں منقسم تھا۔

۱۔ مسلم سلطنت کے مسلم باشندے

۲۔ مسلم سلطنت کے عیسائی باشندے، جنہیں موزاراب (Mozarabs) کہا جاتا تھا۔

(عربی لفظ مستعرب)

۳۔ عیسائی سلطنت کے عیسائی باشندے

۴۔ عیسائی سلطنت کے مسلم باشندے جنہیں مداجر (Mudejares) کہا جاتا تھا۔

(عربی لفظ المدجن، مأخوذ بہ وجن)

ان میں سے ہر گروہ کی ایک جداگانہ تاریخ ہے۔ مسلم سلطنت کے مسلمانوں کی ساری توانائیاں اپنی بقا کی جدوجہد میں صرف ہوتی تھیں۔ جبکہ عیسائی سلطنت کے عیسائی باشندوں کا مٹج نظر ہمیشہ بھی رہا کہ اسپین سے مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دیں۔ چنانچہ عہدِ وسطیٰ کا قومی ہیرو وہی تھو رہو تھا جس نے کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے وجود کو نقصان پہنچایا ہو۔ ان کی خاطر خواہ مثالیں سد (El Cid)، رولینڈ، شارلین، الفانسو، فردینینڈ اور ازابیلا ہیں۔

عیسائی سلطنت کے مسلم باشندے ان حالات میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے جن میں انکی ثقافت کی جداگانہ حیثیت ختم ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں مسلم ریاست کے عیسائی باشندوں کو ہمیشہ ہر قسم کی آزادی اور سہولت میسر رہی، جس کے باعث وہ ہمیشہ مطمئن رہے۔ ان کے اطمینان کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ آٹھ سو سالہ دورِ حکومت میں کسی وقت اور کسی جگہ موزاراب کی بغوت کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ (cf. R. Dozy; Spanish Islam, p. 235)۔ مسلم سلطنت میں عیسائیوں کو مکمل مذہبی، معاشی اور معاشرتی آزادی حاصل تھی۔ اس کے باوجود ۸۵۰ء میں ایک شدید تحریکِ منافرت چلائی گئی۔ پوری تحریک کا غائر مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی بنیاد صرف تعصب، نفرت اور کلیسائی پروپیگنڈے پر تھی۔

اس تحریک کی ابتدا و ایسے عیسائیوں سے ہوئی جن کے رویے نے مسلمانوں میں بے چینی پیدا کی۔ ان افراد کو قانون کے حوالہ کیا گیا اور قانون نے ان کو آزادی۔ کلیسائے اسی مزاکو بہانہ بنا کر یہ شدید تحریکِ منافرت پیدا کی۔ پہلا شخص ایک عیسائی راہب پرفیکٹس (Perfectus) تھا، جس سے قریب میں کسی بے فکرے نے ازراہ تفنن یا تجسس یہ دریافت کیا کہ کیتھولک حضرت عیسیٰ اور آں حضرت ﷺ کے بارے میں کیا عقیدہ

رکھتے ہیں۔ اس نے حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کا اعلان کیا اور حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔ اس نے بائبل کا حوالہ دیا کہ ”... بہت سے جھوٹے نبی میرے بعد آئیں گے۔“ اور پھر یہ کہا کہ ”ان میں سب سے بڑے کذاب..... تھے۔“

بے فکروں نے قتل کا ثبوت دیا اور اس راہب سے درگزر کیا۔ یہ بات رفتہ رفتہ عوام میں پھیل گئی۔ دوسری بار جب راہب بازار آیا تو عام بے چینی پھیل گئی۔ لوگوں نے اسے قاضی کی عدالت میں پیش کر دیا۔ وہاں بھی اس نے دل کھول کر سب و شتم سے کام لیا، جس کے نتیجے میں اسے سرعام پھانسی دی گئی۔ تختہ دار پر بھی آخری دم تک سب و شتم کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسرا شخص ایک عیسائی تاجر جان تھا۔ یہ شخص سودا فروخت کرتے ہوئے کثرت سے حضور ﷺ کے نام کی قسمیں کھایا کرتا تھا۔ موقع بے موقع اس میں دم کے پہلو بھی ہوتے تھے۔ جس کے سبب اسے بھی قاضی کے رو برو پیش کیا گیا، جہاں اسے تازیانوں اور گدھے پر شہرِ گشت کی سزا دی گئی۔

پادری آئزک : ان دو واقعات کو حیلہ بنا کر عیسائیوں نے تحریک شہیدان (Martyr's Movement) شروع کر دی۔ حکومت کا ایک سابق کاتب آئزک، جس نے نواحِ شہر کی ایک خانقاہ میں رہبانیت اختیار کر رکھی تھی، یکا یک بھڑک اٹھا۔ عدالت میں پہنچ کر اس نے قاضی سے کہا کہ میں آپ کا دین اختیار کرنا چاہتا ہوں بشرطیکہ اس کی حقانیت مجھ پر واضح کریں۔ قاضی نے تجھ کو کہا ہی تھا کہ آئزک پھٹ پڑا۔ بھری عدالت میں اس نے ہر ممکن دریدہ دہنی سے کام لیا۔ قاضی نے اسے قید کر کے معاملہ امیر عبدالرحمن ثانی کی خدمت میں پیش کیا، جہاں سے اس کے لیے سزائے موت کا حکم صادر ہوا۔

تحریک کے سرغنہ : آئزک کے بعد اس تحریک کے روح و رواں، دو افراد ’اولو جنیس‘ اور ’الوارو‘ بن گئے۔ اولو جنیس جو ابتداً ایک راہب تھا پھر قرطبہ کا بشپ بنا، اسلام سے نفرت اور عیسائیت سے وابستگی کا نشان بن گیا۔ تعصب اسے ورثے میں ملا تھا۔ اس کے دادا کے کان میں جب اذان کی آواز پڑتی تو سینے پر صلیب کا نشان بناتا اور کہتا، ”اے خدا خاموش نہ رہ۔ اے خدا چپ چاپ نہ ہو اور خاموشی اختیار نہ کر۔ کیونکہ دیکھ تیرے دشمن اوجھم مچاتے ہیں، اور تجھ سے عداوت رکھنے والوں نے سرائیا ہے۔“ (زبور ۸۳، ۱ تا ۲)

(Norman Daniel; The Arabs and the Mediaeval Europe, p.31)

اولو جنیس ایک ایسے ایبٹ (Abbot) کا معتقد تھا جو اسلام کا شدید مخالف تھا۔ ایبٹ کے حلقے میں اس کی ملاقات الوارو سے ہوئی۔ یہ شخص دنیا دار تھا، مگر ایبٹ مذکورہ زبردست حامی تھا۔ اسی حلقے کا ایک سرگرم رکن پرفیکٹس بھی تھا۔ اولو جنیس اپنی اسلام دشمنی کے باعث عیسائی راہبی حنتوں میں بیحد مقبول تھا۔ جب وہ پادری بنا تو اس نے بڑا استثنائے تمام راہبوں اور پادریوں کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ اولو جنیس اور الوارو نے اپنے معتقدین کو بڑے زور و شور سے اس تحریک میں حصہ لینے کے لیے ابھارا۔ اپنے ایک معتقد سانکو (Sanco) کو بھیجا جس نے سب و شتم کر کے اپنی جان دی۔ پھر چھ راہب بیک وقت قاضی کی عدالت میں رونما ہوئے اور انہوں نے دریدہ دہنی

کمر کے اپنے سر قلم کرواتے۔ دریدہ دہنی جاری رہی اور سر قلم ہوتے رہے۔ دو ماہ میں گیارہ افراد نے دریدہ دہنی کمر کے خود کو موت کے حوالے کیا۔ اس جنوبی تحریک کے باعث عام عیسائیوں کی روزمرہ زندگی متاثر ہونے لگی۔ خود قرطبہ کے عیسائیوں نے اس تحریک کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہوں نے کہا کہ جس موت کو یہ گستاخ بزم خود شہادت قصور کرتے ہیں وہ حقیقتاً خود کشی ہے۔

امیر عبدالرحمن نے اس تحریک پر غور و خوض کرنے سے لیے عیسائیوں کی مذہبی کونسل طلب کی۔ اس کونسل نے یہ قرارداد منظور کی کہ عیسائی اس قسم کی موت سے باز رہیں۔

اولو جنیس نے کونسل کا مذاق اڑایا۔ اس کی قرارداد کے بارے میں کہا کہ اس میں شہادت کی مذمت نہیں کی گئی۔ نیز یہ کہ اس قسم کی قرارداد شہادت کے تاج سے کسی عیسائی کو محروم نہیں کر سکتی۔ اس نے لوگوں کو تحریک میں مزید شدت پیدا کرنے کے لیے ابھارا، جس کے نتیجے میں تحریک کے قائدین کو گرفتار کیا جانے لگا۔ دوسروں کو جان دینے پر اکسانے والا اولو جنیس اپنی باری آنے پر جان بچا کر بھاگا۔ بھیس بدل بدل کر بھاگنے تبدیل کر کر کے گرفتاری سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہا۔ جب گرفتار ہو کر زنداں پہنچا تو وہاں ایک مسلمان لڑکی فلورا اور ایک عیسائی لڑکی میری بھی تھی۔ ان لڑکیوں کو ارتداد اور جنوبی تحریک کے جرم میں قید کیا گیا تھا۔ قاضی کے حکم سے انہیں زنداں میں رکھا گیا تھا کہ شاید وہ تائب ہو جائیں۔ زنداں کے شب و روز تے ان کے ارادے متزلزل کر دیے تھے، مگر اولو جنیس نے انہیں بھی تختہ دار تک پہنچا کر دم لیا۔

یہ تحریک منافرت ۸۵۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ ۸۵۲ء میں اسکی یہ کیفیت ہوئی کہ راہب مسجد قرطبہ میں دراتے اور چیخ چیخ کر ہذیانی انداز میں سب و شتم کرتے، اور کینفر و را کو بچھتے۔

(For details see, R. Dozy: Spanish Islam)

اولو جنیس نے اپنی تمام زندگی عیسائیوں میں اسلام کے خلاف نفرت کی مہم چلانے میں گزار دی۔ ۸۵۹ء میں ایک اور مسلمان لڑکی جو مرتد ہو چکی تھی، اولو جنیس کے گھر سے برآمد ہوئی۔ اس کے ساتھ اولو جنیس کو بھی گرفتار کیا گیا۔ مقدمے کے دوران اس نے کارروائی میں حصہ لینے کے بجائے صرف ہرزہ سرائی اور دریدہ دہنی کی۔ قاضی نے اسے سلطان کے دربار میں پیش کیا۔ وہاں بھی وہ ہرزہ سرائی سے باز نہ آیا۔ آخر کار سہم بھی قلم کیا گیا۔ موت کے بعد اولو جنیس عیسائی دنیا کا ہیرو بن گیا۔ اسکی ہڈیاں ترکات میں شمار ہوئیں۔ اسکی آتشیں تحریریں مغرب کے لیے مشعل راہ بن گئیں۔

عالم اسلام کا انتشار : اسپین کی تحریک منافرت، مغلوب عیسائیوں کی نفرت اور دشمنی کا اظہار تھی، جس میں جذبات کی شدت نے خود کشی کی شکل اختیار کی۔ بقیہ مغرب کمزور و رنجیدہ لیکن مغلوب نہیں تھا۔ وہاں بھی اسپین کی طرح تحریک کے روح و رواں کیسا کہ ہی ارکان تھے۔ مغرب میں بھی نفرت اور دشمنی اسی عروج پر تھی۔ اسکا اظہار جارحیت کی شکل میں ہوا۔ جب تک عالم اسلام میں کمزوری کے آثار پھیلے نہیں ہوئے تھے، یہ منافرت سرد جنگ کی شکل میں تھی۔ لیکن دسویں صدی عیسوی کے اختتام کے ساتھ ساتھ عالم اسلام میں کمزوری پیدا ہونے لگی۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اس صدی میں عالم اسلام تین حریف خلافتوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایشیا میں عباسی خلافت تھی، جس کا اقتدار برائے نام رہ گیا تھا۔ درنہ اصل طاقت سلجوقیوں کے ہاتھ میں تھی۔ فلسطین، مصر، افریقہ اور سسلی، فاطمی خلافت کے ماتحت تھے۔ اسپین میں اموی حکمران عبدالرحمن الناصر نے بھی اپنی مملکت کو خلافت قرار دیدیا تھا۔

گیارہویں صدی عالم اسلام کے لیے ابتری کا پیام لائی۔ اسپین کی اموی خلافت ۱۰۳۱ء میں ختم ہو کر، چھوٹی چھوٹی عرب اور بربر ریاستوں میں بٹ گئی، جو ایک دوسرے سے متحارب تھیں۔ ان حالات میں اسپین کی عیسائی ریاستوں 'لیون' (Leon)، اور 'قسطالیہ' (Castilla) نے اس علاقے کو مشترکہ طور پر (Castilla-Leon) کہا جاتا ہے، الفاناسو کی سرکردگی میں ان چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کو ہضم کرنا شروع کر دیا۔

گیارہویں صدی کے اواخر میں مسلم اسپین ملکہ عیسائیوں کا باجگزار بن گیا۔ اسی دور میں سسلی پر نارمنوں نے حملہ کیا اور ۱۰۷۱ء میں اس کے پایہ تخت پلرمو پر قبضہ کر کے ۱۰۸۱ء تک پورا سسلی فاطمیوں سے چھین لیا۔ بارہویں صدی عیسوی میں نارمن حملے افریقہ پر بھی ہونے لگے۔ سسلی کی نارمن بحریہ نے بحر روم میں طاقت کا توازن درہم برہم کر ڈالا۔ بارہویں صدی میں بحر روم پر نارمنوں اور اطالویوں کی برتری قائم ہو گئی۔ انہوں نے تیونس سے تریپولی تک افریقی ساحل پر قبضہ کر کے مشرقی اور مغربی مسلمانوں کا بحری رابطہ منقطع کر دیا۔

خلافت عباسیہ : ابھی قوت کا توازن بحر روم میں تبدیل نہیں ہوا تھا کہ مشرقی عالم اسلام میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونمہ ہونے لگیں۔ تاتاریوں نے ۱۰۲۹ء میں شمالی ایران پر حملہ کر دیا۔ قبیلہ غزنے پورا ملک روند ڈالا۔ ۱۰۵۵ء میں طغرل بیگ سلجوقی نے بغداد پر قبضہ کر لیا۔ سلجوقی قوت سے بازنطین اور فاطمی سلطنت دونوں ہی ہراساں تھے۔ مشترکہ خوف نے دونوں کو آپس میں دفاعی معاہدہ کرنے پر مجبور کیا۔ یہ معاہدہ ۱۰۷۱ء میں کیا گیا۔ اسی سال سلجوقیوں نے شام اور فلسطین کو فتح کر لیا، جس کے سبب فاطمی خلافت مصر تک محدود ہو کر رہ گئی، اور بازنطین سے اسکا بحری رابطہ منقطع ہو گیا۔

بازنطینی حملہ : سلطنت عباسیہ کے انتشار، اور سلجوقیوں اور فاطمیوں کی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بازنطینی شہنشاہ الیگزینڈر کا منیس (Alexius Comnenus) نے مسلم آرمینیا پر حملہ کر دیا۔ سلطان الپ ارسلان نے ۱۰۷۱ء میں بازنطینی افواج کو ملاز می گرد (منزلی کرت) کے تمام پرشمرناک شکست دی۔ اس شکست نے بازنطین کو ایشیائے کوچک سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا۔ ۱۰۸۱ء میں خود قسطنطنیہ پر حملہ ہوا اور بازنطین نے عالم یاس میں مغرب کو مدد کے لیے پکارا۔

فوجی کلر وائیاں

عالم اسلام کا شدید انتشار، اسپین اور سسلی میں عیسائی غلبہ، افریقہ میں فتوحات، بحیرہ روم میں توازن طاقت میں تبدیلیاں، عیسائیوں اور فاطمیوں کی سلجوقیوں کے ہاتھوں شکست، یہ سب ایسی تبدیلیاں تھیں جو مغرب کے لیے خوش آئند تھیں۔ بازنطینی پیش قدمیوں کو بھی مغرب نہایت دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن بازنطین کی مکمل اور فیصلہ کن شکست اور ایشیائے کوچک سے اسکی خروجی ایک سانحہ تھی۔ مغرب نے ترکوں کی اس فتح کو عالم عیسائیت کی توہین اور مغرب کے لیے خطرہ قرار دیا جسے نظر انداز نہ کیا جاسکتا تھا۔

(J.F.C. Fuller; The Decisive Battles of the Western World, p. 281)

مغرب میں عالم اسلام کے خلاف صدیوں سے ایک اضطراب پل رہا تھا، اور اب حالات ایسے ہو گئے تھے کہ مغرب کو دفاعی حیثیت اختیار کرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ اس نے عالم اسلام پر ایک شدید ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

شہنشاہ الیگزینڈر نیس سلجوقیوں کے خلاف بار بار پوپ سے اپیل کر رہا تھا۔ پوپ کی نظر میں عالم اسلام اور بازنطین دونوں ہی دشمن تھے۔ انکی کشمکش کو وہ فطری دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ ہر دو فریق کی تباہی اس کے لیے باعث اطمینان تھی۔ ”اس میں شک نہیں کہ مغرب کی رقابت نے بھی مشرقی ایمپائر (بازنطین) کی تباہی میں خاصا اہم کردار ادا کیا۔“ (حوالہ بالا)۔ جب بازنطین بے دم ہو گیا اور اس نے مایوسی میں پاپا سے مدد کی اپیل کی، جو مغرب کی برتری کو تسلیم کرنے کے مترادف تھی تو ۱۰۹۵ء میں پوپ ار بن ثانی (Pope Urban II) نے اپنا مشہور خطبہ ”جنگ دیا۔“ (Phillips K. Hitti; Islam and the West, p. 73)۔ اس خطبے نے پورے مغرب میں اک آگ لگادی۔ الیگزینڈر مغرب کی مدد سے اک دفاعی حسارت تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ پوپ نے اس سیاسی ضرورت کو ہمہ جہی بنا دیا۔

صلیبی نظریہ : صلیبی نظریہ خود رونہ تھا۔ اسے صدیوں کی کاوش سے دلنشین کیا گیا تھا۔ اسلام کو عیسائیت کا دشمن باور کرایا جا چکا تھا۔ اسکا وجود ایک خطرہ تھا۔ اسکے پروپیگنڈے کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کو فتح کرنا ضروری تھا۔ پوپ نے فرہنگش قوم کو ”قوم خداوندی“ قرار دیکر صلیب کے لیے بازوئے شمشیر زن فراہم کر دیا۔ سلجوقیوں کی فتح عیسائیت کی توہین قرار دی جا چکی تھی۔ مسلمان پہلے ہی سے ارض مقدس اور یہ شلم پر قابض تھے۔ ”ارض مقدس عیسائی سرزمین تھی، لہذا وحشیوں سے اسکی بازیابی لازم تھی۔ اگر فرہنگ عیسائیوں کے فطری قائد تھے تو یہ وہ شلم کو فتح کرنا فرہنگ قوم کا فریضہ تھا۔“

(Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p.115)

پوپ کی اپیل کیا تھی جنگ کی آگ تھی۔ پورا معاشرہ دیوانہ وار اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر فرد جنگِ صلیبی کی تبلیغ کرنے لگا۔

”پیش پیش بشت تھے۔ انکے پیچھے دنیا۔ باپ مسرت کے ساتھ اپنے بیٹوں کو، بیویاں شوہروں کو رخصت کر رہی تھیں۔ جو لوگ نہ جاسکے وہ حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ راہب چھپ چھپ کر، جنگ میں شرکت کرنے کے لیے فرار ہونے لگے۔ لوگ تھے کہ اپنے سینوں پر گرم لوہے سے صلیب کا نشان داغ رہے تھے۔ ایک سرسای کیفیت تھی جو انگلستان سے پھیلتی ہوئی فرانس، وہاں سے سکاٹلی (Gascony) ہوتی ہوئی اطالیہ کی بندرگاہوں تک پہنچی، جہاں صلیبیوں کو لے جانے کے لیے جہاز تیار ہو رہے تھے۔ ۱۰۹۵ء میں ہر طرف آسمانی معجزے دیکھے جانے لگے، جو عموماً اشتعال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لوگوں نے انہوں نے اپنے پونے اپنی جائیدادیں فروخت کیں۔ بچے گھروں سے بھاگ نکلے۔ جس شہر میں پہنچتے وہاں پوچھتے کیا یروشلم یہی ہے۔ عورتیں، بچے اور بوڑھے آگے آگے رواں تھے تاکہ جنگی افراد کے پہنچنے سے پہلے ہی اپنی جان بچا کر نکل سکیں۔ لوگوں نے اپنی انا اور عزت کو خاک گردانا۔ اپنے بیوی بچوں کو خس و خاشاک کی طرح جھک کر الگ ہوئے۔ جنہوں نے ابتداً اس اشتعال کا مذاق اڑایا وہ بھی بعد میں شریکِ حال ہوئے۔ راہب پیٹر کی تقاریر نے اس اشتعال کو اور ہوا دی۔ لوگ ذمہ داریاں ترک کر کے مذی کی طرح دوڑ پڑے۔ انہوں نے اپنا وطن، اپنا گھربار، اپنا خاندان، قلعے، کھیت کھلیاں اور زندگی کی ہر آسائش سے منہ موڑا۔ چوراہکوں نے اس موقع کو اپنی بخشش اور مغفرت کے لیے ایک نادر موقع جانا اور گناہوں کے کفارے کے لیے شریکِ جنگ ہوئے۔“

(حوالہ بالا، صفحات ۱۲۱-۱۲۲)

پہلی صلیبی جنگ کی کامیابیاں : فیوڈل سسٹم نے معاشرے کو نیم فوجی بنا دیا تھا۔ نکلے کی توانائیاں آپس کی خونریزی میں ضائع ہو رہی تھیں۔ امن و امان کی کوششیں بیکار ثابت ہو چکی تھیں۔

(Earnest Barker; 1966, Legacy of Islam, article 'The Crusades', p.46)

صلیبی جنگ کے اعلان نے اس معاشرے کو طالع آزمائی کے لیے بیرون مغرب میدانِ جنگ فراہم کر دیا۔ مذہبی اعتقاد کے لیے شہرِ مبع (یروشلم) کی بازیابی، افلاس کے لیے مال و زر، جتنی فطرت کے لیے فتح و نصرت، فیوڈل ازم کے لیے نئی نئی لاطینی مملکتوں کا قیام، تجارت کے لیے منڈیاں اور کلیسا کے لیے اسلام کی تباہی، غرض کہ ہر طبقے کے لیے صلیبی جنگ میں خاصی کشش موجود تھی۔ اعانہ کر دیا گیا کہ،

"This is altogether forbidden that for any reason they should not enter into any alliance with the Muslims, neither for money nor for tribute, until with the help of God, either their religion or their nation has been destroyed."

(St. Bernard's Book of Praise of the New-Armey, quoted by Norman Danj, The Arabs and Mediaeval Europe, p.225)

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

۱۔ صورتحال خواہ کچھ بھی ہو، اس بات کی سختی سے ممانعت کی جاتی ہے کہ (صلیبی افواج) مسلمانوں کے ساتھ نہ تو مال کے لیے نہ ہی خراج کے لیے، کسی قسم کا کوئی معاہدہ کریں، جب تک خدا کی مدد سے یا تو انکی قوم یا انکا مذہب تباہ نہ ہو جائے۔ [مقدس پوپ نے مغربی خون آشامی کو پرچم صلیب عطا کر کے عالم اسلام پر کھلا چھوڑ دیا۔ ۱۰۹۶ء میں صلیبیوں نے ایشیائے کوچک سے جنوب کی طرف پیش قدمی کی، اور یروشلم کا پورا علاقہ روند ڈالا۔ ۱۵ جولائی ۱۰۹۹ء کو فاطمی افواج نے ایک ماہ کے مقابلے کے بعد بیت المقدس کو صلیبیوں کے حوالے کر دیا۔

یہ پہلی صلیبی جنگ نتائج کے اعتبار سے، فیسا اور مغرب کے لیے، خاصی کامیاب رہی۔ نہ صرف یروشلم قبضے میں آ گیا، بلکہ ایشیائے رومی ساحل پر مندرجہ ذیل چار لاطینی ریاستیں قائم ہو گئیں۔

۱۔ سلطنت یروشلم ۲۔ سلطنت تریپولی ۳۔ سلطنت انطاکیہ ۴۔ سلطنت ادیبہ
اس کامیابی نے مغرب کی بیشتر محرمیاں دور کر دیں۔ بحر روم پر برتری قائم ہوئی۔ تجارتی راہیں کھلیں۔ شام و فلسطین کے غلہ گودام قبضے میں آئے۔ لاطینی عیسائیت کو وسعت کے مواقع میسر آئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کدو شمن کا دین اور اسکی ملت تباہی سے دوچار ہوئے۔

اس جنگ میں دشمن کی تباہی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا گیا۔ قتل و خونریزی، آتش زنی، لوٹ مار، عصمت دری، مقامات مقدسہ کی تخریب، یہ سب تو جیسے صلیبیوں کے ضابطہ اخلاق میں سے تھے۔ اس دور کے مغربی اہل قلم ان واقعات کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ بہیمیت کا اندازہ صلیبی جنگوں پر مستند ترین کتاب ”گستا“ (Gesta) کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔

گلبرت، گستا کا مصنف، خود صلیبی تھا۔ اسکے بیانات کو عینی شہادت کا مرتبہ حاصل ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جو بیشتر صلیبی تاریخوں کا ماخذ ہے۔ اسکے چند اقتباسات نارمن ڈینیئل کے حوالے سے ملاحظہ ہوں۔

(Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe)

”انطاکیہ میں انہوں نے جس تک یا سراسن کو پایا، قتل کر دیا۔ کوئی شخص کسی راستے پر، لاشوں پر گزرے بغیر چل نہ سکتا تھا۔“
”البارہ میں کاؤنٹ سینٹ گلز (St. Gilles) نے ہر عرب مرد و عورت، چھوٹے بڑے کو تہ تیغ کیا۔ اور پھر اس شہر کو دہن مسکی میں داخل کیا۔“ (مارہ (Maarra) میں انہوں نے ہر فرد کو خواہ مرد ہو یا عورت، جہاں پایا قتل کر دیا۔“
”بوہیمند نے جنگی قیدی تک قتل کر دیے۔“ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۳۶)

یروشلم کا قتل عام تاریخ کا بدترین قتل عام ہے، جہاں مغربی فاتحین کے گھوڑوں کے گھٹنے خون میں ڈوبے بیان کیے جاتے ہیں۔ خون کے تالابوں میں لاشیں تیرتی پھرتی تھیں۔

اسکے ایک اور عینی شاہد ریمند نے تحریر کیا۔

”آخر کار جب بت پرستوں کو شکست ہوئی تو ہمارے آدمیوں نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو مندر (مسجد اقصیٰ) سے گرفتار کیا۔ جنہیں مناسب سمجھا انہیں قتل کیا اور کچھ کو زندہ رہنے دیا۔ ہمارے لوگ پورے شہر پر سونا چاندی، گھوڑے، خچر حاصل کرنے اور بھرے گھروں پر قبضہ کرنے دوڑ پڑے۔ یہ لوگ جب لوٹے تو خوشی سے دیوانے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ہو رہے تھے۔ بعض تو فوراً مسرت سے رو رہے تھے کہ انہیں جو بڑے نجات دہندہ مسیح کے مقبرے پر عبادت کی سعادت میسر ہوئی اور اس کے حضور جو سونڈ کھائی تھی، انہوں نے اسے پورا کر دکھایا۔“ (صفحہ ۱۳۵)

فتح کے جوش میں پہلے دن کی کارروائی کو اگر جذباتی حرکت کا نام دے بھی دیا جائے تو دوسرے دن کی کارروائی تو یقیناً ایک غیر جذباتی کارروائی ہی تھی۔ اول شب شہر کے کچھ باشندوں نے مسجد صحرا کی چھت پر پناہ لی تھی۔ انکے قتل کی کیفیت ریمند نے یوں بیان کی۔

”دوسرے دن وہ لوگ احتیاط کے ساتھ مندر کی چھت پر چڑھے اور مسلمان مردوں اور عورتوں پر حملہ کیا۔ شمشیر برہند سے انکے سر تن سے جدا کیے۔ دوسرے مسلمانوں نے یہ دیکھ کر خود ہی اپنے آپ کو سر کے بل گرایا۔“ (صفحہ ۱۳۵)

زندوں کے ساتھ جو ہوا سو ہوا، لیکن مرنے والوں کے ساتھ جو سلوک ہوا، انسانیت کے لیے اے کاتھو ربھی شرمناک ہے۔ مغربی فاتح، ”سیاسیت کے قائد“، ”خدا کی قوم“، فریٹک لاشوں کو چاک کر رہے تھے، کیونکہ انہیں مردوں کے پیٹ سے سنہرے سکتے ملنے کی توقع تھی۔ (صفحہ ۱۳۵)

ان سکوں کی تلاش نے بنا تادم کا دامن حیاتا تار تار کیا۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنی ہی میت کا ذمہ دار بھی ان ہی کو بھرایا۔ فلچر نے تحریر کیا۔

”عورتیں سکتے اپنی اندام نہانی میں چھپا لیتی تھیں۔ یہ مقام چیزیں چھپانے کے لیے کس قدر قبیح تھا۔ اور اس سے کہیں زیادہ مجھے شرم آتی ہے کہ میں بیان کروں۔“ (صفحہ ۱۳۵)

انسانیت یہ دیکھ کر انگشت بدنداں ہے کہ مقدس صلیب کے پرچم تلے اس کے ملبردار مسیح کے پیرو، خود مسیح کے شہر میں مردوں کی لاشیں چیر پھاڑ رہے تھے تاکہ پیٹ میں چھپے سکتے حاصل کر سکیں۔ کچھ لوگ انسانی گوشت کے پار پتے تراش رہے تھے تاکہ بھون کر کھا سکیں۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۳۵)

یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ یہ محض مغرب کی جنہی ہیبت و بربریت تھی یا اس میں اسلام کے خلاف اس پروپیگنڈے کا اثر بھی شامل تھا جو اہل مغرب کے اعصاب پر صدیوں سے سوار تھا، کیونکہ اہل مغرب کی آپس کی جنگوں میں اس قسم کے واقعات کہیں لکھے نظر نہیں آتے۔“

حروب صلیبی کی ناکامی اور مشترکہ دفاعی کوششیں

شام و فلسطین میں لاطینی حکومتوں کے قیام کے ساتھ ہی مسلمانوں میں اس کا شدید رد عمل شروع ہو گیا۔ ۱۱۴۴ء میں موصل کے سلطان اتابک زنگی تاریخ کے صفحات پر ابھرے۔ انہوں نے ۱۱۴۴ء میں ادیبہ فتح کر کے صلیبی شکستوں کی بنیاد رکھی۔ انکے جانشین نور الدین زنگی ہوئے جو روزِ ازل سے صلیبیوں کو بڑا دشمن و شمشیر علاقہ بدر کرنے پر تلے بیٹھے ہوئے تھے۔ انکے بعد میں یروشلم کے صلیبی حکمران نے ۱۱۶۳ء میں مصر پر قبضہ کرنے کی

مہم چلائی۔ سلطان نور الدین نے مصر پر سے صلیبی دباؤ کم کرنے کے لیے صلیبی ریاستوں اٹھایا اور تریپولی پر حملہ کیا، لیکن اس سال خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ مصر میں صلیبی کامیابیوں کو روکنے کے لیے انہوں نے اپنے سپہ سالار شیر کوہ کو مصر روانہ کیا۔ صلیبی جنگوں کے بطل اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی کا ذکر تاریخ میں پہلی بار اسی مہم میں آتا ہے۔ شیر کوہ کو مصر میں اس سال کامیابی نہ ہو سکی لیکن سلطان نور الدین نے دوسری صلیبی سلطنت اٹھایا کو اگست ۱۱۶۴ء میں تباہ کن شکست دی۔

مصر میں دوسرا صلیبی اقدام ہوا تو شیر کوہ اور صلاح الدین ایک بار پھر ۱۱۶۷ء میں مصر میں داخل ہوئے۔ اس بار وہ صلیبی افواج کو اپنے تعاقب میں لگا کر نیل کے کنارے کنارے تقریباً تین سو میل (پانچ سو کلومیٹر) اندرون ملک لے آئے اور بائین کے مقام پر صلیبی افواج کو ایسی شکست دی کہ وہ قاہرہ سے رخصت ہونے پر مجبور ہو گئیں۔

مصر کی خلافت فاطمیہ کے وزیر شاد کی ریشہ دوانیوں کے سبب مصر میں صلیبی حملہ آوروں اور سلطان کی افواج کے درمیان رستہ کشی ہونے لگی۔ یہ شخص سلطان کی افواج کے خلاف صلیبیوں سے اور صلیبیوں کے خلاف سلطان سے کام لیتا تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر ۱۱۷۱ء میں سلطان نے خلافت فاطمی کو ہی ختم کر دیا۔ نور الدین زنگی کے بعد ۱۱۷۴ء میں سلطان صلاح الدین انکے جانشین ہوئے۔

بازنطینی اقدام : ملازی گرد یا منزی کرت کی شکست کے بعد صلیبی حملے نے بازنطین کو ایک بار پھر سنبھلنے کا موقع دیا۔ نور الدین زنگی کے آخری ایام میں بازنطین اس قدر طاقتور ہو چکا تھا کہ ایشیائے کوچک، مصر و شام، سریا اور بتگری پر حملے کر رہا تھا۔ ۱۱۷۱ء میں اس نے سلطان قلعہ ارسلان کے پایہ تخت اکونہ پر حملہ کر دیا تاکہ ایشیائے کوچک سے ترکوں کو نکال باہر کرے۔ سلطان قلعہ ارسلان نے مائریوسیفالون (Myrio Cephalon) کی جنگ میں شہنشاہ بازنطین مینوکل کو ایسی ہی شکست دی جیسی اس کے بزرگوں نے ایک صدی قبل ملازی گرد میں دی تھی۔ شہنشاہ کی پوری فوج کام آئی، اور خود شہنشاہ سلطان کی امان میں یاس و حرام کی زندگی گزارنے قسطنطنیہ پہنچا۔ جنگ ملازی گرد کے باعث صلیبی طوفان اٹھا تھا، تو جنگ مائریوسیفالون صلیبی ناکامیوں کا پیغام لائی۔ بازنطینی قوت نے جل پر صلیبی سلطنتیں محفوظ و مامون تھیں۔ اسکی شکست نے صلیبی سلطنتوں کا پیمانہ عمر لبریز کر دیا۔

دوسری اور تیسری صلیبی جنگیں

سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۳ء تک مصر و شام کو متحد کر کے انکی اندرونی رقابتوں کا خاتمہ کر دیا۔ پھر وہ پوری یکسوئی سے صلیبیوں کی طرف متوجہ ہوئے جنگی دست درازیاں حد سے گزر رہی تھیں۔ مسلمان قوتوں پر تنگ و تار صلیبیوں کا معمول بن گیا تھا۔ دمشق تک انکی دسترس میں تھی۔ مدینہ کے نواح تک

انکے فراق پہنچنے لگے تھے۔ مزید برآں اس قسم کی ناہنجار افواہ بھی گشت کرنے لگی کہ ریناند (Renand) نے قسم کھائی تھی کہ (عیاذ باللہ) وہ مدفن نبوی سے جسد کو برآمد کر کے نذر آتش کرے گا۔

(Sir John Glubb; The Lost Centuries, p.93)

جنگ حطین : جب فرینک وجود مسلمانوں کی جان و مال سے بڑھ کر عزت و آبرو کے لیے خطرہ بن گیا تو سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۱۱۸۳ء میں صلیبی علاقوں پر شدید حملہ کیا۔ اس کے نتیجے میں فریقین میں ۱۱۸۵ء کا صلح نامہ ہوا۔ ۱۱۸۷ء میں صلیبیوں نے قاہرہ سے دمشق جانے والے ایک کاروان کو گرفتار کر کے صلح کو ختم کر ڈالا۔ جس پر سلطان نے صلیبی علاقوں پر حملے کیے اور حطین کے بے آب و گیاہ میدان میں صلیبی قوت کو پاش پاش کر ڈالا۔ سوائے چند سرداروں کے یہاں سے کوئی بچ کر نہ نکل سکا۔ قیدیوں میں دریدہ دہن ریناند بھی شامل تھا جسے سلطان نے بدست خود کفر کر دیا اور تک پہنچایا۔

یروشلم کی بازیابی : حطین میں صلیبی شکست کے بعد یکے بعد دیگرے تمام اہم شہر مسلمانوں کے قبضہ میں آتے چلے گئے۔ سلطان کے بھائی ملک العادل نے مصر سے طوفانی یلغار کی۔ حاف، سدون اور بیروت کو زیرِ نگین کیا، اور ۲۰ ستمبر ۱۱۸۷ء کو سلطان صلاح الدین ایوبی نے نوے سال کے بعد بیت المقدس کو صلیبی قبضہ سے آزاد کرانے کا شرف حاصل کیا۔

مشترکہ مغربی یلغار : سقوط یروشلم نے مغرب میں ایک ہجبان برپا کر دیا۔ پوپ نے تیسری صلیبی جنگ کی اپیل کی۔ اس بار مغربی حکمرانوں نے اس اپیل پر لبیک کہا۔ پوپ کے متعدد حکمران اپنی اپنی افواج لیکر عکرمہ پہنچے۔ ۱۱۸۹ء تک یہ افواج دفاعی جنگ کرتی رہیں، لیکن جب انکی طاقت مجتمع ہو گئی، تو اکتوبر ۱۱۸۹ء میں انہوں نے اجتماعی حملہ کیا، جس میں صلیبیوں کو شکست ہوئی۔ پوپ کی اپیل پر ۱۱۹۱ء میں فرانس اور انگلستان بھی جنگ میں شریک ہو گئے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے پاس بحری قوت نہیں تھی، جس کے باعث مغرب کی کمک روکی نہیں جاسکتی تھی۔ انہوں نے یعقوب المنصور، خلیفہ مراکش سے بحری امداد طلب کی جو انہیں نہیں مل سکی۔ مغرب کی مشترکہ قوت کے آگے زیادہ دنوں تک عکرمہ کا دفاع نہیں کیا جاسکا۔ سلطان کو معاہدہ صلح کر کے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ معاہدہ صلح کے باوجود رچرڈ نے تمام مسلم سپاہ کو تہ تیغ کر ڈالا۔ اس اجتماعی جارحیت سے صلیبیوں نے کچھ ساحلی علاقے ضرور بازیاب کر لیے تاہم بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ برقرار رہا۔ یہ جنگ ایک علیحدہ صلح نامہ پر منتج ہوئی، جس کے بعد سارے مغربی حکمران لوٹ گئے۔

چوتھی صلیبی جنگ کے لیے جو فوج جمع ہوئی اسکا ہدف عالم اسلام کے بجائے مشرقی عالم عیسائیت بنا۔ صلیبیوں نے ۱۲۰۴ء میں قسطنطنیہ پر حملہ کر کے اسے پامال کر ڈالا۔

پانچویں صلیبی جنگ : پانچویں صلیبی جنگ جسے مغرب عام طور پر نظر انداز کرتا ہے مصر میں لڑی گئی۔ چوتھی جنگ نے پوپ کو یہ سبق دیا تھا کہ صلیبی افواج کی کمان اپنے ہاتھ میں ہی رکھے۔ چنانچہ اسکا ایک نائب اس فوج کی سربراہی کر رہا تھا۔ ابتداً صلیبیوں کو اس جنگ سے بہت خوش آمد تو قیامت وابستہ تھیں، مگر اسکا حشر بھی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

دوسری جنگوں سے مختلف نہیں ہوا۔ ۱۲۲۱ء میں اس فوج نے سربراہ نے پاپ و جو رپورٹ پہنچی اس کی بنیاد پر یہ توقع پیدا ہو گئی تھی کہ منگول حملوں کے نتیجے میں عالم اسلام استبدادِ مذہب سے بوجائے گا، کہ مغرب کے لیے اس پر حملہ کرنا آسان ہو جائے گا۔

(cf. Southern R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.45)

تیرھویں صدی عیسوی صلیبی جنگوں سے پرہے جو یروشلم کے ساتھ لڑی گئیں۔ اس صدی کے نصف میں مصر سے ایک نئی قوت 'مملوک' ابھری۔ ان کے حکمرانوں نے ۱۲۶۸ء میں اٹلا کیا، ۱۲۸۹ء میں تریپولی اور ۱۲۹۱ء میں آخری صلیبی مورچے عکبرہ کو فتح کر کے حروبِ صلیبیہ کا باب بند کر دیا۔

تباہ کاری کا نیا منصوبہ، مغرب اور منگول

تیرھویں صدی عیسوی میں جب صلیبی سلطنتوں پر نزع کا عالم جاری تھا، عالم اسلام پر منگول یلغار شروع ہوئی۔ آؤا مغرب نے انکو بھی مسلمان تصور کر کے خطرے کی علامت قرار دیا۔ چنانچہ اس دور کے راہبوں نے انہیں 'بنوا سعلیل' تحریر کیا۔ [cf. Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe,] (p.315)۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب انہیں پتہ چلا کہ منگولوں کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ وہ مسلمانوں کے دشمن تھے اور انکی سرپرستی میں عیسائی نسطوریت پر وان چڑھ رہی تھی، تو مغرب کے دل میں امید کی ایک کرن پیدا ہوئی کہ کیوں نہ انکو عیسائی بنالیا جائے اور پھر صلیبی جنگوں کے بنیادی مقاصد ایسے عظیم پیمانے پر حاصل کیے جائیں جنکا اس سے قبل خواب بھی نہ دیکھا گیا ہو۔ [Earnest Barker; 1960 ed., Legacy of Islam, essay] ('The Crusades', p.48)۔ اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے وفود کا سلسلہ جاری ہوا۔

(for details of mission, see, W.Budges; The Monks of Kublai Khan, pp.

174-197)

- ۱۔ ۱۲۴۵ء میں پوپ انوسنٹ چہارم نے جان آف پلینو کارپینو کی سربراہی میں ایک وفد روانہ کیا، جو دو سال بعد واپس لوٹا۔
- ۲۔ جان کی واپسی کے بعد دوسرا وفد سائمن آف تورنئے کی قیادت میں روانہ کیا گیا۔ اسی دوران منگولوں کا وفد لوئیس نہم کے پاس آیا۔
- ۳۔ پوپ نے اندریو کی سربراہی میں ایک تبلیغی وفد روانہ کیا۔
- ۴۔ لوئی کاچی رودبرک ۱۲۵۳ء میں روانہ ہوا۔

- ۵۔ وفود کا سلسلہ تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک جاری رہا، جس کی آخری کڑی مشہور سیاح مارکو پولو (دو سیاحت ۱۲۷۱ء تا ۱۲۹۵ء) ہے۔ مارکو پولو کا مقصد سیاحت تجارت اور ذاتی منفعت بتلایا جاتا ہے۔ لیکن یہ امر توجہ طلب ہے کہ اس سیاح کے ذریعے بھی پوپ کے پیغامات قبائلی خان تک پہنچے۔
- ۶۔ ۱۲۸۶ء میں منگول لیڈر پوپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

ان وفود کے مقاصد تجارتی، سیاسی اور مذہبی بنائے جاتے ہیں، لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہ سارے وفود تیرہویں صدی کے نصف آخر میں آئے گئے۔ اور اس کے بعد اس قسم کے وفود کا سلسلہ ختم ہونے لگا، یہ شبہ قوی تر ہو جاتا ہے کہ ان کے مقاصد تجارتی نہیں تھے۔ ممکن ہے کہ وفود نے فنی طور پر تجارتی فوائد بھی حاصل کیے ہوں لیکن اس مقصد کے لیے پوپ اور بادشاہان کی سرپرستی بے محل نظر آتی ہے۔ لہذا یہ وفود محض سیاسی اور مذہبی نوعیت کے ہی حامل رہے ہونگے، جن کی غرض یہ تھی کہ صلیبی جنگوں کے معنیہ مقاصد منگولوں اور تاتاریوں کے ذریعے سے حاصل کیے جائیں۔ اس شبہ کی تصدیق نہ صرف اس دور کی تحریروں سے، بلکہ دور ما بعد کے مفکرین کے تبصروں سے بھی ہوتی ہے۔

۱۲۹۱ء میں جب سقوط طغرلہ کی خبر اطالیہ پہنچی تو رمانڈل نے جو مشہور مبلغ عیسائیت تھا تحریر کیا،

”اگر نسطوریوں (منگول عیسائیوں) کو اپنالیا جائے تو سارے سراسن باسانی تباہ کیے جاسکتے ہیں۔“

(Raymond Lull, 'Opera Latina', quoted by R.W.Southern; 'Western Views of Islam in the Middle Ages', p.68)

۱۲۲۱ء میں آرج بپش آف ترائر (Trier) کے نام پوپ نے تحریر کیا،

”محترم برادر پپش، بپش آف الپالو نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ کنگ ڈیوڈ، جسے جبلاء پرسترجان کہتے ہیں، جو ایک کیتھولک اور خدا ترس (عیسائی) ہے، فارس میں ایک طاقتور فوج کے ساتھ داخل ہو چکا ہے۔ اس نے سلطان فارس کو ایک گھسان کی جنگ میں شکست دیدی ہے۔ وہ بیس دن کی مسافت کے بعد اسکی مملکت میں اقدام کر کے اس پر قبضہ کر چکا ہے۔ اب اسکے زیر نگین بہت سے شہر اور قلعے ہیں۔ اسکی فوج اب بغداد سے صرف دس دن کی مسافت پر ہے۔ یہ شہر خلیفہ کا مستقر ہے جسے سراسن اپنا روحانی پیشوا اور بپش کہتے ہیں۔ ان واقعات کی ہیبت نے سلطان حلب کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی اس قوت کا رخ، جس سے وہ دمیتیہ (مصر کی بندرگاہ) کی عیسائی افواج پر حملہ کرنا چاہتا تھا، اس انگ (ڈیوڈ) کی طرف موڑ دے۔ ہمارے نائب اور سفیر نے بہر حال جارجیا والوں کو جو خود بھی کیتھولک اور قومی شمشیر زین ہیں، ایک پیغام کے ذریعے یہ دعوت دی اور استدعا کی ہے کہ وہ اپنی سمت سے سراسن سے جنگ شروع کر دیں، جس کے باعث ہمیں امید ہے کہ اگر ہماری فوج کو دمیتیہ میں کمک پہنچ گئی، جس کی توقع اس سال کے موسم گرما تک کی جاتی ہے، تو خداوند کی مدد سے ہم باسانی سرزمین مصر پر قبضہ کر لیں گے، جبکہ مسلم افواج جو مصر کے دفاع کے لیے چہار جانب سے جمع ہو چکی ہیں، اپنے علاقے کے دفاع کے لیے سرحدوں پر منتشر ہو چکی ہوں گی۔“ (حوالہ بالا، صفحہ ۴۷-۶)

اس قبیل کا ایک خط ایک صلیبی نے میدان جنگ سے تحریر کیا۔ اس میں بھی تقریباً وہی اطلاعات ہیں جو پوپ نے دی تھیں۔ صرف اس قدر اضافہ ہے کہ،
 ”کنگ ڈیوڈ تقریباً چار لاکھ افراد، جس میں ایک لاکھ بیس ہزار کچھنیں نائف... فارس۔ پامال... سقوط بغداد عنقریب متوقع.....“ (حوالہ بالا)

اس میں صحت اس قدر تھی کہ منگول بڑھ رہے تھے اور بغداد کا سقوط ہونے والا تھا۔ لیکن یہ خدا ترس کنگ ڈیوڈ، چنگیز خان تھا، جو بغداد فتح کیے بغیر ہی مر گیا۔ اور سارے کرسچین شہسوار مغربی دماغ کی اچھ تھے۔ چنگیز کے بعد منگول قہم سے گئے۔ پوپ نے اس سیل بلا کو متحرک کرنے کے لیے اپنے ہر کارے دوڑائے۔ ۱۲۵۲ء کے وفد نے جسکا سربراہ ولیم آف روبرک تھا، غالباً کسی نہ کسی طرح خان اعظم کو ہموار کر ہی لیا، جسکا نتیجہ ۱۲۵۸ء میں بغداد کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوا۔

روبرک کی سفارت کے بارے میں ولیم آف فکر نے تبصرہ کیا کہ،
 ”سینٹ لوئیس نے ولیم آف روبرک کو خان اعظم کی خدمت میں اس توقع کے ساتھ روانہ کیا کہ اگر منگولین ایمپائر ایک بار عیسائی بنائی گئی تو وہ ترکوں پر عتب پر سے پیش قدمی کرے فلسطین میں عیسائیوں کی مدد کر سکے گی۔“

(J.C. Filler; The Decisive Battles of the Western World,)

پروفیسر ٹوئن بی نے مغربی معاشرے اور عالم اسلام کی کشمکش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا،
 ”دور، مشرق بعید میں ایک عظیم منگول ایمپائر قائم ہو چکی تھی۔ مغربی خوش فہم عیسائیوں نے اس عالمی قوت کے حکمرانوں کو اپنے مذہب میں داخل کر کے اسلام کو عتب سے آدو پننے کا خواب دیکھا۔ پایا کے وفود قراقرم کا طول طویل سفر طے کر چکے تھے۔ مارکو پولو جند ہی قبلائی خان کے دربار کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ یہ خواب خواب ہی رہ گیا۔ قبلائی خان کچھنیں تو نہ ہوا، ہاں مشرق میں رومن ایمپائر کا خاتمہ ضرور ہو گیا۔“

(Toynbee; A Study of History, Vol VI, pp. 190-191)

سینٹ لوئیس نے ولیم آف روبرک کو دوسرے مشن پر بھیجا۔ یہ وفود خاصے متحرک رہے اور چین تک پہنچے، لیکن سب خواب خواب ہی رہے اور کلیسا کو مسلمانوں کے خلاف کہیں سے مدد نہیں مل سکی۔

(Earnest Barker; 1960 Ed., Legacy of Islam, essay 'The Crusades', p.49)

سردار نے ان وفود کی آمد و رفت کا مقصد، علم اسلام پر مشترکہ جارحیت کی تیاری بتایا ہے۔

(R. W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p. 65)

غرض یہ کہ تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک یورپ اس خوش فہمی میں نظر آتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح وہ اسلام کو ختم کر دیگا۔ اس نے نہ صرف اپنی باری توانائیاں صرف کیں، بلکہ اس مقصد کے لیے اس نے دیگر وحشی اقوام سے کام لینے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ اس مشن کے یافار کے بعد بھی عالم اسلام کی بقا ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

چرچ کا کردار

مغرب کا تانا بانا کترین دور یا تو رومن ایمپائر کا زمانہ تھا یا دورِ حاضر ہے۔ رومن ایمپائر بنیادی طور پر ایک فوجی ریاست تھی، جس نے گرد و پیش کے علاقوں خصوصاً سامی تہذیب کے گہوارے پر قبضہ کر کے اسے بدترین استعمال کا شکار کر رکھا تھا۔ (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. VI, p. 202)۔

صلیبی جنگوں کی ابتدائی کامیابیوں نے پوپ کی آسمانی ہدایت کی صحت پر مہر تصدیق ثابت کی۔ لیکن بازنطینی اقدامات اور منگول غارتگری کے باوجود مغرب کو اپنی قدیم حدود میں لوٹ آنا پڑا۔ صلیبی جنگوں نے اسلام کے بارے میں مغرب کو بہت ساری درست معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اربابِ حکومت، ان کے عمال، انکے جنر، ان کے سپاہی، عام زائر، ارکانِ کلیسا اور راہب، سب کے سب عالمِ اسلام کو بخشم خود دیکھ چکے تھے۔ تاہم مغرب کا عام آدمی اسلام سے اب بھی بے خبر تھا۔ اسے تو کلیسا کے توسط سے اسلام کا ایک نفرت انگیز تصور ملا تھا۔ یہ تصور ان کے دلوں پر اس طرح نقش ہو چکا تھا کہ منائے نہیں مٹ سکتا تھا۔ انکی تسکین صرف اس طرح ہو سکتی تھی کہ اس نقش میں مزید گہرائی پیدا ہو۔ مزید کریہہ رنگ بھرے جائیں۔ مغربی اہلِ قلم اس عوامی ضرورت کی تکمیل کر رہے تھے۔ تاہم اربابِ کلیسا کو یہ احساس تھا کہ اس طرح ہوا میں تیر چلانے سے مقصد حاصل نہ ہو سکے گا۔ اسلام کے علاج کے لیے اسلام کی حقیقی نوعیت اور اسکی کمزوریوں کو سمجھنا ضروری ہوگا۔ اس طرح اسلام کی دو مختلف تصویریں بننے لگیں۔

یا مقصد مطالعہ : پیٹر۔ ونیر ہیل (Peter the Venerable) نے بامقصد مطالعہ کی طرف پیشقدمی کی۔ اس نے اس مقصد کے لیے ایک جماعت (Order) قائم کر کے دینی کتب کے تراجم کا کام شروع کرایا۔ قرآن پاک کا لاطینی ترجمہ ۱۱۴۱ء میں ہوا۔ (cf. Phillips K.Hitti; Islam and the West, p.52)۔ اسی کی جماعت کے ایک انگریز رابرٹ نے ۱۱۴۳ء میں قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ کیا۔ [cf. Robert of]

[Kitton; Translation of Koran, Islamic Quarterly, II, 1955, pp. 309-312)

اس جماعت نے متعدد کتب کا ترجمہ کیا جو گھونٹی تحریرات (Cluniac Corpus) کہلائیں۔ پیٹر نے ان تراجم پر خود اپنے مقالات تحریر کیے۔ یہ تحریریں یہ کاپزس خاصی مقبول ہوئیں۔ تاہم بعض حلقوں میں اس دلچسپی کے بارے میں تشویش پیدا ہوئی۔ پیٹر کے ایک حریف نے اسے کارناموں پر اعتراض کیا جس کے جواب میں اس نے تحریر کیا، ”اگر میری مساعی صرف اس لیے حاصل نظر آرہی ہیں کہ دشمن پر اس سے کوئی اثر نہیں ہوگا، تو عرض یہ ہے کہ ایک عظیم بادشاہ کے ملک میں کچھ کامزوروتوں کے پیشِ نظر اور کچھ کامزورائش و زینائش کے لیے اور بچہ دلوں کے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

لیے کیے جاتے ہیں۔ صاحب امن سلیمان نے دفاع کے لیے ہتھیار بنوائے جنکی ضرورت اس کے دور میں نہیں تھی۔ دائور نے بیکل کی آرائشی اشیاء، تیار کروائیں، جبکہ یہ اشیاء، انکے عہد میں استعمال نہیں کی جاسکیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا کام لا حاصل نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ اگر گمراہ مسلمان اس سے راجع (conversion) پر نہیں لائے جاسکتے تو وہ محقق جو تلاش حق میں سرگرداں ہیں، چرچ کے ان کمزور آرائین کو آگاہ کرنے سے ہرگز گریز نہیں کریں گے جو باستانی متوازن ہو جاتے ہیں یا غیر ارادی طور پر معمولی باتوں سے ہراساں ہو جاتے ہیں۔

(R. W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, pp.38-39)

پیٹر وینیر بیل کے بارے میں رودسن نے اعتراف کیا کہ،

”اس کا مقصد بدعتوں، یہودیوں، اور مسلمانوں سے کارر علمی دلائل کے ساتھ مقابلہ کرنا تھا۔“

(Maxine Rodinson; 1974 ed., Legacy of Islam, article 'The Western Image and Western Studies of Islam', p. 16)

پیٹر کی یہ دلچسپی اسلام کو سمجھنے کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے کمزور پھور دریافت کرنے اور کھینساؤ و وباں سے حملہ آور ہونے کے لیے موافق اہم کرنے کی غرض سے تھی۔ چنانچہ اس نے ترجمہ کے ساتھ ایک ضمیمہ بعنوان ’ازالہ عقائد محمدیان‘ (Refutation of Beliefs of Muhammadans) بھی شامل کیا تھا۔

(Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.53)

قرآن کی طرح بارہویں صدی میں سیرت پر بھی کتب تحریر کی گئیں۔ قہر آف نوبت کی تصنیف کو اولیت دی جاتی ہے۔ اس کتاب کو اس دور میں مستند ترین سیرت تصنیف رکھا جاتا تھا۔ یہ لکھی مستند تھی اس کا اندازہ خود اسکے مصنف کے اعتراف سے ہو سکتا ہے کہ ”اس کے پاس سند اور حوالوں کے لیے کوئی کتاب نہیں تھی اور نہ ہی اس نے اپنی تصنیف میں کسی اور کتاب سے کوئی مدد لی۔“

(R.W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.31)

اس نے اقرار کیا کہ ”اس کا تمام کا تمام مواد رائے عامہ (Public Opinion) (یعنی سنی سنائی باتوں) پر مشتمل تھا۔“ (حوالہ بالا)۔ واقعات کی صحت اور عدم صحت کی ذمہ داری سے گریز کرتے ہوئے اس نے تحریر کیا کہ ”احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ایسے شخص کو برا ہی کہا جائے جس کی بدافعالیاں اس قدر بڑھی ہوئی ہوں کہ بیان نہ کی جاسکیں۔“ (حوالہ بالا)۔

بارہویں صدی عیسوی میں جرمن شہنشاہ کے ایک سکریٹری گادفرے نے اپنے عالمی وقائع میں حیات نبوی ﷺ کا ایک مصنوعی خاکہ بھی شریک کیا۔

(N. Rodinson; 1974 ed., Legacy of Islam, p.20)

اسی صراح کارڈینس رودریچ نے جو طیبلڈ کا بشپ تھا، یورپ میں مرتب کی جانے والی، اونیورسٹی تاریخ عرب تحریر کی جس کی ابتدا عہد نبوی ﷺ سے کی گئی۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

راجر بنکین: راجر بنکین ازمنہ وسطی کا مشہور مصنف ہے۔ اس نے اسلام سے پنپنے کے لیے پوپ کی خدمت میں جو تجاویز پیش کیں انکی تفصیلات حال ہی میں سامنے آئی ہیں۔ اس کی تصنیف (Opus Miaus) کے جو حوالے سدرن نے دیے ہیں، انکے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں اسلام کے بارے میں مغربی کلیسا کا اندازِ فکر کیا تھا۔ اس نے لکھا،

”دنیا میں عیسائیوں کی تعداد بہت کم ہے جبکہ بے دینوں سے بھری پڑی ہے۔ اور ایسا کوئی نہیں جو انہیں راہِ حق بتلا سکے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ راہِ بتلانے والا کیوں نہیں تو جواب یہ ہے کہ کچھ تو عالمِ عیسائیت کے مقاصد غلط تھے اور کچھ اس کے وسائل بھی نامناسب تھے۔ مقاصد اس اعتبار سے غلط تھے کہ یہ غلبہ کی خواہش سے آلودہ تھے، جس کے سبب عیسائی بنانے کی کوششیں ضائع ہو گئیں۔ جنگیں ناکام ہو چکی ہیں لیکن اگر یہ کامیاب بھی ہو جاتیں تو لا حاصل رہتیں، کیونکہ اتنے وسیع علاقے پر قبضہ برقرار رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ پھر جو لوگ باقی بچتے وہ فاتحین کے خلاف مشتمل ہوتے۔ انکی ہمسائیگی خطرناک ہوتی اور یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کر لیتے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ آج ہم مختلف اسلامی مملکتوں میں کر رہے ہیں۔ لہذا تبلیغی وہ واحد طریقہ کار ہے جس کے ذریعہ عالمِ اسلام میں نفوذ کیا جاسکتا ہے۔“

”اس مقصد کے لیے ہمارے وسائل تین اعتبار سے کم ہیں۔ ضروری زبانوں سے کسی کو واقفیت نہیں ہے۔ بد اعتقادی کی کیفیتوں کا نہ تو مطالعہ کیا گیا ہے اور نہ ہی تعین۔ اور پھر انکے ازالے کے لیے ابھی تک دلائل پر غور بھی نہیں کیا گیا ہے۔“

(Opus Miaus III ; 121-122, quoted by R. W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, pp. 56-57)

بنکین کی تحریروں کا بیشتر حصہ ایسی تجاویز سے بھرا پڑا ہے جو عیسائیت کو اسلام پر غلبہ دلانے کی غرض سے پیش کی گئی تھیں۔

بارہویں صدی کے متزجمین نے عالمِ اسلام کے بیشتر نامور فلاسفہ کے کارناموں کو لاطینی میں منتقل کر دیا تھا۔ بنکین ان سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ اس نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ فلسفہ کو بطور ہتھیار استعمال کرنا عیسائیت کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کے نزدیک لوگوں کو حق کی جانب مائل کرنے کے دوطریقے تھے۔ ایک معجزات اور دوسرا فلسفہ۔ ہتھیار کے بل بوتے پر تبدیلی مذہب کے امکان کو وہ پہلے ہی مسترد کر چکا تھا۔ اب اس نے معجزات کو بھی خارج از بحث قرار دیکر صرف فلسفہ کی افادیت پر زور دیا۔ اس نے لکھا،

”فلسفہ بے دینوں کا اہم ترین ہتھیار ہے۔ اس میں جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے انہیں سے کیا ہے۔ چونکہ فلسفہ بے دینوں کا خصوصی ہتھیار ہے اس لیے اس پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، تاکہ ان لوگوں کو جب بھی فلسفہ لوٹایا جائے تو وہ دینی تقدس سے لبریز ہو۔“ (حوالہ بالا)

لیکن نے ادیان عالم کا یکے بعد دیگرے جائزہ لیا اور اس امر کی نشاندہی کی کہ کس مذہب سے کس پیرائے میں بحث کی جائے۔ اسلام اسکے نزدیک نہایت پیچیدہ مسئلہ ہے، تاہم طول طویل بحث کے بعد اس نے دعویٰ کیا کہ اگر اس کا منطقی انداز اختیار لیا جائے تو اسلام کو اکھیر پھینکا جاسکتا ہے۔

(R.W.Southern; 'Western Views of Islam in the Middle Ages', p.59)

ریمنڈل: یہ شخص ہسپانوی کلیسا کا رکن، لیکن کا معاصر اور خیال تھا۔ اسکی زندگی کا واحد نصب العین یہ تھا کہ حروب صلیبیہ کو مادی جنگ سے روحانی جنگ میں تبدیل کر دے۔ [Earnest Barker, 1960 ed.,]

(Legacy of Islam, essay 'The Crusades', p.64)۔ اس نے اپنی ساری توانائیاں اسلام کے خلاف نفرت انگیز لٹریچر تخلیق کرنے میں گزار دی۔ اسے مسلمانوں کی مکمل تباہی سے کم کوئی اور شے مطمئن نہیں کر سکتی تھی۔ یوں تو اس نے دوسو سے زیادہ کتابیں تحریر کیں لیکن اس کا بڑا کارنامہ اس کی کتاب (Refutation of Infidel Errors) [لادینی غلطی کا ابطال] ہے، جس کا عنوان ہی اس کے مندرجات کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ اس نے خود عربی زبان کی تحصیل کی۔ راہبوں کا ایک سلسلہ (Order) قائم کیا، جس کا مقصد اسلام اور بانی اسلام کی حیات طیبہ کا راست عربی سے مطالعہ کر کے ان پر تنقید کرنا تھا۔

اس نے بھی اپنی تجاویز پوپ کو پیش کیں تاکہ ان پر عمل پیرا ہو کر روحانی حروب صلیبیہ لڑی جاسکیں۔ ان تجاویز میں تبلیغی سرگرمیوں اور اور عربی سے راست مطالعے پر خصوصی زور دیا گیا تھا۔ اس نے اپنے مدارس میں عربی زبان کی تعلیم کا خصوصی بندوبست کیا تھا اور اس کی کوششوں سے روم، بلوگنا، پیرس، آکسفورڈ اور سلیمانکا میں عربک اسٹڈیز کے مراکز قائم ہوئے۔ اپنی تبلیغی سرگرمیوں کے سلسلے میں وہ تینوں پہنچا جہاں اس نے کھلم کھلا گستاخیوں کا ارتکاب کیا، جس کے سبب قاضی شہر نے سزائے قید دینے کے بعد اسے شہر بدر کیا۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p.223)

دوسری بار پھر آیا اور مسلمانوں میں تثلیث کا پرچار کرنے لگا۔ اس کی یہ کوشش اس قدر ناکام رہی کہ جھنجھلاہٹ کے عالم میں چیخا پھرتا تھا، ”عیسائی شریعت و قانون مقدس ہے اور مورون [مسلمانوں] کا جھوٹا۔“

اس پر مشتعل ہجوم نے اسے سنگسار کر ڈالا۔ (Phillips K.Hitti; Islam and the West, pp. 52-53)

تجاویز کی منظوری: لیکن اورل کی تجاویز نے چرچ کے ارباب حل و عقد کو متوجہ کیے بغیر نہ چھوڑا۔ ان کی ہر تجویز کسی نہ کسی کے دل کو لگی، جس کے سبب عربی زبان کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اسلامی علوم کے مطالعے کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی۔ تبلیغی سرگرمیاں ناگزیر تھوڑی ہوئیں، روحانی تقدس سے لیس فلسفہ کو اہم ہتھیار کی حیثیت حاصل ہوئی اور ازالہ اسلام کے لیے مناسب دلائل فراہم کرنے کی مہم لازمی ٹھہری۔ وقت کے ان تقاضوں پر غور کرنے اور اور ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے ۱۳۱۲ء میں کلیسا نے وینن کونسل (Vienne Council) بلائی، جس میں ان نظریات کی سرکاری طور پر منظوری دی گئی، جو لیکن اورل نے عربی زبان اور مطالعہ اسلام کے بارے میں پیش کیے تھے۔

(Maxime Rodinson; Legacy of Islam, 1974 ed., article 'The Western Image and Western Studies of Islam', p.26)

اس کونسل نے یہ نظریات کس ماحول میں منظور کیے ہوئے تھے، اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ پوپ کلیمنٹ پنجم (Clement V) نے اپنا استثنائی حکم نامہ اسی کونسل کے پلیٹ فارم سے جاری کیا جس میں عیسائی حکمرانوں کو یہ ہدایت جاری کی گئی کہ وہ اپنے علاقوں میں اذان کی ممانعت کر دیں، اور اپنے متبوعہ علاقوں کے مسلمانوں کو مقامات مقدسہ (حرمین شریفین) کی زیارت کے لیے جانے کی اجازت نہ دیں۔

(Norman Daniel; The Arabs and Mediaeval Europe, p. 258)

ان نظریات کی منظوری کی بدولت یورپ کی یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے شعبوں کا قیام عمل میں لایا جانے لگا۔ تبلیغی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔ نئے نئے تبلیغی سلسلے (Orders) وجود میں آئے۔ تحقیقی ادارے قائم ہوئے۔ انگلستان میں ایک انجمن (Society for Promotion of Christian Knowledge) علوم مسیحی کے ارتقاء کے لیے قائم ہوئی۔ مسٹر سیل (Sale) اسی انجمن کے محقق گزرے ہیں، جنہوں نے ۱۷۳۷ء میں سوسائٹی کی جانب سے قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ عصر حاضر تک مستند سمجھا جاتا تھا، تا آنکہ ۱۹۶۰ء میں اسے قابل اعتراض قرار دیکر حکماً اسے نئے امریکن یونیورسٹی لائبریری قاہرہ سے خارج کیے گئے۔

(Phillips K. Hitti; Islam and the West, pp. 54)

فلسفہ: چودھویں صدی عیسوی سے فلسفے کی جانب بھی توجہ شروع ہو گئی۔ مسلم فلاسفہ کے مطالعے نے ابن رشد کو یورپ کے دل و دماغ پر مسلط کر دیا تھا۔ ابن رشد کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے خود کلیسا کو زبردست جدوجہد کرنی پڑی۔ سینٹ تھامس اکویناس نے جب ابن رشد کے ازالہ کا دعویٰ کیا تو مغرب میں ایسی مسرت محسوس کی گئی گویا انہوں نے میدان فکر میں ایک شخص یا مکتب فکر کو نہیں بلکہ اسلام کو شکست دیدی ہو۔

اصلاح مذہب: علوم اسلامیہ اور فلسفے کے با مقصد مطالعے اور دلائل و براہین کی تلاش نے بعض اہل نظر کو اصلاح مذہب کی طرف مائل کیا۔ انہیں یہ محسوس ہونے لگا کہ کیتھولک کلیسا کی خامیوں کی بدولت لوگ عیسائیت سے دور اور اسلام سے وابستہ ہیں۔ لہذا اگر کلیسا اور مذہب میں ضروری اصلاحات کر لی جائیں تو اسلام خود بخود ہی مرجعاً جائے گا۔ اس نکتہ نظر کا پر جوش حامی وے کلف (John Waycliffe) تھا۔ اس کے نزدیک اسلام میں جتنی خامیاں بیان کی جاتی تھیں وہ سب کی سب خود کلیسا میں موجود تھیں۔ اس نے اسلام کے ارتقاء کا ذمہ دار کلیسا کو قرار دیا۔ اس نے کہا کہ کلیسا کی نظر میں اسلام ایک بدعت ہی سہی، لیکن انجیل مقدس کی نظر میں خود کلیسا اسلام سے بدتر بدعتی ہے۔

کلیسا سے مخالفت کی تہہ میں بھی اسلام سے دشمنی کا جذبہ کارفرما تھا۔ وے کلف کے مطابق اسلام سے صرف اس وقت مد مقابل ہوا جاسکتا تھا جب چرچ میں اندرونی اور بیرونی تطہیر کر لی جائے۔

(cf R.W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, pp. 78-82:

also Henry Pirenne; A History of Europe, pp. 402-404)

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

بنی اسرائیل کی شکست و فتح کا عقیدہ بھی عیسائیت نے من و عنان پایا۔ چونکہ خدا خود شریک جنگ ہوتا تھا اس لیے فتح تو اسکی خوشنودی کی علامت تھی۔ لیکن اس شرکت کے باوجود اگر شکست ہوتی تو اس شکست کی توضیح اسرائیلی انداز میں یہی کہی گئی کہ یہ شامت اعمال کا نتیجہ تھی، جسے خداوند نے شکست کی صورت میں ان پر مسلط کیا۔ غرضیدہ کہ عیسائے مغرب کو ایک مؤثر نظریہ جنگ عطا کیا، جس کے اثرات جلد ہی ظاہر ہونے لگے۔ اسپین میں مغلوب عیسائیوں کی جنوبی تحریک چلی اور گیارہویں صدی میں پوپ کی ایک آواز پر صلیبی پرچم کے سائے تلے ایک قیامت صغریٰ مشرق پر نوت پڑی۔ صلیب کے بادل چھٹے ہی تھے کہ منگول طوفان نے عالم اسلام کو تہہ وبالا کر ڈالا۔ اس طوفان کی انگینت میں پوپ کی مساعی کو بھی دخل تھا۔

پندرہویں صدی عیسوی، تبدیلیاں اور اقدامات

سیاسی تبدیلیاں : صلیبی اقدامات اور منگول یلغار نے مغرب پرست عالم اسلام کے ہدایاؤ کو تقریباً ختم کر دیا تھا۔ ہسپانوی مسلمانوں کا کمزور وجود سٹ کر غرناطہ میں محصور ہو چکا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی میں اسلام مغرب کے لیے کوئی خطرہ نہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس صدی کے اختتام تک مفکرین کے تمام نظریات محض تجاویز کی حیثیت رکھتے تھے، جن پر شدت سے عمل پیرا ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ گویا عربی زبان کی تحصیل اور فلسفے کے مطالعے کی طرف پیشرفت ہو چکی تھی لیکن ان میں سے کسی مسئلے میں شدت نہیں پیدا ہوئی تھی۔

پندرہویں صدی عیسوی میں سیاسی حالات میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اسپین میں مسلم اقتدار نے آخری پگھی لی تو یورپ کو مغرب کی سمت سے مسلم خطرے سے نجات ملی۔ لیکن اسی صدی میں مشرقی یورپ سے ترکوں نے اقدام کیا، اور اس صدی کے نصف اول میں ااطینی شہنشاہیت کی تمام بیرونی چوکیاں سر کر لیں۔ پورا بلقان کا علاقہ فتح کر لیا، اور قسطنطنیہ کے سقوط کے بعد ترکوں نے ہنگری کے پایہ تخت دینا نا کے دروازے کھٹکھٹانا شروع کر دیے۔ ترکوں کی اس کامیابی کے باعث مغرب پر ایک بار پھر خطرے کے بادل منڈلانے لگے۔ عالم اسلام کے اس طرح رو بر و آ جانے کے باعث ایک بار پھر جنگ صلیبی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ پوپ نے صلیبی جنگ کی اپیل کی۔ ہنگرین اور جرمن اقوام ترکوں کے مد مقابل ہوئیں، لیکن شکست کھا کر پسپا ہوئیں۔

حکمتِ عملی کا تعین

ابتلاء اور ابتری کی اس صدی میں مغرب کا ہر ملک ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ ہر صاحبِ فکر اسلام کے خطرے سے نمٹنے کی تدابیر سوچ رہا تھا۔ ان حالات میں اس صدی نے چار شخصیتیں پیدا کیں۔ یہ سب کے سب کلیسا کے اہم عہدیدار اور ہم عصر تھے۔ ان کا تعلق مغرب کے مختلف ممالک سے تھا۔ ان سب کا رخ نظر اسلام کو کسی نہ کسی طرح نیچا دکھانا تھا۔ گو یہ اس حکمتِ عملی میں ایک دوسرے سے متفق نہیں تھے، لیکن اگر ہم ان کو ان کے ملکوں کی نمائندہ شخصیات تصور کریں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ پورا مغرب اب اسلام کے خلاف مزید کچھ کر گزرنے پر کمر بستہ ہو چکا تھا۔

جان دی سیکو ویہ: (Juan de Segovia) یہ ایک ہسپانوی نژاد (۱۴۰۰ء - ۱۴۵۸ء) آرج بشپ اور پوپ کا پر جوش حامی تھا۔ آخری عمر گوشہ نشینی میں گزاری۔ ایام گوشہ نشینی میں اس نے علوم اسلامیہ کا مطالعہ کیا، اور زندگی کے آخری ایام میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ اب ناپید ہے، تاہم اس ترجمہ کا مقدمہ محفوظ رہا۔ سابقہ تراجم خصوصاً پیٹرونیئر ہیل کے ترجمے پر اس نے اعتراضات کیے، اور ان میں لاطینی اصطلاحات کے استعمال کو بے محل قرار دیا۔ کیونکہ یہ اصطلاحات خالص عیسائی نکتہ نظر کی حامل تھیں، جن کے ذریعہ مسلم نکتہ نظر واضح نہ ہو سکتا تھا۔ (cf. D. Cabanelas Rodrigues; 1952, Juan de Segovia)

اس نے سنجیدگی اور متانت اختیار کی اور کوشش کی کہ صرف مذہبی رقابت کے باعث اسلام کو غلط رنگ میں نہ پیش کیا جائے۔ اس نے دعویٰ کیا کہ سیدھے سادے ترجمے کے ذریعے قرآن کا الجھاؤ اور تضاد (نعوذ باللہ) زیادہ واضح ہوتا ہے۔ لیکن کی طرح اس نے بھی جنگ کی حکمتِ عملی کو تسلیم کرنے سے انکار کیا، اور یہ بھی تسلیم کیا کہ تبلیغ کے ذریعہ مسلمانوں کو عیسائیت کی جانب راغب نہیں کیا جاسکتا۔

اس نے اپنی کچھ تجاویز پیش کیں اور ان پر غور کرنے کے لیے مسیحی علماء کا عام اجتماع طلب کیا۔ اس اجتماع کو اس نے کانفرنس کا نام دیا اور اس کے بعد ایسے اجتماعات کے لیے یہ نام ایک اصطلاح کی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس کانفرنس کا مقصد ہی ازالہ اسلام تھا۔ یہ کانفرنس نہ صرف مذہبی بلکہ سیاسی نوعیت کی بھی تھی۔

(for details cf. R.W.Southern; Western Views of Islam in Middle Ages, pp. 86-91)

نیکولاس آف کیوسا: (Nicholas of Cusa) (۱۴۰۱ء تا ۱۴۶۴ء)، ایک جرمن کلیسا کا کارڈینل، فلسفی اور نرم مزاج تھا۔ اس نے برسوں اسلام کے خلاف مواد جمع کیا۔ ایک کتاب یادگار چھوڑی جس میں اس نے ادیانِ عالم کا تقابل کیا تھا۔ وہ ایک زبردست ناقد تھا۔ اس کے مباحث اور تنقیدیں آج بھی یورپ کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اس نے بھی ازالہ اسلام کے لیے کانفرنسیں منعقد کیں۔ اس نے کلیسا کے وفور اپنے دور کے حکمرانوں خصوصاً ترک سلاطین اور شہزادگان کی خدمت میں روانہ کیے، جن کے ذریعے انہیں عیسائیت قبول کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

کرنے کی دعوت دی۔ ۱۳۶۰ء میں اپنی نوعیت کی یگانہ کتاب (The Cribratio of Alcoran) تحریر کی جس میں قرآنی مضامین کی چھان بین تفصیلی انداز سے کی اور یہ مفروضہ پیش کیا کہ قرآنی مضامین کے تین بنیادی عناصر ہیں۔ اولاً نسطوریت، ثانیاً عیسائیت کے اختلافی نظریات جن سے یہودی مشیروں نے روشناس کرایا اور ثالثاً وہ رد و بدل، تحریف و تصریف جو وصال نبوی ﷺ کے بعد یہود نے (نعوذ باللہ) قرآن میں کی۔ اس کے نظریے کے مطابق نہ صرف جنگ و تبلیغ، بلکہ فلسفہ بھی اسلام کے خلاف بیکار اور بے اثر تھا۔ وہ خود قرآن میں نقائص کا متلاشی رہا، اور دوسروں کو بھی اس راہ پر گامزن ہونے کی دعوت دیتا رہا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۹۲ تا ۹۴)۔

ژال ژرمان : (Jean Jermain) متوفی (۱۳۶۱ء) ایک فرانسیسی بپش تھا جس کا مطلق نظر عالم اسلام کی تباہی تھا۔ اس کا انداز فکر دوسروں سے مختلف تھا۔ اس نے اپنے دور کے کرجمین حکمرانوں کو ابھارا کہ حقیق ہو کر اسلام کے خلاف تلوار اٹھائیں، اور عیسائیت کو فتح اور کامرانی سے ہمکنار کریں۔

اس نے شاہ فرانس کو تحریر کیا،

”آئیے ہم گادفرے اور باویلن کا جذبہ پیدا کریں، فلیس الفاتح، شاہ فرانس کی روایت کو زندہ کریں، سینٹ لوئی کے نقش قدم پر چلیں۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو ساری دنیا آپ کی عظمت، شوکت اور فتح مندی کے ترانے گائے گی، آپکو چارلس الفاتح۔ شاہ فرانس، نئے داؤد، نئے کائنات نامین اور نئے شارلمین کے القاب سے یاد کرے گی، جنہیں خداوند نے تمام فتوحات عطا کر کے مقدس کیتھولک مذہب کی اعانت، اور خود اپنے عظمت و جلال کی خدمت کی عزت و حرمت فرمائی، اور لازوال نیک نامی سے سرفراز کیا۔“

(R. W. Southern; Western Views of Islam in Middle Ages, p.95)

اس نے ساری زندگی اس کوشش میں گزار دی کہ مغرب کو متحد کر کے کسی نہ کسی طرح پھر سے جنگِ صلیبی چھیڑی جائے، اور اسلام کی جگہ عیسائیت کو بزورِ مشیر رائج کیا جائے۔ جان دی سیگو ویہ نے اسے جنگ سے احتراز اور پرامن طریقوں سے مسئلہ اسلام کا حل تلاش کرنے کا مشورہ دیا، (cf. Cabanelas D.; [Juan de Segovia, pp. 325-328])، تو اس نے جواب میں تحریر کیا،

”عرصہ ہوا کہ مذہبی جنگ پوپ کے فیصلے اور بادشاہوں کے دستور کے مطابق مقدس ہو چکی ہے۔ رومن چرچ اس کا اختیار دیتا ہے اور اس کے شرکاء کو مغفرت عطا کرتا ہے۔ اس کی توثیق عہد نامہ شتیق اور سوراؤں کے ایک طویل سلسلہ سے ہوتی ہے۔ ایک نئی جنگِ صلیبی تشکیل پذیر ہے، (لہذا) کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو مغربی یورپ کے فوجی مقاصد کے منافی ہو۔“

(R.W.Southern; Western Views of Islam in Middle Ages, p.96)

یہ شخص اس قدر متعصب تھا کہ مسلمان تو مسلمان، ان عیسائیوں سے بھی متفرق تھا جو کبھی کسی مسلمان ملک میں گئے ہوں یا جنہوں نے اسلام میں پائی جانے والی کسی حقیقت کا اعتراف کیا ہو۔

ایشیئس سلوینس : (Aenias Silvius) متوفی ۱۴۶۳ء، ایک اطالوی پوپ تھا۔ اس کی فکر کا حاصل تحریب اسلام اور تعمیر عیسائیت تھی۔ اس نے بھی اس مقصد کے لیے شاہانِ یورپ سے توقعات وابستہ کیں۔ اپنی سی کوشش کر دیکھی کہ سب مل کر عالم اسلام پر دھاوا بول دیں۔ جان دی سیگو ویہ نے اسے بھی جنگ جوئی سے باز رہنے کا مشورہ دیا، اور یاد دلایا کہ عیسائی اگر دس ہزار ہو گئے تو بیس ہزار مسلمان اٹھ کھڑے ہوں گے کیونکہ مسلمان تعداد میں عیسائیوں سے زیادہ ہیں۔ اس نے پوپ کی توجہ اس جانب مبذول کرانی کہ چرچ کا تحفہ جنگ نہیں بلکہ امن ہے۔ سلوینس نے جان کو تو جواب نہیں دیا، ہاں ۱۴۶۰ء میں ایک خط سلطان محمد ثانی، فاتح قسطنطنیہ کو تحریر کیا، جس کے بعد جان کے خط کے جواب کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اس خط کو ۱۹۵۳ء میں جی۔ توفینن نے شائع کیا۔ اس خط کی ابتدا، مغرب کی عظمت کے ترانوں، اس کی قوت و شان و شوکت، مغرب کی ہیبت اور عالم پر اسکی فوقیت کے بیان سے ہوتی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ قسطنطنیہ کی فتح کے بعد سلاطین عثمانی کا کوئی مد مقابل نہیں تھا۔ پوپ کا یہ کھوکھا بیان صرف مغرب کا بھرم قائم رکھنے کے لیے تھا۔ اس نے لکھا، ”آپ ہمارے کوائف سے اس قدر نابلد نہ ہونگے کہ عیسائی طاقتوں سے واقف نہ ہوں کہ اسپین کس قدر ثابت قدم، گال کتنے جنگجو، جرمن کتنے کثیر العدد اور برطانیہ کتنا طاقتور، پولینڈ کس قدر جری، ہنگری کتنا متحرک اور اطالیہ کس قدر دولت مند، بلند حوصلہ اور حرب و ضرب میں ماہر ہے۔ ترکوں کو اپنی حالیہ آسان فتوحات کی بنا پر اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونا چاہیے کہ وہ یورپی اقوام پر قابو پالیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یورپ نے ابھی جنگ کی ابتداء بھی نہیں کی ہے۔“

اس کے بعد پاپا قسطنطین،

”بہر کیف ایک معمولی سی چیز ایسی بھی ہے کہ جو آپ کو اس دور کا عظیم ترین، ناقابل شکست انسان اور لازوال شہرت کا مالک بنا سکتی ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ وہ کیا ہے۔ اس کا حصول کچھ مشکل نہیں۔ اس کی تلاش میں بھٹکانا بھی نہیں پڑتا۔ یہ شے ساری دنیا میں عام ہے۔ ایک تھوڑا سا پانی، جس سے پتھر لیکر آپ عیسائیت اختیار کر سکیں، اور انجیل پر ایمان لائیں۔ ذرا اتنا سا کر دیکھیے، پھر دنیا کوئی حکمران نہ ہوگا جو عظمت میں آپ سے زیادہ، یا سطوت میں آپ کے برابر ہو۔ ہم آپ کو شہنشاہِ یونان و مشرق کے لقب سے مخاطب کریں گے۔ جس سرزمین پر آپ کا قبضہ بالجبر ہے اس پر یہ قبضہ بالاتفاق ہوگا۔ تمام ممالک آپ کے تقدس کو تسلیم کر لیں گے اور آپ کو اپنا عادل و منصف مانیں گے۔ کامیابی آپ کے لیے اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آپ مسلم شریعت کے پیرو ہیں۔ بس ذرا ایک کرچمچن ہو دیکھیے، پھر آپ اپنے دور کے عظیم ترین انسان تسلیم کیے جائیں گے۔“

(G. Toffanin; Lettera a Maometto, II, pp.113-114,

quoted by R.W.Southern; Western Views of Islam in Middle Ages, p.100)

ہیسل کونسل : ۱۴۳۳ء میں کونسل آف بیسل منعقد ہوئی، جس میں مندرجہ بالا چاروں افراد نے

شرکت کی۔ اس کونسل میں چرچ آف گرلیس اور چرچ آف روم میں مصالحت کی (نا کام) کوشش کی گئی، تاکہ

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

یورپ کو اسلام سے منہ کی یکسوئی میسر آ جائے۔ اسی کونسل کے بعد ان شرکاء نے اپنے اپنے طور پر اسلام سے نبرد آزما ہونے کی راہیں تلاش کرنا شروع کیں۔

کانفرنسیں : نکولاس آف کیوسا نے اسلام کے خلاف متعدد کانفرنسیں کیں۔ ان میں شرکت کرنے کے لیے اس نے قاہرہ، اسکندریہ، آرمینیا اور یونان سے مندوب طلب کیے، جن سے اسلام کے خلاف مواد حاصل کیا، اور پھر مختلف وفود اسلامی ممالک کے حکمرانوں اور خاص کر ترک شہزادوں کی خدمت میں روانہ کیے تاکہ انہیں عیسائیت کی دعوت دیں۔ اہم ترین کانفرنس جان دی سگلو ویہ نے منعقد کی، جس کے شرکاء نے اسلام کے خلاف دفاع اور اس کے ازالے کی تجاویز پیش کیں، جس کے نتیجے میں چار مختلف گروہ منظم ہو کر سرگرم عمل ہوئے۔ چونکہ ہر گروہ کا بانی اور سربراہ خود پوپ یا کلیسا کا کوئی اعلیٰ عہدیدار تھا، لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ کلیسا کی تطہیر کے سوا ہر طریقہ کار کو کلیسا کی منظوری حاصل تھی۔

پہلا طریقہ کار جنگ : ٹاٹاں ژرماں اور اس کے گروہ کے نزدیک اسلام کا علاج جنگ تھا۔ گوسلیبی جنگیں بے سود ثابت ہو چکی تھیں، جس کے سبب اس کے بمعصر مقلدین کو اس طریق کار سے اتفاق نہ تھا، تاہم اس نے اپنے عہد میں کرجین حکمرانوں کو متاثر کر کے اسلام کے خلاف صف آرا کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اسکی حکمت عملی نے اسکی زندگی میں کوئی کامیابی حاصل نہیں کی۔ ترکوں کا فاتحانہ اقدام سولہویں صدی عیسوی سے پہلے نہیں رک سکا۔ تاہم اس کے بعد اس کے طریق کار نے اپنے اثرات دکھائے۔ اسپین میں مسلمانوں کی مکمل تباہی سے لیکر بیسویں صدی تک پورے عالم اسلام پر مغرب کا غلبہ اسی کے خواب کی تعبیر کہی جاسکتی ہے۔

دوسرا طریقہ کار تبلیغ : تبلیغ کے ذریعے اسلام سے مقابلہ کرنے کی تجویز اولاً بیکن نے پیش کی تھی۔ لہل نے اسے آگے بڑھایا، اور پندرہویں صدی میں اس غلیظ نظر کواٹینیس سلوینس اور اس کے گروہ نے تحریک کی شکل دی۔ اس صدی کے بعد تبلیغی ادارے کثرت سے سامنے آئے اور اسلامی ممالک میں پہنچے۔ انکا کام یہ تھا کہ ان مباحث کی تشہیر کریں جنہیں مغربی مقلدین نے موضوع کیا ہو، اور ایسے مسائل سے کلیسا کو مطلع کریں جن کے باعث انکی سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو، تاکہ انکے ازالے کی فکر کی جاسکے۔

تیسرا طریقہ کار تحقیق : بیکن نے کلیسا کی توجہ اس امر کی جانب مبذول کرائی تھی کہ اگرچہ گمان کے مطابق اگر اہل عربوں کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ نیز یہ کہ رہنمائی کے لیے ضروری وسائل یعنی زبان سے واقفیت، اسلامی علوم سے آگاہی، اسلام کے کمزور پہلوؤں کا تعین اور عقائد اسلامی کے ازالے کے لیے دلائل مفقود تھے۔

جان دی سگلو ویہ نے اس جانب پیشقدمی کی۔ اس نے اس طریق کار کو ایک تحریک کی شکل دی۔ جان اور اس کے متبعین کوششیں کی افادیت سے انکار تھا۔ ساتھ ہی ان کے نزدیک مسلم ممالک میں تبلیغ ہی ایک مشکل کام تھا اور اگر ایسے ذرائع میسر آ بھی جاتے تو منطقی طور پر مسلمانوں کو عیسائیت کا قائل کر لینا ممکن نہیں تھا۔ اس گروہ نے فلسفہ، منطق اور علم کا سہارا کو مسلمانوں کی قوت استدلالی سے بڑا مفقود مرقوم کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی مکتبہ کا سب سے بڑا مفت مرکز

کہ چونکہ یہ علوم معاشرے کے اعلیٰ اور ارفع اذہان کو متاثر کرتے ہیں، اور اعلیٰ اذہان معاشرے کا دل و دماغ ہوتے ہیں، لہذا اگر عالم اسلام کے اذہان عالیہ کو مسخر کر لیا جائے تو پورے معاشرے کو بآسانی مسخر کیا جاسکتا ہے۔ یہ تھا وہ گروہ جس نے نظریاتی محاذ کی ابتدا کی اور اسلام کے خلاف قلم کو آلہ حرب کی حیثیت دی۔ ہمارا موضوع سخن یہی گروہ ہے۔

چوتھا طریقہ کار اصلاح : دے کلف نے اسلام کے ارتقاء کا ذمہ دار چرچ کو ٹھہرایا تھا، کہ چرچ کی کوتاہیوں کے سبب اسلام پھیلا، اور یہ کہ چرچ اگر اب بھی اپنی اصلاح کر لے تو اسلام مرجھا جائے گا۔ اس نظریے کو لو تھر نے سولہویں صدی عیسوی میں ایک تحریک بنا دیا۔ مارٹن لو تھر نے گزشتہ صدیوں کی اسلام دشمن تحریروں کو جمع کر کے انہیں جرمن زبان میں منتقل کیا اور ان میں خود اپنے پیش لفظ اور دیباچے بھی شامل کیے، جن میں اس نے بڑی شدت سے ازمہ وسطی کے اس دعوے کا اعادہ کیا کہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان مذہبی، علمی یا سیاسی مصالحت کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ قائل تھا کہ مسلمانوں کو عیسائی نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ انکے دل سخت ہو چکے ہیں۔ وہ مقدس صحائف (اناجیل) کے منکر اور (نعوذ باللہ) قرآنی لغویات کے قائل ہیں۔

لو تھر نے عیسائیوں کے دو دشمن قرار دیے۔ بیرونی دشمن اسلام اور اندرونی دشمن پوپ۔ اس نے کہا، ”کیا اسلام ہی عیسائیت کا واحد اور عظیم ترین دشمن ہے۔ نہیں بلکہ اس سے زبردست اور عظیم ترین دشمن تو خود چرچ میں موجود ہے۔ اور یہ دشمن پوپ کے سوا اور کون ہے۔“

(Quoted by R.W.Southern; The Western Views of Islam in the Middle

Ages, p.106)

نظریاتی محاذ

مستشرقین کی ابتداء اور علومِ شرقیہ کا مطالعہ

حکمت عملی کا تعین : لال اور نیکن (تیرہویں صدی عیسوی) سے لیکر لو تھر (سولہویں صدی عیسوی) تک تمام مفکرین اس امر پر متفق تھے کہ اسلام سے نمٹنے کے لیے محض فوجی کارروائی ہی کافی نہ تھی، بلکہ نظریاتی جنگ اشد ضروری تھی۔ مفکرین کی تجاویز کے مطابق نئے محاذ کے لیے حسب ذیل وسائل لازمی تھے۔

- ۱۔ اہل مشرقی، خصوصاً عربی زبان سے واقفیت
- ۲۔ علومِ اسلامی کا مطالعہ تاکہ کمزور پہلوؤں کو دریافت کر کے وہاں سے دباؤ ڈالا جاسکے
- ۳۔ ازالہ اسلام کے لیے مناسب دلائل کی فراہمی
- ۴۔ مسیحی تہذیب سے لبریز فلسفہ جو عالمِ اسلام کے اذہان کو متاثر کر سکے
- ۵۔ ایسا لٹریچر جو مسلمانوں کی اسلام سے وابستگی ختم کر سکے
- ۶۔ تبلیغی سرگرمیاں تاکہ مسلم معاشرے کو عیسائی بنایا جاسکے

مندرجہ بالا مقاصد سولہویں صدی عیسوی تک متعین ہو چکے تھے۔

ان محنتیں کردہ مقاصد کے حصول کے لیے جس گروہ نے عملی حصہ لیا وہ مستشرق کہلایا۔ یہ گروہ کلیسا کا پیدا کردہ تھا، اس لیے انیسویں صدی تک کلیسا کی مقرر کردہ پالیسی پر کاربند رہا۔ جب کلیسا کی گرفت کمزور ہوئی تو مستشرقین بھی کلیسا کے دباؤ سے آزاد ہوئے۔ مستشرقین کی اصل اہمیت مذہبی تھی لیکن جب مغربی ممالک کے سیاسی اور اقتصادی تعلقات ممالکِ اسلامیہ کے ساتھ قائم ہوئے تو انکی سیاسی اہمیت بھی پیدا ہوئی، تاہم دیگر اہمیت ثانوی تھی جو صرف مشرقی زبانوں سے واقفیت تک محدود تھی۔

مستشرقین کی ابتداء : لفظ مستشرق میں بڑی وسعت ہے، لیکن بنیادی مقاصد کے اعتبار سے یہ وہ گروہ ہے جو اباب کلیسا کے منصوبوں کے مطابق اہل مشرق اور علومِ اسلامیہ کا مطالعہ کرنے اور ایسا مواد فراہم کرنے کے لیے وجود میں آیا جو نظریاتی جنگ کے لیے مفید ہو۔ عربی زبان سے واقفیت اور علوم کے مطالعے نے مستشرقین کو

علمی مقاصد کی تکمیل کا بھی موقع دیا۔ چنانچہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں فرانسیسی، جرمن اور ہالندیزی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی تجاویز والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

مستشرقین نے تمام علوم اسلامیہ خصوصاً طب، فلسفہ، کیمیا، نباتات، ریاضی، جغرافیہ اور فلکیات کے خزانے اپنی قومی زبانوں میں منتقل کیے۔ سولہویں صدی (۱۵۸۶ء) میں عربی طباعت رائج ہوئی، جس کا مقصد تبلیغی اداروں کو عربی مطبوعات بہم پہنچانا تھا۔ اسکی بدولت بے شمار عربی کتب مستشرقین کے ہاتھوں میں پہنچیں۔ علمی اور مذہبی دلچسپی رکھنے والے افراد اور گروہوں کے علاوہ، سیاسی اور تجارتی مقاصد کے لیے بھی مشرقی زبانوں کی طرف بھی انگلستان اور یونائیٹڈ پرائس میں توجہ دی جانے لگی۔

سولہویں صدی عیسوی

عربی زبان کا اولین شعبہ، ۱۵۳۹ء میں کالج دی فرانس میں قائم ہوا، جسکی صدارت کا شرف گلاؤم پوسٹال (Guillaume Postal) کو حاصل ہوا۔ پوسٹال اپنے وقت کا عظیم سبکی عالم تھا۔ اسے مستشرقین کا باوا آدم کہا جاسکتا ہے۔ اسکی محنت نے مستشرقین کی جماعت پیدا کی، جس میں جوزف اسکالجر بہت نامور ہوا۔ اس شعبے کے کتب خانے میں بے شمار قلمی نسخے فراہم کیے گئے تاکہ سنجیدہ مطالعے کا سلسلہ شروع ہو۔ ان محققین کے کارنامے عربی رسم الخط میں شائع ہونے لگے، تاکہ دیگر مستشرقین کو آگاہی ہو سکے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ صرف نحو، لغات اور منطق سے پیشتر مستشرقین مسلح ہو چکے تھے۔

سولہویں صدی میں ہی لیڈن میں بھی عربی شعبے کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ فرانس فان راویلنجن (Francis von Ravelingen) نے ۱۵۹۳ء سے وہاں عربی کی تدریس شروع کی۔

سترہویں صدی عیسوی

سترہویں صدی سے عربی زبان کے شعبے تقریباً ہر یورپی ملک میں قائم ہوئے۔ پوپ اربن ہشتم نے ۱۶۲۷ء میں روم میں کالج آف پروپیگنڈہ (College of Propaganda) قائم کیا جہاں مشرقی علوم کا سرگرمی کے ساتھ مطالعہ کیا گیا۔ ۱۶۳۸ء میں آکسفورڈ میں شعبہ عربی کا قیام عمل میں آیا۔ ایڈورڈ پوکاک اسکے اولین صدر مقرر ہوئے۔ انکے جمعہ صوفیوں میں اسکالجر اور ہوتنگر خاصے نامور ہوئے۔ ان مستشرقین کی کوششوں کو بہت سراہا گیا۔ انکی کوششوں سے عربی زبان سے نابلدہ افراد نے بھی فائدہ اٹھایا۔ بی، دی ہربیلوٹ (B. de Herbelot) نے مستشرقین کے فراہم کردہ مواد پر اپنی کتاب (مطبوعہ ۱۶۹۷ء) ’ببلیو تیک اور پینالو‘ (Bibliothèque Orientale) ترتیب دی جو مغرب میں انسانکو پیڈیا آف اسلام مرتب کرنے کی اولین کوشش تھی۔

مسلمانوں کی تحریروں کے راست مطالعے کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کچھ اہل قلم ایسے بھی نظر آنے لگے جنہوں نے اسلام کی مدافعت میں قلم اٹھایا۔ رچرڈ سائمن (Richard Simon) نے ۱۶۸۴ء میں اپنی ایک کتاب میں مسلمانوں کے عقائد و یا ننداری سے تحریر کیے اور کہیں کہیں سراسہ نہ کا انداز اختیار کیا جس کے سبب اسکے دوستوں نے اسے مطعون کیا۔

(cf. Simon's Letters Choiesies; 1930, Amster Dam, III-245, f: 258 f.,

quoted by Maxime Rodinson; The Legacy of Islam, 1974 ed., p. 37)

ولندیزی عربی داں اے ریلند (A. Reland) نے بھی سائمن کے انداز میں سترہویں صدی کے اواخر میں اسلام پر قلم اٹھایا۔ فلسفی پیئر بیل (Pierre Bayle) نے سیرت پر ایک بے ضرر کتاب ۱۶۹۷ء میں تحریر کی۔ اسی صدی میں ہنری اسٹب (Dr. Henry Stubb) نے [Rise and Fall of Mohametanism;] (1911, Published by Luzac and Co., London)، نامی کتاب تحریر کی۔ اگر اس کتاب کی چند تاریخی غلطیاں، جن کا ماخذ کرجینن تحریر میں ہیں، نظر انداز کر دی جائیں تو یہ نہ صرف ایک غیر جانبدار جائزہ بلکہ مغرب کا اولین اعتراف بھی ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی

اداروں کا قیام : اٹھارویں صدی میں مستشرقین نے اپنے باقاعدہ جداگانہ ادارے قائم کیے، تاکہ تعلیم گاہوں سے باہر ہمہ وقتی تحقیق کی جاسکے۔ مستشرقین (Orientalists) کی اصطلاح بھی اسی صدی میں رائج ہوئی۔

۱۔ لوئی چہاردہم نے ۱۷۰۰ء میں اور میریا تھریسیا نے ۱۷۵۴ء میں مترجمین کی تربیت کے ادارے قائم کیے۔

۲۔ ہندوستان میں ۱۸۴۰ء میں ولیم جونز نے 'ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال' قائم کی۔

۳۔ ۱۸۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کولکٹہ میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا، جس کی نگرانی میں مشرقی کتب، خصوصاً فارسی اور عربی سے، انگریزی میں ترجمہ کی گئیں۔

۴۔ اٹھارویں صدی کے بعد بھی مستشرقین کے ادارے انکی افادیت کے پیش نظر قائم ہوتے رہے۔

جرمنی میں اٹھارویں صدی کے اختتام تک یونیورسٹیوں پر کلیسا کا قبضہ رہا، جسکے باعث علوم شرقیہ کے آزاد مطالعے کی ابتداء انیسویں صدی میں ہوئی۔ ۱۸۰۹ء میں ویانا میں 'اورینٹل اکیڈمی' کا قیام عمل میں آیا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اسلامی مکتبہ کا سب سے بڑا مفت مرکز

علوم کا مطالعہ

مستشرقین کے اداروں کا قیام مغرب کے اندازِ فکر کا اہم سبب بن گیا۔ سترہویں صدی عیسوی میں سیاسی اعتبار سے اسلام خطرہ نہ رہ گیا تھا۔ جس کے سبب یورپ کا ذہن خوف سے آرا ہو چکا تھا۔ عربی نسخوں کے تراجم کے باعث حقائق سامنے آنے لگے۔ خود مغربی محققین نے اپنے لٹریچر سے وضعی مواد کو خارج کرنا شروع کر دیا۔ اڈورڈ پوکاک، صدر شعبہ عربی، آکسفورڈ نے اپنے مطالعے کی بنیاد پر اپنے قارئین کو خبردار کیا کہ، ”مغلط تاہوت کی کہانی پر مسلمان جی کھول کر بیٹھتے ہیں، اور اسے محض سرچین ذہن کی ایک قرار دیتے ہیں۔“

(Phillips K. Hitti; Islam and the West, p. 54)

اس نے کبوتر کی اس کہانی پر بھی تنقید کی جو پورے یورپ میں انیسویں صدی تک عام تھی جس کے مطابق نبی (ﷺ) نے ایک سفید کبوتر پالا تھا جو ان کے کاندھے پر بیٹھ کر کان سے دان نکال کر کھاتا تھا، جس سے لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا تھا کہ فرشتہ بشکل کبوتر وحی پہنچا رہا ہے۔ (حوالہ بالا)۔

ایڈیسن کے ایک معاصر ہمنگرے پریدو (Humphery Prideaux) نے سیرت پر ایک کتاب مغربی اور عربی مواد کی بنیاد پر تحریر کی، جس میں کچھ اصول تنقید مقرر کیے۔ اس نے بھی کبوتر کی کہانی اور اس قسم کی دیگر خرافات کو اس بنیاد پر مسترد کیا کہ یہ سب بے بنیاد اور تھوڑے سے بعید تھیں، اور یہ کہ ایسی چالیں عربوں کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھیں۔

(Humphery Prideaux; The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mohemet, 8th ed, p.38)

اٹھارویں صدی میں اسلام کے بارے میں خاصا مواد راست عربی کتب سے مغربی زبانوں میں منتقل ہو چکا تھا۔ عظیم علمی اور سائنسی سرمایہ صرف ترے کی محنت پر مغرب کی ملکیت بن چکا تھا۔ اسلامی معاشرے کو مغرب چشم خود دیکھ رہا تھا۔ ان کے مبلغین عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے سفراء مسلم حکمرانوں کے درباروں میں موجود تھے۔ تجارت کا دن رات کا سابقہ تھا۔ اس کے باوجود اسلام انکی چشم روشن میں محض فریب اور (نعوذ باللہ) پیغمبر ہر وہیے تھے۔

ہمنگرے کی کتاب ایک طرف لغویات کو مسترد کرتی نظر آتی ہے تو دوسری طرف اس کا عنوان (Nature of Imposture Displayed)، (اظہارِ اندازِ فریب) ہی مقصد تحریر کو ظاہر کرتا ہے۔

پوکاک کے جانشین ریویرنڈ جوزف وہائٹ نے ۱۸۴۷ء میں جو لیکچر دیے ان کا مقصد سرچین عقائد کو مستحکم اور شبہات و بدعات کا ازالہ کرنا تھا۔ ان میں سے ایک لیکچر اسلام کے لیے مختص تھا۔ اس لیکچر کا عنوان بھی (Mahomet's Imposture) (نعوذ باللہ) [فریبِ محمدی (ﷺ)] تھا۔ (cf. Joseph White;)

[Sermons Preached before University of Oxford in the Year 1784, p.171]

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اٹھارویں صدی کے مستشرقین میں جن لوگوں نے اسلام پر معاندانہ یا جہر دانہ انداز میں قلم اٹھایا ان میں جوزف جہانک، ہنریکس، بریڈمانڈ، ایڈمز، وٹ، ہینٹ، بلیر، دی انکونا، سائمن اوکلی، ایڈورڈ سائمن، جارج نیل، معروف فرانسیسی ادیب اور انقلابی و التبع اور مشہور جرمن شاعر گوٹے بہت نامور گزرتے ہیں۔

انداز میں تبدیلی : مسیحی علماء، شعراء اور ادباء کی بہ نسبت مسیحی مورخین نے اسلام، قرآن اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کچھ بہتر رویہ اختیار کیا۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک مغربی مورخین تاریخ اسلام کو زروں کے عہد تک محدود رکھتے تھے۔ سائمن اوکلی (پروفیسر آف عربک، گیمبرج یونیورسٹی) نے اپنی تاریخ کی ابتداء وصال نبوی ﷺ سے کی۔ اگرچہ تاریخ نویسی میں اس نے اعتدال سے کام لینے کی کوشش کی لیکن ذات نبوی ﷺ کے لیے (The Great Imposter) (نعوذ باللہ) عظیم فریب کار، اور اسلام کے لیے (Superstition) (توہم) کی اصطلاحات استعمال کرنے سے باز نہ رہا۔

(Simon Oookley; The History of Saracens, 5th ed., p.94)

ایڈورڈ گیلن نے اپنی مشہور تاریخ (The Decline and Fall of Roman Empire) میں ایک مکمل باب [۵۰] اسلام کے لیے مختص کیا۔ اپنی جولانی قلم، وسعت علمی اور اعتدال بیان کے باوجود اس نے اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی قابل ذکر پیشرفت نہیں کی اور اپنے پیشرووں، یعنی پریدو اور اوکلی کے نظریات کو جوں کا توں برقرار رہنے دیا۔

فرانس میں والتبع نے مؤرخ کی حیثیت سے قدرے رواداری کا ثبوت دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی شجاعت اور پامردی کا مقابلہ کرامویل سے کیا اور انکے کارناموں کو افضل قرار دیا۔ (cf. Phillips K. Hitti; Islam and the West, p.59) لیکن اپنی دوسری تصنیف میں اپنے دور کی روش سے گریز نہ کر سکا اور رسول اللہ ﷺ کو (نعوذ باللہ) بہروپے کے روپ میں پیش کیا۔ (حوالہ بالا)

اٹھارویں صدی کا جرمن شاعر گوٹے مشرق کا دلدادہ تھا۔ یہ صاحب فکر و نظر، پہلا مغربی فرد ہے جو کسی طور پر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو سکا کہ رسول اللہ ﷺ (نعوذ باللہ) بہروپے تھے۔ اس نے حیات طیبہ کو نظم کرنا شروع کیا تھا، مگر بد قسمتی سے یہ کاوش مکمل نہیں ہو سکی۔ علامہ اقبال نے اس نظم کے ایک حصے (Mahomets Gesang) (نغمہ محمدی) کو منظوم کیا ہے۔

اس طرح اٹھارویں صدی عیسوی سے قبل مغرب اسلام اور داعی اسلام کی مخالفت میں یک زبان تھا۔ اٹھارویں صدی میں، علوم اسلامیہ کے مطالعے کی بدولت، جو مخالفت ختم نہیں ہوئی، لیکن رکاکت ختم ہونے لگی۔ مخالفت میں بھی سنجیدگی اور معقولیت کی ضرورت محسوس کی جانے لگی۔ کچھ لوگ حق و انصاف کی جانب مائل ہونے لگے۔ شخصیت نبوی ﷺ کے چند پہلو با عظمت تسلیم کیے جانے لگے۔

ایک ہزار سال کے بعد مغرب میں ایک آواز ایسی بھی سنائی دی جس نے مغرب کے متحفظ الزام بہروپیت کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ گوٹے کی اس اخلاقی جرأت نے فکر مغرب میں ایک نیا موڑ پیدا کیا۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

انیسویں صدی عیسوی اور نظریاتی حملے

انیسویں صدی میں مغرب نے بے شمار مستشرقین پیدا کیے، جنہوں نے ہر دو انداز میں قلم اٹھایا۔ ان میں تھامس کارل کُل، ڈیون پورٹ، باس ورتھ آتمہ، اسٹینلے لین پول، ریناں، واشنگٹن ارونگ، ایچ جی ویلز، کانیتانی، بکر، گرم، دلہاؤزن، فان کریمر، شبر، نولدکی، سیل، اسپرنگر، دوزی، گولڈزیہر، ویر، ڈیوڈ مارگولتو، سی ڈی بور، ہنری لیمن، اور ولیم مینور کے نام بہت مشہور ہوئے۔

مستشرقین کی محنت کی بدولت اتنا عظیم سرمایہ علمی بہم ہو چکا تھا کہ اس سے استفادے کے لیے علوم کو شاخ در شاخ تقسیم کرنا پڑا۔ اور ہر شاخ کی تحقیق کے لیے ماہرین کی ضرورت پیش آئی۔ مہارت اور حقائق دونوں کی دستیابی کے باعث تقابل ادیان کی راہ کھلی، جو یقیناً ایک صحت مند رخ تھا۔ اس کے باعث مغربی نمکسال کے قدیم جہوٹے سکوں کا چلن ختم ہوا۔ گوتے کے نقش قدم پر کارلائل نے پیش رفت کی۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو انبیاء کا ہیر و تسلیم کیا۔ مغرب کو پہلی بار یہ باور کرنے پر مجبور کیا کہ حضور ﷺ اپنے مشن میں پر خلوص تھے، اور اسلام ایک حقیقی مذہب ہے۔ کارلائل کی اس پیش رفت نے مستشرقین کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا۔ مغربی اہل قلم کے لیے اب یہ ممکن نہ رہ گیا تھا کہ اشبہ قلم و بے لگام ہونے دیں۔

نئی راہ : تاہم مستشرقین اور ماہرین اپنے معاشرے کے جزو تھے۔ ان میں سے کوئی اتنا توانا نہیں تھا کہ معاشرے کی مروجہ روش کو ختم کر سکتا۔ نیز انکی تحقیقات کا صحیح نظر خالصتاً اسلام نہ تھا، بلکہ انکا اپنا معاشرتی مفاد تھا۔ یہ ماہرین اس تعصب سے بالاتر بھی نہ تھے جو مغرب کی گھٹی میں پڑا تھا۔ مذہبی عصبیت و جدل نے ماہرین کی نگرانی میں نئی راہ اختیار کی۔ غیر مفید حقائق بے دردی سے نظر انداز ہوئے۔ کارآمد مواد کا خورد بینی مطالعہ کیا گیا۔ اور اب جو اعتراضات سامنے آئے ان میں شاطرانہ مہارت پائی جاتی تھی، جسے رد کرنا عام انسان کے لیے آسان نہ تھا۔ یہ اعتراضات عیسائی دنیا کے لیے دل خوش کن، عالم اسلام کے لیے کرب انگیز، اور غیر جانبدار لوگوں کے لیے گمراہ کن تھے۔

انیسویں صدی کے سیاسی اور اقتصادی حالات یکسر بدل چکے تھے۔ عالم اسلام اب بھی دشمن تصور ہوتا تھا، لیکن ایسا دشمن جسکی کمزور پستی تھی۔ ماضی کا یہ عظیم ہیر و مندھال اور بے دست و پا ہو کر بہر انداز ہو رہا تھا۔ مغرب نے ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر عالمی برتری حاصل کر لی تھی۔ نہ صرف عالم اسلام بلکہ پورا کرۂ ارض، مغرب کے سیاسی اور اقتصادی جال میں پھنس رہا تھا۔ اس بالادستی نے مغرب کے قدیم احساس برتری کو شہت سے بیدار کیا۔ انیسویں صدی کا یورپ اس آقا کے انداز میں گفتگو کرتا نظر آتا ہے، جس کا ہر قول و فعل خود ستائی پر مبنی ہو۔ جو کل کائنات میں بے مثل ہو، کسی کو اپنا ثانی تصور نہ کرتا ہو اور جس کے مقابلے میں ہر شے پوچھ، لغو اور بیچ ہو۔

نظریاتی حملے

انیسویں صدی کی اہم ترین خصوصیت مذہب کی مخالفت ہے۔ بڑے بڑے مفکر، فلاسفر اور سیاستدان سب ہی نے حسب استطاعت مذہب کی خبر لی۔ ہیگل، فویرباخ، مارکس، اینگلس، وبر، ہرٹسٹن نے مذہب پر تند و تیز حملے کیے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے (نسیاسیت کے) ایوان مذہب میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ وہ تو کہیے کہ فکر نو کلیسا کی گرفت سے آزاد ہو چکی تھی، ورنہ ان میں سے شائد ہی کوئی دار و رسن سے بچ سکتا۔ مذہب پر تنقید کرنا فیشن بن چکا تھا۔ ان میں سے جو جری تھے انہوں نے خود اپنے مذہب کو نشانہ بنایا، اور جن میں اتنی جرأت نہیں تھی، انہوں نے چاند ماری کے لیے دوسروں کے مذہب کو منتخب کیا۔ مستشرقین تو وقف ہی اسلام کے لیے تھے، انہوں نے بھی کھل کر اپنے جوہر دکھائے۔

انٹلیکچوئل حملوں پر گفتگو اور بحث کرنے کے لیے ہم یہاں صرف تین موضوعات پر اکتفا کریں گے، جو اسلام، قرآن مجید اور حیاتِ طیبہ ہیں۔ باقی موضوعات بخوف طوالت چھوڑے جا رہے ہیں۔

اسلام

انیسویں صدی میں مستشرقین کے درمیان اسلام کو بحیثیت مذہب تو تسلیم کیا جا چکا تھا لیکن اسے ناقص بنا دیا جاتا تھا۔

کریمیر: ہندریک کریمیر (Hendrik Craemer) نے ہیگل کے مکتب فکر کی پیروی میں مذہب کی تعریف یوں کی کہ،

”ہر مذہب ناقابلِ تقسیم ہوتا ہے۔ اسے تقسیم نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس کا ہر جزو، عقائد، رسوم، اساطیر، ادارے اور مسلک، سب اپنے کل سے اس طرح یکجان اور پیوست ہوتے ہیں کہ انہیں جدا کر کے ان کی افادیت، اہمیت اور انکے رجحانات کو کبھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسکی مثال زندگی کا وجود ہے کہ جسم کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا اور اسکا صحیح ادراک اس کے وجود کوئی پر منحصر ہے۔ اجزائے بدن اسی وقت تک زندہ اور فعال ہیں جب تک (زندہ) بدن کے جزو ہیں۔“

(Hendrik Craemer: The Christian Message in a Non-Christian World, p.135)

لیکن یہی کریمیر اپنی ہی متعین کردہ تعریف مذہب کو اسلام پر منطبق کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اسلام کو غیر اصلی مذہب (Un-Original Religion) قرار دیتا ہے۔ (حوالہ بالا)۔ اس کے نزدیک اسلام ایک ایسا عظیم بدنِ مشترک ہے، (Great Syncritistic Body)، جس میں متضاد عناصر کو ایک نظام میں مجتمع کر دیا گیا ہے۔ (حوالہ بالا)۔

سیدھے سادے الفاظ میں، وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ، عیسائیت کا اگر تجزیہ کیا جائے گا تو اسکی ماہیت، افادیت اور اہمیت سمجھی نہیں جاسکے گی، اس لیے اسکا تجزیہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ لیکن اسلام کی ماہیت سمجھنے کے لیے اسکا اجزاء میں منقسم کر کے مطالعہ ضروری ہے۔ کریم نے مذاہب کو جانچنے کے لیے یہ معیار مقرر کیا کہ ”مذہبی تحریکیں اپنے ثمرات سے پہچانی جاتی ہیں۔“ [Attributed to Kreimer, quoted by]

-(Montgomery Watt; Truth in the Religions, p.10)

اس اصول کو مقرر کرنے کے بعد پھل کو جانچنے کا ایک انوکھا معیار یوں مقرر کیا کہ،

"That for Christians, the value of Religious and Social Phenomena must be judged by Christian Values."

[عیسائیوں کے لیے، مذہبی اور معاشرتی فہم کی قدر، عیسائی اقدار کے مطابق جانچی جاتی ہے۔] (حوالہ بالا)

مذہب اپنے ثمرات سے پہچانا جاتا ہے۔ لیکن ثمر کتنا ہی اچھا ہو، اگر عیسائی اقدار کے مطابق نہ ہو تو فضول گردانا جائے گا۔ گویا شرکی فطری خوبی کوئی شے نہیں ہے۔ اصل شے عیسائی اقدار میں۔ ظاہر ہے کہ اسلام کے ثمرات، عیسائی اقدار سے مطابقت نہیں رکھتے، پس اچھے نہیں ہیں۔ اور برا پھل دینے والا درخت برائی سمجھا جاتا ہے۔

ویبر: میکس ویبر نے اپنی کتاب سوشیولوجی آف ریلیجن میں اسلام پر بکثرت تبصرے کیے ہیں۔ ان تبصروں کو ترتیب دیا جائے تو اسکی نظر میں اسلام محض ایک سیاسی اور جنگی مذہب ہے۔ یہ مسخ کردہ تصدیر اس دعوے کی روشنی میں اور بھی آریہ ہو جاتا ہے کہ عیسائیت غیر سیاسی اور امن کا مذہب ہے۔ اس نے تحریک اسلام کے بارے میں لکھا،

"The Religion of the Prophet, which is fundamentally political in its orientation, grew primarily out of his purely prophetic mission. A merchant, he was first a leader of pietistic conventicles in Mecca, until he realized more and more clearly that the organization of the interest of the Warrior Clans in the acquisition of the booty was the external basis provided for his missionizing". (Max Weber; The Sociology of Religion, p.47, translated by Ephxaim Fischhoff)

[پیغمبر کا دین، جو اپنی سمت کے اعتبار سے بنیادی طور پر سیاسی ہے، ابتداً اُنکے خالص پیغمبرانہ نصب العین سے ابھرا۔ وہ ایک تاجر، اور مکہ میں پرہیزگارانہ اجتماعات کے رہبر تھے، یہاں تک کہ انہوں نے اس بات کا، واضح سے واضح تر طور پر، ادراک کیا کہ جنگجو قبائل کی مالی غنیمت کے حصول میں دلچسپی کا لحاظ، اُنکے نصب العین کی خارجی بنیاد ہونی چاہیے۔]

میکس ویبر کے تصدیر کے مطابق داعی اسلام ﷺ کی شخصیت کی عظمت، سیاسی اور فوجی بالادستی کی مہموں منبت ہے۔ جسکی کامیابیوں نے اسلام کو ”جنگی مذہب“ کی حیثیت سے استوار کیا۔ اسلام اس کے نزدیک

محض فوجیوں کا مسلک (Warrior Cult) تھا۔ اس کے نزدیک اسلام مذہب نجات نہیں۔ اسلام نے نفس اور بدن کے جو حقوق تسلیم کیے ہیں، وہ برا نہیں پیش کرتی قرار دیتا ہے۔ اس مفروضہ پر اس نے دعویٰ کیا۔

"As a religion of Masters, Islam despite its Jewish-Christian roots, was never a religion of salvation."

[آقاؤں کے مذہب کے طور پر اسلام، اپنی یہودی-عیسائی جڑوں کے باوجود، کبھی بھی مذہب نجات نہیں رہا۔]

(Max Weber; Economy and Society, Vol. 3, p. 625, ed. Gunther Roth)

اس صدی کے عام مبصرین کی مانند وہیر نے بھی ذات نبوی ﷺ اور جنس پر گھمایا تبصرے کیے۔

اسلام کے ارتقا کو اس نے بھی جنگ اور فتیالی کا نتیجہ قرار دیا۔

ولیم میور: اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلانے کا الزام اسی صدی کے بیشتر اہل قلم کا دستور تھا۔ ولیم میور نے

اس الزام کو بڑے زور و شور سے اچھالا۔ اس نے اپنی دو تصنیفات (Life of Mohammed, 1858)،

اور (The Caliphate, Its Rise, Decline and Fall, 1891) میں یہ تاثر دیا کہ مسلمان کے ایک

ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن ہوتا ہے۔ گویا اسلام ایک مذہب جبر ہے جو مفتوحین اور ذمیوں کے لیے

اسلام یا موت، دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اور یہ کہ اسی جبر کے نتیجے میں اسلام پھیلا۔

میور نے اپنی الزام تراشی کو تقویت دینے کے لیے اپنے ذاتی مشاہدات بھی پیش کیے۔ اس نے

ہندوستان کی جنگ آزادی کے واقعات اپنے بھائی کے نام تحریر کیے۔ اس خط میں اس نے لکھا،

”مسلمانوں نے یہ تہقہ کر کرتے ہوئے کہ انکے لیے اپنے مقاصد میں حتمی کامیابی کے امکانات خاص روشن ہیں،

کھلم کھلا اندر میں شرکت کر لی ہے۔ مثلاً علی گڑھ میں مسلمان کافی عرصے تک غالب رہے۔ انہوں نے وہاں کے

بہت سے ہندوؤں کو جبراً مسلمان بنایا۔“ (P. Hardy; The Muslims of British India, p.63)

ولیم میور کے اس نظریے سے مستشرقین عام طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ جی ای گریو نے باؤم

ایک معتدل صاحب قلم ہونے کے باوصف اسی نظریے کو دہراتا نظر آتا ہے۔ (cf. G.E. Grunebaum,]

-[Islam, essays on 'Nature and Growth of a Cultural Tradition', p.12)

شمشیر اور اسلام، عیسائی ترویر و دفاع: حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلانے کا شاخسانہ

عیسائیت کا وضع کردہ دفاعی نظریہ ہے۔ اس کے ذریعہ صرف یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام کی

مقبولیت اسکی حقانیت کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے جبر کا نتیجہ ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف اب خود مغربی اہل قلم بھی

کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ برائن ٹرنر نے لکھا،

"In order to explain the spread of Islam, Christian theology developed a defensive theory, which demonstrated that Islamic success was the product of Muslim violence, lasciviousness and deceit."

[اسلام کی توسیع کی وضاحت کرنے کے لیے عیسائی مذہبیت نے ایک دفاعی نظریہ پروان چڑھایا، جو یہ بیان کرتا تھا کہ اسلام کی کامیابی مسلمانوں کے تشدد و شہوت رانی اور فریب کاری کا نتیجہ ہے۔]

(Bryan Turner; Understanding Islam, p.19)

یہ کہنے کی اب کوئی ضرورت نہیں رہ جاتی کہ اس نظریے کا پرچار کرنے والے صرف کرگچین تھیولوجی کی ضروریات کی تکمیل کرتے ہیں۔

القرآن

عہدِ وسطیٰ میں قرآن کو طرح طرح سے بدف بنایا گیا۔ کسی نے اسے (نقلی کفر کفر نہ باشند) شیطانی کتاب قرار دیا۔ کوئی تھا جو اسے مجرمانہ سرقت کہتا تھا۔ اور کسی کے نزدیک یہ کتاب مقدس کا چرہ تھا۔ کسی کے خیال میں اسے کیسا کے باغی راہبوں نے مدون کیا تھا۔ غرض یہ کہ قرآن سب کچھ تھا لیکن صحیفہ ساوی نہیں تھا۔ مستشرقین میں بھی قرآن کے بارے میں یہی تصور پایا جاتا ہے کہ قرآن صحیفہ آسمانی نہیں بلکہ انسانی تصنیف ہے، اور اس میں پایا جانے والا بیشتر مواد کتاب مقدس سے ماخوذ ہے۔ یہ اندازِ فکر مغرب میں آج بھی عام ہے۔

میکسم روڈنسن نے مارکس اور فرانڈ کی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے یہ تاثر دیا کہ قرآن حضور ﷺ کے لاشعور کی پیداوار ہے۔ انکے لاشعور میں یہودی اور عیسائی تعلیمات موجود تھیں جو وقتاً فوقتاً غیر شعوری طور پر قرآن کی شکل اختیار کرتی رہیں۔ نیز یہ کہ وہ غیر مخلص نہیں تھے تاہم قرآن کو وحی باور کرنے میں (نعوذ باللہ) ان سے غلطی ہوئی۔ (cf. Maxime Rodinson, Mohammed, p.77)

معاندین کی زبان سے قرآن کے بارے میں جو کچھ نکلا، اس کے سوا ان سے اور کچھ توقع کی بھی نہیں جاسکتی تھی، لیکن حیرت تو اس وقت ہوتی ہے جب غیر متعصب سمجھے جانے والے، بلکہ معذرت کا انداز اختیار کرنے والے، مستشرقین بھی قرآن کو تورات و انجیل کے مطالعے کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

ڈیون پورٹ : ڈیون پورٹ حضور ﷺ کے مذاہن کی صف میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن غارِ حرا میں حضور ﷺ کے تحت کو جس طرح بیان کرتا ہے اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ قرآن دراصل بائبل کے مطالعے کا نتیجہ ہے۔ اس نے لکھا،

”بیان کیا جاتا ہے کہ ہر سال وہ ایک مہینہ غارِ حرا میں گزارتے تھے، جو مکہ کے مغرب میں تقریباً تین میل [پانچ کلومیٹر] کے فاصلے پر واقع ہے، اور یہی وہ مقام تھا جہاں انہوں نے بائبل اور گاسپل (صحائف) کا مطالعہ کیا، بحث اور استغراق سے لطف اندوز ہوئے۔“

(John Davenport; An Apology for Mohammed and Quran, p.13)

نکلسن: آراء نکلسن نے پامر کے ترجمہ قرآن کا دیباچہ تحریر کیا جس میں اس نے تذکرہ کیا کہ دو ربی ﷺ میں ایسے کئی افراد تھے جنہوں نے اپنا قدیم مذہب ترک کر کے خود اپنی راہ متعین کر لی تھی، اور یہ کہ یہ لوگ حنیف کہلاتے تھے۔ پھر قیاس کیا کہ قبل نبوت رسول اللہ ﷺ کے تعلقات ان لوگوں سے ضرور رہے ہوں گے۔ نیز یہ کہ تجارتی سفریوں نے حضور ﷺ کو یہ مواقع بہم پہنچائے کہ یہودیوں اور عیسائیوں سے تبادلہ خیال کر سکیں، جن کے نتائج قرآن میں محفوظ ہیں۔ [R. A. Nicholson, Introduction to 'The Koran',]

[<translation of Quran from Arabic to English by E. H. Palmer>, pp. x-xix)

نکلسن کے نزدیک قرآن کے مصنف حضور ﷺ ہیں۔ اس نے مکی سورتوں کو انجیل کے انبیاء کے کلام کے مطابق قرار دیا جبکہ مدنی سورتوں کے بارے میں تحریر کیا کہ، "یہ کہن کہ بقیہ قرآن فیضانِ وحی سے مبرا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا مصنف فریب (فراڈ) سے باخبر تھا۔" (حوالہ بالا)

قرآن کی ترتیب و تدوین پر بحث کرتے ہوئے نکلسن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ چونکہ وفات نبوی کے بعد اس کے تدوین کرنے والے اس کی صحیح طریقہ سے تدوین نہیں کر سکے، اس لیے انہوں نے آسان طریقہ یہ اختیار کیا کہ طویل سورتیں پہلے اور مختصر سورتیں آخر میں جمع کر دیں۔ اور یہ کہ اگر طریقہ کار اس کے برعکس ہوتا تو قارئین کے لیے شکاک کی گنجائش کم ہوتی۔ (حوالہ بالا)

اس نے دعویٰ کیا کہ عبادات جیسے اہم معاملات میں تفصیلات کا ناپایا جانا یہ ظاہر کرتا ہے کہ حضور ﷺ اپنی وحی کو کسی کتاب کے ابواب نہیں تصور کرتے تھے، بلکہ صرف ایسا پیغام سماوی سمجھتے تھے جو وقتی ضرورت کی تحمیل کرنے کے لیے نازل ہوا ہو، اور بعدہ جس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرز فکر کے باعث، بقول اسکے حضور ﷺ یا ان کے سامعین، ان آیات کے مستقبل سے بے پروا تھے۔ (حوالہ بالا)

نکلسن قرآن کو انانجیل نہیں بلکہ انانجیل کے مسٹر داور غیر مصدقہ مواد پر مبنی قرار دیتا ہے۔ (حوالہ بالا)

سپیل، میو ر اور نولد کی: سپیل، ویلم میو ر اور نولد کی میں سے ہر ایک نے قرآن کی جمع و تدوین کے مسئلے پر اپنے اپنے انداز میں بحث کی ہے، اور اپنے اپنے شبہات کا اظہار کیا ہے، جن کا مجموعی تاثر یہ ہے کہ حضرت زیدؑ نے جیسی بھی تحریر پائی درج کردی اور مطالب و معنی محل و مقام سے غیر متعلق رہے۔ نیز یہ کہ ان کے مجموعے میں نہ تو پورا قرآن مدقون ہو سکا اور نہ انکا ایڈیشن ملت نے تسلیم کیا۔

(cf. Muir, Life of Mohammed, pp. 555,557; Noldeke, Dictionary of Islam, pp. 486-487; Sale, Essays on Islam, pp. 214,218)

میو ر نے قرآن پاک کے بارے میں یہ شراغیز دعویٰ کیا کہ "لعوذ باللہ" محمد (ﷺ) خود اپنی وحی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔" (میو ر، حوالہ بالا، صفحہ ۱۴۲)

نولد کی نے قرآن کے حروف مقطعات کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ حروف ان اشخاص کے ناموں کی نشاندہی کرتے ہیں جن سے حضرت زیدؑ بن ثابت نے یہ سورتیں حاصل کیں۔ انہوں نے

بطور یادداشت یہ حروف سورتوں کی ابتدا میں تحریر کر دیے، جو بعدہ متن قرآن کا جزو تصور کر لیے گئے۔ مثلاً الر اس کے خیال میں الزبیر کا، المر، المغير، ہکا، اور ط حضرت طلحہ کے نام کا مخفف ہے۔

گولڈزیہر: (Goldziher) نے قرآن کا مطالعہ عمرانی نقطہ نظر سے کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ اسلام اور قرآن پر پارسیت اور عرب بدویت کے بھرپور اثرات ہیں۔ گولڈزیہر، نیز دیگر مستشرقین، ان اثرات کو جو علاقائی بودو باش کے تحت مسلمانوں نے قبول کیے یا ان لغزشوں کو جو انفرادی طور پر، یا گروہی حیثیت سے مسلمانوں سے سرزد ہوئیں، ہمیشہ اسلام سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اسلام پر پارسیت کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اسے زبان اور آرٹ پر پارسیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ تاریخ نویسی میں اسلام اسے ایران کا پیرو نظر آتا ہے۔

اس کے نزدیک قرآن کی تلاوت پر زور، نوحہ کی ممانعت، قرآن میں میزان کا بیان، وضو اور غسل کے احکامات، پنج وقتہ نمازیں، لوح محفوظ، شرک کی نجاست کا تصور، سب کے سب پارسیت کے اثرات ہیں۔

(Goldziher, article 'Influence of Parsisue on Islam', The Religion of the Iranian People, pp. 163-186)

گولڈزیہر کو قرآن میں سبت کی عدم موجودگی پارسیت کا اثر معلوم ہوتی ہے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۸۲)۔ لطف یہ کہ جن لوگوں نے جمعہ کو سبت کے مترادف قرار دیا، انکو اسکا وجود، یہودیت اور عیسائیت کا اثر نظر آتا ہے۔ اس نے اپنی کتاب (Muhammedaneche Studien, Halle 1988) کے باب اول میں یہ دعویٰ کیا کہ قرآن نے قدیم بدوی ضابطہ اخلاق (مروء) کو مبن و عنن اپنایا ہے۔ (cf. Montgomery Watt; What is Islam?, p.191)۔ اگنس گولڈزیہر کے اس نظریہ پر مستشرقین نے خاصی بحث و تنقید کے بعد اسے محض ایک غلو قرار دیا ہے، کیونکہ معروفات کسی ایک مذہب، قوم یا نسل کی میراث نہیں بلکہ انسانیت کی اعلیٰ قدریں ہیں۔ قرآن نے اگر انہیں مستحسن قرار دیا تو یہ کہنا کہ اس نے انہیں کسی سے مستعار لیا ہے، ایک نہایت ہی مضحکہ خیز امر ہوگا۔

مستشرقین کا نقطہ نظر: قرآن پر مستشرقین نے کیا کیا لکھا۔ اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ تاہم جو بھی تحریر کیا وہ اپنی ہی قدروں کی بنیاد پر تحریر کیا۔ یہ تحریریں زیادہ تر تقابلی تھیں، جنکا مطمح نظر یہ تھا کہ بہر طور مغربی قدروں کی برتری ثابت کی جائے۔ چنانچہ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ وہ تراجم قرآن یا تحریریں جو مندرجہ بالا نکتہ نظر کی حامل نہیں تھیں، یا تو شائع ہی نہیں ہو سکیں، یا اگر شائع ہو بھی گئیں تو اب اقتدار نے عمداً انہیں نیست و نابود کر دیا۔ مثلاً الیگزندر پاگانینی کا ترجمہ قرآن، مطبوعہ ویانا، پوپ کے حکم سے مندر آتش کیا گیا۔

(cf. John Davenport; An Apology for Mohammed and Quran, p.63)

سترہویں صدی عیسوی میں 'لودوویکو مراسی اس' (Lodovico Marracius) کے ترجمہ قرآن کی اشاعت کی اجازت اس وقت تک نہ دی گئی جب تک اس نے قرآن کی مخالفت میں ایک دیباچہ شامل نہیں کیا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۶۴)

عیسائی اقدار کی برتری قائم رکھنے کے لیے قرآنی اخلاقیات پر ناروا حملے اٹھائیں صدی تک عام تھے۔ قرآن کی دعوت کو وقتی اور مقامی ٹھہرایا گیا۔ اسکی تعلیمات کو دنیا پرستی اور عیش کوشی کی تعلیم کہا گیا۔ اس کے بحث کے تذکروں کی تصحیک کی گئی۔ جہاد کو خونریز، کا حکم دیا گیا۔ ایک سے زیادہ شادیوں کو عیاشی، اور حج کی رسوم کو مشرکانہ رسوم کی یادگار کہا گیا۔ اسکی زبان کو ہردی، ان گھڑ اور گھڑ قرار دیا گیا۔ اس میں تکرار، غیر موزونیت، الجھاؤ، ابہام، گرامر کی غلطیاں، حقائق سے ناواقفیت، تحریف و تصرف، اکتاہٹ جیسی غیر وصفی کیفیات بیان کی گئیں۔

ہرچند کہ ان حضرات کو قرآن میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی، لیکن پتہ نہیں کن مصلحتوں کی بنیاد پر اس کی تصنیف کا سہرا، عیسائی مانک اور ایرانی یہود کے سر باندھا جاتا ہے۔

حیاتِ طیبہ

عیسائیت اپنے بانی کے نام سے موسوم ہوئی۔ حضرت عیسیٰ کے بعد ان سے منسوب اقوال جمع ہوئے۔ تاریخی حقائق سے قطع نظر اسکی ایسی سوانح حیات مرتب کی گئیں جو خود اختیاری عقائد و رسوم کو سہارا دے سکیں۔ ان کتب کو صہبہ سامی کا نام دیا گیا۔ اللہ کے اس برگزیدہ عبد کو اپنی صنم پرستی کی تسکین کے لیے معبود قرار دیکر اس کی پرستش شروع کر دی گئی۔ چونکہ عیسائیت کا محور اس کے بانی کی ذات تھی، انہوں نے اسلام کو بھی اسکا مثنی تصور کیا، اور اس کے بانی ﷺ کی ذات گرامی کی طرف توجہ مبذول کی۔

مذہبی جدل و تنگ نظری نے ان پر اسقدر غلبہ کیا کہ حضور ﷺ کی ذات گرامی پر تہمتوں اور الزامات کے انبار لگا دیے۔ ہر بری بات منسوب کی۔ صنمیت وضع کیں۔ چڑیا چڑے کی کہانیاں گھڑیں۔ وحوش و بہائم کی دلخراش داستانیں ترتیب دیں۔ کنویں کا افسانہ تراشا۔ بیماری کے قصے تیار کیے۔ چنگیز کے اسلاف سے تعلق ثابت کرنے کے لیے خراسان کی وطنیت موسوم کی۔ ہسپانیہ کے مغرور و سفہ کے اہتمام کیے۔ راہبوں سے نام نہاد تعلیم کے حصول کے ذہول چیلے۔ عیسائی فوج میں تربیت کی داستان تراشی۔ فرضی حکمران کے خون کا الزام رکھا۔ کلیسا کی عہدہ داری اور الوہیت (کے دعوے) کی تہمت دھری۔ پھر جو کج روئے بدلی تو جہنم کے شیاطین کو بھی پناہ مانگنے پر مجبور کر دیا۔ (تفصیلات باب چہارم میں آرہی ہیں۔)

مستشرقین کے سنجیدہ مطالعے نے یکے بعد دیگرے ان تمام لغویات کو مسترد کرنا شروع کر دیا۔ تاہم ایک الزام ایسا بھی تھا جو بحدِ سخت جان نکلا۔ یہ الزام بہر و پیت یا ڈھونگ کا تھا، جسکی بازگشت انیسویں صدی تک سنائی دی۔

تھامس کارلائل گو کہ اسلام یا عربی زبان پر کوئی خصوصی مہارت نہیں رکھتا تھا، لیکن اس نے ۸ مئی ۱۸۳۰ء کو انمبر میں تاریخ کے بیروز اور ہیرو وازم پر سلسلہ وار لیکچرز شروع کیے۔ اس کا دوسرا لیکچر (The Hero as Prophet) تھا، جس میں انبیاء کے ہیرو کی حیثیت سے آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی کو خراج تحسین پیش کیا گیا۔ اس لیکچر نے پہلی بار مغرب کو یہ سننے پر مجبور کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایک پر خلوص شخص تھے۔ اس نے حضور ﷺ کے خلوص کے بارے میں کہا،

"Ah, No! This deep hearted son of the wilderness, with his beaming black eyes and open social deep soul, had other thought in him than ambition. A silent great soul; He was one of those who cannot but be in earnest, whom nature herself had appointed to be sincere."

(Thomas Carlyle; On Heros, Hero Worship, and the Heroic in the History, p.52)

[ارے نہیں، صحرا کے یہ گدازد دل فرزند، اپنی مسکراتی سیاہ آنکھوں اور ہر ایک کے لیے گہری محبت رکھنے والی روح کے ساتھ، خود نمائی سے بہت ہی مختلف خیالات کے حامل تھے۔ ایک خاموش فطرت عظیم نفس۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو سوائے لگاؤ کے کچھ اور برت ہی نہیں سکتے تھے، اور جن کو خود فطرت نے بطور خاص خلوص کے لیے ہی مقرر کیا تھا۔] (تفصیلات باب چہارم میں آ رہی ہیں)۔

"We shall err widely if we consider this man as a common voluptuary; intent mainly on base enjoyments, nay on enjoyment of any kind."

[ہم بہت بڑی غلطی کریں گے اگر ہم ان صاحب کو ایک ایسا عام لذت پسند شخص گردانیں گے، جو بنیادی طور پر گھنیا عیش کوشی پر مائل ہو (جبکہ وہ) کسی بھی قسم کی لطف اندوزی سے گریز کرتے تھے]۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۶۴)

کارلائل نے اپنے دور تک کے مغربی انداز تحریر کو شرمناک قرار دیا اور برملا کہا کہ یہ تصوّر کہ عرب کے نبی (ﷺ) نعوذ باللہ ایک منصوبہ ساز بہروپے تھے، یا انکا دین خرافات کا مجموعہ تھا، اب کسی طور قابل قبول نہیں۔ جانتے بوجھے کذب و افتراء کا جو طوفان انکے خلاف اٹھایا گیا ہے وہ مغرب کے لیے باعث ننگ ہے۔ (حوالہ بالا صفحہ ۴۰)۔

پھر اس نے مغربی اہل فکر کو اپنے دل ٹٹولنے کی دعوت دی کہ ان کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ گزشتہ کئی صدیوں سے کروڑوں افراد کی زندگی کی رہنمائی کر رہا ہے۔ کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ (ظہور اسلام) محض ایک کرہناک روحانی فریب تھا جس کے لیے قادر مطلق کی مخلوق کی اتنی بڑی تعداد نے اپنی زندگی وقف کی اور ہستہ کھیلنے موت کو گلے لگا لیا۔ کارلائل نے کہا کہ وہ ایسے کسی مفروضے سے متفق نہیں ہو سکتا۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۴۱)۔

کارلائل وہ پہلا مغربی فرد ہے جس نے اپنے معاشرے کے برخلاف یہ اعلان کیا،

"The man's words were not false, nor his workings lure below, no inanity and simulacrum; a fiery mass of life cast-up from the great bosom of nature herself..... The words of such a man is voice direct from nature's own heart."

[ان صاحب کے الفاظ دروغ نہیں تھے، نہ ہی ان کے طرزِ عمل میں کوئی جال، کھوکھلا پن یا مصنوعی بھرم تھا؛ وہ تو زندگی کی حرارت سے بھرپور ایک وجود تھے جس نے فطرت کی اپنی کوکھ سے جنم لیا تھا..... ایسے شخص کے الفاظ تو فطرت کے اپنے دل کی آواز ہوتے ہیں] (حوالہ بالا صفحہ ۵۰)

مستشرقین کے گروہ : کارلائل کے لیکچرز کی بدولت مستشرقین کے دعووں کے دبدبے، طنطنے میں بدل گئے۔ لے وہی رہی لیکن سروں میں فرق آ گیا۔ سیرت نگار مستشرقین دو گروہوں میں بٹ گئے۔ اولاً وہ گروہ جس نے باور کیا کہ نفسیاتی اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نارمل تھے، لیکن وحی اور پیغام الہی کے بارے میں (نعوذ باللہ) پر خلوص نہیں تھے۔ دوسرا گروہ یہ باور کرتا ہے کہ وہ پیغام الہی اور فرائضِ نبوت پر پختہ یقین رکھتے تھے، لیکن (نعوذ باللہ) ذہنی طور پر متوازن نہیں تھے۔

روڈنسن نے ان دونوں الزامات کے درمیان یہ راستہ اختیار کیا کہ ایک نئی تہمت باندھی۔ اس دہریے نے انہیں بھی اپنا ہم خیال تصور کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ وہ غیر مخلص تو نہیں تھے تاہم قرآن کو وحی باور کرنے میں انہیں غلط فہمی ہوئی۔ (cf. Rodinson Maxime; Muhammed, p.77)

نکلسن : نکلسن نے پامر کے ترجمہ قرآن پر دیباچہ تحریر کیا، جس میں وہ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کے خلوص کو تسلیم کرتا نظر آتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکا کہ،

"When by force of circumstances, the prophet in him had grown into the ruler and legislator, it was a psychological necessity he should still feel himself to be chosen medium of the divine message."

(R. A. Nicholson; Introduction to 'The Quran' by E. H. Palmer)

[جب حالات کے جبر کے تحت، پیغمبر ایک حکمران اور قانون ساز میں ڈھل گئے، تو بھی یہ ایک نفسیاتی ضرورت تھی کہ وہ خود کو الہامی پیغامات کا منتخب ذریعہ سمجھتے رہیں]

ویسر : انیسویں صدی کے عام مبصرین کی مانند ویسر کے تبصرے بھی سطحی ہیں۔ اسے حضور ﷺ کے مکی دور میں نبوت کی شان نظر آتی ہے لیکن مدنی دور میں وہ اس شان کو دیکھنے سے قاصر ہے۔ اس نے لکھا،

"His position in Medina, which was between that of an Italian Podesta and that of Calvin in Geneva, grew primarily out of his purely prophetic mission. A merchant, he was first a leader of pietistic conventicles in Mecca, untill he realized more and more clearly that the organization of the interest of the Warrior Clans in the acquisition of the booty was the external basis provided for his missionizing".

(Max Weber; The Sociology of Religion, p.47, translated by Ephxaim Fischoff)

[مدینے میں انکی حیثیت اطالیہ کے پودستا (شہر کے امیر اور حکمران) اور جینیوا کے کالون (پروٹسٹنٹ فرقے کے ایک شہری اور دینی ناظم) کے بین بین تھی، جس نے بنیادی طور پر انکے خالصتا پیغمبرانہ نصب العین سے نمود پائی تھی۔ وہ ایک تاجر، اور مملکت میں پرہیز گارانہ اجتماعات کے رہبر تھے، یہاں تک کہ انہوں نے اس بات کا، واضح سے واضح تر طور پر، ادراک کیا کہ جنگجو قبائل کی حصول مال غنیمت میں دلچسپی کا لحاظ، انکے نصب العین کی خارجی بنیاد ہونی چاہیے۔“

اس کے نزدیک بانی اسلام کی شخصیت کی عظمت سیاسی اور فوجی بالادستی کی مرہونِ منت ہے۔

میویر، اسپرنگر اور فان گریو نے باؤم: انیسویں صدی کے بیشتر مستشرقین نے حیاتِ نبوی کے واقعات کو مسخ کر کے ان میں کمزوری کے پہلو وضع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ولیم میویر نے کہا کہ (نعوذ باللہ) ”محمد (ﷺ) خود اپنی وحی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔“ (William Muir; Life of Mohamet, Vol II, p.142)۔

اس نے ’کافروں کو مراءات‘ کے عنوان سے واقعہ غرانیق کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا،

”عالمِ بیچارگی میں محمد (ﷺ) نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے اہل وطن سے مصالحت کی کوشش کریں۔ وہ قریش کے درمیان دوستانہ ماحول میں بیٹھ کر سورۃِ انعام کی قرأت کرنے لگے۔ جب وہ آیت ۱۹-۲۰ پر پہنچے تو انکی زبان سے یہ الفاظ ادا ہوئے، ”کیا تم نے لات اور عزیٰ اور منات پر بھی غور کیا ہے؟ یہ نہایت معزز دیویاں ہیں اور بیشک انکی شفاعت کے مقبول ہونے کی امید ہے۔“ اس کے بعد آیتِ سجدہ تلاوت کی اور تمام قریش سجدے میں گر گئے۔ (حوالہ بالا صفحہ ۱۵۱)

اسپرنگر کی تصنیف میں ایک بار پھر بہرہ و پیت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اشہب قلم منہ زوری کرتا نظر آتا ہے۔ اس نے لکھا، (نعوذ باللہ)

”اسلام... کا کارنامہ ہے۔ یہ اس بہروپے (شخص) کی اپنی تعلیمات بھی نہیں۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسی بہروپے نے اسے اپنی بدکرداری اور فنی بے راہ روی سے آلودہ کیا اور یہ تمام قابلِ اعتراض تعلیمات اسی کی اپنی ہیں۔“ (Springer; Life of Mohammed)۔

گریو نے باؤم نے جبر اسود کے بارے میں تحریر کیا کہ کعبے کے پرستاروں کے لیے حقیقی کشش ایک سیاہ پتھر میں تھی۔ یہ قدیم الایام پتھر اس کی دیواروں میں نصب تھا۔ حضور ﷺ کو بادل ناخواست اس پتھر کے

تقدس و احترام کو اسلامی رسوم میں جگہ دینا پڑی۔ جہاں وہ اب بھی اس امر کے ثبوت کے طور پر موجود ہے کہ اسلام قدیم رسوم سے اپنا دامن چھڑانے میں ناکام رہا۔ (Von Grunebaum; Mediaeval Islam, p.68)۔ حجر اسود کے بارے میں یہ تبصرہ اس غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اس کی پرستش کرتے ہیں۔ حالانکہ بقول حضرت عمرؓ یہ صرف ایک پتھر ہے جسے اگر نبی کریم ﷺ نے بوسہ نہ دیا ہوتا تو ہرگز کعبے کے دوسرے پتھروں سے ممتاز نہ ہوتا۔ یہ نہ تو معبود ہے نہ اس کی پرستش ہوتی ہے۔ اسکی اہمیت صرف یہ ہے کہ اس سے لب نبوی (علی صاحبہ صلوٰۃ و سلام) اور بعدہ صحابہ، تابعین اور بزرگان و اعیان ملت کے لب مَس ہوئے۔ یہ وہ مستند ترین شے ہے جس کے توسط سے ایک عامی یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے عبادِ صالحین سے بعدِ زمانی کے باوجود قرب حاصل کر لیا۔

•

باب چہارم

مستشرقین

- ۱۔ مستشرقین کی ابتداء
- ۲۔ عالم اسلام سے علمی استفادہ
- ۳۔ مستشرقین کی کاوشوں کا جائزہ

مستشرقین کی ابتداء

مغربی رومن ایمپائر کا وہ مرکزی نقطہ تھا جس نے اس ایمپائر کی تشکیل کی تھی۔ عالم اسلام سے تصادم اور پسپائی کے باعث جب اس میں شکست و ریخت کے آثار ظاہر ہوئے تو کلیسا نے مغرب کو رومن ایمپائر (بازنطین) سے علیحدہ کر کے اس کی آزادانہ اور جداگانہ حیثیت قائم کی اور اسے 'مسیحی جمہوریہ مغرب' اور 'بولی رومن ایمپائر' کا نام دے کر اس پر نو معاشرے کی تعمیر کی۔

اس معاشرے کے فکر و عمل میں واضح تضاد تھا۔ عملاً وہ رومن تہذیب کا جانشین تھا جس کا تائناک ماضی شمشیر و سناں سے تعمیر ہوا تھا، لیکن فکری اعتبار سے وہ عیسائیت کا پیرو تھا، جس میں رہبانیت کو مثالی حیثیت حاصل تھی۔ راہب کی حقیقی دنیا اندرونی دنیا تھی۔ بیرونی دنیا سے لاتعلقی کمال دینداری تصور ہوتی تھی۔ کشور کشائی، جہاگیری و جہانبانی، اور رہبانیت کی عزمت نشینی، مسکنت اور خاکساری کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ حالات کا تقاضہ تھا کہ یہ تضاد دور کیا جائے۔ عالم اسلام کے فاتحانہ اقدام کو روکنا رہبانیت کے بس کی بات نہیں تھی اور اسے روکے بغیر عافیت بھی نہیں تھی۔

ان حالات میں تین ہی طریقے اختیار کیے جاسکتے تھے۔ فلسطین، مصر و افریقہ کی طرح اسلام قبول کر لیا جائے۔ بصورت دیگر اسپین کی طرح مسلم بالا دستی قبول کر کے ثانوی حیثیت اختیار کر لی جائے یا پھر رومن انداز میں نبرد آزما ہوا جائے۔ آخر الذکر طریقہ کار منتخب کرنے کے لیے کلیسا نے معاشرے کی فکر میں تبدیلی پیدا کی۔ تارک الدنیا راہب کی جگہ شہسوار کو دی۔ طبل و علم پر مذہب کی چھاپ لگائی اور شمشیر زنی کو روایتی زہد کا نعم البدل قرار دیا۔

معاشرے اور تہذیبیں نظریات کی بنیادوں پر پروان چڑھتی ہیں۔ یہ نظریات اہل فکر و نظر فراہم کرتے ہیں۔ مغربی فکر کا سرچشمہ کلیسا تھا۔ کلیسا نے مغربی معاشرے کو جو نظریات دیے انہیں مذہبی حیثیت حاصل تھی۔ مذہبی نظریات کے ساتھ وقت یہ ہوتی ہے کہ سائنس، ادب، فلسفہ یا سیاست کے نظریات کی طرح ان میں تبدیلی نہیں پیدا کی جاسکتی۔ عام طور پر اصحاب فکر و نظر با اقتدار نہیں ہوتے لیکن وہ ہرے نظام اقتدار کی بدولت مغربی کلیسا با اقتدار بھی تھا۔ جس کے سبب اس کے نظریات کو مذہبی عقائد اور قانونی احکام کی حیثیت حاصل تھی۔ کلیسا کے نظریات کے پس منظر میں اگر عہد وسطی کے طرز عمل کا مطالعہ کیا جائے تو پورے دور کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ لاتعلقی کا دور: یہ وہ دور تھا جس میں کلیسا عملاً اسلام سے لاتعلقی تھا۔ نہ اس نے سیاست میں قدم رکھا تھا نہ معاشرے کی سیاسی ضروریات کو مذہبی رنگ دیا تھا۔ وہ عالم اسلام کی وسعت کو تشویش کی نظر سے ضرور دکھ رہا تھا تاہم اسلام کو محض ایک ایسی افتاد تصور کرتا تھا جو بالآخر خود ہی فرو ہو جائے گی۔ یہ دور جنگ یرموک (۶۳۳ء) سے شروع ہوتا ہے اور پوپ کے پایہ تخت روم پر عربوں کے دوسرے حملے (۶۷۵ء) پر ختم ہوتا ہے۔ اس دور کی تحریریں مغرب کی روایتی تلخی سے مبرا ہیں۔ جو کچھ تحریر کیا گیا وہ محض لاعلمی، افواہوں اور بازنطینی عیسائیوں کے مسخ کردہ مواد پر مبنی تھا۔

۲۔ نبرد آزمانی کا دور: روم پر عربوں کے دوسرے حملے کے بعد پوپ نے کلیسا اور دین مسیحی کی مدافعت کے لیے معاشرے میں اسلام کے خلاف ہتھیار اٹھانے کا پرچار شروع کیا۔ اسی مہم کے دوران اسلام کو دشمن عیسائیت اور داعی اسلام ﷺ کو دشمن مسیح قرار دیا گیا۔ اسلام دشمنی کیتھولک عقیدے کی حیثیت اختیار کر گئی۔ نفرت کی شدید لہریں اٹھیں۔ اسلام سے جنگ ہر دیندار عیسائی کے لیے مذہبی فریضہ بن گئی۔ مدافعت میں کامیابی نے جارحیت کی شکل اختیار کی۔ صلیبی پرچم تلے عالم اسلام پر دوصد یوں تک بھیسروں ناچتا رہا۔ مغربی بھیسروں تھک گیا تو مشرقی عنفریت منگول کو اس نے اپنا شریک کار بنالیا۔ اس کے باوجود تیرہویں صدی عیسوی کے اختتام تک مغرب کو اپنی دیرینہ حدود تک لوٹ آنا پڑا۔ صلیبی ناکامیوں کے بعد مغرب کی ساری توانائیاں اسپین کی بازیابی اور ترکوں کے خلاف مدافعت میں استعمال ہوئیں۔ اس طرح نبرد آزمانی کا دور نویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ دور ہے جس کی تحریروں میں تلخی اپنے شباب پر پہنچی۔

۳۔ سرد جنگ: سرد جنگ کی ضرورت کا احساس تو سقوط عکبرہ (۱۲۹۱ء) کے فوراً بعد ہی ہونے لگا تھا۔ سقوط کی اطلاع جب اطالیہ پہنچی تو کلیسا میں نیچینی کی لبر دو گئی۔ ریمندل نے اس موقع پر تحریر کیا: ”اگر نسطوری عیسائیوں کو اپنی صف (کیتھولک) میں شریک کر لیا جائے اور تاریخوں کو عیسائی بنالیا جائے تو سارے ’مراستین‘ باسانی تباہ کیے جاسکتے ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی متنبہ کیا: ”خوف یہ بھی ہے کہ اگر ان تاریخوں نے ترغیب یا تحریص کے باعث شریعت محمدیہ تسلیم کر لی تو پھر عالم عیسائیت کے لیے شدید خطرہ پیدا ہو جائے گا۔“

(cf. R. W. Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p. 65)

اس طرح مغرب پوری طرح اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اسلام کے خطرے سے نمٹنے کے لیے عیسائیت کی ترویج ناگزیر تھی۔ تاہم اس کا مقصد ابھی تک اسلام کو بالقوت تباہ کرنا تھا۔

مفکرین مغرب نے مسلح تصادم کی ناکامی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ عالم اسلام کی قوت و استحکام محض شمشیر و سنان کی بدولت نہیں بلکہ اس میں نظریاتی عنصر کا بڑا حصہ ہے۔ ریمندل نے کلیسا کو دعوت دی کہ ”علوم شریعہ کے مطالعے کو روحانی صلیبی جنگ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے۔“

(Earnest Barker in his article 'The Crusade' states, "It was Catalan Raymondus Lulls who first attempted to promote development of Oriental Studies as the instrument of sacrificial crusades in which the arms would be entirely spiritual", cf. 'Legacy of Islam', 1960 ed.)

چنانچہ اس نے خود علومِ شرقیہ کے مطالعے کے مدارس قائم کیے اور اپنی تبلیغی کاوشوں میں ہی جان دی۔ لیکن نے بھی اپنے نظریات پیش کیے لیکن اُس وقت ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

پندرہویں صدی عیسوی میں لیل اور نیکن کے نظریات پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا۔ پوپ اور اس کے بشپ اس یکطرفہ سرد جنگ کو تیز تر کرنے کے لیے سرگرم ہو گئے۔ بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ اغراض و مقاصد کا تعین ہوا۔ طریقہ کار طے کیے گئے۔ علومِ شرقیہ کے بامقصد مطالعے کا دور شروع ہوا۔ یونیورسٹیوں سے علومِ شرقیہ کے ماہرین پیدا ہونے لگے، جن کا متعینہ مقصد یہ تھا کہ وہ عیسائیت کی "بیج اور اسلام کی بیج کئی کے لیے خود کام کریں اور دوسروں کو موادِ بہم پہنچائیں۔

مستشرقین: پس مستشرقین کا وجود کوئی اتفاقی امر نہیں تھا۔ وہ ایک ایسے معاشرے کے ذمہ دار اصحابِ فکر تھے، و صدیوں سے عالمِ اسلام کے ساتھ حالتِ جنگ میں مبتلا تھا، اور عالمِ اسلام کو ہر قیمت پر نابود یا کم از کم مغلوب کرنے پر تلا بیٹھا تھا۔ جس نے اپنی کمزوریوں کی تشخیص کر لی تھی اور جسے دشمن کی برتری کے راز معلوم ہو چکے تھے۔ جس نے اپنی کمزوری رفع کرنے اور دشمن پر برتری حاصل کرنے کا ایک جامع منصوبہ تیار کر کے اس پر عمل درآمد شروع کر دیا تھا۔ علومِ شرقیہ کا مطالعہ اسی جنگی منصوبے کا ایک اہم حصہ تھا۔ مستشرقین اس منصوبے کے اہم کارکن تھے۔ وہ روحانی حروبِ صلیبیہ کے ہراول دستے تھے۔ جن کا فرض یہ تھا کہ وہ دشمن کے خزانوں سے اپنے ملک کو مالا مال کریں اور ان کمزور مقامات کو دریافت کریں، جہاں سے دشمن پر حملہ آور ہوا جاسکے۔ اور ان مستحکم مقامات کی نشاندہی کریں جہاں سے نقصانات یقینی ہوں۔

اس میں شک نہیں کہ حالات کے ساتھ ساتھ مستشرقین کا دائرہ کار بھی وسیع ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے نہ صرف نظریاتی ضروریات کے لیے مواد فراہم کیا بلکہ انکی مساعی کی بدولت مغرب کو سیاسی اور اقتصادی سہولتیں بھی میسر ہوئیں۔ مستشرقین نے ایشیا اور افریقہ کی تہذیبوں اور انکے علوم پر بڑی بڑی تحقیقات کیں۔ قبل تاریخ کی گمشدہ تہذیبوں کا سراغ لگایا۔ مردہ زبانوں کو معنی دیے۔ تاریخِ انسانی کی گمشدہ کڑیاں فراہم کیں۔ دنیا کی ہر زبان کے علمی خزانے اپنی زبانوں میں منتقل کیے۔ انکی تحقیقات اور کاوشوں کا موجودہ علوم کے ارتقاء میں ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ وہ اپنی تائیس کے اعتبار سے اسلام سے سرد جنگ لڑنے کے لیے مختص تھے۔ زیرِ نظر مقالہ انکے اسی پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا ہم صرف یہ دیکھنے پر اکتفا کریں گے کہ اسلام سے انہوں نے کیا لیا اور اسلام کو انہوں نے کیا دیا۔

عالم اسلام سے علمی استفادہ

نبی امی ﷺ نے ہر مسلمان مرد و عورت کے لیے حصول علم لازم قرار دیا۔ مسلمانوں نے تعمیل حکم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ عالم اسلام میں عظیم پیمانے پر علم کی جستجو شروع ہو گئی۔ بغداد، قاہرہ، پلرمو، طلیطلہ اور قرطبہ علوم کے مرکز بن گئے۔ دنیا کے کونے کونے سے کتابیں ان مراکز میں پہنچنے لگیں۔ یونان، مصر، ہندو چین کے تمام علوم آٹھویں صدی عیسوی تک عربی میں منتقل ہو چکے تھے۔ مسلمانوں نے ان علوم کا صرف ترجمہ ہی نہیں کیا بلکہ انہیں سمجھنے کے بعد انہیں قابل فہم بنایا اور ان مبادیات پر ارتقاء علوم کی منازل طے کیں۔ تاریخ انسانی میں مسلمانوں سے قبل کسی قوم کو کوئی نوع انسان کے علوم کے تمام جواہر کسی ایک خزانے میں منتقل کرنے کا افتخار حاصل نہ ہو سکا تھا۔ مغرب کی سرحدوں پر ان علوم کے دو مراکز تھے۔ ایک قرطبہ، دوسرا ہلرمو (سسلی)۔ ان دونوں مراکز سے علوم کی مشام جانفزا مغرب میں بھی پہنچنے لگی۔ اس دور کا مغرب قومی نظریات سے تابلہ، مختلف ریاستوں پر مشتمل تھا جو سب کی سب ایک مشترک مذہبی قدر میں منسلک تھیں، اور رومن چرچ ان سب پر حکمران تھا۔ عقل و فہم کے تمام شعبے اسی کے قبضے میں تھے۔ علم پر اس کی اجارہ داری تھی۔ اس وقت کا مغرب عالم اسلام پر رشک کرتا تھا۔ عالم اسلام، صنعت و تجارت و حرب میں ہی ممتاز نہ تھا، بلکہ فلسفہ، سائنس، طب و قانون ہر میدان میں یکتا تھا۔ جبکہ مغرب میں اس وقت ان میں سے کسی شے کا وجود نہیں تھا۔ مغربی ذہن جب اپنی غفلت سے بیدار ہونے لگا تو اس میں اسلامی فطانت اور علوم کی طلب پیدا ہوئی۔ لیکن اس طلب میں یہ خوف بھی پوشیدہ تھا کہ کہیں ان علوم کے ساتھ اسلام کے مذہبی اثرات بھی نفوذ نہ کر جائیں۔ اس خدشے کے پیش نظر کلیسا نے انہیں کالے علوم کا خطاب بخشا اور اپنی حدود میں ممنوع قرار دیا۔ لیکن جب کلیسا کو یہ احساس ہوا کہ یہ علوم قوت کا سرچشمہ ہیں تو اس نے ان علوم کے حصول کی جانب توجہ کی، تاہم یہ احتیاط ملحوظ رکھی کہ علوم کو منتقل کرنے سے پیشتر انہیں پتہ نہ ہو کہ ضرور دیا جائے۔

علوم کا پتہ: علوم کی منتقلی دو ادوار میں ہوئی۔ دور اول میں مغربی علماء نے عربی زبان سے ناواقفیت کے سبب یہودی مترجمین سے تراجم کروائے۔ پہلے تو یہود نے ہی ان علوم سے ممکنہ حد تک اسلامی اثرات دور کیے۔ پھر جب یہ علوم عیسائیوں کے پاس پہنچے تو سونے پر سہاگہ کے مصداق ان کو خسی الامکان اپنا رنگ دیا۔ انہیں خود سے منسوب کیا اور جن علوم کو خود سے منسوب نہ کر سکے انہیں یونانی الاصل قرار دیکر اپنی میراث ٹھہرایا۔ مسلم تصانیف کو اپنے ناموں سے منسوب کرنے کی شکایت ہمیں گیارہویں صدی عیسوی سے ملتی شروع ہو جاتی ہے۔ اس صدی میں ابن عدون (Ibn Adun) نے تحریر کیا کہ ”کتابوں کو عیسائیوں کے ہاتھ نہیں فروخت کرنا چاہیے، کیونکہ وہ

انہیں ترجمہ کر کے اپنے بپشوں (Bishops) سے منسوب کر دیتے ہیں۔“ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

(cf. E. Levi; Provençal; and E. Garcia Gomez; 'Sevilla a Cominzos del Siglo' XII, Madrid, 1948, p.173, quoted by Juan Vernet; Legacy of Islam, 1974, article 'Science' p. 486)

ایسی کتنی تصانیف کا سرقہ کیا گیا۔ کتنے مسلم علماء کی کاوشیں رہی ہوگی جن کے مصنف اب عیسائی ہشپ تصور کیے جاتے ہو گئے، آج اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ بغداد کے کتب خانوں کی تباہی اور اس کے بعد قرطبہ کے کتب خانوں کا نذر آتش ہو جانا ایسے سانحے تھے جنہوں نے سرقوں کی تحقیقات کا امکان ہی ختم کر دیا۔ تاہم ان مشاہیر کی کتب کو جنکے متعدد نسخے موجود تھے، اور جن کا معیار مغربی معیارِ علم سے کہیں بلند تھا، مصنفین سے ہی منسوب رکھا گیا۔ اگر انہی کی تفصیلات بیان کی جائیں تو اس بات میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ مغرب کا ہر علم مسلم علوم پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کی صدیوں کی کاوش کا ثمر مغرب کو ملا، اور مغرب نے اپنے علوم کی بنیاد مسلم علوم پر رکھی۔

منتقلی کا دور اول: یہ دور اسپین میں طیلطلہ کے سقوط (۱۰۸۵ء) سے شروع ہوتا ہے اور تیرہویں صدی عیسوی تک محیط ہے۔ اسپین میں طیلطلہ بھی علم کا عظیم مرکز تھا۔ اس کے سقوط کے بعد طیلطلہ کے نادر کتب خانے عیسائیوں کے قبضے میں آئے۔ طیلطلہ پر عیسائی قبضے کے باوجود وہاں بدستور عربی زبان کا چلن رہا۔ علماء اور خصوصاً یہودی اہل قلم اس زبان سے دامن کش نہ ہو سکے۔ انہی علاقوں میں مسلم علوم کی لاطینی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں منتقلی کا کام شروع ہوا۔ اس عہد میں فلسفی ریاضی اور طب کو خصوصیت کے ساتھ مغربی زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ اس عہد کے مغربی علوم کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ان کی تمام بنیادیں عربی سے مستعار ملیں گی۔ طیلطلہ کے آرج ہشپ ریمند (۱۱۲۶ء تا ۱۱۵۱ء) نے ایک دارالترجمہ قائم کیا جو عربی سے لاطینی میں تراجم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ یہ دارالترجمہ تقریباً ایک صدی تک کام کرتا رہا۔ اس میں خود مسلم علماء، یہودی مترجمین اور مغربی اہل قلم سب ہی ملازم تھے۔ اس ادارے کا سربراہ ایک اطالوی، جرارد آف کریمونا (Gerard of Cremona) تھا، جس نے خود کم از کم اکہتر [۱۷] نادر کتب کا ترجمہ کیا۔ اس کی مترجمہ کتب کی فہرست میں بطلیوس کی کتاب المناجست (Almagist)، ابن حنین کا 'ترجمہ جالیوس' (Translation of Galen)، الخوارزمی کی 'الجبر و المقابله'، الکلندی کی تصانیف، ابن سینا کی 'القانون' (The Canon)، اور الزہراوی کی جراحی اور تشریح الاعضاء پر مبنی کتب شریک ہیں۔ پندرہویں صدی عیسوی تک القانون کی پندرہ بار لاطینی زبان میں اشاعت ہو چکی تھی۔ اسی طرح الزہراوی کی کتب کے بے شمار نسخے لاطینی میں بار بار چھپے۔ ان دونوں کتب کو صدیوں تک یورپ کی درس گاہوں میں حرفِ آخر کی حیثیت حاصل رہی۔ (cf. Philips K. Hitti; 'Islam and the West', p.72)

تیرہویں صدی میں مائیکل اسکات (متوفی ۱۲۳۲ء) نے ابن رشد کی تصانیف کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس کی تصانیف نے مغرب کو ارسطو کے فلسفے سے متعارف کرایا۔ البرٹس مگنٹس (Albertus Magnus) (متوفی ۱۲۸۰ء) نے ارسطو کے فلسفے کو کلیسا کے عقائد سے ہم آہنگ کیا۔ انگریز فلسفی راجر بیکن نے بصریات میں کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

جو کارنامے انجام دیے ان کی بنیاد ابن الہیثم کے نظریات پر تھی۔ ابن العربی، جنہوں نے اشراقی مکتب فکر کی بنیاد رکھی، انکی تصانیف کا بھی ترجمہ کیا گیا۔

ایک اور مترجم رابرٹ تھا، جس نے الخوارزمی کے الجبرے کے علم کو لاطینی میں منتقل کیا۔ اسی منتقلی کے سبب عربی ہندسوں نے رومن ہندسوں کی جگہ لی۔ موجودہ ہند سے جنہیں ہم انگریزی تھوڑے کرتے ہیں، حقیقتاً عربی تھے اور یورپ آج بھی انہیں عربی ہند سے (Arabic Numerals) کہتا ہے۔ رومن ہندسوں میں یہ صلاحیت موجود نہیں تھی کہ وہ ریاضی کے لیے استعمال ہو سکیں۔ عربی ہندسوں کی کل تعداد دس ہے اور یہ سائنسی طریقے سے جمع، ضرب، تفریق اور تقسیم کے ذریعے حساب کی ہر ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ عربی ہندسوں کے بغیر موجودہ ریاضی، جس پر سائنس اور ٹیکنالوجی کا دارومدار ہے، ہرگز ارتقاء پذیر نہیں ہو سکتی تھی۔

انگریزی زبان میں طبع ہونے والی پہلی ترجمہ کردہ کتاب [The Dictes and Sayings of Philosophers] تھی، جو ویسٹ منسٹر میں ۱۱۷۰ء میں چھپی۔ یہ فرانسیسی زبان سے ترجمہ کی گئی تھی۔ فرانسیسی میں اسکا ترجمہ لاطینی سے ہوا تھا اور لاطینی نسخہ عربی کتاب کا ترجمہ تھا، جس کا نام 'مختار الحکم و محاسن العکام' تھا جسے ایک شامی الاصل مصری موثر ابن فائق نے تصنیف کیا تھا۔

مغرب نے اسپین کے مسلمانوں سے صنعت و حرفت میں بھی بہت کچھ سیکھا۔ ان میں پارچہ بانی، سلک سازی، رنگ ریزی، شیشہ گری، ظروف سازی، فنی تعمیر، فنِ تزئین، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یہود کے تراجم: پروفیسر الفردنگھام کا دعویٰ ہے کہ یورپ کے موجودہ ارتقاء پر یہود کا بہت بڑا احسان ہے۔ کیونکہ وہ عربی اور لاطینی زبانوں کے درمیان ایک نہایت اہم کڑی تھے، اور انہی کی بدولت یورپ کو مسلمانوں کے علوم و فنون میسر آ سکے تھے۔ پروفیسر نے سینکڑوں مترجمین کے نام اور انکے کارنامے لٹوائے ہیں۔

(see Alfred Guillaum's essay, 'The Jewish factor in Medieval Thought', published in 'Legacy of Israel')

یہودی عالم الحق اسرائیلی نے اپنی کتاب (On Definition) میں عربی کی تمام طبی اصطلاحات کو جمع کر کے انکی تشریح کی۔ ایک دوسری کتاب میں اسطو کے طبیعیاتی مسائل جمع کیے جسے اس نے عربی کے توسط سے حاصل کیا تھا۔

ابن سینا کی عہد آفریں کتاب 'القانون' کے بارے میں، جس کا عہدِ وسطیٰ میں سب سے زیادہ مطالعہ کیا گیا تھا اور جس کا مکمل ترجمہ صدیوں یورپ میں طب کے نصاب میں شریک رہا، یہود کا دعویٰ ہے کہ اسے انہوں نے ہی عربی سے لاطینی میں منتقل کیا تھا۔ ابی جبران کو کئی علوم میں دستگاہ تھی۔ اس نے (Fountain of Life) نام کی کتاب یورپ کو دی۔ یہ کتاب اسپین میں عربی تخیلات کی آئینہ دار ہے۔ اس میں افلاطونی فکر کا انچوڑ ہے۔ ابی جبران کو ایک عرصے تک یہودی مصنف ابن جبریل سمجھا گیا۔ ابی جبران کا یہ شاہکار صدیوں تک یورپ میں ذوق و شوق سے پڑھا گیا ہے۔ ابراہیم بن عذرا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اس قدر عربی لٹریچر لاطینی میں منتقل کیا کہ اس کے ترجمے لاطینی علوم کے سر تاج بن گئے۔

ابن رشد کی فکر کے جواب میں غزالی نے فلسفہ فنا پیش کیا، جس کے جواب الجواب میں ابن رشد نے فنا، الفناء، تحریر کی۔ یہ دونوں کتابیں حسب ذیل ناموں سے لاطینی میں منتقل ہوئیں، غزالی کی کتاب (Destructio Philosophorum)، اور ابن رشد کی کتاب (Destructio Destructiones)۔

موسیٰ بن میمون جسے یورپ میمونائڈ کہتا ہے، ایک یہودی فلسفی اور طبیب تھا۔ جہاں اس کی اپنی تصانیف تھیں، وہیں اس نے مسلم علوم کو بھی کثرت سے قلمبند کیا۔ ابن سینا اور مسلم متحمیمین کے افکار اس کے توسط سے یورپ کو ملے۔

ایک شخص قسطنطین افریقی (Constentine Africano) نامی گزرا ہے، جو افریقہ سے مرتد ہو کر سلفو (جنوبی اطالیہ) میں جا بسا تھا۔ یہ پہلا فرد تھا جس نے اطالیہ میں عربی علوم کے تراجم بکھ پھیلانے۔ ادیلارڈ آف باتھ (Adelord of Bath) سے منسوب تمام مقالے اور نقشے مشہور مسلمان ماہر فلکیات و ہیئت دان الخوارزمی کے تراجم ہیں۔ ادیلارڈ کی کتاب (Introduction to the Art of Astronomy) بھی الخوارزمی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

پطرس الفانسوا ایک یہودی تھا جو عیسائی ہو گیا تھا۔ چونکہ عربی سے بخوبی واقف تھا اس لیے اس نے بکثرت عربی کتابوں کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ یہی پطرس انگلینڈ پہنچا تو وہاں علماء و عقلاء کا مرکز توجہ بن گیا۔ اس کی مدد سے والچر (Walcher) نے عربی علم ہیئت کو انگریزی میں منتقل کیا۔ ایک اور عربی داں یہودی ابراہیم بن عذرا نے ریاضی، ہیئت، اور فلکیات کے علوم انگریزی زبان میں منتقل کیے۔ ایک دوسرے یہودی ابن داؤد نے ابن سینا کی کتاب 'الروح' کا ترجمہ (On the Soul) کے عنوان سے کیا۔ اس نے الغزالی کی کتابوں کا بھی ترجمہ کیا۔ اس شخص نے علم ہیئت، فلکیات اور نجوم پر ضخیم کتابوں کا ترجمہ کیا، جن میں ابو ماثر بغدادی، عمر بن الفروشن ایرانی، ثابت بن قزہ، مصحح نصیری، الفرغانی وغیرہ کی تصانیف شامل ہیں۔ اس نے الفارابی کے بھی تراجم کیے، جن میں حسب ذیل مشہور ہیں۔

1. On the Division of Philosophy 2. On the Origin of Science

اس کے تراجم میں اہم ترین کتب محمد بن موسیٰ الخوارزمی کی کتب ریاضی ہیں۔ عربی علم مثلث (Trigonometry)، مساحت اور جیومیٹری سے لاطینی دنیا کو ابراہیم بن حنیٰ نے، جسے صاحب الشرح (Sava Sorda) کہا جاتا تھا، متعارف کرایا۔

سسلی کے نارمن حکمران نہایت علم دوست تھے۔ ان کے دربار میں عرب علماء کی تو قیہ تھی۔ وہاں ترجمے کی مہم سرکاری طور پر چلائی گئی۔ شاہ فریدرک اور اس کے بعد اس کے بیٹے مینفرڈ اور اس کے بعد چارلس آف آنجو کے عہد میں بے شمار تراجم ہوئے۔ سسلی کے تراجم میں اہم ترین کارنامہ انازم زکریا رازی کی طبی کتب کے ذخیرے کا ترجمہ ہے۔ سسلی میں ہی ابن رشد کی کتاب فنا، الفناء کا بھی ترجمہ ہوا۔ غرض یہ کہ کہا جاسکتا ہے کہ بارہویں صدی عیسوی مغرب میں عربی سے تراجم کی صدی تھی۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

تیرہویں صدی میں اسپین میں شاہ الفانسو دہم کی سرپرستی میں تراجم کی مہم زوروں پر رہی۔ اس کے درباریوں میں بکثرت مترجم تھے۔ اس کے دور میں فلکیات کے جو جدول تیار کیے گئے انہیں الفانوسی جدول کہا گیا۔ یہی جدول یورپ کے علم فلکیات کی اساس ہیں۔ یہاں تک کہ سترہویں صدی میں گلیلیو اور کپلر نے بھی انہیں جدولوں پر اپنے کام کی بنیاد رکھی۔

الفانوسی پیریوی اس کے ہمسایہ حکمرانوں نے بھی کی۔ ارنون کے حکمران جیمس اول نے عرب تصنیفات اور نقشوں کی مدد سے بحری نقشے تیار کروائے اور اپنی بحری تجارت کو وسعت دی۔ یہی نقشے موجودہ نقشوں کے لیے بنیاد بنے۔

تیرہویں صدی کے نصف سے تراجم کا کام سست پڑ گیا۔ یورپ نے جو کچھ حاصل کیا تھا اسی پر اکتفا کر کے، اس پر عامل ہو گئے۔ علمی مراکز نے مغربی زبانوں میں کتابیں شائع کرنا شروع کر دیں۔ عربی کلیات (قوائین طب) نے (Colliget) کا نام اختیار کر لیا۔

قدیم کتابیں از سر نو عربی سے ترجمہ کی گئیں۔ ابن رشد کی تحریریں پھر سے منظر عام پر آئیں۔ ابن زبیر ہسپانوی (متوفی ۱۱۶۳ء) کی کتاب تاثیر (Theiser) کے نام سے لاطینی میں آئی۔ عربی ادویات و فہرستیں، خواص اور استعمال کے طریقے لاطینی میں منتقل ہوئے۔ غرضیکہ کوئی شعبہ علم ایسا نہ تھا جو عربی علوم کی منت کش نہ ہوا ہو۔

فلسفہ، طب، ریاضی اور سائنس کی کتب کے علاوہ ادبیات کے جی بے شمار ترجمے ہوئے۔ جن میں کلیلہ و دمنہ، سندباد کے سفر، کتاب الاغانی، ألف لیلة، جنین بن الحلق کے جمع کردہ اقوال فلاسفہ، سعدی کی گلستان و بوستان، کلام حافظ و خیام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تیرہویں صدی کے اواخر میں کسی معلوم عرب مصنف کی کتاب 'معراج' کا ترجمہ الفانسو دہم کے لیے ہسپانوی زبان میں کیا گیا۔ ہسپانوی زبان کے توسط سے یہ کتاب لاطینی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کی گئی۔ عیسائیوں کی نظر میں یہ کتاب مسلمانوں کا ایک ایسا مقدس صحیفہ تھی جسے خود پیغمبر اسلام ﷺ نے تحریر فرمایا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں آسن پولاسیئس (Asin Polacius) نے اپنی تحقیق کی بنا پر یہ دعویٰ کر کے علمی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا کہ دانستے کی تصنیف 'ڈیوانین کامیڈی' (Divine Commedia)، اسی کتاب 'معراج' کا چرہ تھی۔

ائمہ اور انکے علوم

دور اول کے تراجم قلمی اعتبار سے ناقص تھے۔ سولہویں صدی کے بعد جب مستشرقین نے عربی زبان سے واقفیت حاصل کر لی تو انہوں نے مشہور کے شاہکاروں کو براہ راست عربی سے سمجھنے کی کوشش کی۔

جس کے باعث سترہویں صدی سے راست عربی کی طرف مراجعت ہوئی اور ان کتب کا از سر نو ترجمہ کیا گیا۔ یہ دور انیسویں صدی تک جاری رہا۔ سترہویں صدی کے مترجمین میں فرانس کے رازر (A-du-Ryer)، اطالیہ کے جینٹیس (G. Gentius)، اور جرمنی کے کارپوس (A. Clarius) بہت مشہور ہوئے۔

رازی : عہدِ وسطیٰ کے مسلم اہل قلم کی یہ بھی ایک خصوصیت تھی کہ ان میں سے بیشتر ایک سے زیادہ فنون کے امام تھے۔ ان میں سے ایک ابو بکر محمد بن زکریا رازی تھے، جنہیں یورپ (Rhazes) کے نام سے جانتا ہے۔ امام موصوف یونانی علوم کے ہر شعبے سے واقف تھے۔ یورپ نے بھی انہیں سترہویں صدی تک امام (Authority) تسلیم کیا۔ رازی کی بیشتر تصانیف جو فلسفہ، انبیات، کیمیا اور طب پر مشتمل تھیں، لاطینی میں منتقل کی گئیں۔ طب کے موضوع پر ان کی تصنیف 'الحاوی' لاطینی میں 'کانٹین' (Continen) اور المنصور (Ad Almansorum) کے نام سے ترجمہ ہوئیں۔ ان کتب میں رازی نے اپنے دور کے مروجہ طبی اصولوں کو ارادی طور پر چیلنج کیا۔ ایک اور کتاب میں انہوں نے یونان کے طبیب اعظم جالینوس (Galen) سے تعارض کیا ہے۔

رازی کو عظیم کیمیا میں بھی مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے تجربات، طریقہ کار، تجربات کے لیے درکار آلات، اور تجربات سے حاصل کردہ نتائج، باکرم و کاست بیان کیے۔ جس کے باعث انکی پیروی کرنے والوں کو بڑی مدد ملی۔

ابو یحیٰٰن البیرونی : البیرونی عظیم سائنسداں ہونے کے ساتھ ساتھ، ریاضی دان، ماہر ارضیات و فلکیات اور اعلیٰ پائے کے موزخ بھی تھے۔ انکی مختلف کتابوں کے ترجمے لاطینی میں کیے گئے۔ جن میں بک آف اسٹون (Book of Stone) اور فارماکولوجی (Pharmacology) نے بڑی شہرت پائی۔ انکی ریاضی اور فلکیات کی کتب سے قطع نظر 'کرونولوجی آف انشینٹ نیشنز' (Chronology of Ancient Nations) کا تذکرہ کیے بغیر حق مضمون ادا نہیں ہوگا۔ اس کتاب کا شمار اس موضوع پر دنیا کی پہلی کتاب میں ہوتا ہے۔ تاریخ اقوام و مذاہب پر یہ کتاب نادر مواد ہے۔

علم نجوم : ابو معشر جعفر بن محمد البخّی کی کتب نجوم کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ علم نجوم و ستارگان (Astrology) پر انکی کتابیں نہایت بلند پایہ تھیں۔ یورپ انہیں ہولی فیلیمس ابن راگل (Holy Filius Aben Ragel) کہتا ہے۔ انکی کتاب 'البہاری فی احکام النجوم' کا ترجمہ ہسپانیہ کے شاہ الفاسود جم کے لیے کیا گیا۔

(On the Astronomical - Astrological Works at the Court of Alfonso , see E. Velyn and S. Proctor; 1951, Alfonso X of Castile, Patron of Literature and Learning, Oxford)

طب و عطاری

علی الطبری : یورپ کو مسلم علوم سے جس قدر خزانہ شعبہ طب کے توسط سے میسر آیا اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ ابن سینا اور رازی کی کتب کا حوالہ پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ ان کے بعد جو کتاب لاطینی میں منتقل ہوئی وہ علی بن ریحان الطبری کی مشہور تہذیب فردوس الحکماء ہے، جو عربی میں قدیم ترین انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی تھی۔ طبری نے یہ کتاب نویں صدی عیسوی میں تحریر کی۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں اپنے ہم عصر طبیب حنین بن اسحق کی علم بصریات کی تحقیقات کی وضاحت کی گئی تھی۔ نیز ایک خصوصی باب طب ہندی کے لیے مختص تھا جس میں ہندی اور یونانی طب کا موازنہ کیا گیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ کتاب بین الاقوامی علوم طب کا مرقع تھی۔

علی بن عباس : علی بن عباس بغداد کا شاہی طبیب تھا۔ اسے لاطینی میں (Holy Filius Abbas) کہا جاتا ہے۔ اس نے ایک عظیم کتاب طب تحریر کی جسے امیر عبداللہ سے منسوب کیا۔ یہ ترجمہ لاطینی میں (Liber Regius) یا (Regalis) کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کتاب اور اس پر مبنی دیگر کتب (Liber Fantegni) یا (Panthero) سرنو کے مدرسہ طب میں عرصہ تک رائج رہیں۔ قسطنطین افریقی نے بھی طب اسلامی کے خزانے لاطینی میں مدرسہ طبیہ سرنو کے لیے منتقل کیے جو کارپس کہلائے۔ ان (Corpus) کی حالیہ تحقیق سے واضح ہوا ہے کہ یہ نوشتے قبروان کے فلاسفہ اور حکیم اہل بن سلیمان کی تحریروں پر مبنی ہیں۔

یوحنا سینا : سینا کی کتاب قانون جولاطینی میں (Canon) کہلائی، عہد وسطیٰ میں طب کی بائبل تسلیم کی جاتی تھی۔

ابن رشد : عظام طب میں ابن رشد بھی صف اول میں تھے۔ انکی کتاب کليات (Colliget) کے نام سے ترجمہ کی گئی۔

علم الابدان : اس علم پر ابن بطان اور ابن رضوان کی نزاعی بحثیں اور ابن النفیس کے دوران خون پر نظریات کی کتب مائیکل سروئٹس (Michael Servetus) نے لاطینی میں ترجمہ کیں۔

(cf. J. Schacht; 'Ibn Al-Nafis, Servetus and Columbo', xxii, pp. 317-336)

علم بصریات : عرب حکیم علی بن عیسیٰ، (Jesus bin Hali) کی علم بصریات پر عظیم کتاب کا لاطینی میں ترجمہ وینس میں پندرہویں صدی عیسوی میں کیا گیا۔

علم تشریح الاعضاء : جدید تشریح الاعضاء و جراحی (Anatomy and Surgery) کا بانی آندرے ویسالیس (Andreas Vesalius) کو باور کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی تصانیف سولہویں صدی میں طبع کرائیں۔ لاطینی میں طبع شدہ کتاب میں اس نے متعدد جدول (Tables) شامل کیے، تاکہ ابتدائی اصولوں کی وضاحت ہو سکے۔ ان جدولوں میں بکثرت عربی اصطلاحات، عربی و عبرانی رسم الخط میں موجود ہیں، جو اس امر کی گواہی دیتی ہیں کہ یہ علم بھی عربی سے لیا گیا تھا۔

دیگر سائنسی علوم

نباتات و زراعت: نباتات و زراعت پر بھی مسلم تصانیف کو لاطینی میں منتقل کیا گیا۔ ابو حنیفہ الدیناوری کی کتاب 'النباتات' کا ترجمہ (The Book of Plants) کے نام سے ہوا۔ ابن وحشیہ کی زراعت و کاشتکاری سے متعلق ایک کتاب کا ترجمہ (Nabataian Agriculture) کے نام سے ہوا۔ اس کتاب کے طویل حوالے متعدد تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔

جغرافیہ: وسیع اسلامی مملکت میں رسل و رسائل، حمل و نقل، تجارت و سیاحت، وغیرہ نے علم جغرافیہ کو ناگزیر بنادیا تھا۔ چنانچہ مسلم اہل علم نے اس شعبے میں نہایت اہم کارنامے انجام دیے۔ اس دور کے وسائل کے پیش نظر ان کارناموں کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سسلی کے نارمن حکمرانوں کی دلچسپی کے پیش نظر بکثرت عربی کتب جغرافیہ جمع کی گئیں۔ ان میں زمین کا وہ شہرہ آفاق نقشہ بھی تھا، (Earth Silver Map) جو راجا ثانی کی فرمائش پر بنایا گیا تھا۔ اس کے ساتھ اکبر [۱۷] دیگر نقشے اور بھی تھے۔ یہ سارے نقشے 'محمد الشریف الادریسی' کے رسالے پر مبنی تھے۔ [cf. R. V. Tooley; Maps and Map Makers, chapter I, 1]

['The Arabs and Medieval Europe': also G. Oman; 'Encyclopedia of]
[Islam', 2nd Ed., article - 'Al-Idrisi'] ان نقشوں نے مغربی جہازرانی کی ترقی میں بے حد مدد دی۔
واسکودی گاما کے پائلٹ ابن ماجد نے ایک رسالہ بحر ہند میں جہازرانی کی بابت تحریر کیا، جس سے مغربی جہازرانوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔

(cf. S. Maqbool; Encyclopedia of Islam, 2nd Ed., article - 'Ibn Majid')

ترک ملاح پیری رئیس نے بحر روم میں جہازرانی کے بارے میں ایک رسالہ تحریر کیا جس میں شامل ایک نقشے کے بارے میں یورپ نے ہمیشہ یہ دعویٰ کیا کہ یہ نقشہ کولمبس کا تھا۔ عصر حاضر کے محقق چارلس ہپگڈ (Charles H. Hapgood) نے یہ ثابت کیا کہ رئیس کا نقشہ کولمبس کا نہیں بلکہ کسی اور قدیم تر نقشے پر مبنی تھا۔ کیونکہ یہ محض بندرگاہوں اور ان کے راستوں پر ہی نہیں بلکہ حقیقی طور پر ریاضی کے اصولوں پر مبنی تھا۔ اس دور میں ایسے نقشے صرف مسلمان ہی تیار کر سکتے تھے۔

الادریسی کی کتاب: ۱۱۶۹ء میں دو ایسے افراد نے جن کا تعلق جہازرانی سے تھا الادریسی کی کتب کے ماخوذات 'جیوگرافیہ نوبینینس' کے نام سے (Geographia Nubiensis) لاطینی میں شائع کیے۔

ریاضی: مسلمانوں نے جب سائنس کی طرف توجہ دی تو ریاضی کی ترقی لازم و ملزوم ہو گئی۔ ہسپانوی زبان میں عربی سے سب سے پہلے ریاضی کو منتقل کیا گیا۔ یہ علم زیادہ تر الخوارزمی کے توسط سے لیا گیا۔ اسی لیے ہسپانوی لفظ گازرے (Guarisme) کے معنی ہی اعداد، ہندسہ اور اعشاریہ کے ہو گئے۔ الخوارزمی کی شہرہ آفاق

کتاب 'المجمع والتفریق بحساب الهند' (عربی اصل اب معدوم) سب سے پہلے ہسپانوی زبان میں ترجمہ ہوئی۔ یورپی زبانیں اتنے طویل نام کی متحمل نہ ہو سکیں، اس لیے اس علم کو یورپ نے اپنے استاد الخوارزمی کے نام سے موسوم کیا، اور اس طریقہ میں مستعمل اعداد کا نام 'عربی اعداد' ہو گیا۔

الخوارزمی اور عمر خیام کا دوسرا کارنامہ الجبرا تھا۔ یہ مسلمانوں کی ہی ایجاد تھی اور انکے سوا کوئی دوسری قوم اس سے واقف ہی نہیں تھی۔ الخوارزمی کے علاوہ ابوکامل شجاع، الخازن اور الکرنفی کے ریاضی کے شاہکار بھی منتقل کیے گئے۔ موئی بن شاکر نویں صدی میں اقلیدس (جیومیٹری) کے امام تھے۔ انکی کتاب 'معارف المساحت الاشکال' کا ترجمہ خیر اراد آف کریمونائے (Verba Filiorum Noysi Filii Sakir) کے نام سے کیا۔ (cf. F. Babinger; Encyclopedia of Islam, article by C.C. Hapgoog) علم المثلث (ٹرائیکلو میٹری) کے ماہرین البطانی، البنصر اور البیرونی کی تصانیف کو مختلف ادوار میں لاطینی میں منتقل کیا گیا۔

علم البہیت: بہیت میں پیمائش کے لیے جو آلہ استعمال ہوتا تھا وہ اصطرلاب کہلاتا تھا۔ اس آلے میں قطب تارے کو مرکز قرار دیکر مختلف ستاروں اور سیاروں کی جائے وقوع ظاہر کی جاتی تھی۔ ابتدا ایسے قرص یا طشت استعمال ہوئے جو ہر زاویے کے لیے الگ الگ تھے۔ انڈی بہیت داں علی بن خلف نے ایسا طشت یا اصطرلاب تیار کیا جس میں سیاروں کی علامت کو حرکت دیکر ان کی جائے وقوع معلوم کی جاسکتی تھی۔ اس کی انتہائی اعلیٰ شکل مظفر الدین طوسی کی تیار کردہ اصطرلاب تھی۔ سولہویں صدی عیسوی میں اس اصطرلاب کو گیمافریشا (Gemma Frisia) نامی ایک عیسائی نے بچشمہ دیکر اسکا نام کیتھولک اصطرلاب (Astrolabum Catholicum's) رکھا۔ انڈی بہیت داں عباس بن فرناس نے قرطبہ میں ایک حجرہ بنایا تھا جس میں سیارگان، ستارے، بادل، بجلی اور کڑک، ہر شے کا موجود ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ ان نمونوں کے ذریعے بہیت کو سمجھنے اور سمجھانے کا کام لیا جاتا تھا۔

مسلمانوں کا علم بہیت پورے کا پورا یورپ کو منتقل ہوا۔ مغرب کی آسٹرونومی (Astronomy) اسی علم بہیت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بہیت اور علم المثلث (Trigonometry) کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عربی علم المثلث کے بغیر یہ علم پروان نہیں چڑھ سکتا تھا اس لیے علم المثلث کے ماہرین کی کتب کا ترجمہ کیا گیا۔ علم بہیت کا عظیم ترین کام خلیفہ مامون الرشید عباسی کے عہد میں علماء کے ایک گروہ نے کیا تھا۔ اس گروہ نے عراق کے میدانوں میں موصل کے قریب سبخر کے مقام پر زمین کے قطر کی پیمائش کی، اور عرض البلد کے ایک درجے کی قدر حتمین ہوئی۔ اس دور میں یہ فاصلہ [۸۱۳ء ۱۱۱ء] کلومیٹر مقرر ہوا تھا۔ (آج یہ فاصلہ [۱۱۰۹۳۸] کلومیٹر ہے)۔ عرب بہیت دانوں میں البطانی سب سے بڑے بہیت داں ہیں۔ انہوں نے علم المثلث کو مدور اجسام (زمین وغیرہ) کی پیمائش میں استعمال کیا اور نہایت اہم اضافے کیے۔ البطانی 'مستن' نامی نقشہ جات کے خالق ہیں۔ جن کی مدد سے سورج گہن اور چاند گہن کے اوقات کا تعین ہوتا تھا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ثابت بن قزہ : وہ ہنیت واں ہیں جنہوں نے سیاروں کی گردش کے مدار متعین کیے۔ اسی طرح سلطان جلال الدولہ ملک شاہ کے حکم پر عمر خیام نے شمسی سال کا کیلنڈر مدون کیا۔ یہ کیلنڈر حیرت انگیز حد تک موجودہ نافذ العمل گریگورین کیلنڈر سے مشابہت رکھتا ہے۔

علم بصریات : مسلمانوں نے اسے بڑی ترقی دی۔ قوس قزح کو روشنی اور پانی کے بخارات کی پیداوار ثابت کیا۔ سفید رنگ کو مختلف رنگوں کا مجموعہ قرار دیا۔ موجودہ دور میں اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ سفید رنگ مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے، ایک طشت استعمال کیا جاتا ہے جس پر ایک خاص تناسب سے سات مختلف رنگ کیے جاتے ہیں۔ جب اس طشت کو تیزی سے گردش دی جاتی ہے تو یہ طشت سفید نظر آنے لگتا ہے۔ یہ طشت نیوٹن کی تختی کہلاتا ہے اور اس تجربے کا سہرا نیوٹن کے سر باندھا جاتا ہے، جبکہ یہی تجربات نیوٹن سے صدیوں قبل قطب الدین الشیرازی اور کمال الدین الفارسی (متوفی ۱۳۲۰ھ) چکی کے پاٹ کے ذریعے کر چکے تھے۔

ابن الہیثم : ابن الہیثم علم بصریات کے امام گزرے ہیں۔ انہوں نے اس بارے میں کہ ہم کیونکر دیکھتے ہیں اس نظریے کو صحیح قرار دیا کہ اشیاء سے روشنی منعکس ہو کر ہماری آنکھ تک پہنچتی ہے، جس کے باعث ہم دیکھتے ہیں۔ اپنے دلائل کے ثبوت میں انہوں نے کمرے کی ابتدائی شکل ترتیب دی اور اپنے نظریات کے ثبوت بہم پہنچائے۔ ان ہی نظریات کی بنیاد پر روشنی کی رفتار کا تعین ہوا۔ انعکاس نور اور انعطاف نور کے نظریات بھی ابن الہیثم نے دیے۔ عدسے (Lens) کی خصوصیات کا تعین بھی ابن الہیثم کا کارنامہ ہے۔ عدسوں کی مدد سے اشیاء کو بڑا دیکھنا انہوں نے ہی ممکن بنایا۔ انہی عدسوں کی بدولت دوربین اور خوردبین وجود میں آئیں۔ ابن الہیثم کی تصنیف 'کتاب المناظر' نہایت معرکتہ آرا کتاب تھی جسے ۱۵۷۲ء میں (Thesarus Opticus) کے نام سے لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مغرب نے عالم اسلام سے ہر شعبہ علم و فکر کی بنیادیں مستعار لیں اور اس پر موجودہ تہذیب کی تعمیر کی۔ یہ کیفیت محض علوم تک محدود نہیں بلکہ صنعت و حرفت، تجارت و زراعت، تعمیر و تزئین، آرٹ اور لٹریچر ہر شعبہ کو محیط کیے ہوئے ہے۔ وہ الفاظ جو آج بھی یورپ کی مختلف زبانوں میں پائے جاتے ہیں، اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ مطاب کے ساتھ ساتھ انکے الفاظ بھی اپنائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ کے الفاظ، ایڈمرل (امیر البحر)، آرسل (دار الصنعہ)، میگرین (مخزن)، شوگر (شکر)، موسیقی کے الفاظ، گنار (ستار)، ریک (Rebeck) (رباب)، تنیر (طنبورہ)، لوت (Lute) (العود)، کیمیا اور ہنیت کے الفاظ، صافر (Cypher) (صفر)، ازیمتھ (Azimuth) (السمت)، زینتھ (Zenith) (زینت)، المہک (Alembic) (ترنپق)، ازیور (Azure) (ازہر)، تجارت میں موہترہ (مختارہ)، فرانسیسی لفظ اوول (Oval) (حوالہ)، چک (Check) (ثقبہ، سک)، وغیرہ۔ یہ تو وہ الفاظ ہیں جو باقی ہیں۔ یہ نہیں کہتے مسخ ہو کر مٹ گئے یا مرنے دیئے گئے ہونگے۔ تاہم یہ سب علم اسباب کے احسانات کی نشاندہی کرتے ہیں۔

مغرب نے کلیسا کے دباؤ کے تحت اسلامی روح کو قبول کرنے سے ہمیشہ گریز کیا ہے۔ اس نے اسلام سے صرف مادی اثرات قبول کیے۔ یہی مادی اثرات تھے جو بے روح علم بن کر مغرب کے ہاتھوں میں پہنچے، جسے انہوں نے عیسائی فضا میں پروان چڑھایا۔ وہ تناور درخت جس میں اسلامی روح نظر نہیں آتی، مسلمانوں کا لگایا ہوا پودا ہے، جو خود عالم اسلام میں نشوونما نہ پاسکا اور ناموافق حالات میں ٹھنڈ کر رہ گیا۔

مستشرقین کی کاوشوں کا جائزہ

مستشرقین کو عہدِ وسطیٰ کے مغربی تصورِ اسلام سے ملی علمی میراث

عجب ستم ظریفی ہے کہ جس دور میں مغرب، عالمِ اسلام سے عہدِ آفریں علوم کا حصول کر رہا تھا، اسی دور میں اسلام سے نفرت اور عداوت کے شدید جذبات بھی بیدار کر رہا تھا۔ جسکے نتیجے میں پورا معاشرہ لاوے کی طرح پک رہا تھا۔ قلم اور زبان دونوں کی تیش انتہا پر تھی۔ دنیا کی ہر وہابی تباہی اسلام اور داعیِ اسلام ﷺ کے لیے وقف کی جا رہی تھی۔ اسلام میں کسی خوبی کا تصور تک [بزعِ خویش] کسی ایماندار عیسائی کے لیے گناہ تھا۔ تحریر و تقریر کا یہ عقیدہ بن چکا تھا کہ ”ایسے شخص کو برا کہنا ہی مناسب ہے جسکی برائیاں حدِ بیان سے تجاوز کر جائیں“۔

(Attributed to Gilbert of Nogent, vide R.W.Southern; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.31)

مغربی لٹریچر اور مسلمان : عیسائی اہل قلم نے مسلمانوں کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے، جنہیں اگر مسلمان کی صفت تسلیم کیا جاسکے تو اس کے معنی ہی بدل جائیں۔ بہر حال یہ الفاظ اس دور کے معاشرے کی ذہنی کیفیت کے آئینہ دار ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو بت پرست (Pagan)، ملحد (Heathen)، بے دین (Infidels)، فتنہ گر (Miscreants)، دشمنِ خدا، باجرین (Hagarenes)، قاتلین (Canes)، موابی، اور کہیں کہیں گاتھ اور وینڈل بھی تحریر کیا۔ (قاتلین اور موابی وہ اقوام ہیں جنکا ذکر تورات میں تحقیر کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جبکہ گاتھ اور وینڈل مغرب پر حملہ آور جرمن اقوام کا نام ہے)۔ ایک لفظ ”سراسین“ یا ”ساراسن“ ایسا بھی ہے جو ہر دور میں مسلمانوں کے لیے استعمال کیا گیا۔ طرفہ تماشا یہ کہ قدمائے مغرب یہ تصور کرتے تھے کہ یہ نام خود مسلمانوں نے اپنی نسلی کمتری پر پردہ ڈالنے کے لیے اپنایا ہے۔ چنانچہ مورخ میتھیو پیرس نے تحریر کیا ”ساراسن بزعم خود یہ تصور کرتے ہیں کہ وہ سارا (حضرت بی بی سائرہ) کی نسل سے ہیں، جبکہ انہیں باجرین یا اسمعیلی کہنا زیادہ مناسب ہوگا“۔ (Mathew Paris; English History, Vol.1, p.15, Bohns Ed., 1854)۔

لیکن یہ نام اس قدر مقبول تھا کہ میتھیو پیرس کی تجویز بے اثر رہی۔ کثرتِ استعمال نے اس ایک لفظ کو نفرت اور ذلت کی علامت بنا ڈالا۔ مستشرقین کے ہراول اسکالجر (Scaliger) اور ہوتنگر (Hothinger) نے اس لفظ کی جانب خاصی توجہ دی، اور یہ نکتہ دریافت کیا کہ لفظ سراسین دراصل ”سارقین“ ہے جس کے معنی چوروں کے ہیں اور جو عربی لفظ ”سرق“ سے مشتق ہے۔ چونکہ یہ قوم چوروں اور ڈاکوؤں کی ہے، اس لیے سارقین کہلائی۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

(cf. Henry Stubb; Rise and Progress of Mohamatanism, p.114)۔ مستشرق پوکاک نے سراسیم کو شرقیوں کی بگڑی ہوئی شکل قرار دیا اور یہ بھی دعویٰ کیا کہ اسلام کا نام آنجیل کی مناسبت سے رکھا گیا ہے، اور ہجرت کا تعلق حضرت ہاجرہ سے ہے۔

ترکوں کے حملوں نے مغرب کو لفظ ترک سے متاثر کیا۔ چودھویں صدی عیسوی سے لفظ ترک اور اسلام ایک دوسرے کے مترادف ہو گئے۔ اس لفظ پر بھی تحقیق ہوئی تو نتیجہ یہ نکالا گیا کہ یہ لفظ 'تارتارس' (Tartars) سے مشتق ہے۔ یہ وہ قوم ہے جو ایک جہنم تارترس (Tartarus) سے نکلی تھی۔ (cf. Buckles; Civilization in England, Vol.1, Chapter VI)۔ بعد کے دور میں عربوں کو یاجوج (Gog) اور ترکوں کو ماجوج (Magog) قرار دیا گیا۔

بت پرستی

مغربی چرچ میں یہ امر متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا تھا کہ مسلمان بت پرست تھے، اور اسلام بت پرستی کا مذہب تھا۔ ماہومت ایک بت تھا جس کی پرستش ہوا کرتی تھی۔ مورخ آرڈیریکس (Ordericus) نے ایک مناجات ضبط تحریر کی جس میں فلسطینی خواتین یوں دعا کرتی نظر آتی ہیں:

"Praise be to Mahomet our God. Sound the glad timbrels and offer him victims that our terrible enemies may be overcome and perished."
(Ecclesiastical History of England and Harmony, Vol III, pp.175-176)

[سر بلندی ہو ہمارے خداوند ماہومت کی؛ خوشی کی جھانجھریں بجاؤ اور اس کو قربانی پیش کرو تا کہ ہمارے ہولناک دشمن مغلوب اور ناپید ہو جائیں۔]

عوامی سطح پر سراسر بڑے جادوگر سمجھے جاتے تھے۔ مسلم عظام مثلاً الکندی، جابر، ثابت بن قرة، اور ابن سینا، یہاں تک کہ خود ختمی مرتبت ﷺ، (نعوذ باللہ) سب کے سب بڑے جادوگروں میں شمار کیے جاتے تھے۔

(cf. 'William of Malsbury's Chronicles', pp.173-174, Bohn, Bohn's ed.:

and Naudxus; History of Magic, Chapter XIV)

فرضی اصنام : ابتدائی صدیوں میں یہ عقیدہ عام تھا کہ مسلمان اپنے نبی کی پرستش کرتے ہیں۔ سدرن نے اوٹو آف فرینگ کے حوالے سے لکھا کہ "آرچ بشپ تھیمو کو مسلمانوں نے اس لیے قتل کر ڈالا کہ اس نے قاہرہ میں انکے بتوں کو توڑ ڈالا تھا"۔

(Southern R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages, p.35)

نغماتِ رولینڈ (Songs of Roland) سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے خیال میں عیسائیوں کی طرح مسلمانوں کے بھی اقا نیم ثلاثہ تھے۔ ترویگان (Tervegan)، اپولو (Apollo) اور ماہومت (Mahomet)۔ (Phillips K. Hitti; Islam and the West, Reading No.16, p.150) یہ یونانی علم الاضنام کا سیدھا سادا منطقی اندازِ فکر تھا کہ اگر عیسائیوں کے تین خدا ہو سکتے ہیں تو مسلمانوں کے اس سے کم نہیں ہونے چاہیے۔ پھر یہ تعداد بڑھتی چلی گئی۔ شاید اس لیے کہ صرف تین خداؤں کا وجود تو تثلیث ہو جاتا جو عین عیسائیت ہے، لہذا تکثیر ثابت کرنا ضروری تھا۔ مغربی لٹریچر میں کم و بیش تیس [۳۰] خداؤں کا ذکر ملتا ہے جنہیں سراسر ان پوجتے تھے۔ انہیں لوسیفیر (Lucifer)، جیو پیٹر، ڈیانا (Diana)، افلاطون (Plato)، دجال (Anti-Christ) اور القرآن بھی شامل ہیں۔ انکے بیان کے مطابق، مسلمان اپنے ان خداؤں کی پرستش کا بجا کر کرتے تھے۔ ان کے آگے دھونی رمانی جاتی، قمر نے چھوٹے جاتے، رقص ہوتا، حیوانات کا خون پیا جاتا اور پھر دودھ اور شہد سے ضیافت ہوتی۔ (cf. B.P. Smith; Islam in English Literature, p.2) ہی بت یا صنم کے ہو گئے۔ جس سے لفظ معمری بنا جسکے معنی بت پرستی کے ہوئے۔

صنمِ اعظم : مغرب نے مسلمانوں کے لیے جو سب سے بڑا صنم تراشا اس کا نام ماہوئن یا ماہوینڈ (Mahoin/Mahoind) رکھا۔ تاریخِ چارلس اعظم کے صفحات اس فرضی بت کی تفصیلات سے مزین ہیں۔ صاحبِ تاریخ کے بقول اس بت کو خود موحدِ اعظم نے تراشا تھا، جسے شیطانوں کی مدد سے ناقابلِ شکست قوت کا مالک بنایا گیا تھا۔ جو شخص اسے تباہ کرنے کے لیے جاتا تھا خود تباہ ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پرندہ بھی اگر اس بت کے اوپر سے پرواز کرتا تو مردہ ہو کر گر پڑتا تھا۔ (cf. Bishop Turpin; 'History of Charles the [Great, Chapter IV, pp.6-7, Translated by T. Rodd])

فان سائیکل (Von Sybel) نے اپنی تاریخ میں اس بت کے اور اسکی پرستش کے بارے میں مزید تفصیلات مجہم پہنچائی ہیں۔ اس کے مطابق سرقد میں خالص سونے کا یہ بت مقناطیسی کشش کے باعث ہوا میں معلق تھا۔ دور دراز سے سلاطین اس پر قربانی چڑھانے کے لیے حاضر ہوتے، اسکی پرستش کرتے اور دعائیں مانگتے۔ اس نے اس بت کی یا ترا کا منظر کھینچتے ہوئے لکھا:

”اس کی خدمت میں بغداد سے اسرین کا پوپ حاضر ہوتا۔ پھر عرب حاضری دیتے۔ جو یسوع مسیح اور اسکے دوبارہ زندہ ہونے پر تیز اترتے۔ کالے جادو کی ماہر جادوگر نیاں جلوس کی شکل میں شرکت کرتیں۔ انکے عقب میں مکہ کا حکمران، ماہوینڈ کی مورتی یا شبیہ لیے آتا۔ یہ شبیہ اندر سے کھوہلی ہوتی جس کے اندر ایک بدروح مقیم ہوتی۔ قوم پنیم (Penim) اس کے آگے رقص کرتی۔ باجے گا بجے غے شور میں یہ بت اپنی منزل تک پہنچایا جاتا۔ جہاں خلیفہ اس کے استقبال کا منتظر ہوتا۔ پھر اس کھوہلی مورت کی بدروح یوں کلام کرتی کہ آسمان کی ملکیت عیسائیوں کے خدا کی ہے، لیکن زمین میری ہے۔ جسے جواب میں مجمعِ نعرے لگاتا کہ: ”ہوینڈ نے کیا خوب فرمایا۔“

(cf. Von Sybil; History and Literature of the Crusades, edited by Lady Duff Gordon, pp.41-45)

یہ نام مغرب کے شعراء، افسانہ نویسوں اور ڈرامہ نویسوں کا مقبول ترین نام رہا ہے۔ اس لفظ کو افراط و تفریط کے ذریعے کئی شکلیں دی گئیں، جیسے [Mahon, Mahoun, Mohown, Mahoune,] (Mammetry, Maumery,] مثلاً [Mahmet, Maumet]، وغیرہ۔ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری میں ماہومت کے اٹھارہ [۱۸]، اور ماہوند کے سترہ [۱۷] اور دیگر چھ [۶] تلفظ اور پائے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ نام اکتالیس [۹۱] مختلف شکلوں میں ملتا ہے۔

ماہوند کی قدامت : مغرب نے ماہوند کو حق کا ازلی دشمن ثابت کرنے کے لیے اسے نہ صرف مافوق الفطرت ہستی بنایا، بلکہ نامعلوم قدامت کا حامل بھی قرار دیا۔ ماہوند ماقبل تاریخ بھی موجود تھا جس کی پرستش ہر دور کے بت پرستوں میں عام تھی۔ ہر وہ کردار جسے توریت یا انجیل نے مردود قرار دیا ہو، ماہوند کا پرستار تھا۔ مغرب کے توسط سے ہمیں یہ اطلاع ملی کہ فرعون (Mahometan) تھا۔ جب وہ حضرت موسیٰ کا تعاقب کرتے ہوئے یانی میں گھر گیا تو اس نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ ماہوند سے رجوع کرے تاکہ وہ انہیں غرقابی سے نجات دلائے۔ فرعون کا یہ تاریخی فرمان مغرب نے ان حروف میں محفوظ رکھا:

"Hefe appe youre hartis ay to Mahomede, He will be nere us in oure node". (cf. York Plays; p.91, edited by Lucy T. Smith)

اسی طرح بیزر آگنسٹس (پہلی صدی قبل مسیح) ماہوند کی قسمیں کھاتا نظر آتا ہے۔

(cf. Tonnelly; Plays IX, 'Ceaser Augustus', N.E. Text Society, 1897)

اس کی قسموں کا پسندیدہ انداز یوں ملتا ہے،

"I swear by Mahown", "I pray thee as thou lovest Mahown" or
"By Mahownd's blood".

آگنسٹس کی مینہ آخر الذکر قسم سے اندازہ ہوتا ہے کہ ماہوند سے بھی مصلویت یا ایسی ہی کوئی روایت منسوب تھی جب ہی اس کے خون کی قسم کھائی جاتی تھی۔

یہودیہ کا حکمران ہیرود (Herod) جس نے حضرت عیسیٰ کو انکے ایام طفلی میں قتل کرانے کی کوشش کی اور جس کے ہاتھ حضرت یحییٰ کے خون سے رنگین ہیں، ماہوند کی شریعت کا پیروکار بتایا جاتا ہے۔

(cf. The Coventry Mystries, pp.20-91, Shok -SOC 1841)۔ وہ ایسے عیسائیوں کو جو ماہوند کی شریعت کے منکر تھے، پھانسی دیکر، زندہ جلوا کر یا زندان میں اذیتیں دیکر نہایت محفوظ ہوتا تھا۔ ہیرود اور دیگر دشمنان مسیح کو ماہوندی قرار دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عام عیسائیوں نے یہ گمان کیا کہ حضرت عیسیٰ کے قاتل مسلمان تھے۔ دشمن خدا کی جو اصطلاح سراسیمہ کے لیے استعمال ہوئی اسکی بنیاد غالباً یہی دروغ بانی تھی۔

حضرت عیسیٰ چونکہ مغربی عقیدے کے مطابق خدا ہیں اور خدا کی مخالفت شیطان کے لیے وقف ہے لہذا ہر وہ طاقت جو حضرت عیسیٰ کے خلاف تصور کی گئی، اسے شیطانی طاقت سے تعبیر کیا گیا۔ ماہوند اسی اعتبار سے

شیطان سے بھی بڑا طاغوت تصور ہوا۔ چنانچہ مغربی ڈراموں میں اس قسم کے مناظر بھی ملتے ہیں کہ شیاطین جہنم میں ماہوند کی پناہ طلب کرتے ہیں۔

"All the devyls, that ben in helle, shall pray to Mahound, as I telle".

(cf. 'The Coventry Mystries', Play XXII, p.207, 1841)

ماہوند کی صفات : ماہوند کی صرف ذات ہی نہیں بلکہ اس کی صفات کا تذکرہ بھی تفصیل سے پایا جاتا ہے۔ وہ عظیم و مقتدر الہ ہے جو اپنے پرستاروں کی نصرت کرتا ہے۔ زندگی میں انکی حفاظت کرتا اور ان پر حکومت کرتا ہے۔ موت کے بعد اس کے پرستاروں کی رو میں اس کے قبضہ میں چلی جاتی ہیں۔ وہ الوہیت عسیٰ سے حسد کرتا ہے اسی سبب سے اس کے پرستار عیسائیوں سے برسرِ جنگ رہتے ہیں، اور صلیب کے مقابلے میں اسکی شبیہ لیے پھرتے ہیں۔

(cf. The Siege of Milan and the Romance of Roland, p.11, N.E. Text

Society, 1880)

پیٹر پلوین نے ماہون کو بے پناہ سغلی صفات کا مالک قرار دیا، تو ولیم ڈنبر (متوفی ۱۵۲۰ء) نے اسے

جہنم کی تقاریب کا آقا بیان کیا ہے۔ (cf. G.E. von Grunebaum; Medieval Islam, p.48)۔

ماہوند کے مغربی زائرین : ماہوند کے بت کی زیارت کا شرف کئی عیسائیوں کو میسر آیا۔ مغرب کے کئی ہیرو ایسے بھی ہیں جنہیں اس عظیم بت کو پاش پاش کرنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ چارلس دی گریت نے اس بت کو محض اس مصلحت سے باقی رہنے دیا تا کہ اس کے تابع شیاطین انتقام نہ لیں۔ جبکہ رولینڈ، سر بے وں (Sir Bevis) وہ ہیرو ہے جو بت شکنی میں کامیاب ہوا۔ ایک تیسرا سورمارینالڈو (Ronaldc of Montalbon) ان سب پر بازی لے گیا اور وہ خالص سونے کے اس بت کو ضم کدے

سے لے اڑا۔ (cf. Wagner; Epics and Romances of Middle Ages)۔

بتانِ حرم : میتھیو ہیرس نے اس بت کی مکہ میں موجودگی اور پھر تباہی کا ذکر کیا۔ نیل نے فادر موبیلاں کے حوالے سے اپنی دشمنی میں تحریر کیا کہ مسجد عمر میں سونے کا ایک عظیم بت پایا گیا ہے جسے چودھوی افراد جہنم

تک ندے سکے۔ (cf. 'Bayl's Dictionary; entry 'Mahomet')

اسلام میں بتوں کے وجود اور مسلمانوں کی بت پرستی کی گونج سولہویں صدی تک، اور ختمی مرسلات ﷺ کی الوہیت کا تصور مغرب میں سترہویں صدی عیسوی کے نصف تک پایا جاتا ہے۔

اسلام دشمنی کے جواز : مغربی عیسائیوں نے ہر دور میں اسلام دشمنی کا کوئی نہ کوئی جواز پیدا کیا، جس میں مذہبی تعصب بہر طور کارفرما ہوتا تھا۔ ہر [برغمِ خویش] ایماندار عیسائی کسی نہ کسی جواز کا سہارا لیکر مسلمانوں سے نہرو آڑا ہونا اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتا تھا۔ کبھی خداوند یسوع مسیح کی مقدس سرزمین کو بے دینوں کے تسلط سے آزاد کرانے کے لیے، تو کبھی کسی مقدس سینٹ یا فرشتے کی دعوت جنگ پر لبیک کہنے کے لیے اندھا دھند ٹوٹ پڑتا۔ ایک اور وجہ جنگ یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ کے خون کا انتقام ہر عیسائی پر فرض تھا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

چونکہ خداوند کے فرزند یسوع مسیح کو ان ہی سراسین کے اسلاف نے مصلوب کیا تھا، اور خداوند کے خون کا نہ کوئی حق تھا نہ جواز، اس لیے عیسائی، سراسین اور ان کے ہر فرقے کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ (Chronicles; p.403, Globe Edition, 1899)۔ ایک اور وجہ عناد یہ بھی تھی کہ سراسین مقدس ہتیسے اور مریم عذرا پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔

مسلمانوں سے جنگ اور ان کی تباہی، عہدِ وسطیٰ کے عیسائی کا مذہبی نصب العین بن گیا تھا۔ اس میں شدت پیدا کرنے کے لیے مذہبی حلقے اپنے عوام کو یہ باور کراتے تھے کہ ان جنگوں میں خداوند، اس کے فرشتے، کنواری مریم اور ان کی مقرب خواتین، اور مقدس اولیاء سب کے سب حصہ لیتے تھے۔

(cf. C.H.Milis; History of Crusades, Chapter II, p.50)

ان جنگوں میں فتح، خداوند کی عظمت کا اظہار، اور شکست عیسائیوں کی شامت اعمال سمجھی جاتی تھی۔ جب مسلمانوں کی تباہی عالم بالا کا مقصد تھی تو بھلا عام عیسائی اس کا رٹو اب سے کبے محروم رہ سکتا تھا۔

تباہی کی توقعات : عیسائی دنیا کا ہر دور میں یہ اعتقاد رہا کہ جلد یا بدیر اسلام کی تباہی یقینی ہے۔ فرزند ان کلیسا نے چونکہ اسلام کو محض کفر و الحاد کا درجہ دے رکھا تھا، اس لیے اس کی تباہی نیک فال تصور کی جاتی تھی۔ یہ آخر کب فنا ہوگا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جو رہ کر اٹھتا تھا، اور جس کے جواب میں ہر دور میں ایک نئی تاریخ متعین کرنا پڑتی تھی۔

(For predictions about destruction of Islam see:

Norman Daniel; The Arabs and Medieval Europe, pp. 108, 158, 208-209:

R.W.Southern; 'Western Views of Islam in the Middle Ages', pp.15, 24,39:

Roger of Windove; Flowers of History, Vol II, p.515)

کبھی یہ مدت انجیل اور تورات کے مبہم الفاظ کو اعداد و شمار میں منتقل کر کے ۳۰۰-۳۱۰ جگ یا (۷۰ x ۳۵) یعنی ۲۴۵ سال مقرر کی گئی۔ کبھی علم نجوم کی مدد سے ۱۲۲۹ء اور ۱۲۳۶ء کے درمیان تباہی کا یقین دلا یا گیا۔ مکے اور مدینے کے چراغ گل ہونے کے خواب تاریخ کے صفحات کی زینت بنے۔ آئے دن عیسائیوں کے لیے خوشخبری، عجیب و غریب خبر، معجزہ، روایہ اور پیشینگوئیوں کے عنوان سے چھوٹے موٹے پمفلٹ جاری ہوتے رہتے، جن میں کسی سیاح، مخبر یا سفیر کے توسط سے یہ دل خوش کن اطلاع دی جاتی کہ بس اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اسلام مٹ جائے گا۔ اس قسم کی بہت سی تحریریں اب بھی محفوظ ہیں۔ ان میں کتابچے [Strange] (and Miraculous News from Turke; London 1642) کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔

مریم عذرا اور مدینے کے چراغ : اس کتابچے میں ایک معجزے کا ذکر ہے جس کے مطابق شدید طوفان کے بعد مدینے کے افق پر آدھی رات کو عربی رسم الخط میں ایک تحریر نمودار ہوئی کہ 'آخر کذب پر ایمان کب تک!'۔ پھر اسی شب دو تین بجے کے قریب ایک خاتون سفید پوشاک میں ملبوس نمودار ہوئیں۔ سورج انکا ہالہ

کیے ہوئے تھا۔ انکے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ ان کے مد مقابل ترکوں، ایرانیوں، عربوں اور دیگر مسلم اقوام کی افواج تھیں۔ یہ افواج اس خاتون پر حملہ آور ہوئیں۔ خاتون اپنی جگہ استقامت سے کھڑی رہیں۔ انہوں نے صرف کتاب کھولی ہی تھی کہ تمام افواج تحلیل ہو گئیں۔ اور اسی لمحے رونے کے تمام چراغ بھی گل ہو گئے۔ یہ منظر صبح کے آثار تک قائم رہا اور عام طور پر دیکھنے والوں کا تاثر یہ تھا کہ انکا مذہب جھوٹا اور ان کا... جعلی ہے۔

سترہویں صدی میں اس قبیل کی بے شمار تحریروں پائی جاتی ہیں، جن میں مشترکہ طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ عنقریب دین اسلام پر مذہب عیسائیت کا غلبہ ہو جائے گا۔

(For further details, the following may be referred:

True News from Turkey, London 1664:

Prophecies of Christopher Kotterus, 2nd Ed., Hazlit 1664:

Great and Wonderful Prophecies', Duke Lane, Hazlit, 1684:

The Prophecies of a Turk', London, 1687, Guild Hall Library:

The Great Vision Sun in Turkey Land, 1702, Bib-Coll., W.C. Hazlit)

فرضی مناظرے : عبد وسطی کی تحریروں میں فرضی مناظرے کثرت سے ملتے ہیں۔ جن میں اہم ترین مباحث توحید و تثلیث کا تقابل اور تثلیث کی فضیلت، قرآن پر بائبل کی فضیلت، اور سیرت پر تنقیدیں ہیں۔ ان مناظروں کا اختتام ہمیشہ مسلمان فریق کی ندامت اور یشیائی پر ہوتا ہے۔

(cf. Mathew Paris; English History Vol.II, p.501:

and Turpin; History of Charles the Great, Ch. XXII, pp. 27-30)

اس قسم کی جانبدار اور متعصبانہ تحریروں کی بدترین مثالیں الکندی سے منسوب رسالے (Risalat al-Kindi, Cairo 1912) اور ولیم بیڈول (William Bedwell) کی ترجمہ کردہ کتاب (Mohammedis Imposture) ہیں۔ ان تمام فرضی مناظروں میں سوائے یکطرفہ جذباتیت کے کسی قسم کی سنجیدگی یا افہام و تفہیم کا وجود نہیں پایا جاتا۔

لفظی مغالطے : مغربی لٹریچر میں لفظی ہیر پھیر اور مغالطوں سے بھی بھرپور کام لیا گیا ہے۔ فرضی اسنام کے نام ماہوئن، ماہونند، مامیت وغیرہ اسی کی مثالیں ہیں۔ اسپین کے نامور نیشتر رقم الویرو نے اللہ اکبر کے جو معنی پیدا کیے وہ اس کی فطانت کا شاہکار ہیں۔ اس کے مطابق زہرہ (وہنس) کو عرب 'کنز' یا 'کنز' کہتے تھے۔ اسی ستارے کی تکریم میں ہر صبح عبادت گاہ سے 'اللہ اکبر' کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔

(cf. Norman Daniel; The Arabs and Medieval Europe, pp.41-42)

اس نے اللہ اکبر کا املا "اللہو کبر" (Allaho Howa Kabar) کیا اور اس املا کی مدد سے یہ معنی پیدا کیے کہ اللہ ہی کبر ہے۔ منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کو اکبر پرستی کا نام ہے۔ مستشرقین نے بھی لفظی کاوشوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ انیسویں صدی میں لفظ 'حنیف' پر اور 'مسلم' پر کافی زور و شور سے بحث ہوتی رہی ہے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اسلام اور تلوار : اسلام مننے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ عیسائی ذہن پر یہ سوال مسلط رہتا تھا کہ آخر حق پر باطل کیوں اور کیسے مسلط ہے۔ اس کے متعدد جوابات دیے گئے۔ مثلاً عیسائیوں کی شامت ائمال کے سبب، خداوند نے عربوں اور ترکوں کو اپنے قہر کا مظہر بنایا۔ پھر یہ کہ جادو کے زور پر مسلمان ساحروں نے اقصائے عالم پر قبضہ کر رکھا ہے۔ نیز یہ کہ کائنات کی تمام سغلی قوتیں اسلام کی مددگار ہیں۔

جب ان جوابات سے تسلی نہیں ہوئی تو یہ نظریہ عام کیا گیا کہ اسلام کو تلوار کے زور پر رائج کیا گیا تھا اور اسے لوگوں پر مسلط رکھنے کے لیے ہر وقت ان کے سروں پر تلوار لٹکتی رہتی ہے۔ ویٹکن دی وارڈ (Wynkyn de Worde) نے ۱۵۱۵ء میں ایک کتاب لکھی جس میں اس نے دعویٰ کیا کہ،

”جب مسلمانوں کا مبلغ اپنے جھوٹے عقائد کی تبلیغ کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو جب تک اس کا خطبہ جاری رہتا ہے اس کے ہاتھ میں ایک فنی تلوار رہتی ہے۔ یا پھر یہ تلوار کسی ایسے بلند مقام پر رکھی رہتی ہے کہ سب کی نظروں میں رہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص لرزاں و ترساں رہے۔“ [Quoted by Henry Stubb; Rise and] (Progress of Mohometanism, Ch.VIII, p.158).

بعد کے دور میں مستشرقین نے اس نظریہ پر کافی زور قلم صرف کیا۔

حصول قرآن : حاصل وحی اور مہبط وحی کے بارے میں گمراہ کرنے کے لیے جس قدر شرمناک طریقے اختیار کیے گئے ہیں، انہیں دہرانا بھی قلم کو آلودہ کرنا ہے۔ صداقت و روحانیت کے ان سرچشموں سے رکاکت اور جعل و فریب کو صرف اس لیے منسوب کیا گیا کہ مغرب کا ذہن اس طرف راغب نہ ہو سکے۔ آندریو بورڈے (Andrew Borde) نے اپنی کتاب (Introduction to knowledge) میں اپنے ناظرین کے لیے ایک حیرت انگیز کہانی پیش کی، جس میں اس نے لکھا،

”اس نبی نے اس مقصد کے لیے ایک اونٹ پالا تھا۔ اس اونٹ کی گردن سے ایک کتاب باندھی گئی اور اسے ایک نواحی جنگل میں پہنچا دیا گیا۔ جب لوگ ایک بڑے معجزے کی توقع میں جمع ہو گئے تو اس اونٹ کو چھوڑ دیا گیا۔ یہ اونٹ سیدھا اس نبی کے پاس پہنچا اور دوڑانو ہو گیا۔ اس نبی نے اونٹ کی گردن سے کتاب کھولی، چند اسباق پڑھے اور پھر استعجاب کے ساتھ کہا، یہ اونٹ تو ہمارے لیے ہمارا قانون (شریعت) لایا ہے تاکہ ہم اس پر کار بند ہوں۔“ (حوالہ بالا، صفحہ ۲۲۸)

اسی ڈرامے کو ہلدے برت (طوس کے اسقف اعظم متوفی ۱۱۲۳ء) نے بھی دہرایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس میں ہر کارہ اونٹ کی جگہ تیل ہے۔ ایک تیسری کہانی میں اونٹ اور تیل کا کردار گدھے سے ادا کرایا گیا۔ وحی کا تسخیر اڑانے کے لیے طرح طرح کی کہانیاں بیان کی گئیں۔ کبوتر کا افسانہ اور بیماری کی داستانیں اسی تسخیر کی کڑیاں ہیں۔ جب وحی کا وجود ہی تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس وحی پر پڑی کتاب کیسے صحیفہ آسمانی ہو سکتی ہے۔ لہذا الکتاب کسی نہ کسی نے مدون کی ہوگی۔ اسکی تدوین کا سہرا عیسائی تئیس سر جینس کے سر باندھا گیا، جو کلیسا سے منحرف ہو گیا تھا، اور انتقاماً اس نے اپنی تحریر کے بل بوتے پر ایک رقیب مذہب پیدا کر دیا۔ یہ انداز نظر

مستشرقین میں بھی کسی نہ کسی رنگ میں پایا جاتا ہے۔ قرآن کے دنیاوی ماخذ کی تلاش، اسے انجیل کا چرہ قرار دینا اور اسلام کو عیسائیت سے متاثر ثابت کرنے کی کوششیں اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

حرماتوں کے فسانے

مغربی معاشرے میں شراب اور خنزیر جائز تھے۔ جبکہ اسلام نے ان دونوں اشیاء کو حرام قرار دیا ہے۔ فطرتاً مغربی ذہن میں اس کے سبب کے بارے میں تجسس پیدا ہوا۔ جب ان کے ذہن رسا کونا کامی ہوئی تو چند قصے کہانیاں گھڑ ڈالیں۔ یہ من گھڑت کہانیاں اس قدر مستند تھوڑی گئیں کہ تاریخ کے صفحات کی زینت بن گئیں۔

حرم خنزیر: ملکہ الزبتھ کے دور کے ایک عیسائی مبلغ ہنری اسمتھ کے حوالے سے راجر وندور نے حرم خنزیر کے بارے میں تحریر کیا، (نعوذ باللہ)

”ایک شام... اپنے محل میں شراب سے مخمور بیٹھا تھا کہ اسے اندازہ ہوا کہ اس پر اسکی بیماری کا دورہ پڑنے والا ہے، لہذا تیزی سے اٹھ کر روانہ ہوا۔ بہانہ یہ بنایا کہ اسے فرشتے سے گفتگو کرنے کے لیے بلایا جا رہا ہے، لہذا کوئی اس کے پیچھے نہ آئے مبادا وہ فرشتے کو دیکھتے ہی ختم ہو جائے۔ اس خیال سے کہ کہیں گرنے سے چوٹ نہ آجائے وہ گوبر کے ایک ڈھیر پر چڑھ کر بیٹھ رہا، جہاں سے وہ اس حالت میں لڑھکتا گرا کہ دانت پر دانت جھمکے ہوئے تھے اور منہ سے کف جاری تھا۔ یہ دیکھ کر وہاں پر موجود بہت سارے خنزیر دوڑ کر حملہ آور ہوئے، اور تکتہ بوئی کر کے اس کا خاتمہ کر ڈالا۔ اسکی بیوی اور اہل خانہ نے جو شور مچا تو دوڑے اور اپنے آقا کی لاش اس حالت میں پائی کہ اسکا بیشتر حصہ کھایا جا چکا تھا۔ بچے کچھ اعضا کو انہوں نے یکجا کر کے ایک تابوت میں بند کیا، جو سونے چاندی سے گھڑا گیا تھا اور یہ اعلان کیا کہ اللہ کے فرشتوں نے اسکا بدن مشکل سے ہی زمین پر چھوڑا ہے، اور اسکی روح کو خوشی خوشی آسمانی مسرتوں سے ہمکنار کر دیا گیا ہے۔“

(Roger of Windover; Flowers of History, Vol.1, p.74)

ایک دوسرے محترم پوپ نے حرم خنزیر کی توجیہ پیش کرتے ہوئے لکھا،

”دیکھو کہ..... نے انہیں خنزیر کے استعمال سے آخراً منع کیوں کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک دن اس نے زمین میں پانی کے کچھ برتن پوشیدہ کیے، تاکہ موسیٰ کے معجزوں جیسا کوئی معجزہ دکھا سکے اور یہ باور کرا سکے کہ وہ بہت بڑا نبی تھا۔ تو ہوا یوں کہ اس جانور نے جوز مین کھودا ہی کرتا ہے، ساری کرامت پر پانی پھیر دیا۔“

(Father Jerom Dandini: A Voyage to Mount Libanes, Ch. VIII)

حرم سگ: ایولوگس (متوفی ۸۵۹ء) نے لکھا، (نعوذ باللہ)

”جب اسے احساس ہوا کہ موت قریب ہے تو اس نے پیشینگوئی کی کہ اس کی موت کے تیسرے دن فرشتے آ کر اسکا جسد آسمان پر لے جائیں گے۔ جب اسکی روح واصل جہنم ہوگئی تو اسکے معتقدین اسکی لاش کے پاس بیٹھ کر

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

انتظار کرنے لگے لیکن جب کوئی فرشتہ نہ آیا تو معتقدین نے یہ سمجھا کہ شاید انکی موجودگی آسمانی مہمانوں کی آمد میں مغل ہے۔ لہذا لاش کے (جو بگڑ کر متعفن ہوگئی تھی) پاس سے ہٹ گئے۔ اس کے بعد آسمانی فرشتوں کی جگہ کتے پہنچے، جنہوں نے لاش کو چیرنا پھاڑنا شروع کر دیا۔ جو کچھ باقی بچا اسے مسلمانوں نے دفن کر دیا۔ اسی حرکت کے باعث مسلمان کتوں سے انتقام لینے کے لیے ہر سال انکا قتل عام کرتے ہیں۔ اور یہ ہیں..... کے معجزات۔“

(Quoted by R.Dozy; Spanish Islam, pp.79-80, translated by F.G.S.Stokes)

حرمت شراب : جان مانڈیول نے حرمت شراب کی تاویل میں مندرجہ بالا انداز کی ہی ایک اور کہانی پیش کی۔ اس نے لکھا:

”اور..... کو ایک نیک راہب سے محبت تھی۔ یہ راہب ایک صحرا میں رہتا تھا۔ اکثر و بیشتر..... اپنے لوگوں کے ساتھ اس راہب کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہ اور اس کے آدمی رات رات بھر شوق سے اس کی باتیں سنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس کے آدمیوں نے سوچا کہ اس راہب کو قتل کر ڈالیں۔ ایک رات ایسا ہوا کہ..... نے عمدہ شراب پی اور سو گیا۔ اس کے آدمیوں نے..... کی تلوار لی اور اس راہب کو قتل کر کے خون آلودہ تلوار میان میں واپس رکھ دی۔ صبح جب راہب کو مردہ پایا تو..... غم و غصہ میں اپنے آدمیوں کو قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن سب کے سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ خود اسی نے تو راہب کو نشے کے عالم میں قتل کیا تھا۔ اور ثبوت کے طور پر اسکی خون آلودہ تلوار دکھائی۔ تب اس نے شراب اور اسکے پینے والوں پر لعنت بھیجی۔“

(John Maundeville, 'Travels', Chapter Xil, pp.140-141)

فادر جیروم نے حرمت شراب کی ایک اور وجہ تحریر کی۔ اسکے مطابق،

”..... ایک مرتبہ ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ اس کے ہمراہ اسکے کئی سپاہی بھی تھے۔ انہوں نے شراب پینے کے لیے رقم طلب کی۔ لیکن اس نے انکار کیا۔ کیونکہ شراب پی کر وہ اسے مجبور کرتے کہ گاؤں کی عورتوں کو تصرف میں لانے کی اجازت بھی دے۔ چونکہ وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا یا کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے اس نے شراب کو ہی حرام قرار دے دیا۔“ (Father Jerom Dandini; A Voyage to Mount Libanes, Ch. VIII)۔

کاش ان خرافات کو نظر انداز کیا جاسکتا لیکن معاملے کی نوعیت اور اسکی سنگینی کا تقاضہ یہ ہے کہ مغربی کارنامے بلام و کاست نقل کیے جائیں۔

داعی اسلام ﷺ

کائنات کی کوئی اور شخصیت اس قدر موضوع گفتگو نہیں بنی، جس قدر کہ سرور کائنات ﷺ کی ہمہ پہلو شخصیت۔ عالم اسلام میں قلم انکے عشق و مستی میں سرشار تو عالم عیسائیت کا قلم بغض و عناد میں ڈوبا ہوا۔ ابو جہل و ابولہب نے اگر انہیں شاعر و ساحر و مجنون و مفتون قرار دیا تو صادق و امین و حلیم و کریم بھی تسلیم کرتے تھے۔

انہیں مغرب کی نظریں عرب جاہلیہ کے تعادل سے بھی عاری تھیں۔ انہیں سوائے قبیح کے کوئی حسن نظر ہی نہیں آیا۔ اپنی پورے پستی کو وہ انکی شخصیت کا عکس سمجھے۔ اپنی ذہنی قبیح کو الفاظ میں ڈھالا اور اسے سیرت نگاری تصور کرتے رہے۔ یہی مناقشت کو مذہبی مسئلہ بنانے کے باعث سیاسی اختلافات نے مذہبی رنگ اختیار کیا۔ سیاسی دشمنی مذاہب کی دشمنی بن گئی۔ اسلام کو عیسائیت کا دشمن اور داعی اسلام کو بانی عیسائیت کا مخالف قرار دیا گیا۔ عیسائیت کی بقا کے لیے اسلام کو نیست و نابود کرنا ضروری سمجھا۔ کرائسٹ کی عظمت کے اظہار کے لیے مفروضہ دشمن مسیح پر تہز الازی ہوا۔ جب بنیادی غلط مفروضوں پر پڑی تو نتائج کا کریمہ ہونا لازمی تھا۔ عیسائیت کے بانی کو اگر الہ کا درجہ حاصل تھا تو داعی اسلام ﷺ کو بھی مدعی الوہیت تصور کیا گیا۔ اگر انکا خدا حقیقی تھا تو اسکے مقابلے میں خدائی کا دعویٰ کرنے والا صرف جھوٹا خدا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ مابہر زمان و مکاں سے آزاد، اٹلیس سے بھی بڑا طاغوت نظر آتا ہے۔

مرور زمانہ کے بعد جب مغرب کے علم میں یہ بات آئی کہ داعی اسلام الہ نہیں، صرف عبد و رسول ہیں، تو انہوں نے اپنی تصحیح کی۔ مافوق البشر مابہر زمانہ پروردہ چلا گیا، اور اب جو کردار انکے اسٹیج پر لایا گیا وہ گوشت پوست کا مابہر زمانہ تھا۔ جس کی پوری زندگی از مبداء تا آخر سرفریب تھی۔

سلسلہ نسب: مورخ میتھیو پیرس نے ایک لمبا چڑا سلسلہ نسب فراہم کیا ہے اس کی ابتدا حضرت اسماعیل سے کی۔ اٹھائیسویں پشت میں حضور ﷺ کے ایک ہمنام کا ذکر کیا، اور پھر انکی اولاد میں ترتیب وار عبد شمس، ہومئلا، ایلزار، اکفان، مورکن، عبد الملب، عبد الرحمن (یہی عبد میمنف بھی کہلاتے تھے) کا تذکرہ کیا اور یہ دعویٰ کیا کہ آخرا لڈ کر حضور ﷺ کے والد تھے۔ (Mathew Paris; English History, pp.14,28)

والدین: پیٹر ہیلن ایک سیاح گزرا ہے جس نے اپنے ہموطنوں کی ضیافت طبع کے لیے حسب ذیل ہرزہ سرائی کی ہے: (نعوذ باللہ)

”یہ..... اطراپ (Itrarip) میں ۷۷۵ء میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ کٹر بت پرست اور والدہ توہم پرست یہودن تھی۔ ایسے معزز جوڑے سے ایسا ہی خدا پرست شیطان پیدا ہو سکتا تھا، جیسا کہ.....“

-(Peter Heylyn; A Little Description of the Great World, p.606)

حلیہ: پیٹر مذکور نے اپنی ذہنی پستی کو ان الفاظ کا سہارا دیا: (عیاذ باللہ)

”..... پست قد، گھنجے سر، بد بخت تھے۔ بد کرداروں میں پائی جانے والی تمام شیطانی صفات کے حامل، انتہائی چور پن اور بچہ عیاش“۔ (حوالہ بالا)

مولد: پیٹر مذکور نے اطراپ (غالباً یثرب) کو مولد قرار دیا تو راجروئنڈ ورنے انہیں صوبہ خراسان کا باشندہ بتلایا۔ (cf. Roger Wendover; Flowers of History, Vol. 1, p. 73)۔ رومن دی ماہومت کے مصنف نے انہیں ایدوم کے ایک کسان کا فرزند تحریر کیا۔ (Quoted by Henry Stubb; Rise and)

(Progress of Mahomatenism, p.220] بہت سے دیگر وقائع نگاروں نے انہیں شامی اور رومی تصور کیا۔

راہب کی پیشینگوئی: رومن دی ماہومت کے مطابق 'عبد مہیث' کی ملاقات ایک راہب سے ہوئی جس نے یہ پیشینگوئی کی کہ ماہومت کے باعث شریعت عیسوی سخت بحران میں مبتلا ہوگی۔ اور ایک جھوٹی شریعت انکے توسط سے پروان چڑھے گی۔ (حوالہ بالا)۔

مشاغل: ابتدائی تحریروں میں انہیں دربار روم سے منسلک بیان کیا گیا ہے۔ وہ عیسائی تھے جنہیں پوپ بننے کی آرزو تھی۔ (cf. Phillips K.Hitti; Islam and the West, p.52)۔ جب یہ آرزو پوری نہیں ہوئی تو شام کی جانب رخ کیا۔ اس پر کسی نہ کسی طرح قبضہ کیا اور ایک نیا مذہب رائج کیا۔

فوجی ملازمت: ہنری اسٹب سترہویں صدی کے مصنف ہیں۔ انہوں نے اس دور میں اخلاقی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نہایت بے باکی سے مغربی انداز نگارش کی مذمت کی۔ ممکنہ حد تک ان الزامات کی تردید کی جو ان کے عہد میں داعی اسلام سے منسوب کیے جاتے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے حضور ﷺ کے مشاغل میں رومن فوج کی ملازمت کو ٹریک کیا ہے۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جو واقعات انہوں نے بیان کیے ہیں، وہ تاریخی حقیقت سمجھ کر بیان کیے ہیں، جنہیں قبولیت عامہ حاصل تھی۔ موصوف نے لکھا:

”ان کے فوجی ذوق و صلاحیت نے انہیں نچلا نہیں بیٹھنے دیا۔ چونکہ ان کے ہم وطنوں میں بہت سے لوگ عیسائی فوج میں ملازمت کرتے تھے، وہ بھی اپنے چچا ابوبکر کی ماتحتی میں، جو عیسائی فوج کی بریگیڈ کے کمانڈر تھے، فوج میں شامل ہو گئے۔ یہیں انہوں نے فوجی اور انتظامی حکمت عملی سیکھی، اور عیسائیوں کے افتراق اور کمزوریوں کا پتہ چلایا۔“

(Henry Stubbs; Rise and Progress of Mahomatenism, p. 218)

سفر اسپین: اسٹب نے حضور ﷺ کی سیاحت کی تفصیلات بھی تحریر کی ہیں۔ ان کے بموجب انہوں نے نہ صرف اسکندریہ اور مصر کے دیگر حصوں کی سیاحت فرمائی بلکہ افریقہ کے دور دراز علاقوں کا بھی سفر کیا۔ جہاں سے گزر کر ۶۰۵ء میں اسپین پہنچے۔ وہاں ملک میں شدید بے چینی پائی۔ وہاں کے حالات درست کرنے کے لیے اپنے عقائد کی ترویج کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سینٹ اسی دور (Saint Isidore) کی روم سے واپسی کی بدولت مراجعت کرنی پڑی۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۷۵)

شادی: حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شادی کی مختلف روایات ملتی ہیں۔

رومن دی ماہومت میں انہیں اچھا قلمساز (Good Clerk) بتایا گیا ہے، اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ جس رومن امیر کے یہاں ملازم تھے، اس کی موت کے بعد اس کی بیوہ کو ورغلا کر اس سے شادی کی۔ شادی کے دن مرگی کا دورہ پڑا جسے نزول وحی کا نام دیا گیا۔ کتاب کے مطابق وہ مکہ کی حوالی میں اپنے شتم و خدم کے ساتھ رہائش پذیر تھے اور ان کے قبضے میں منتخب جنگلات، چراگاہیں، باغات اور دریا تھے۔ کثرت ازدواج، ختمے کا حکم،

اور رسوم عیسائیت کی مخالفت انکی تعلیمات کا لب لباب تھا۔ انتقال کے بعد انکا جسم ایک دھاتی تابوت میں رکھ کر ہوا میں معلق کر دیا گیا۔

(cf. Roman the Mahomet, Edited by Reinand; Paris, 1831, quoted by Henry Stubb; Rise and Progress of Mahomatenism, p.220)

موزخ راجروندو۔ ور کے مطابق خراسان کی ملکہ قدسیان (Qodison) تھیں۔ سراسین کے نبی کا زب نے ان کی ملکہ کو رجھایا اور مسیحا ہونے کا دعویٰ کیا۔ ملکہ نے اس دعوے سے دھوکہ کھا کر شادی کر لی۔ اس طرح یہود اور سراسین کے گروہ کے گروہ گرد جمع ہو گئے۔ اس موزخ نے صرع کی بے بنیاد کہانی اور وصال کے شرمناک افسانے کو بھی بیان کر کے اپنے اعمال سیاہ کیے ہیں۔

(Roger of Wendover; Flowers of History, Vol.1, p.173)

حصولِ اقتدار: بارہویں صدی عیسوی تک مغرب کے لٹریچر میں داعی اسلام ﷺ کو عیسائی تحریر کیا جاتا رہا، جنہوں نے چرچ سے روکش ہو کر ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ ہلدے برت (Hildebert) نے بھی انہیں عیسائی بیان کیا اور تحریر کیا:

”وہ یروشلیم کا اسقف بننا چاہتا تھا جسکے باعث اس دور کے شہنشاہ نے ملک بدر کیا۔ تب وہ مجوسی لیبیا چلا گیا، جہاں وہ ایک درباری کے گھر مقیم ہوا، جسے اس نے قتل کر ڈالا تاکہ اس کی جگہ خود لے لے۔ لیبیا کے بادشاہ کی موت کے بعد اس نے اعلان کیا کہ جو شخص ایک خاص تیل کو رام کر لے گا وہ ملک کا بادشاہ ہوگا۔ اس سفید تیل کو خفیہ طور پر خود اس نے سدھایا تھا اور اس طرح وہ بادشاہ بن بیٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اسے خدا مان لیں، لیکن خدا نے اسے مرگی کی سزا دی۔ وہ بڑی دردناک موت مرا۔ خنزیریوں نے اسے ہنسنجوڑا، اور اسکا تابوت ہوا میں معلق ہوا۔“

(quoted by Henry Stubb; Rise and Progress of Mahomatenism, p.219)

تیل، اونٹ یا گدھا، مرگی، معلق تابوت، دردناک موت کی کہانیاں مغربی لٹریچر میں تو اتر کے ساتھ ملتی ہیں۔ عیسائی ذہن کی ان خرافات میں، جنکا حقائق سے کوئی واسطہ ہی نہیں، جسقدر کمزور بات ہو سکتی ہیں، سب جمع کر دی گئی ہیں۔ ان کے اہم اجزاء، مثلاً چرچ کے عہدوں کی طلب، چرچ سے اخراج، بدعت، فریب، خون ناحق، بیماری، غاصبانہ قبضہ وغیرہ، سب کے سب عیسائی روایتوں کے عناصر ہیں۔

عیسائیت کے نزدیک کوڑھ، برص اور مرگی ایسے امراض تھے جو آسمانی سزا کے طور پر بدکردار افراد پر مسلط کیے جاتے تھے۔ ایسے افراد کو معاشرے کا ناسور سمجھ کر شہر سے باہر محصور کر دیا جاتا تھا۔

یونانی دیونا میں ایک بدکردار شخص کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ جس کے مرنے کے بعد زمین اور آسمان دونوں نے اسکی لاش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اسکا تابوت ہوا میں معلق ہو گیا تھا۔ معلق تابوت بدکرداری کی علامت بن گیا۔ دھوکے اور فریب کو مقدس ہستیوں سے منسوب کرنا بھی کوئی نئی بات نہیں۔ تورات کی کتاب پیدائش، باب بیس [۲۰]، کے مطابق ابراہیم نے سازش کر کے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

حضرت ایلچی سے حضرت یعقوب کو برکت (نبوت) دلوائی، جو وہ اپنے بڑے فرزند عیسو کو دینا چاہتے تھے۔ اسی طرح باب انیس (۲۹) میں حضرت یعقوب اور ان کے سسرالی رشتہ دار ایک دوسرے کے ساتھ بد معاملگی میں ملوث کیے گئے۔ کتاب خروج باب بارہ (۱۲) کے مطابق، خروج سے پہلے حضرت موسیٰ کے حکم پر بنی اسرائیل نے مصریوں سے ان کے زیورات اور ملبوسات مستعار لیے، اور پھر وہ یہ مال اپنے ساتھ لیکر خروج کر گئے۔ اس طرح انہوں نے مصریوں کو دھوکا دیکر لوٹا۔ غرضیکہ کہ مکرو فریب، دھوکا اور جعل جب خود اپنے مقدس انبیاء سے منسوب کیا جاسکتا ہے تو غیر اس سے کب محفوظ رہ سکتے تھے۔ پھر وہ جھوٹ جو کسی اعلیٰ مقصد کے لیے ہو، انکی اصطلاح میں 'مقدس جھوٹ' کہلاتا ہے، جو ہر کہہ و مہمہ کے لیے جائز تصور کیا جاتا ہے۔

بدعت کا الزام: مغربی لٹریچر میں حضور کو ابتداً عیسائی تصور کیا گیا۔ کبھی دربار روم سے منسلک بتلایا گیا، کبھی اچھا قنیس بیان کیا گیا۔ کبھی پوپ کے عہدے کے طلبگار ٹھہرائے گئے، کبھی یروشلم کے اسقف بننے کے متمنی بنائے گئے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ عام عیسائی نے یہی باور کیا کہ داعی اسلام ﷺ بنیادی طور پر عیسائی تھے، جنہوں نے بعد ازاں ایک نیا مذہب ایجاد کر کے اسے عیسائیت کا رقیب بنا دیا، جو دنیا بھر میں عیسائیت کو زچ کر رہا تھا، تو بلا توقف اسلام کو بدعت اور اس کے داعی کو بدعتی قرار دیا۔ عیسائیت میں بدعتی کا مقام جہنم ہے، اس لیے شعراء نے بلا تکلف جہنم کے مناظر کھینچے اور اس کے اسفل ترین درجے میں ان کا مقام متعین کیا۔ [cf. Phillips K.]

[Hitti; Islam and the West, p.52: also refer Dante's Inferno, XXIII, pp.31-32]

مصریوں نے اس قسم کی تصاویر سے کلیسا کو رنگ۔ ڈرامہ نویسوں نے ڈراموں میں اس قسم کے مناظر دکھائے۔ اطالوی مصوٰ را در کاگنا (Orcagna) نے پیسا میں کیپوسانتو (Campo Santo) میں ایک تصویر بنائی جس میں انہیں جہنم میں دکھایا گیا۔

www.KitaboSunnat.com

ایک نئی گر: تیرہویں صدی کے اختتام تک مغرب کو یہ پتہ چل چکا تھا کہ وہ نہ تو عیسائی تھے نہ رومی، نہ راہب تھے نہ قنیس، تو فنکاروں نے اپنی دروغ بانی میں ترمیم کی۔ اب انہیں ایک بدعتی عیسائی کی جگہ ایک بدعتی قنیس کا آلہ کار کہا جانے لگا۔ یہ ترمیم ہمیں گولڈن لی جنڈ (Golden Legend) میں واضح انداز میں ملتی ہے۔ لی جنڈ میں انہیں نبی کا ذب ہی کہا گیا تاہم پچھلے دروغ کی یوں توجیہ کی گئی،

”در بار روم میں ایک نہایت ہی نامور قنیس تھا، جسے وہاں سے حقیر کر کے نکالا گیا۔ اس کی ملاقات ماہومت سے ہوئی۔ اس نے کہا میں تمہیں تمام اقوام کا آقا اور سربراہ بنا دوں گا۔ اس مقصد کے لیے اس نے ایک کبوتر کو تربیت دینا شروع کیا۔ وہ قنیس ماہومت کے کان میں گیبوں کے دانے رکھتا اور کبوتر کو ان کے کاندھے پر بٹھاتا تاکہ کان سے دانہ چکے۔ جب پرندہ تربیت پا گیا تو اس قنیس نے لوگوں کو جمع کیا اور کہا کہ وہ اُس شخص کو ان پر بادشاہ مقرر کرے گا، جس پر روح القدس کبوتر کی شکل میں نزول کرے گا۔ پھر اس نے خفیہ طور پر کبوتر کو چھوڑا جو اڑتا ہوا سیدھا ماہومت کے کاندھے پر آ بیٹھا۔ لوگوں نے باور کیا کہ یہ روح القدس تھا، جو ان پر نازل ہوا تھا۔ آگے چل کر اس قنیس کا نام سر جینس بیان کیا گیا۔

(Golden Legend; translated by Caxton, 1470, quoted by Henry Stubb;

Rise and Progress of Mohametanism)

لطف کی بات تو یہ ہے کہ یہ کہانی دو ربیوں سے کم و بیش دو سو سال پہلے فادر اتھنا سنس سے منسوب تھی۔ اس پادری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن راہ میں ایک کبوتر اڑتا ہوا اس کے کاندھے پر کان کی طرف آ بیٹھا۔ تثلیث پرستوں (Trinitarians) نے اسے ایک معجزہ قرار دیا، جبکہ ایرین (Arians) فرقے کے لوگوں نے اسے جادو ٹھہرایا۔

کبوتر عیسائیوں کی مذہبی علامت ہے۔ انجیل لوقا، باب چہارم [۴]، جملہ [۲۲] کے مطابق روح القدس کا نزول حضرت عیسیٰ پر کبوتر کی شکل میں ہوتا تھا، جبکہ عربوں اور مسلمانوں میں اس پرندے کی کوئی مذہبی اہمیت نہیں ہے۔ کبوتر کا اس انداز میں استعمال صرف عیسائی ذہن کو ہی متاثر کر سکتا تھا۔ یہ حربہ اس قدر کامیاب رہا کہ کہانی اپنے جھول کے باوجود انیسویں صدی تک دہرائی جاتی رہی۔

(for the fables of dove see;

i) Shakespeare; Henry VI, Part I, Act 1, Scene 2, 140 Sequence

ii) John Sheffield; A dialogue between Mahomet and the Duke of Guise, Vol II

iii) J. Lee; The Life of Mahomet, the famous Oriental Imposter

iv) Lodewik Lloyd; Consent of Time, p.292

v) Phillips K. Hitti, Islam and the West, pp. 54-55)

شیکسپیر جیسا ادیب بھی اس روایت کو دہرانے سے باز نہ رہ سکا۔ مغربی ادیب اس کبوتر کی ذات اور رنگ تک سے واقف تھے۔ کبوتر بازوں نے کبوتروں کی ایک نسل کا نام ہی ماؤمت (Maumet) رکھ دیا تھا۔

معلمین: یہ مسئلہ کہ داعی اسلام ﷺ کے تعلیمی ذرائع کیا تھے، ہر دور میں زیر بحث رہا۔ اور مغرب آج بھی اس مسئلے پر غور و خوض کرتا نظر آتا ہے۔ اگر وحی کو ذریعہ ابلاغ تسلیم کر لیا جاتا تو سارا مسئلہ ہی ختم تھا۔ لیکن بنیادی نکتہ تو یہی تھا کہ داعی اسلام ﷺ کی نبوت ہی ناقابل قبول تھی۔ لہذا اس پہلو کو چھوڑ کر باقی تمام قابل قیاس پہلوؤں پر عقل کے گھوڑے دوڑائے گئے اور وحی کو شیطانی الہامات اور فرشتے کو شیطان ٹھہرایا گیا۔ ابتدائی دور میں انہیں ماہوند تصور کیا گیا۔ پھر جب انہیں بشریت کا مقام دیا تو عیسائی کلیسا کا رکن سمجھا گیا جسکے معنی یہ ہوئے کہ ان کے معلمین کارکنان کلیسا تھے۔ چونکہ اسلامی تعلیمات کی تھوڑی سی عقائد کے منافی تھیں، اس لیے معلمین کا تعلق کسی ایسے فرقے سے رہا ہوگا جو غیر کیسٹووک بلکہ تثلیث سے منحرف تھے۔ اس دور میں ایسا فرقہ نسطوری تھا۔ لہذا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ نسطوری تفسیر سر جینس یا سولیس معلم رہا ہوگا۔ اتفاقاً سفر شام کا واقعہ اکثر مسلمان مؤرخین نے بڑے وثوق سے بیان کیا ہے، جس میں ایک راہب بحیرہ سے ملاقات کا ذکر پایا جاتا ہے۔ تو بحیرہ کے معلم ہونے میں کلام نہیں رہ گیا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ ملاقات صرف ایک مرتبہ اور نہایت مختصر وقت کے لیے بیان کی جاتی ہے، جو

تعلیم و تعلم کے لیے قابل نور نہیں۔ لہذا اس قسم کے معلمین کو عرب میں تلاش کیا گیا۔ لوگوں کی نظریں ورقہ بن نوفل پر پڑیں، جو عبرانی علوم میں ماہر سمجھے گئے۔ قرعہ فال انہی کے نام پڑا۔ بڑے وثوق سے یہ بات کہی گئی، ”ان [خدیجہ] کے ایک چچا ورقہ نامی تھے، جو عبرانی یا شامی زبان جانتے تھے، اور فنی تحریر سے بھی واقف تھے۔ انہیں اس خاتون نے مابہوت کی تعلیم پر مامور کیا۔ قریش میں مشکل سے ہی کوئی ایسا رہا ہوگا جو لکھنا پڑھنا جانتا ہو۔ جلد ہی انہوں نے لکھنا سیکھ لیا جس سے ان کے وقار میں اضافہ ہوا۔“

(Henry Stubb; Rise and Progress of Mohametanism, pp.77-78)

ورقہ کے معلم ہونے کا دعویٰ پوکا کھانے کا بھی کیا۔ مستشرقین نے معلمین کی تلاش میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ انہوں نے [یہ مفروضہ] دریافت کیا کہ زید بن حارثہ عیسائی تھے، اور دن رات حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ اسی طرح حضرت بلالؓ اور ائمہ المومنین ماریہ قبطیہ کے عیسائی ہونے پر زور دیا گیا۔ گواہیں معلم نہیں کہا گیا لیکن ان کے (مفروضہ) قدیم مذہب کی طرف اشارہ کرنے کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ عیسائیت سے ان کے توسط سے واقفیت ہوئی۔ جس امکان کی طرف اشارہ ہے اس پر فہمی آتی ہے کیونکہ حضرت زید بن حارثہ جب حضور ﷺ کی خدمت پر مامور ہوئے تو ان کی عمر صرف نو [۹] سال کی تھی۔ حضور ﷺ نے خود ان کی تربیت فرمائی۔ حضرت بلالؓ عالی مرتبت اصحاب میں سے ہیں، لیکن ان کے علم و فضل کی بابت کوئی ضعیف روایت بھی نہیں ملتی۔ حضرت ماریہ قبطیہؓ ۷ھ میں خدمت نبوی میں تشریف لائیں اور یہ دور کسی بھی صورت میں تعلیم و تعلم کا نہیں سمجھا جاسکتا۔

ہجرت: ہجرت کو اب تک محض فرار تصور کیا جاتا ہے۔ اسے عظیم قربانی کے بجائے محض پناہ گیری کا رنگ دیا جاتا ہے۔ عہد وسطیٰ میں ہجرت کا تصور یہ تھا کہ کسی جرم کی سزا میں ملک بدر کیا گیا تھا۔ چنانچہ موزخ میتھیو بیس نے متعدد الزامات عائد کرنے کے بعد تحریر کیا،

"He seized the camel of Aize Hali and fled to Medina whereupon the inhabitants expelled him from the city".

(Mathew Paris; English History, p.28)

[انہوں نے علی کا اونٹ لیا اور مدینے چلے گئے، جب شہر کے باشندوں نے انہیں جلا وطن کر دیا۔]

ثقت کی گواہی: عالم عیسائیت کے شدید پروپیگنڈے کے باوجود، ایسا لگتا ہے کہ یہ سوال بار بار اٹھا کر آخر لاکھوں انسان داعی اسلام پر ایمان کیوں لائے۔ ابتدائی جواب تو یہ تھا کہ یہ سب کچھ سحر اور جادو کی بدولت ہوا۔ شیطانی اور سفلی قوتوں نے لوگوں کو مسحور کر لیا۔ لیکن جادو اور سحر قوی چیزیں ہوتی ہیں اور ان کے اثرات دیر پا نہیں ہوتے۔ سفلی قوتیں بھی آخر تھک ہار جاتی ہیں۔ ان میں بھی ایسا استحکام نہیں ہوتا۔ لہذا یہ یقین دہانی اپنی اہمیت کھو بیٹھی۔ جب از سر نو یہی سوال اٹھا تو اس کے جواب میں یہی سمجھا گیا کہ یہ سب دھوکے اور فریب کے نتائج ہیں۔ چنانچہ سینٹ جان دشتی نے تحریر کیا، (نعوذ باللہ)

”شہنشاہ ہرقل (Heraclius) کے دور میں ایک کاذب نبی اٹھا، جس کا نام تھا۔ اس نے عبدنامہ قدیم و جدید سے واقفیت حاصل کی اور پھر ایک ایرین راہب سے تبادلہ خیال کے بعد ایک فرقہ قائم کیا۔ مکارانہ پاکبازی کے ذریعے اس نے اپنی قوم کے دل جیت لیے۔ بعد میں اس نے دعویٰ کیا اس کے اوپر آسمان سے ایک صحیفہ نازل ہوا ہے۔ اُن تمام مہمل اور مضحکہ خیز احکام کو، جو اس نے اس کتاب میں تحریر کر رکھے تھے، اپنی قوم کے لیے مقدس تعلیمات قرار دیا۔“ (Von Grunebaum; Mediaeval Islam, p.43)۔

سینٹ جان نے یہ خاکہ آٹھویں صدی عیسوی میں فراہم کیا تھا۔ اس کی یہ پریشان خیالی مغرب کے بڑے کام آئی۔ اس کے ایک ایک جملے کے ثبوت میں مغرب نے فرضی قصے گھڑے، اور انہیں تاریخی حیثیت دی۔ نزول صحیفہ سے متعلق لغویات ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ حرمت خنزیر و حرمت شراب کی توجیہات بھی نظر سے گزر چکیں۔ ایرین اور نسطوری معتمدین کی روایات اور انجیل و تورات سے واقفیت کے دعوے، سب سینٹ جان کے اجمال کی تفصیل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مغرب نے تکذیب نبوت اور مکارانہ پاکیزگی کے ضمن میں جو کارنامے انجام دیے ہیں، انکی تفصیل نہایت کر بناک ہے۔ اگلے کمر و فریب کا کچھ اظہار، کبوتر کی کہانی، سفید بیل کے افسانے، شادی کی روایات اور ہجرت کے بارے میں لغویات سے ہوتا ہے۔ نبوت کی تکذیب کے لیے مغرب نے خود شیطان سے رابطہ قائم کیا، اور اسے مجبور کیا کہ وہ حقیقت کا اعتراف کر لے۔ شیطان کی بھلا کیا حیثیت تھی۔ ایک مقدس پادری اور عیسائی مبلغ ہنری اسمتھ کے روبرو اسے یہ اقرار کرنا ہی پڑا کہ (نعوذ باللہ) ”قرآن میں صرف بارہ ہزار [۱۲۰۰۰] جھوٹ ہیں، اور باقی سب سچ ہے۔“ [The Works of Henry Smith; Vol II, pp.]

[404-412, edited by J.C.Miller, Nicholl's Series of Standard Devine)

شیطان کے اقرار کے بعد مبلغ مذکور کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ تحریر فرماتے ہیں، (نعوذ باللہ) (حوالہ جالا)

"Their is no evidence to prove Mahomet a true prophet, many prove him to be a false prophet, and blasphemous and presumptuous, and his religion to be a wicked, cruel, absurd and false religion, proceeding from a proud spirit, and human, subtle, corrupt invention, and even from Devil, the crafty father of lies, a murderer and a man killer from the beginning".

[ماہومت کے سچے نبی ہونے کے بارے میں کوئی شہادت نہیں ہے جبکہ اس کے جھوٹے نبی، اہانت کنندہ اور حد سے زیادہ خود اعتماد ہونے کی کئی ہیں۔ اسی طرح سے اس کے مذہب کے گندے، ظالم، مضحکہ خیز اور جھوٹے ہونے کے بارے میں بھی ہیں، جو شیطان کی اعانت سے ایک مغرور روح کی، انسانی، خام اور بد عنوان ایجاد ہے۔ جھوٹ گھڑنے والوں کا باپ، قاتل اور اہتا سے انسان گُش تھا۔]

ایلیزینڈر اس ایک اور مسیحی پادری تھے، جنہیں فرانسیسی زبان سے انگریزی میں قرآن کا ترجمہ کرنے کی اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے ترجمے کے ساتھ ایک دیباچہ بھی شریک کیا۔ اس میں جہاں کہیں انہیں موقع میسر آیا، اسم گرامی کے ساتھ اسم توصیفی ضرور استعمال کیا۔ مثلاً، (نعوذ باللہ)

"The Great Arabian Imposter, the Little Horn in Daniel, Arabian Swine, Goliath, Great Hypocrite, Great Thief, Thieving Carcus, The Great Destroyer as his name signifies". (cf. Ross; 'A Needful Caveat', appended to the translation of the 'Al-Koran of Mahomet')

[ترجمہ دانستہ چھوڑ دیا گیا ہے۔] اسی قبیل کے اوصاف موصوف نے الکتاب [قرآن] کے بھی بیان کیے۔ ڈاکٹر اسٹب کے توسط سے ہمیں یہ پتہ چلا کہ مغرب میں سترہویں صدی عیسوی میں کنوئیں کی بھی ایک کہانی رائج تھی، جسکے مطابق، (نعوذ باللہ)

"..... نے اپنے گھریلو ملازم کو شاہراہ پر واقع ایک کنوئیں میں چھپنے کی ہدایت یہ کہہ کر دی کہ جب وہ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ وہاں پہنچیں تو ان کی رسالت کی گواہی بلند آواز سے دے۔ جب تعمیل حکم ہو چکی تو..... نے اس غیبی شہادت پر خدا کا شکر ادا کیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اس کنوئیں کو پر کر کے اس معجزے کی یاد میں اس پر ایک مسجد بنائی جائے۔ اور یوں وہ غریب پتھروں میں (زندہ) دفن کر دیا گیا تاکہ فریب کا پردہ چاک نہ ہو سکے۔

(quoted by Nick Earl; 'Culture and Greed', p.65)

دورِ دانش

ساتویں صدی تا سولہویں صدی کے دور کو مغرب زمانہ جاہلیت کا نام دیتا ہے۔ سترہویں صدی سے یورپ کا دورِ دانش شروع ہوا۔ اس دور میں پروپیگنڈے کو بھی معقولیت کی جانب موڑا گیا۔ زمانہ جاہلیت کے بھونڈے پروپیگنڈے کی تصحیح کی گئی۔ پرانی شراب نئی بوتلوں میں منتقل کی گئی۔ مثال کے طور پر مشہور مصنف فرانس بیکن (Francis Bacon) نے 'جرات' کے عنوان سے ایک ایسا وضعی واقعہ تحریر کیا جسے عیسائی دنیا میں ضرب المثل کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس نے لکھا:

"..... نے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ وہ ایک پہاڑ کو اپنے پاس بلائیں گے۔ اور اس پہاڑ کی چوٹی سے اپنی شریعت کے متبعین کے لیے دعا کریں گے۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو..... نے پہاڑ کو بار بار آواز دی کہ وہ ان کے پاس آئے، اور جب پہاڑ بے حرکت کھڑا رہا تو پشیمان ہونے کے بجائے یہ کہا کہ اگر پہاڑ..... کے پاس نہیں آتا تو..... خود پہاڑ کے پاس جائیں گے۔" (Works of Francis Bacon; Vol II, p.279)۔

مندرجہ بالا اندازِ نظر خالص مسیحی ہے، جو فرانسس بیکن نے بڑے شاطرانہ انداز میں داعیِ اسلام سے منسوب کر دیا ہے۔ عیسائیت اپنے ابتدائی دور میں بڑے یقین کے ساتھ آسمانی حکومت کی آمد کی منتظر تھی۔ لیکن جب آسمانی حکومت کے آثار نہ پائے گئے تو اس کی توضیح یہ کی گئی:

"Jesus had been misunderstood. If the Kingdom of Heaven was not coming to man, then man must be going to the Kingdom of Heaven."

ایسوع کو غلط سمجھا گیا تھا۔ اگر آسمانی بادشاہت انسان کے پاس نہیں آ رہی تو انسان کا آسمانی بادشاہت کی طرف جانا لازمِ بھہر چکا ہے۔ [

تکذیبِ نبوت کی مہم نہایت قدیم تھی۔ اس مقصد کے لیے بائبل کو پوری طرح سے استعمال کیا گیا۔ بائبل میں ملنے والے الفاظ کھینچ کر ان کو اسلام اور داعیِ اسلام ﷺ پر چسپاں کیے گئے۔ عہد نامہ قدیم کی کتاب دانیال اس معاملے میں بڑی کام آئی۔ دانیال نے خواب میں چار درندے دیکھے۔ ان میں چوتھا درندہ نہایت ہولناک اور زبردست تھا۔ اس کے دس سینگ تھے۔ پھر ایک چھوٹا سینگ نکلا، جس نے تین سینگ اکھاڑ پھینکے۔ اس سینگ میں انسان کی سی آنکھیں تھیں اور ایک منہ تھا، جس سے گھمنڈ اور غرور کی باتیں نکلتی تھیں۔ اس سینگ کے بارے میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کہ یہ مقدسوں سے جنگ کرتا رہے گا، جبکہ 'قدیم الایام' آ کر مقدسوں کا انصاف نہ کرے۔ (کتاب دانیال، باب ۷، ۱-۲۵)۔ چھوٹے سینگ کے بارے میں تحریر ہوا کہ وہ دس بادشاہوں کے بعد گیارہواں بادشاہ ہوگا، جو تین بادشاہوں کو زیر کرے گا۔ حق تعالیٰ کے مقدسوں کو تنگ کرے گا اور شریعت کو بدلنے کی کوشش کرے گا۔ ایک دور، دو دور اور آدھا دور اس کے حوالے کیے جائیں گے۔ تب عدالت قائم ہوگی اور سلطنت اس سے لے لی جائے گی۔

اس خواب کی تعبیر مغرب کو اسلام کی شکل میں نظر آئی۔ چوتھے درندے کے اعداد [۶۶۶] بنتے تھے، جو اسمِ گرامی کے حسب ذیل املا کے پورے کیے گئے۔

(MAOMETHS; M=40, A=1, O=70, M=40, E=5, T=300, H=10, S=200;
40+1+70+40+5+300+200=666)

نیز چھوٹے سینگ کی پھبتی بھی کسی گئی، جیسا کہ اوپر الیگزینڈر اس کے حوالے میں آچکا ہے۔ قبلِ اسلام جب روم، عیسائیت پر بلائے بے درماں بنا ہوا تھا، تو عیسائی بزرگوں نے روم کو بائبل کا شفی اور قیصر روم کو خواب کے درندے کا نام دیا، اور نمبر [۶۶۶] الاٹ کیا گیا۔ مکروہ تشبیہات عیسائی ادب، یہاں تک کہ آسمانی کتب میں بھی معیوب نہیں سمجھی جاتیں۔ روم کو پال اور سینٹ پیٹر کے دور میں مادرِ مشفق سمجھا جاتا تھا، لیکن جلد ہی یہ انداز بدل گیا، اور سینٹ جان نے اپنے مکاشفہ میں روم کو میسوا بنادیا۔ روم کے بارے میں تحریر کیا،

”میں تجھے اس بڑی کسی کی سزا دکھلاؤں جو بہت سے پانیوں پر بیٹھی ہوئی ہے اور جس کے ساتھ زمین کے بادشاہوں نے حرام کاری کی، اور زمین کے رہنے والے اسکی حرام کاری کی لے سے متوالے ہو گئے۔۔۔۔۔ ایک سونے کا پیالہ مروبہات یعنی حرام کاریوں کی ناپاکیوں سے بھرا ہوا اسکے ہاتھ میں تھا۔“
(مکاشفہ یوحنا، باب ۱۷، ۲-۴)

سینٹ جان کی نظر میں رومی شہنشاہ، ظن اللہ سے درندہ، بلکہ دانیال کے خواب کا درندہ (The Beast) بن گیا تھا۔

اس نے لکھا، ”جو سمجھ رکھتا ہے وہ اس درندے کا عدد گن لے کیونکہ وہ آدمی کا عدد ہے، اور اس کا عدد چھ سو چھیاسٹھ [۶۶۶] ہے۔“ (مکاشفہ یوحنا، باب ۱۳، ۱۸)
علمائے مسیحی اس امر پر متفق ہیں کہ اس درندے سے مراد تیسرے روم ہے۔

"One thing is certain, that mainly it refers to the Caesar, who has made himself into a God. If the enigma is conceived into Greek, the values of the letters of the word 'Lateinos' will give [666]. If it is conceived in Hebrew the value of the letters in the words 'Neron Qesar' will add up to the required figure. In either case it is the same person, that is meant".

(Warner Stark; The Sociology of Religion-- A study of Christianity, Vol.3, p.3)

پس عیسائیت کا یہ دستور رہا ہے کہ جس شہر سے وہ متغیر ہوں اسے بابل، اور جس مقتدر سے انہیں خوف و نفرت ہو اسے [۶۶۶] کے اعداد والا درندہ کہتے ہیں۔ یہی طرز عمل انہوں نے داعی اسلام ﷺ کے ساتھ بھی روا رکھا۔

مغرب کا ایمان تھا کہ حق و صداقت، روحانی پاکیزگی، خالق سے ربط اور نجات صرف عیسائیت کے لیے مختص ہے۔ باقی مذاہب نیم پختہ، نامکمل، ضلالت و گمراہی اور ابھام ہیں۔ اس ذہنی تیقن کے ساتھ دورِ دانش میں مغرب نے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ تیقن نہ ہوتا تو شاید کلیسائے مغرب کو اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرنے کے لیے ۱۹۶۵ء تک کی مہلت درکار نہ ہوتی۔ (تاریخ عیسائیت میں پہلی بار کیتھولک کلیسا نے دوسری وٹیکن کونسل کے بعد ۱۹۶۵ء میں یہ اعتراف کیا، کہ اسلام میں بھی حقانیت پائی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں عالم عیسائیت میں اعلیٰ سطح پر اسلام کے ساتھ ماضی میں گئی نا انصافیوں کا ازالہ کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ وٹیکن کے غیر مسیحی امور کے دفتر (Office for Non-Christian Affairs) نے ایک ضخیم دستاویز شائع کی ہے جس میں قارئین کو ہدایت کی گئی ہے کہ ماضی سے مننے والے فرسودہ تصورات اسلام کو فراموش کر دیں۔ ماضی کے پرتشدد و تعصب کا احتساب کریں اور توحید کے پرستاروں میں یگانگت پیدا کریں۔ اس اتحاد کی جانب خود پوپ نے پیشقدمی کی اور ۱۹۷۴ء میں اپنے نمائندے شاہ فیصل کی خدمت میں بھیجے۔ چھ ماہ بعد پوپ پال ہشتم نے وٹیکن کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

میں سعودی علماء کے وفد کا استقبال کیا۔ اسکے بعد جامعۃ الازہر اور یٹیکن آفس کے وفد کا بھی تبادلہ ہوا۔ (ملاحظہ ہو ڈاکٹر بوکانی، بائبل، قرآن اور سائنس کا دیباچہ، ۱۹۷۹ء)۔ اس تیقن کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں ہر وہ پہلو دلنشین نظر آیا جس سے کراہت محسوس ہو اور ہر وہ پہلو جو حسین تھا داغ دارغ کیا گیا۔ داعی اسلام ﷺ کا عظیم ترین اور اہم ترین وصف نبوت تھا۔ دورِ دانش کے اہل قلم نے بے سرو پا کہانیوں کو ترک کر کے سارا زور انکی نبوت کی تردید پر صرف کیا۔ لینکلنٹ ایڈیسن (Lanclot Adison) نے ۱۷۹۱ء میں لندن سے ایک کتاب

[The First State of Mahometism or an Account of the Author and]
[Doctrine of that Imposter] شائع کی۔ اسمیں اس نے شعوری طور پر فرضی اور مضحکہ خیز کہانیوں سے گریز کیا۔ تاہم گستاخی اور دریدہ دہنی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

ایڈیسن کے ہم عصر ہمفری ے پریڈو (Humphrey Predaux) نے، جو ناروے کا ڈین تھا، حیاتِ طیبہ پر ایک مبسوط کتاب لکھی۔ اس میں اس نے عربی تراجم اور دیگر زبانوں کی مدد سے مواد حاصل کیا، اور تنقیدی طریقہ کار اختیار کیا۔ اس نے کبوتر کی کہانی اور دیگر کہانیوں کو سختی سے مسترد کیا، اور انہیں بے بنیاد اور حقیقت سے مبرا قرار دیا۔ اس نے لکھا، ”ایسی چالیں عربوں کی نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھیں“۔

[Humphrey Predaux; The True Nature of Imposture Fully Displayed in the]
[Life of Mahomet, 8th Ed., p.38]۔ اس کے باوجود کتاب کا موضوع صرف یہ تھا کہ اسلام پر فریب مذہب کا مکمل نمونہ ہے۔ یہ کتاب ایک صدی سے زیادہ عرصے تک معیاری تصوف رکی گئی۔

(Henry Stubb; Rise and Progress of Mohametanism, p.229)

مصلحین اور داعی اسلام : شاعروں، مصوفوں اور مورخین کو اسلام کا جو تصور ملا تھا وہ مسیحی فضلاء سے ملا تھا۔ ہر معاشرے میں مذہبی گروہ حق پرست طبقہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن مغرب کا مذہبی گروہ اسلام کے معاملے میں بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ کیتھولک ارباب کلیسا کے بیانات اور ارشادات نظر سے گزر چکے۔ وہ مصلحین جنہوں نے پوپ اور کیتھولک چرچ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، ان سے توقع ہو سکتی تھی کہ وہ کیتھولک کلیسا کی غلط روش کی اصلاح کریں گے، لیکن اسلام کے معاملے میں انہوں نے پوپ کے نقش قدم سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ مذہبی مصلحین نے اس باب میں جو کچھ کیتھولک کلیسا سے وراثہ پایا تھا، اسے نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اسمیں حسبِ توفیق شیطانی اضافہ ہی کیا۔

لوہر جو پرنسٹن فرقیے کا بانی، پوپ کا دشمن اور کلیسا کا حریف تھا، اسلام اور داعی اسلام ﷺ کے معاملے میں مجسمِ قہر و غضب بن جاتا ہے۔ اس نے کہا،

”شیطان، سراپا اور ترک، سب ایک ہی شے کے مختلف نام ہیں“۔ (حوالہ بالا)۔

مزید ملاحظہ ہو: (حوالہ بالا) (نعوذ باللہ) [ترجمہ دانستہ نہیں کیا گیا]۔

"Oh fie for Shame, you horrid Devil, you damned Mahomet"

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

یہی مصلح گرامی، یسوع مسیح سے التجا فرماتے ہیں کہ،

”القرآن کے مصنف پر آگ اور پتھروں کی بارش فرما“۔ (حوالہ بالا)

جان بیل (John Bale) (متوفی ۱۵۰۳ء) ایک بپش گزرے ہیں۔ پوپ کے سخت مخالف تھے۔

اس کی تحقیر کے لیے انہوں نے پوپ کا موازنہ داعی اسلام سے کیا۔ انکے مضامین کا ایک مجموعہ پایا جاتا ہے۔ اس میں انہوں نے بے شمار انکشافات کیے ہیں۔ لکھتے ہیں،

”روح القدس نے یاجوج ماجوج کا جو ذکر کیا ہے، اس سے کوئی اور نہیں، بلکہ صرف پوپ اور.....، اور انکی بدقماش نسلیں مراد ہیں“۔ اس نے مزید لکھا کہ:

”رومی پوپ اور..... کی چالیں اسقدر شاندار ہیں کہ انکے متبعین انہیں فرشتہ نور تصور کرتے ہیں۔ انکی عبادت گاہیں نہایت مقدس تصور کی جاتی ہیں، جبکہ دونوں ہی اپنی مکروہ تاریکیوں کے ساتھ جحیم شیطان ہیں“۔ اس نے مزید تحریر کیا:

”پوپ اپنا درندہ خود تخلیق کرتا ہے۔ وہ مہا پجاری ہے۔ وہ پیٹر کا ہمسرہ ہے۔ وہ غلطی سے مبرا ہے۔ وہ اپنے چرچ کا سربراہ ہے اور حجت بانغہ ہے۔ وہ کرائسٹ کا نائب ہے۔ وہ اپنے درندے کے ذریعے لوگوں کو باور کراتا ہے کہ وہ ان کے لیے قانون (شریعت) مرتب کر سکتا ہے۔ انجیل کا پابند کر سکتا ہے اور سلطنتیں تقسیم کر سکتا ہے۔..... بھی تو دعویٰ کرتا ہے کہ وہ عظیم نبی ہے۔ وہی وہ مسیح موعود ہے جسکی بشارتیں دونوں کتب مقدسہ میں آئی ہیں۔ ان دونوں فتنہ پروردوں نے شریعت موسوی، زبور اور انجیل کی تعلیم کو تسلیم کرنے کے باوجود اپنے قوانین (شریعت) مرتب کیے جو ان پر فوقیت رکھتے ہیں۔ پوپ کے قابل نفیس قوانین اور..... کی فاسق کتاب..... وہ لوگوں کا بیدار بخ فتن کرتے ہیں۔ اس طرح اگرچہ وہ بظاہر نہایت پرہیزگار نظر آتے ہیں، لیکن حقیقتاً شیطان کے خبیث نائب ہیں۔“

(Bales Select Works, pp.262,571 Parker Society, 1849)

پروٹسٹنٹ عظام نے جن ہتھیاروں کا استعمال کیتھولک سربراہ پوپ کے خلاف کیا، انہی ہتھیاروں کا استعمال کیتھولک فرقے نے پروٹسٹنٹ فرقے کے خلاف کیا۔

فاضل کارڈینیل پیرون (Peron) نے اس معرکے میں حصہ لیتے ہوئے ایک کتاب Luther's Al-Coran) تصنیف کی۔ انہوں نے لوتھر کی تعلیمات اور قرآنی تعلیمات کی مماثلت میں چالیس [۴۰] نکات پیش کیے۔ اور پھر پروٹسٹنٹ شخصیتوں خصوصاً ہنری ہشتم کا موازنہ ذات نبوی سے کیا۔ اور لکھا کہ،

”یہ تو غنیمت ہے کہ..... اور ہنری، پلومارک فلسفی کے عہد میں نہ ہوئے، ورنہ وہ انکو انسانیت کے نابکار ترین

عفریت قرار دیتا“۔ (Peron Cardinal, Luther's Al-Coran, Part II, p.III)

کارڈینیل مذکور نے ہنری کی بد اعمالیوں کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے تان یہاں یر توڑی کہ،

"The ecclesiastical primacy of the church was never challenged until this 'Mahumetan Henry' through more than Nimrodian avarice, had demolished several thousands of religious houses". (Ibid p.125)

(کلیسا کی مذہبی بالادستی کو محمدی ہنری سے پہلے کبھی کسی نے ضروری ہوں کے ذریعے، ہزاروں دینی مکانات کو مسمار کر کے اس طرح سے نہیں لٹکا رہا تھا)۔

اس موازنہ کے بعد اس کا قلم لوقہ اور سرجنیس کی شخصیتوں کے موازنے کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں کو شیطان کا آلہ کار اور مروجہ دین سے برگشتہ کہا، اور نئے دین کی تعلیمات کی تدوین کا الزام دیتے ہوئے سرجنیس کو القرآن کا مصنف قرار دیا، اور معاشرے کو پروٹسٹنٹ تحریک سے متفر کرنے کے لیے اسے (Gallo Mahumetani) کا نام دیا۔ (حوالہ بالا، پارٹ-۱، باب-۳۱)۔

مناجات: گر جاگھروں میں مناجات اور خطبات میں تہذیبی ایک عام بات ہے۔ ملکہ الزبتھ کے دور کی جو مناجاتیں ضبط تحریر میں آئی ہیں، ان میں جہاں شیطان سے پناہ طلب کی جاتی ہے وہیں ترکوں کا نام بھی آتا ہے۔ پارکرسوسانی نے اس دور کی جو مناجاتیں جمع کی ہیں، اس کی ایک مناجات کے آخری حصے کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ ”لہذا ان وجوہات کی بنا پر وہ (ترک) ہم سے نفرت کرتے ہیں کہ ہم تجھے خدائے پدر مانتے ہیں۔ اور تیرے فرستادہ یسوع مسیح کو تیرا فرزند تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ترک تیرے محبوب ترین فرزند یسوع مسیح پر غضب، عنفیت، ملعون،..... کو برتری اور عظمت دیتے ہیں“۔ (نعوذ باللہ)

(Liturgical Services of the Reign of Queen Elizabeth; p.533)

سیاحوں کے سفر نامے: دورِ دانش میں بے شمار مبلغین اور سیاحوں نے مسلم ممالک کے سفر کیے۔ لیکن جو سفر نامے اور وقائع انہوں نے ترتیب دیے، ان میں وہی قدیم ہرزہ سرائی برقرار رکھی، اور اپنے ہم وطنوں کو باور کرایا کہ اسلام اور داعی اسلام کے بارے میں ان کے قومی تصورات من و عن صحیح تھے۔ یہ تجاہلِ عارفانہ کیوں؟ شائد اس لیے کہ وہ معاشرے کے مروجہ نظریات کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ یا پھر مسیحِ عمد کے پابند تھے۔ اور بہت ممکن ہے کہ انکی سیاحت ہی فرضی ہو۔ لائید لدوک کا سفر نامہ ۱۵۹۰ء میں شائع ہوا جس میں وہی کھسی پنی باتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کا ایک جملہ ہی اندازِ تحریر اور رپورٹنگ کی نوعیت کے اظہار کے لیے کافی ہوگا۔ (نعوذ باللہ) [ترجمہ دانستہ چھوڑ دیا گیا۔]

"This poisoned scorpion and the only plague of Christians vomited his malice". (cf. Lloyd Ludowik; Consent of Time, pp.282-292)

پتیرہ بینن اور الیگزینڈر راس بھی سیاح تھے۔ ان کے حوالے ہم پچھلے اوراق میں دے چکے ہیں۔ اقول الذکر نے والد اور والدہ کا ذکر کرتے ہوئے مکروہ حبیہ بیان کیا اور ثنی الذکر نے بدترین اوصاف کو منسوب کیا۔

اہانت کا ترقی یافتہ انداز

یہ تھی وہ علمی وراثت جو مستشرقین کو اپنے بزرگوں سے ملی تھی۔ انکے اغراض و مقاصد متعین تھے۔ وہ روحانی صلیبی جنگ کے ہراول تھے۔ انکا ذہن مغربی معاشرے کا آئینہ دار تھا۔ انکا مطمح نظر اسلام کو شکست دیکر روندنا تھا۔ لہذا انکے لیے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ غیر جانبداری کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کر سکیں۔ انکی تحریریں ایک خاص مقصد کی پابند تھیں۔ وہ مواد جو انکے کام آ سکتا تھا منتخب کیا گیا۔ وہ صحیح مواد جس سے تحریف و تصرف کا کام لیا جاسکتا تھا، مخ عدا کا شکار ہوا۔ کلبی اور واددی جیسے دروغ گو جنہیں عالم اسلام نے مردود قرار دیا تھا، مستشرقین کے لیے ثقہ ٹھہرے۔ ابن اثق جسے امام مالک نے کاذب قرار دیا تھا مغرب کی نظر میں معتبر ہوا۔ احادیث کے دشاع قابل اعتماد، اور ابن عباس جیسے بزرگ محدث وضع قرار دیے گئے۔

تاہم مستشرقین کی بدولت، اہل مغرب کو اسلام کے بارے میں راست علمی معلومات ملنی شروع ہو گئیں۔ جس کے باعث کم از کم یہ ضرور ہوا کہ علم الاضنام قسم کا مواد اسلام کے باب سے خارج ہونے لگا۔ پوکاک، اسٹب، ہوشنگر، اسکا لچر وغیرہ نے وحوش و طیور کے قصے کہانیوں پر سخت تنقید کی۔ اپنے اہل وطن کو مطلع کیا کہ مسلمان تو حید پرست ہیں، اور داعی اسلام مبنود نہیں بلکہ عبد ہیں۔ حضور ﷺ کی عالی نسب کے خلاف الزامات کو رد کیا۔ فرضی معتمدین کی نفی کی۔ اسٹب نے لکھا کہ اگر کوئی عیسائی قرآن کا مصحف ہوتا تو اس کے لیے الوہیت عیسیٰ سے انکار ناممکن ہوتا۔ جبکہ قرآن انہیں ابن اللہ کے بجائے ابن مریم کہتا ہے، اور اگر کوئی یہودی مصحف ہوتا تو وہ حضرت عیسیٰ کا احترام برقرار نہ رکھ سکتا۔ اس نے پوکاک کے اس دعوے کی بھی تردید کی کہ ورقہ بن نوفل نے (حضور ﷺ کو) عبرانی رسم الخط سکھایا تھا، جس کی مدد سے عربی زبان بھی ضبط تحریر میں آ سکتی تھی۔ اسٹب نے تردید میں یہ دلیل پیش کی کہ صرف رسم الخط سے اگر واقفیت ہو بھی تو محض اسکے سبب قرآن جیسا عظیم کارنامہ سرانجام نہیں پاسکتا۔ اس نے مغربی دریدہ دہی کو بھی اس بنا پر مطعون کیا کہ،

"It is certain that the Christians which lived under the Mahomatens, do mention Mahomet with great respect as Mahomet of glorious Memory, and Mahometan super quo pax and benedictis & C."

(Henry Stubb; Rise and Progress of Mahometanism, p.143)

[یہ بات قطعی ہے کہ جو عیسائی مجتہد یوں کے زیر نگین رہے ہیں، وہ محمد (ﷺ) کا ذکر نہایت احترام سے کرتے ہیں، جیسے عظیم یادوں والے محمد، اور عظیم المرتبت امن اور برکتوں والے محمد، وغیرہ۔]

سترہویں صدی عیسوی یورپ کی تاریخ کا نیا موڑ ہے۔ یہ انقلابی صدی کہلاتی ہے۔ یہ بیجانی دور تھا۔ اس میں بے شمار تحریکیں، قومیت کا احیاء، مذہبی اصلاح، خانہ جنگیاں، اصلاحات کی جدوجہد، سائنسی پیش رفت، آزاد خیالی، فکری تجدد، فلسفہ و اخلاق کا نزاع، سب ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ اس میں

ایسے لوگ بھی نظر آتے ہیں جو مسیحائی اور خدائی کا دعویٰ کرتے تھے۔ ایسے گروہ بھی ابھرے جو حق کے متلاشی ہونے کے دعویدار تھے۔ اسی صدی میں چرچ کا اقتدار بحروح ہوا۔ چرچ کی عدالتیں ختم ہوئیں۔ گرجاؤں میں جبری حاضری کا قانون منسوخ ہوا۔ چرچ کی جائدادوں پر ٹیکس عائد ہوئے۔ چرچ کے قوانین پارلیمنٹ مرتب کرنے لگی۔ عوام پر سے چرچ کے ٹیکس ختم ہوئے۔ حکومت سے چرچ کے اراکین خارج کیے گئے۔ چرچ سے سزائے موت کا اختیار چھین گیا۔ لے دے کر صرف تعلیم اور سفر کے اختیارات چرچ کے پاس رہ گئے۔ یونیورسٹیوں میں بھی آزاد خیالی کی گنجائش پیدا ہوئی۔

ان تبدیلیوں کا یہ اثر ہوا کہ مستشرقین میں بھی چرچ کی پالیسیوں سے اختلاف کی ہمت پیدا ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ سترہویں صدی اور اس کے بعد ایسے اصحاب قلم ملتے ہیں جو حرف حق زبان پر لانے کی جرأت کرنے لگے اور زبان سے اسلام کے بارے میں حقائق کا اعتراف کرنے لگے۔ تاہم صدیوں کے اثرات یکھت ختم نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر کسی نے حق گوئی کی جرأت کی تو معاشرے نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے ادیب بھی اپنی تحریروں میں اہانت کے مرتکب ہوتے رہے اور یہ سلسلہ سترہویں، انھارویں اور انیسویں صدی کے نصف تک مسلسل جاری رہا۔ انیسویں صدی کے نصف سے اس انداز میں واضح تبدیلی ہونے لگی۔

اخلاص: جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں عرض کیا کہ اقبال کا مجذب فرنگی 'گوئے' وہ پہلا فرد نظر آتا ہے جس نے حضور ﷺ کے خلوص سے عاری ہونے کو تسلیم کرنے سے یکسر انکار کر دیا۔ پھر کارلائل نے ایک قدم آگے بڑھایا اور حضور ﷺ کے خلوص بیت کو زنی دلائل سے ثابت کر کے اپنے ہم مذہبوں کو مہربل کیا۔ جس کے بعد خلوص کی مختلف تاویلات کی گئیں۔ کسی نے کہا کہ قرآن ان کے لاشعور کی پیداوار تھا، جسے ان کے خلوص نے وحی تصور رکھا۔ گویا قرآن کو حنیفہ ساوی سمجھنے میں پر خلوص غلط فہمی ہوئی۔ کسی نے کہا کہ جبرئیل کا وجود محض تصور کا پیدا کردہ ہیولا تھا، جسے وہ وجود لطیف تصور کرتے تھے اور عالم استغراق میں محسوس کرتے تھے کہ فرشتہ ہمکام ہے۔ گویا وجود جبرئیل محض وابہ تھا۔ کسی نے کہا کہ عالم جذب طاری کرنے پر قادر تھے، ورنہ قرآن ان کی مرضی کے مطابق کیوں اترتا تھا۔ گویا حصول وحی خود اختیاری نفسیاتی کیفیت تھی۔ غرضیکہ ان تاویلات کے ذریعے یہ کوشش جاری رہی کہ وحی کو غیر حقیقی قرار دیا جائے۔

وحی پر شک و شبہ نہایت قرآن پر شک و شبہ کے مترادف ہے، اور نہایت قرآن پر شک کے بعد منطقی طور پر دین و ایمان برقرار نہیں رہ سکتا۔ مقام رسالت محض معاشرتی اصلاح ہو کر رہ جاتا ہے، جو سراسر ارتکاب اہانت ہے۔

اگر قرآن جیسے عظیم کلام کو ناقدین غیر الہامی قرار دے سکتے ہیں تو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں رہ جاتا کہ عالم انسانیت الہامی کتب سے محروم ہے، کیونکہ پھر قرآن سے کمتر درجہ کی کتب کو بھی الہامی نہیں کہا جاسکتا۔

کردار: ۱۸۷۴ء میں باسور تھ اسمتھ نے رائل انسٹیٹیوٹ آف گریٹ برٹن میں لیکچرز کا سلسلہ شروع کیا جس میں انہوں نے یہ کوشش کی کہ مغرب کو کردار نبوی ﷺ کی عظمتوں سے روشناس کرائیں، اور ان احسانات پر کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

روشنی و ایلیم جو ان کی ذات نے عالمِ انسانیت پر کیے۔ باسوتھ کے معترضین نے ان کی اس پیش رفت پر شدید اعتراضات کیے، جس کے باعث انہیں اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے پیش لفظ میں یہ لکھنا پڑا،

"So many Christian writes, as it seemed to me, had approached Islam only to vilify and misrepresent it, that it appeared desirable that one who was at least profoundly impressed with the dignity and importance of the subject, should, in default or better qualified persons, make an attempt to treat it not merely with a cold and distant impartiality but even with something akin to sympathy and friendliness".

(Boswarth Smith; Muhammed and Muhammedanism, Introduction)

[بہت سے عیسائی محققین نے، مجھے ایسا لگتا ہے، اسلام کا قرب صرف اسے کمتر ثابت کرنے اور اسکی غلط تصویر پیش کرنے کے لیے ہی حاصل کیا، حالانکہ پسندیدہ یہ بات ہوتی، کہ کم از کم وہ لوگ یا ان سے زیادہ لائق فائق افراد جو موضوع کی اہمیت اور اسکی بزرگی سے متاثر تھے، اس کے ساتھ بعد اور سردہری سے لبریز غیر جانبداری سے مورا ہو کر بلکہ کچھ ہمدردانہ اور دوستانہ رویہ اپناتے ہوئے، برتاؤ کرتے۔]

اسی طرح کارلائل نے بھی اپنے معاشرے کی روش کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ جس عہد و مد کے ساتھ اس نے اسلام اور داعی اسلام ﷺ کی مدافعت میں قلم اٹھایا، اس کی نظیر مغرب میں اس سے قبل نہیں ملتی۔ اس نے کوشش کی کہ ذاتِ نبوی کے کردار عالیہ کے مختلف روشن پہلو اجاگر کرے۔ اس کی پیش رفت نے قدیم انداز کا دھارا موزا۔ لیکن باسوتھ اور کارلائل کی تحریروں کا نظیر غائر جائزہ لیا جائے تو اسلام اور داعی اسلام ﷺ کے بارے میں انکی تحریروں میں ایک خاص احساس برتری پایا جاتا ہے، کہ اسلام دراصل عیسائیت کی ایک ثانوی شکل ہے۔ یہ نکتہ نظر بذاتِ خود اہانت آمیز ہے۔ جب وہ عظیم اہل قلم جو موافقت کا دم بھرتے نظر آتے ہیں، اسلام کو عیسائیت سے کمتر تصور کرتے ہوں، تو ان کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی جو موافقت کے دعویدار نہ ہوں۔ اس پیشگی تحقیق کے باعث عیسائی تحریریں عدل سے بیگانہ ہی رہیں۔ ٹوین بی جیسا بے لاگ صاحبِ نظر جب ذاتِ گرامی کے بارے میں گفتگو کرتا ہے تو اس کی فکری بلندیوں مائل بہ پستی نظر آنے لگتی ہیں۔ اس نے تحریر کیا:

"اپنی کینیڈی میں کوئی خاص مقام نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں قاصر رہے۔ اور جب مکہ نے رد کر دیا تو مدینے میں شاندار استقبال ہوا۔ وہ حقیقتاً مدینے کے لیے زیادہ کارآمد تھے کہ وہاں سیاسی امن و امان قائم کر سکتے تھے۔"

"محمد (ﷺ) کی حیات کے دھوئے ہیں۔ مکہ میں ان کی کوشش محض مذہب کے لیے تھی۔ دوسرے مرحلے میں انہوں نے مذہبی کام کو پس پشت ڈال دیا، اور سیاسی مقاصد نے غلبہ حاصل کر لیا۔"

(Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. II, p.278)

پچھلے ابواب میں ہم ٹوئن بی کا ایک تبصرہ پیش کر چکے ہیں، جس میں مدنی کا میا بی کو اس نے نبوت کی ناکامی قرار دیا اور کہا کہ ”عرب کے سیز ربن کر انہوں نے مقام نبوت کی توہین کی“۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۴۷)

جارج برنارڈ شا کی عظمت کا کسے اعتراف نہیں۔ آزادی فکر کے عظیم علمبردار ہیں۔ لیکن یہی جارج برنارڈ شا جب داعی اسلام کا ذکر کرتے ہیں تو عجب سو قیانہ سا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ باور نہیں آتا کہ انہوں نے ہی یہ لکھا ہوگا، (نعوذ باللہ)

"It could nerve Mahomet to convert the fierce tribes of Arabia from worshipping stones to an exalted monotheism; but it could not make him say no to a pretty woman".

(Shaw on Religion; p.141, edited by Warren Sylvaster)

[محمد ﷺ] عرب کے تندخو قبائل کو پتھروں کی پرستش سے ہٹا کر ایک خالص توحید کو منوانے کا عزم تو کر سکتے تھے مگر کسی حسین خاتون کو رد کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔]

غرضیکہ مغرب اپنی تہذیب کی برتری کا اس طرح شکار ہے کہ کسی اور تہذیب کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ دیگر عظیم تہذیبوں کو اپنا رقیب تصور کرتا ہے اور یہ رقابت ہی اسے حرف حق کہنے سے باز رکھتی ہے۔

مغرب کلام الملک، ملک الکلام کے بموجب اپنے جھوٹ کو بھی سچ قرار دیتا ہے۔ خود ایک انسان کو خدا تو مان سکتا ہے لیکن دوسرے انسان کو نبوت کے مقام پر بھی فائز نہیں دیکھ سکتا۔ عیسائیت کے ہر پیرو پر روح القدس نازل ہو سکتا ہے، لیکن یہی روح القدس کسی غیر عیسائی سے تعلق قائم کر سکے، مغرب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ عالم بالا کو بھی وہ اپنی خود ساختہ قدروں کا پابند تصور کرتا ہے۔ پتہ نہیں کہ اپنی اس کیفیت کو وہ فطرت کی تو قیر سمجھتا ہے کہ توہین۔

•

باب پنجم

سترہویں تا اٹیسویں صدی عیسوی کا مشترکہ انداز

- ۱۔ اسلام، قرآن، حدیث اور حیاتِ طیبہ پر اعتراضات
- ۲۔ مسخ بالعمد اور ازالہ اعتراضات
- ۳۔ حیاتِ طیبہ اور مستشرقین
- ۴۔ انفرادی اعتراضات
- ۵۔ مسخ کردہ حقائق
- ۶۔ کردارِ نبوی

اسلام، قرآن، حدیث اور حیاتِ طیبہ پر اعتراضات

سینٹ جان دمشق کا حوالہ پچھلے باب میں دیا جا چکا ہے، جس نے اسلام کو عیسائیت کی بگڑی ہوئی [بدعتی] شکل قرار دیا، اور یہ باور کرایا کہ شہنشاہ ہرقل کے دور میں ایک نبی کا ذب (نعوذ باللہ) عربوں میں اٹھا، اس نے عہد نامہ کدیم و جدید سے واقفیت حاصل کی اور پھر ایک ایرین راہب سے تبادلہ خیال کے بعد اپنا ایک فرقہ قائم کیا۔ مگر انہ پاسبازی کے ذریعے اس نے لوگوں کے دل جیتے۔ بعد میں اس نے دعویٰ کیا کہ آسمان سے اس پر ایک صحیفہ نازل ہوا ہے اور ان تمام مہمل اور مضحکہ خیز احکام کو، جو اس نے اس کتاب میں تحریر کر رکھے تھے، اپنی قوم کے لیے مقدس تعلیمات قرار دیا۔ (von Grunebaum; Medieval Islam, p.43)۔

سینٹ جان نے مندرجہ بالا خاکہ آٹھویں صدی عیسوی میں فراہم کیا تھا۔ سترہویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے معاند مستشرقین کی تحریروں کا جائزہ یہ واضح کرتا ہے کہ انہوں نے کسی نہ کسی عنوان سے سینٹ جان کی ہی پیروی کی۔ ان کا زور قلم سینٹ مذکور کے اجمال کی ہی تفصیل فراہم کرنے میں صرف ہوا۔ ان کے تمام اعتراضات، تنقیدیں اور تبصرے حسب ذیل عنوانات سے ہی متعلق نظر آتے ہیں۔

- ۱۔ قرآن کو غیر الہامی کتاب قرار دینا۔ اسے کتب قدیم کا چربہ بتلا کر اس کی مقدس تعلیمات کو مضحکہ خیز اور مہمل باور کرانا۔
- ۲۔ اسلام کو کھینچ جان کر عیسائیت اور یہودیت کی ہی ایک شکل قرار دینا۔
- ۳۔ عقائد و ارکانِ اسلام کا خاکہ اڑانا۔
- ۴۔ تاریخی واقعات کو مسخ کرنا۔
- ۵۔ تابناک کردار نبوی کو مغربی اقدار پر پرکھنا۔

ہرچند کہ یہی مقاصد عہد وسطیٰ کی تحریروں کے بھی تھے لیکن اس دور کی تحریروں میں حقائق سے ناواقفیت کی بنا پر بازاری رنگ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ انیسویں صدی تک یورپ کی تمام زبانوں میں قرآن، حدیث، سیرت، مغازی اور تاریخوں کے تراجم ہو چکے تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ صحیح بخاری، صحیح مسلم، مشکوٰۃ المصابیح، اللواقیدی کی کتاب المغازی، ابن ہشام کی سیرت رسول اللہ ﷺ، تاریخ ابوالفداء، سہمودی کی تاریخ مدینہ، ابنِ قتیبہ کی تاریخ معارف، مسعودی کی تاریخ مروج الذهب، تاریخ یعقوبی، تاریخ طبری، اور ابن سعد کی

غادر الوجود کتاب طقات ابن سعد قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ان اصل تاریخی تصنیفات سے واقف ہونے کے بعد انیسویں صدی کے لٹریچر میں نمایاں تبدیلی آئی۔ گویا، کارلائل، باس ورتھ اسمتھ، جان ڈیون پورٹ، کینیڈی، ڈوزی، رینا، ٹوئین بی، اور اسمتھ سدو، سب کے سب انیسویں صدی کے مشاہیر ہیں جن کی تحریروں میں یہ شعوری کوشش پائی جاتی ہے کہ حقائق کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ محققین کے ایک بڑے گروہ نے تاریخ اسلام اور سیرت پر آزادانہ تحقیق کر کے کثیر تعداد میں کتابیں لکھیں۔ چنانچہ صرف سیرت پر انیسویں صدی میں کم و بیش پچاس کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں کارلائل، باس ورتھ، ڈیون پورٹ، اسمتھ سدو، واشنگٹن ارونگ نولد کی، مارگولوتھ، ولہوزن، رینا، دی پرسپوال، اسپرنگر، گاڈفرے ہکنس، ولیم میور، آنرے دی کاستری، ہنری لیسن، ویل، گولڈزیہر، اور بور خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مصنفین کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ وہ جو عربی سے واقف نہیں، اور جن کا ماخذ اوروں کی تصنیفات ہیں۔ ان حضرات نے تمام مشتبہ اور ناقص مواد جمع کیا اور عہد وسطیٰ کی یا وہ گوئی کی مطابقت میں ایک قیاسی ڈرامہ ترتیب دے کر اس کا نام سیرت رکھ دیا۔ اس قسم کی کتب یورپ کے عامیانہ مزاج کے مطابق تھیں اس لیے زیادہ مقبول ہوئیں۔ یہ گروہ گویا کہ سینٹ جان دمشق کا حقیقی پیرو تھا۔

۲۔ اس دوسرے گروہ میں عربی داں حضرات شریک ہیں۔ انہوں نے صرف عربی پڑھ کر خود کو فنی حدیث، فقہ، تفسیر، سیرت اور مغازی کا بھی ماہر تصور کر لیا۔ محض زبان سے واقفیت کو علوم پر مہارت تصور کرنا خوش فہمی سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ یہ حضرات اصطلاحات، اسلامی امور اور سیرت کے بارے میں فاش غلطیوں کے مرتکب ہوئے، مثلاً جرمن ڈاکٹر ساخو کے تراجم اور مضامین میں بعد المشرقین ہے۔ طبقات ابن سعد اور البیرونی کی کتابوں کے ترجمے اعلیٰ ہیں تو ان پر دیے گئے حواشی امور محتلفہ سے ناواقفیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ نولد کی نے خاص طور پر قرآن کا مطالعہ کیا لیکن انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (جلد ۱۶) میں اس کا مضمون قرآن اس کے تعصب و جہل کا شاہکار ہے۔ اسی طرح پامر کا ترجمہ قرآن ہے جس کے حواشی مغربی ذہنیت کے آئینہ دار ہیں۔ یہ گروہ سینٹ جان کی پیروی پیتر۔ ییزیل کے توسط سے کر رہا تھا۔

۳۔ تیسرے گروہ میں وہ مستشرقین ہیں جو عربی کے ساتھ مذہبی لٹریچر سے بھی واقف ہیں۔ ان سے گویا عام غلطیاں سرزد نہیں ہوتیں لیکن ان کا مطالعہ خورد بینی ہوتا ہے، یعنی سطح نظر کمزوریاں تلاش کرنا ہے۔ وہ تجزیاتی گفتگو کرتے ہیں اور کریم کے اصول کے مطابق مذاہب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کی روح فنا ہو جاتی ہے۔

(H. Krammer; The Christian Message in the Non-Christian World, p. 135)

اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اس تجزیاتی اور خورد بینی مطالعہ کا مقصد ہی اسلام کو بے روح ثابت کرنا ہے۔ یہ حضرات سادہ سے سادہ شے کو جس میں حق کا شائبہ تک نہ ہو اپنے فتن کی مدد سے کریہہ النظر دکھاتے ہیں۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

گزشتہ تین صدیوں میں مستشرقین اور محققین نے اسلام اور داعی اسلام کے بارے میں جو اعتراضات اور الزامات عائد کیے ہیں ان کے مشترکہ انداز پر آنے والی سطور میں گفتگو کی جارہی ہے۔

اسلام

اسلام پر گفتگو کا عمومی انداز کچھ اس طرح کا ہے۔

۱۔ اسلام مذہب ہی نہیں ہے۔

(Bryan S. Turner; 'Weber and Islam', p.1)

۲۔ اسلام جنگی ٹولے کا ضابطہ اخلاق ہے۔ (حوالہ بالا)

۳۔ اسلام عام مذاہب سے جدا ہے اس لیے عمرانیات مذاہب سے خارج ہے۔ (ملاحظہ ہو حوالہ بالا)

۴۔ اسلام عرب جاہلیہ کی 'مروءہ' کا بدلا ہوا نام ہے۔

(Ignas Goldziher; Muslim Studies, p.22)

۵۔ اسلام دنیاوی مذہب ہے۔ اسلام مذہب نجات نہیں۔

(P. Hardy; Muslims of British India, p.175)

۶۔ اسلام 'لوٹ' ہے۔ (Maxime Rodinson; Mohammed, p.77)

۷۔ اسلام انفرادی مذہب ہے۔ (حوالہ بالا)

۸۔ اسلام یہودیت اور عیسائیت کا مرکب ہون منت ہے۔

(Klein, F. A; The Religion of Islam, p.21)

۹۔ داعی اسلام دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام دین ابراہیمی کی تجدید ہے جبکہ حقیقتاً ایک نیا مذہب ہے۔

(Davonport, J.; An Apology for Mohammed, p.138)

۱۰۔ اسلام عیسائیت کا رقیب و دشمن ہے۔

۱۱۔ اسلام کے ارکان دوسرے مذاہب سے مستعار ہیں۔ توحید اور عبادات یہودیت اور عیسائیت سے، حج مشرکین عرب سے، طواف کعبہ، حجر اسود کا بوسہ اور جانوروں کی قربانی مقامی مذاہب سے مفاہمت کی نشانی ہے۔ پس اسلام مختلف مذاہب کا اشتراک ہے۔

(H. Krammer; The Christian Message in the Non-Christian World)

۱۲۔ اسلام میں شدید جمود ہے۔ ارتقاء میں ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں۔ اس کی قدریں اپنی افادیت کھو رہی ہیں۔ سود کی حرمت، پردہ اور قطعید سے خود مسلم معاشرہ بیگانہ ہو رہا ہے۔ (متعدد)

۱۳۔ مسلمانوں کی پستی کا ذمہ دار اسلام ہے۔ (متعدد)

۱۴۔ اسلام بزدل و شمشیر رانچ یا گیا۔ (متعدد)

قرآن اور حدیث

- ۱۔ قرآن وحدیث کے بارے میں گفتگو کا عام انداز یہ ہے۔
قرآن کلام اللہ نہیں، داعی اسلام کی تصنیف ہے۔ (بیشتر)
- ۲۔ قرآن بے ربط، پر تکان، جھجک اور پرچ ہے۔
(Thomas Carlyle; On Heros, Heroworship and the Heroic in the History, pp. 64-65) •
- ۳۔ قرآن کی روایات یہود کے مضامین اور بائبل کے غیر مستند مواد پر مشتمل ہیں۔
(R.A. Nicholson; Introduction to W.H. Palmer's translation of 'The Koran')
- ۴۔ قرآن کا اولین ایڈیشن ملت نے تسلیم نہ کیا۔ موجودہ نسخہ نظر ثانی کے بعد ترتیب دیا گیا۔
(Muir; Life of Mohammed, pp. 555-557)
- ۵۔ قرآن مریم عذرا اور تورات کی مریم میں تمیز نہیں کرتا۔ نیز اس میں تورات کے کردار ہامان کو فرعون کا وزیر بیان کیا گیا ہے۔ (متعدد)
- ۶۔ قرآن عرب شعراء کے دیوان سے مطابقت رکھتا ہے۔
(Noldeke; Dictionary of Islam, pp.486-487)
- ۷۔ احادیث وضعی ہیں۔ دوسری صدی میں پیغمبر اسلام ﷺ کی عظمت بڑھانے یا قرآنی مباحث کی تشریح کے لیے وضع کی گئیں۔
(Klein; The Religion of Islam, pp.4)
- ۸۔ قرآنی قوانین قاطب نفاذ نہیں ہیں۔
(von Grunebaum; Medieval Islam, pp. 143-144)

حیاتِ طیبہ پر مشترکہ اعتراضات

سترہویں، اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مستشرقین نے حیاتِ طیبہ پر بے شمار اعتراضات کیے جن میں سے بیشتر مستشرقین نے ہی رفع بھی کیے۔ مستشرقین نے فرہی اور مکار کہا تو مستشرقین نے ہی اس دعوے کی تکذیب بھی کی۔ اس میں سے بیشتر نے عالی نسب کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تو ان میں سے ہی ایسے بھی ہیں جو اس انکار کو احقانہ فعل قرار دیتے ہیں اور عالی نسب کو ایک تاریخی حقیقت تسلیم کرتے ہیں۔ بہتوں نے حضور ﷺ کے فرضی معلم دریافت کیے تو دوسروں نے ہر معلم کے وجود سے انکار کیا۔ انہوں نے ہی مبتدل حکایات

ترتیب دیں اور انہوں نے ہی ان حکایات کو لغو بھی قرار دیا۔ کسی کو ان کی حیاتِ طیبہ عیش و عشرت کی زندگی نظر آئی تو دوسروں نے اس زندگی کو سادہ اور میانہ روی پر گامزن پایا۔ تاہم انیسویں صدی کے اختتام بلکہ بیسویں صدی میں دوسری عالمگیر جنگ تک جو مشترکہ انداز پایا جاتا ہے اس میں بھی شدید غلط فہمی بلکہ بعض معاملات میں مسخِ عمدہ باقی ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ، (نَعُوذُ بِاللّٰهِ)

۱۔ حضور ﷺ اگرچہ تاریخ کے دور میں تشریف لائے مگر ان کی زندگی کے حقیقی خد و خال تاریخ کی نظروں سے اوجھل اور روایات میں گم ہیں۔

۲۔ داعیِ اسلام ﷺ کو تو حیدر پسندی کا تہو ریبودیوں اور عیسائیوں سے ملا۔

۳۔ داعیِ اسلام ﷺ کو اندازہ تھا کہ یہود و نصاریٰ کی ترقی کا راز تورات و انجیل میں مضمر تھا۔ ان کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ ایک ایسی کتاب اپنی قوم کو دیں جسے وہ آسانی کتاب کے طور پر قبول کرے، اور ترقی کی راہیں طے کرے۔ چونکہ عرب کے ماحول میں ایسا کر گزرنانہایت آسان تھا اس لیے قرآن ان کا ذاتی کارنامہ ہے۔

۴۔ انہوں نے مروجہ مذاہب کا بغور مطالعہ کیا۔ یہود و نصاریٰ کے عقائد سے آگاہی حاصل کی اور پھر ایک نیا مذہب استوار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کے تمام انبیاء و رات و انجیل کے مذکور انبیاء ہی ہیں۔ اسی لیے اسلام کے ارکانِ عبادت دوسرے مذاہب سے ماخوذ ہیں۔

۵۔ مکہ کی زندگی عسرت میں بسر ہوئی۔ دولت کی طلب نے ہر لمحہ پریشان رکھا۔ اس عسرت کے خاتمے کے لیے معمر و دلتند خاتون سے شادی کی۔ اسی دولت کے حصول کے لیے مدینے کی زندگی میں مختلف چھاپوں اور لوٹ مار کے واقعات نظر آتے ہیں۔

۶۔ مکی زندگی میں صرف بت پرستی کی مخالفت کی، جبکہ مدنی زندگی میں یہودیت اور نصرانیت سے بھی ناٹھ توڑ لیا تا کہ ان کا اپنا مقام ثانوی نہ رہ جائے۔

۷۔ ابتداء میں اپنی نبوت کا جواز پیدا کرنے کے لیے تمام عظام بنی اسرائیل کو تسلیم کیا کیونکہ نبوت کا تہو رے صرف بنی اسرائیل میں تھا۔ اگر یہ سہارا نہ لیا جاتا تو محلِ نبوت نہ رہ جاتا۔ لیکن جب قوت مل گئی اور نبوت تسلیم کر لی گئی تو خود کو سب سے بڑا نبی قرار دیا۔ اور سلسلہ نبوت کو اپنی ذات پر ختم کر لیا۔ اپنے دین کو دیگر ادیان کا ناخن قرار دیا تا کہ مسلمان ادیان قدیم کی طرف توجہ نہ دے سکیں اور یہ حقیقت مستور رہے کہ، بنِ اسلام ان سابقہ ادیان کی ہی خوشہ چینی ہے۔

۹۔ اپنا نسب تعلق حضرت ابراہیم کے صاحبزادے حضرت اسمٰعیل سے قائم کیا اور انہیں بھی نبی کا درجہ دیا۔ مکی دور میں ان کے ہیرو حضرت موسیٰ تھے۔ مدینے میں یہود کی مخالفت کے سبب حضرت ابراہیم کو ہیرو بنادیا۔ ان کے کارنامے بڑھا چڑھا کر بیان کیے۔ انہیں اسرائیل اور نصاریٰ

کتاب و سنت کے دو گولہ سبکیں ملنے تو چکی تاکہ اہل حق کو کفر و کلمہ کی گولہ سبکیں مل سکیں جو کلمہ حق کی گولہ سبکیں

کہ دین ابراہیمی ہی دین اسلام ہے۔ اس طرح اس سلسلہ تقدس کا رخ تاریخی حقیقتوں کے خلاف موڑ کر اپنی جانب کر لیا اور یہود و نصاریٰ کو نظر انداز کر کے اس ورثہ کو معرب کیا اور اپنا قومی ورثہ قرار دیا۔ مکی زندگی و رویشانہ اور یمیرانہ زندگی تھی لیکن مدنی زندگی میں یمیری کی شان بادشاہت میں بدل گئی۔ اقتدار ملنے کے بعد لوازم سلطنت اختیار کیے۔ لشکر کشی، خونریزی، قتل و انتقام وغیرہ شیوہ پیغمبری نہیں بلکہ دنیاوی بادشاہت کے لاحقے ہیں۔

اسلام کو بزور شمشیر پھیلا یا۔

کثرت ازدواج کی آڑ میں نفس پرستی کی۔

مجرمین کو دی جانے والی سزائیں قتل و خونریزی ہیں اور مسلمان درحقیقت قاتل اور لیرے ہیں۔

داعی اسلام ﷺ نے کئی بار موقع پرستی سے کام لیا۔ اس کی تائید میں واقعہ غرانیق کو رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ کفار مکہ سے رعایات حاصل کرنے کے لیے کفار کی تین دیویوں کو شریک الوہیت تسلیم کر لیا گیا، لیکن جب حضور ﷺ کو اس کے عواقب و نتائج کا اندازہ ہوا تو اس شرکت کا انکار کر دیا۔

حضور ﷺ کی ذات میں مختلف عوارض تھے۔

کتب سیرت میں پائی جانے والی تفصیلی حیات طیبہ ناقابل اعتبار ہے۔ یہ شبہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ چونکہ کتب سیرت وصال کے صدیوں سال بعد تحریر ہوئیں اس لیے حضور ﷺ کی حقیقی زندگی وہ نہ رہی ہوگی جو کتب سیرت میں ملتی ہے۔ سیرت میں عقیدت ایک مثالی زندگی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ وہ واقعات نہیں جو حقیقی زندگی میں پیش آئے بلکہ وہ افسانے ہیں جو سیرت کو اسلامی روح سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مؤلفین نے لکھ کر اپنے نبی سے منسوب کر دیے۔ سیرت نگاروں نے اپنے ہیرو کی داستان کو موثر، پرکشش اور پر عظمت بنانے کے لیے سیدھی سادی زندگی کو عقیدت کے رنگ میں رنگ دیا۔

قرآن کے محمد ﷺ [صرف ایک انسان ہیں۔ مسلمانوں نے انہیں ربانی اور ملکوتی مقام پر فائز کر دیا۔ وہ معجزات جو داعی اسلام ﷺ سے منسوب ہیں، صرف انکی ذات کو انبیاء صادق کے ہم پلہ ثابت کرنے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

مسخ بالعمد اور ازالہ اعتراضات

اسلام

’اسلام مذہب نہیں یا اسلام جنگی ٹولے کا مذہب ہے۔ اسلام انفرادی مذہب ہے۔ اسلام عرب جاہلیہ کے ’مرہۃ‘ کا بدلا ہوا نام ہے یا اسلام لوٹ ہے۔‘ یہ اور ان جیسے بے اصل اور بے بنیاد اعتراضات اس قابل بھی نہیں کہ ان پر غور بھی کیا جاسکے۔ ہر وہ شخص جو اسلام سے تھوڑی بہت واقفیت بھی رکھتا ہے ان مہمل دعووں کو لاعلمی یا پھر کذب عمد پر محمول کرے گا۔

’اسلام مختلف مذاہب کا اشتراک ہے۔ اس لیے اس کی تعلیمات کے سرچشمے عیسائیت اور یہودیت ہیں۔‘ یہ دعویٰ بھی عہدِ وسطیٰ کے اس الاپ کی یادگار ہے جس میں اسلام کو عیسائیت کی ایک بدعتی شاخ قرار دیا جاتا تھا۔ تمام مذاہب میں چند قدریں مشترک ہیں۔ حقیقتِ عظمیٰ کا وجود، اس کی توقیر و تکریم، اس سے ہدایت حاصل کرنے کے مخصوص طریقے، ہدایت پر عمل، عبادت، ریاضت، تزکیہ نفس، نکوکاری، بدکاری سے اجتناب، یہی تو وہ قدریں ہیں جن پر مذاہب استوار ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر مذاہب عالم سب کے سب ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ پس ایک اصل کی دو شاخوں میں مماثلت بھی فطری ہے۔ اور کسی ایک کو دوسرے کی عاریت قرار دینا مضحکہ خیزی ہی ہے۔ اسلام کو انفرادی مذہب قرار دینا یا اس کی افادیت کو کسی مخصوص زمانے یا خطے تک محدود کرنا بھی کھلی زیادتی ہے۔

زمان و مکاں: اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے نسلی امتیاز پر شدید ضرب لگائی۔ اقصائے عالم میں بسنے والا ہر مسلمان، بلا امتیاز رنگ و نسل، ایک دوسرے کا ہم رتبہ ہے۔ اسلام نے عظمت کا معیار کردار کو مقرر کیا۔ ذات پات، برادری، حسب و نسب، مال و دولت، قوت و اقتدار کے امتیاز کو صرف ایک جملہ کہہ کر رد کر دیا،

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقٰكُمْ ط (سورۃ الحجرات - آیت ۱۳)

”بیشک تم میں سب سے زیادہ قابلِ تکریم وہ ہے جو سب سے بڑھ کر صاحبِ تقویٰ ہے۔“

یہ ایک نیا معیارِ تکریم تھا جو انسانیت کو اسلام نے عطا کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ عالمِ اسلام میں مختلف النسل اقوام نے ہمیشہ ایک ملت کی حیثیت سے گزر بسر کی۔ یہ ایسی مساوات تھی جس نے رنگ و نسل کے مسائل پر نہایت کامیابی سے قابو پایا۔ بین الاقوامی اسلامی برادری کا قیام اور اس کا استحکام ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ کتابِ طہاسلیت یعنی التواشیحہ میں لکھی ہوئی مخالفتِ نسلانی اور دھواہنِ ملتہی بکثرت کلاسِ سب سے بڑا مغفیل مرکز ہے

قابل عمل نظام ہے۔ اسلام محض فرد کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ صالح افراد کے ذریعے ایک نظریاتی معاشرہ ترتیب دیتا ہے۔ یہ معاشرہ مطلق العنان، خود سر، گردن کش، جابر و بے راہرو نہیں بلکہ قادرِ مطلق کے آگے جواب دہ ہے۔ یہاں قوانین کی پابندی کرانے کے لیے کسی بیرونی قوت اور بائیکا استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ یہ فرد کی اندرونی انضباطی قوت ہے جو ہر شخص کو پابند رکھتی ہے۔ اسلام نے فرد اور معاشرہ دونوں کو اپنا محاسب خود بنایا ہے۔ ایسے مذہب کو انفرادی قرار دینا یا علاقائی تصور کرنا حقائق سے چشم پوشی کے مترادف ہے۔

اسلام کی افادیت کو دور ماضی سے وابستہ کرنا بھی فیشن ہے۔ عصر حاضر کو کوئی صحیح الذہن شخص دور ماضی نہیں کہہ سکتا۔ دیکھنا چاہیے کہ اس عہد حاضر کے عمومی مسائل کیا ہیں اور جو مذہب ان مسائل کے شافی حل پیش کرتا ہو اس کی افادیت سے انکار کرنے والوں کو کس زمرے میں شامل کیا جانا چاہیے۔

نسلی امتیاز: نسلی امتیاز عہد حاضر کا ایک نہایت اہم مسئلہ ہے جسے اسلام نے اپنے اولین دور میں ہی حل کر دیا تھا۔ عالم اسلام میں اس مسئلے کا کوئی وجود ہی نہیں۔ نسل کی طرح رنگ کے تفوق پر بھی اسلام نے ہی پہلی ضرب لگائی۔ اسود و احمر کے امتیاز کو حضور نبی کریم ﷺ نے جیسے الوداع کے خطبے میں ختم فرمادیا جس کے باعث اس تفوق کا وجود مٹ گیا۔

بین الاقوامی برادری: دنیائے پچھلی صدی میں بھد مہیب عالمی جنگیں لڑیں، جس کے بعد وہ اس نتیجے پہنچی کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو انسانیت کی تباہی لازمی ہے۔ مگر نالوجی نے جنگ کو ایک مہیب صنعت بنا ڈالا ہے۔ اجتماعی ہلاکت و تباہی کے جس قدر طاقت ور ہتھیار آج موجود ہیں اس سے قبل کبھی بھی نہ تھے۔ عصرِ حاضر اس تباہی سے محفوظ رہنے کے لیے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ایک عالمی برادری قائم کی جائے جہاں عالمی مسائل گفت و شنید کے ذریعے حل ہو سکیں اور قوت کا استعمال ترک ہو۔

یہ حل اسلام نے چودہ سو سال پہلے پیش کیا تھا۔ اس نے ابتدائی دور میں ہی بین الاقوامی برادری قائم کرنے میں پیش رفت کی اور اس برادری کو ایک اعلیٰ ضابطہ اخلاق دیا۔ اس کے حقوق کی حفاظت کی اور حق تلفی کی ممانعت کی۔ بلا فکر کبھی کوئی معاشرہ عظیم نہیں بنا۔ یہودی، عیسائی، بودھ، چینی اور روسی معاشرے سبھی کی بنیاد فکر پر ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کے سوا کوئی اور فکر بین الاقوامی معاشرہ پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ دیگر مذاہب اور نظریات کا تکیہ نظر عالمی نہیں۔ کوئی صرف ایک مخصوص نسل کی ترجمانی کرتا ہے جس کے باعث دیگر نسلیں اسے اپنے لیے قابل قبول نہیں پاتیں۔ دوسرا انسانی زندگی کو مختلف دائروں میں تقسیم کر کے اپنا دائرہ کار محدود کر لیتا ہے۔ کوئی انسان کی تقسیم طبقات میں کرتا ہے اور خود کو پسماندہ طبقے کے لیے وقف کرتا ہے، اور دیگر طبقات کا وجود مٹا دینا اس کا مطمح نظر قرار پاتا ہے جس کے باعث طبقاتی نفرت شدید تر ہو جاتی ہے۔ اس منظر نامہ میں صرف اسلام ہی وہ مذہب ہے جو انسانی گروہ کو ایک مکمل نظام عطا کرتا ہے۔ ایک عالمی برادری کے قیام کی راہیں کھولتا ہے اور عالمی قوانین کی بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

معاشیات: آج کے دور کا اہم ترین مسئلہ معاشیات ہے۔ دنیا کے دو عظیم معاشرے [مغرب اور روس] جس زمانے میں یہ مقالہ لکھا گیا تھا، سوویت یونین منتشر نہیں ہوا تھا | ایسے بھی ہیں جنہوں نے معاشیات کو پرکار کار مرکز بنا کر پورے نظام کو اس کے گرد گھما رکھا ہے۔ معاش انسانی زندگی کا ایک جزو ہے، گھل نہیں۔ صرف اس جزو کو اس قدر اہمیت دینا کہ گھل اس میں گم ہو جائے محض ایک ظلم ہے۔ انفرادیت کو اجتماعیت میں فنا کر دینا، فرد پر انتہائی زیادتی ہے۔ اشتراکی معاشرہ بھی جس مقصد کو لے کر اٹھا تھا اس میں ابھی تک کامیابی نہیں حاصل کر سکا۔ طبقاتی جنگ جو شروع میں بہت شدید تھی بظاہر ختم ہو چکی ہے۔ سرمایہ داروں، کوکلوں (Kulaks)، جاگیرداروں اور کارخانہ داروں کا اشتراکی معاشرے سے وجود مٹ چکا ہے۔ لیکن طبقات اب بھی ہیں۔ ایک حاکم اور دوسرا محکوم۔ بہت سے طبقات مٹ چکے ہیں لیکن اسٹیٹ اب بھی باقی ہے۔ یہ اسٹیٹ جس نے ہر فرد کو اپنا تابع بنا رکھا ہے، اس معاشرے کے عوام کے لیے عظیم ترین طبقہ ہے۔ جب تک یہ نظام قائم ہے سرمایہ دارانہ نظام خود کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ نتیجہ یہ کہ عالمی برادری دو متحارب کیمپوں میں منقسم ہے۔ دونوں آپس میں سرد جنگ میں مبتلا ہیں جو کبھی بھی حقیقی جنگ میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

معاشی نظریات کے اس اختلاف نے پوری انسانیت کو دہشت زدہ کر رکھا ہے۔ ایک کے نزدیک سرمایہ دارانہ نظام استحصالی ہے تو دوسرے کے نزدیک اشتراکیت ایک لعنت ہے۔ یہ دونوں ہی ہر اعتبار سے انتہا پسند ہیں۔ نظریاتی اعتبار سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کی فنادوسرے کی بقا ہے۔ یہ نظریاتی بعد متصادم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ دونوں معاشرے ایک دوسرے کی قوت سے خوف زدہ ہیں، اور صرف اپنی برابری کے خوف سے دوسرے پر حملہ کرنے سے گریزاں ہیں۔ لیکن امکان اس بات کا ہے کہ جیسے ہی کسی ایک کو یہ اطمینان ہوگا کہ دوسرے کو مغلوب کر سکتا ہے وہ جنگ چھیڑنے میں کوئی پس و پیش نہیں کرے گا۔ یہ جنگ نسل انسانی کی تباہی کا پیش خیمہ ہوگی۔ اس تباہی کا سد باب صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ دونوں فریق انتہا پسندی سے باز آجائیں۔ مصلحت کی فضا پیدا کرنے کے لیے اپنے نظریات میں چلک پیدا کریں۔ جہاں اپنی اقدار کو عزیز رکھیں وہیں دوسروں کی اقدار کا بھی احترام کریں۔ اپنی اقدار کو تسلیم کرانے کے لیے قوت اور دباؤ سے گریز کریں۔ پھر جو مشترک عالمی اقدار سامنے آئیں گی وہ اسلام کی روح سے ہم آہنگ ہوں گی۔

سرمایہ داری کو سرمائے کے ارتکاز کی حد مقرر کرنی ہوگی۔ اسلام سرمائے کے ارتکاز کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ لیکن دولت کی کس مقدار کو سرمائے کا ارتکاز قرار دیا جائے اس کا تعین نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام معاشرے کو یہ اختیار دیتا ہے کہ حالات کی روشنی میں یہ حد قائم کرے۔ افراد اور گروہوں کو اس حد سے تجاوز کی اجازت نہ دے۔ اضافی دولت کا رخ معاشرے کی بہبود کی جانب پھیرے۔ یہ ایک ایسا نظام ہوگا جو سرمایہ داری کی تمام لعنتوں سے معاشرے کو پاک کر سکتا ہے۔

سوشلزم کو انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرنا ہوگا: انسان محض معاشی حیوان نہیں کہ ساری زندگی کو لٹھو کے تیل

کی طرح صرف نان شبینہ کے لیے پسینہ بہاتا رہے۔ سرمایہ داری نظام ہو تو اپنی محنت سے سرمایہ دار کی تجوری بھرتا کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

رہے اور سوشلسٹ نظام ہو تو معاشرے کے لیے فنا ہو جائے۔ یہ اس کی فطری خواہش ہے کہ اپنی صلاحیت اور اپنی محنت سے اپنی ذات کو نفع پہنچائے۔ جو کچھ اس نے کمایا ہے بلا شرکت غیر اس کی اپنی ملکیت ہو۔ یہ خواہش آزادی کا جزو ہے۔ انسان کو آزادی فطرتاً عزیز ہے، جس میں سیاسی آزادی، معاشی آزادی، آزادی فکر، اظہار خیال کی آزادی، جسم و روح کی آزادی سب ہی شریک ہیں۔ ان میں سے کسی ایک پر بھی پابندی ہو تو مکمل آزادی نہیں رہ جاتی۔ ایک فرد کے اکتساب کو دوسرا فرد غصب کرے تو یہ لوٹ ہے اور اگر ایک پورا طبقہ اپنے اکتساب کی ملکیت کے حق سے محروم ہو تو یہ معاشی غلامی ہے۔

اسلام ان تمام آزادیوں کو حق دیتا ہے، اور معاشی آزادی کا جس قدر مکمل نظم صرف ایک بلیغ جملہ میں بیان کرتا ہے وہ سوشلزم اور سرمایہ داری دونوں کے لیے مشعل ہدایت ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا:

وَأَنْ تَلِيسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (سورۃ الحج، آیت ۳۹)۔

”اور یہ کہ انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے خود کوشش کی“۔

لفظ انسان کا اطلاق فرد، معاشرہ اور بنی نوع انسان سب پر ہوتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی سعی سے پیدا ہونے والی منفعت کو فرد اور معاشرے دونوں کے لیے تسلیم کیا گیا ہے۔ سرمایہ داری اور سوشلزم دونوں میں جس چیز کا مشترکہ فقدان ہے وہ میانہ روی ہے۔ سرمایہ داری اپنے جائز حقوق سے تجاوز کر کے مزدور کو اس کے حقوق سے محروم کرتی ہے تو سوشلزم فرد کی سعی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حق ملکیت کو ہی تسلیم نہیں کرتا۔

اگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں دونوں مروجہ نظام اس افراط و تفریط میں اعتدال پیدا کر لیں یعنی سرمایہ کے ارتکازی زیادہ سے زیادہ حد مقرر ہو جائے اور انفرادی یا اجتماعی پیداوار پر کارکنوں کا حق تسلیم کر لیا جائے تو دونوں متضاد اور متضارب نظاموں میں ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے اور نوع انسانی کی تباہی کا خطرہ جو دونوں نظاموں کے اختلافات کے باعث درپیش ہے نل سکتا ہے۔

عالمی ضابطہ اخلاق: فی الحال اس نام کی کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ تاہم وہ وقت دور نہیں ہے جب عالمی ضابطہ اخلاق کی ضرورت شدید ہوگی۔ عالمی قوانین، عالمی عدالتیں، مختلف عالمی اداروں کے قیام کے بعد عالمی برادری اور عالمی حکومت کی جانب پیش قدمی ہوگی جس کے لیے عالمی ضابطہ اخلاق لازمی ہوگا۔ اسلام کا ضابطہ اخلاق ماضی میں بین الاقوامی ضابطے کی حیثیت منو چکا ہے۔ اسلام ہی وہ واحد نظام ہے جو عالمی ضابطہ اخلاق فراہم کر سکتا ہے۔ اس کے معروفات اور منکرات ہی عالمی برادری کے لیے مشعل راہ ثابت ہونگے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ دعویٰ کرنا کہ اسلام کی افادیت وقتی یا مقامی ہے، نہایت ہی مضحکہ خیز ہے۔

اسی طرح یہ تصور رکھنا کہ اسلام میں جمود ہے، حرکت کو جمود سے تعبیر کرنے کا نام ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ پسماندگی کو اسلام سے منسوب کرنا بھی محض ایک طعن ہے۔ پس ماندگی بے عملی اور وسائل کی کمی کے سبب سے ہے۔ [اس میں بڑا ہاتھ جغرافیائی حالات اور تاریخ کے جبر کا بھی ہے۔ درحقیقت اس پس ماندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں نے قدرت کے باوجود اپنے دور عروج میں، اسلامی تعلیمات کی وجہ سے محکموں کے ساتھ

ظلم و جور کا سلوک روا نہیں رکھا، ان کے وسائل کا استحصال نہیں کیا اور انکی نسل کشی نہیں کی، جبکہ دورِ حاضر کی ترقی یافتہ اقوام نے اس ضمن میں کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ [اس کا تعلق کسی طور بھی مذہب سے نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کا راز ان کے قبضہ کردہ وسائل اور انکی فعالیت میں مضمر ہے۔ اس میں ان کے مذاہب کا کوئی دخل نہیں۔ ورنہ مذاہب عالم میں اسلام وہ واحد مذہب ہے جو علم و عمل پر سب سے زیادہ زور دیتا ہے۔ یہی اعتراض اگر مغرب پر کیا جائے تو بے شمار تاریخی ثبوت اس امر کی شہادت دیں گے کہ مغرب نے جب تک اپنا دامن کلیسا سے نہیں چھڑایا، اس وقت تک ترقی کی راہیں مسدود ہی رہیں۔

مغرب کی ترقی کی راہ میں کلیسا سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ نشاۃ ثانیہ کے دور میں کلیسا کو زندگی کے تمام میدانوں سے خارج کیا گیا۔ تب کہیں جا کر ارتقاء کی راہیں کھل سکیں۔ اپنی کمزوریوں اور گناہوں کو دوسروں سے منسوب کرنے کی یہ بھی ایک مثال ہے۔

توحید

اسلام کے منفرد عقیدہ توحید نے مستشرقین کو سرگرداں رکھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ ثابت کریں کہ عقیدہ توحید اسلام نے یہودیت اور عیسائیت سے مستعار لیا ہے۔ مانی الضمیر صرف یہ ہوتا ہے کہ اس انفرادیت سے اسلام کو معزاً اقرار دیں۔ اس خوبی کا سہرا کسی اور مذہب کے سر نہ باندھ سکیں تو عرب جاہلیہ سے ہی حلق کر دیں تاکہ اسلام تو تو صیغ سے محروم ہو سکے۔ ڈی، جی مارگولتھ نے لکھا کہ قرآن کے انداز بیان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ابتداءً ان لوگوں سے مخاطب تھا جو ایک واجب الوجود کو تسلیم کرتے تھے۔ اس نے کئی مثالیں ایسی دیں جن سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ توحید کا وجود عرب میں اسلام سے پہلے سے تھا جسے اسلام نے اپنے اندر ضم کر لیا۔

(D.G. Margolouth; The Origins of Arab Poetry)

سی، سی، توری نے صرف عقیدہ توحید ہی نہیں بلکہ پورے قرآن کو عرب جاہلیہ کے نظریات پر مبنی قرار دیا۔

"His Arabic Koran, a work of genius, the great creation of a great man, is indeed built throughout from Arabic materials." (C.C. Torrey; The Jewish Foundation of Islam, 2nd Lecture)

[انکا عربی قرآن، ایک فطانت کا شاہکار، اور ایک عظیم آدمی کی عظیم تخلیق، بلاشبہ ازل تا آخر عرب مواد سے تشکیل دیا گیا ہے۔]

اس نے عربی اصطلاحات پر غور کیا اور فیصلہ دیا کہ یہ اصطلاحات عرب میں عام تھیں۔ اصطلاحات کا وجود تخیل کے وجود پر دلالت کرتا ہے۔ عرب جاہلیہ میں اسے توحید کا دھندلا تصور ملتا ہے جس کا اظہار عبادت کی شکل میں نہیں ہوتا تھا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

توربی نے قرآن اور عہد نامہ قدیم میں راست تعلق قائم کرنے اور اسلام کے عقیدہ و توحید کو یہودی توحید سے ماخوذ ثابت کرنے کے لیے ایک بیرونی معکم کی تلاش میں سرکھپایا۔ اس نے اس امر پر خاصاً زور صرف کیا کہ حضور ﷺ نے اس امر سے انکار نہیں کیا کہ کسی انسان نے انہیں تعلیم دی، بلکہ اس پر اصرار کیا کہ یہ تعلیمات ان کو بذریعہ وحی ملی ہیں۔

(C.C. Torrey; The Jewish Foundation of Islam, pp. 32, 48, 50, 71, 74)

اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مذاہب عالم میں بہت سی قدریں مشترک ہیں۔ مثلاً ہر مذہب ایک یا کئی مافوق الفطرت قوت یا قوتوں کا قائل ہوتا ہے۔ اس قوت کو انسان پر اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد روحانی دنیا میں بھی اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اس کے دائرہ عمل اور اختیارات کا تعین ہر مذہب جدا جدا کرتا ہے۔ ان کے نام اپنے ذوق کے مطابق رکھتا ہے لیکن پرستش اسی اختیار قوت کی ہی کرتا ہے۔ ہر عالمی مذہب حیات بعد الممات کا قائل ہے۔ کہیں یہ حیات ایک بار اور کہیں بار بار مصور ہوتی ہے۔ کوئی مذہب اس حیات کو مادی جسم کے ساتھ اور کوئی روحانی جسم کے ساتھ خیال کرتا ہے۔ ہر مذہب نے کچھ اخلاقی اور روحانی اقدار مقرر کی ہیں۔ ان اقدار پر عمل پیرا ہونا باعث ثواب اور روگردانی کرنا باعث عذاب ہوتا ہے۔ اقدار پر عمل پیرا ہونے میں نجات کا انحصار ہوتا ہے۔ ہر مذہب اپنے ماننے والوں کو اپنے حلقہ اثر میں رکھتا ہے اور دوسرے تمام مذاہب کے اثرات کو ناپسند کرتا ہے، وغیرہ۔

اس اعتبار سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر مذہب ایک دوسرے کا خوشہ چیں ہے۔ اسلام۔ کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کلیتہاً ایک نیا مذہب ہے۔ اس کے برخلاف اس کی تعلیم یہ ہے کہ توحید پسندی دین فطرت ہے۔ تمام انبیاء سابقین موحد تھے اور ایک خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان انبیاء کے گزر جانے کے بعد معاشرہ رفتہ رفتہ توحید سے غافل ہو جاتا تھا۔ اور انہیں از سر نو توحید کی راہ پر لانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ابتدائے نسل انسانی سے چلا آتا ہے۔ اس اعتبار سے عقیدہ توحید ازلی ہے، کوئی نیا نہیں۔ اگر یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام کا عقیدہ توحید اور انبیاء سابق کا عقیدہ توحید ایک ہی ہے تو یہ عین حقیقت ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اسلام نے یہ عقیدہ یہود و نصاریٰ سے یا مشرکین عرب سے حاصل کیا ہے تو یہ بالکل غلط ہے۔ دین اسلام عقیدہ توحید کی بنیاد پر ہی استوار ہوا ہے، لیکن اگر اسکی بنیاد یہود و نصاریٰ کا عقیدہ توحید ہوتا تو اسلام کی نوعیت ان مذاہب سے اس قدر جدا گانہ نہ ہوتی۔

توحید اسلام: (لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ) زندگی کا فطری قانون جلب منفعت اور دفع ضرر ہے۔ کمزور نے فقر و احتیاج رفع کرنے کے لیے ہر نفع بخش طاقت کو اور اپنی حفاظت کی خاطر، ہر ضرر رساں قوت کو الہ قرار دے دیا۔ اس سے ذل و افتخار کی نسبت قائم کی، اور اس کے آگے سجدہ ریز ہو کر خود کو ذلیل کیا۔

لا الہ کے عقیدے نے انسان کو ان تمام فرضی خداؤں سے نجات دلادی اور لا الہ کے اثبات نے اسے ایک ذات واحد سے جو تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے، وابستہ کیا۔ اسے عزت نفس دی، آزادی، بے خوفی اور قوت

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

عطا کر کے نفس مطمئنہ عطا کیا۔ اس کی عبادت، اس کی فرمانبرداری اور اس کے حکم کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پابند کیا۔ اس کی کائنات میں اس کا بندہ نائب ہوا۔ اسے رب کے عطا کردہ اختیارات میسر آئے اور بندہ اپنے اعمال کا جوابدہ اپنے رب کے ہی سامنے ٹھہرا۔ سعادت اس کے لیے نصیب ہوئی اور بے حیثیت اس کے لیے متردک ہوئی۔

توحید اگر بنیادی عقیدہ ہے، عمل کا مرکز ہے تو مسئلہ علم الکلام بھی ہے۔ توحید اسلامی کی دو عینیں صرف حیات انسانی پر ہی نہیں بلکہ کائنات پر بھی محیط ہیں۔ چند الفاظ میں توحید یہ ہے کہ اللہ کی ذات واحد کو اس کی صفات کے ساتھ تسلیم کیا جائے۔ اگر مخلوق کی صفات اس کے ساتھ وابستہ کی جائیں تو یہ تجسیم اور اگر اللہ کی صفات کسی مخلوق کے ساتھ وابستہ کی جائیں تو یہ شرک ہوگا۔ تجسیم و شرک دونوں ہی توحید سے خارج ہیں۔

صفات : لا الہ الا هو، هو الٰہی القیوم، هو الظاہر و هو الباطن، وہی اوّل وہی آخر، وہی خالق کائنات، اس کا علم کائنات سے وسیع تر، لا مکال ولا زماں وہی، نور وہی حق وہی، ہر جگہ موجود، قید مکانی سے منزہ، قادر مطلق، کوئی کمزوری اس سے تعلق نہیں رکھتی، وہی رب جو کائنات کے ذرے ذرے کو تربیت دیتا ہے اور اسی تربیت کے طفیل ان کے ربط باہمی کا ظہور ہے اور اسی ربط سے کائنات کی فعالیت کا وجود ہے۔ وہ رحیم وہ رحمن، وہ کریم وہ بخشنہ و غفار، وہی نجات دینے والا، نہ اس کو کوئی پیدا کرنے والا، نہ اس کا کوئی بیٹا یا رشتہ دار، نہ اس کا کوئی شریک نہ مقابل، نہ مثل ہے نہ ضد، نہ صورت ہے نہ شکل، نہ جسم ہے نہ اعضاء، نہ جسد ہے نہ نہایت، نہ اس کی بدایت ہے نہ غایت، تمام قیود سے آزاد، قید اطلاق سے بھی منزہ، باعتبار ذات نامعلوم و ناقابل فہم انسانی، جسے صرف اس کی صفات سے جانا جاسکتا ہے، ذات سے صفات قائم، ذات میں وحدت، صفات میں کثرت، ذات غیر متبدل، صفات میں تغیر، ذات کو اجمال و تفصیل نہیں، صفات کو اجمال و تفصیل، تخلیق بھی اسی کی صفت، تغیر بھی اسی کی صفت، مخلوق کی بوسیدگی اور معدومیت بھی اسی کی قدرت، معدومیت کے اسباب اسی کے پیدا کردہ، وہ خود قادر مطلق، تاہم مخلوق کی محدود دائروں میں صفت قدرت اسی کی عطا کردہ، وہی عادل وہی منصف۔ غرضیکہ تمام دین اسلام کا انحصار توحید پر ہی ہے۔ عبادت کی بنیاد توحید، سعادت کا حصول توحید۔ توحید بمنزلہ دل ہے کہ درست ہو تو تمام بدن درست اور یہ فاسد ہو تو کل وجود فاسد۔

یہود کا تصور توحید : اس عظیم تصور توحید کو یہود و نصاریٰ یا عرب مشرکین کے تصورات سے ماخوذ قرار دینا صریحاً ناانصافی ہے۔ سوال یہ ہے کہ خود انہیں یہ تصور کہاں سے ملا؟ کیا یہ ان کی اپنی فکر کا نتیجہ تھا۔ اگر تھا تو فکر کا مبداء کیا تھا۔ جس مبداء فکر نے انہیں، موجودہ مبہم و نامکمل، اور ہمارے یقین کے مطابق ابتداء مکمل تصور جو بعد میں مسخ ہو گیا، عطا کیا تھا اسی مبداء فکر نے اسلام کو بھی یہ تصور عطا کیا۔ یہ مبداء فکر ذات مطلق، علیم و خبیر کی ہے۔ مروجہ مذاہب عالم میں مذہب یہود قدیم ترین مذہب ہے جو صرف ایک خدا کی پرستش کا حکم دیتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کی کتب مقدسہ خدا کے صحیح تصور سے نا آشنا ہیں۔ یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت ابراہیمؑ، حضرت اٹھؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت موسیٰؑ نے اپنی اہم کو یہ نامکمل تصور دیا ہوگا۔

اسی باعث یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان انبیاء نے جو صحیح تصوّر ذاتِ باری تعالیٰ کا امتّ یہود یہودیہ کو دیا تھا اس تصوّر کو وہ اس کی صحیح روح کے ساتھ محفوظ نہ رکھ سکے، بلکہ اس سے اپنے ذوق کے مطابق ایک ایسا خدا بنالیا جس کی صفات یہ ہیں۔

۱۔ **متذنب خدا:** قادرِ مطلق تو ہے، حکیمِ مطلق نہیں۔ کتابِ پیدائش بابِ اوّل کا مطالعہ یہ تاثر پیدا کرتا ہے کہ عملِ تخلیق میں خدا مصروف ہے، اپنی تخلیق کے بارے میں اسے اندیشہ ہے کہ کہیں نتائج خلافِ منشاء نہ برآمد ہوں۔ تخلیقی مدارج کے بعد وہ تخلیق کا معائنہ کرتا نظر آتا ہے۔ جب نتائج حسبِ منشاء ملتے ہیں تو وہ مطمئن ہوتا ہے۔ چھ دن کی تخلیقی محنت کے بعد ساتویں دن آرام کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ گویا تھکن اور اضمحلال کے عوارض کا بھی اس سے تعلق ہے۔ وہ ہمہ توانا نہیں۔

۲۔ **شرکت دار خدا:** یکہ و تنہا نہیں، اس کے کچھ شریک کا بھی ہیں جن میں ایجنہ اس کی صفات موجود ہیں۔ ”اور خداوند خدا نے کہا، دیکھو انسان نیک و بد کی پہچان میں ”ہم میں سے ایک“ کی مانند ہو گیا۔ اب کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اپنا ہاتھ بڑھائے اور حیات کے درخت میں سے بھی کچھ لے کر کھائے، اور ہمیشہ زندہ رہے۔“ (پیدائش، باب ۳، درس ۲۲)

یہاں نہ صرف وحدتِ معرض بحث میں آ جاتی ہے بلکہ مقدرت بھی کہ حیاتِ ابدی کا تعلق خدا کے بجائے حیات کے درخت سے تھا جس سے کچھ کھا کر انسان لافانی ہو سکتا تھا۔ اور اس کا علاج صرف یہ تھا کہ انسان کو باغِ عدن سے نکال باہر کیا جائے۔ (ملاحظہ ہو، پیدائش، باب ۳، درس ۲۳)

۳۔ **ترساں خدا:** یہود کا خدا انسان سے ترساں یعنی خوفزدہ ہے۔ اس کی ایک مثال تو اوپر آ چکی ہے۔ اس کا ترساں ہونا ان سطور سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

”اور خداوند نے کہا دیکھو یہ لوگ سب ایک ہیں اور ان سبھوں کی ایک ہی زبان ہے۔ وہ جو کچھ یہ کرنے لگے ہیں تو اب کچھ بھی جس کا یہ ارادہ کریں ان سے باقی نہ چھوٹے گا۔ سو آؤ ہم وہاں جا کر ان کی زبان میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھ سکیں۔“ (پیدائش، باب ۱۱، درس ۶ تا ۷)

۴۔ **پشیمان خدا:** یہ ایک ایسا خدا ہے جو پشیمان بھی ہوتا ہے۔

”تب خداوند انسان کو زمین پر پیدا کرنے سے ملول ہوا اور دل میں غم کیا۔ اور خداوند نے کہا ”میں انسان کو، جسے میں نے پیدا کیا ہے روئے زمین پر سے مٹا ڈالوں گا۔“ (پیدائش، باب ۶، درس ۶ تا ۷)

”اور خداوند نے ان کی (سوختنی قربانی کی) راحت انگیز خوشبو لی، اور خداوند نے اپنے دل میں کہا کہ انسان کے سبب میں پھر کبھی زمین پر لعنت نہ بھیجوں گا۔ کیونکہ انسان کے دل کا خیال لڑکپن سے برا ہے۔ اور نہ پھر سب جانداروں کو جیسا اب کیا ہے، ماروں گا۔“ (پیدائش، باب ۸، درس ۲۱)

۵۔ **باددہانی کا ضرور تمند خدا:** یہود کا خدا جو عہدِ باندھتا ہے اس کو یاد رکھنے کے لیے اسے نشانِ مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گویا عارضہٴ نسیان کا اس کے ساتھ تعلق ہے۔

”اور کمانِ بادل میں ہوگی اور میں اس پر نگاہ کرونگا، تاکہ عبد کو یاد کروں۔“ (پیدائش، باب ۹، درس ۱۶)

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

۶۔ نسل پرستی کا حامی خدا: یہود کا خدا صرف بنی اسرائیل کا خدا ہے۔ وہ بنی نوع انسان کا خدا

نہیں۔ صرف بنی اسرائیل اس کی محبوب قوم ہے۔ بقیہ نوع انسانی اس کی مغضوب ہے۔ اس تصور نے بنی اسرائیل میں شدید قسم کی نسل پرستی کو جنم دیا۔ یہود برہمنوں کی طرح اپنے آپ کو نوع انسانی سے افضل و برتر سمجھتے ہیں۔ خود کو خدا کے بیٹے کہتے ہیں۔ بقیہ عالم انسانیت اس فضیلت سے محروم ہے۔

۷۔ مغضوب الغضب خدا: یہود کا خدا، خدائے جنگ ورت الافواج ہے۔ مغضوب الغضب ہے۔

اس کے مغضوب الغضب ہونے کے حوالے تو رات کی پانچویں کتابوں میں کبھرے ہوئے ہیں۔ اس کا حکم ہے کہ مفتوحین میں سے کسی کو زندہ نہ رہنے دیا جائے۔ شہر جلا کر راکھ کیے جائیں۔ مفتوح کا مال و متاع لوٹ لیا جائے۔ (استثناء، باب ۷، درس ۱۶ اور ۱۷، باب ۲۰، درس ۱۱ تا ۱۲)

۸۔ مجسم خدا: یہود کا خدا مجسم ہے جسے رہنے کے لیے مسکن کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسے بنی اسرائیل کے

بزرگوں اور شرفاء نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھا۔ (خروج، باب ۲۴، درس ۱۱ تا ۱۲)

۹۔ محدود طاقت کا خدا: یہ مجسم خدا محدود جسمانی طاقت کا حامل ہے جو رات بھر حضرت یعقوب سے

کشتی لڑتا رہا اور صبح تک انہیں نہ چھوڑا۔ صبح ہوتے اپنی جان چھڑانے کے لیے اس نے یعقوب کی ران کی نس دبائی جس کے صدمے سے انہوں نے خدا کو چھوڑ دیا۔ اس زور آزمائی کی بدولت ہی انہیں اسرائیل کا لقب ملا جس کے لفظی معنی 'خدا سے زور آزمائی کرنے والا' ہیں۔ جس مقام پر یہ کشتی ہوئی اس کا نام 'فنی ایل' یعنی 'خدا کا دیدار رکھا گیا۔ اس واقعے کی یادگار میں ران کی اندرونی نس یہود پر حرام ہوئی۔ (دیکھیے پیدائش، باب ۳۲، درس ۲ تا ۳۱)

۱۰۔ پڑوسیوں کو لوٹنے والا خدا: یہود کا خدا غیروں کی دولت ہتھیانے کی تعلیم دیتا ہے۔

”اور یوں ہوگا کہ جب تم نکلو گے تو خالی ہاتھ نہ نکلو گے۔ بلکہ تمہاری ایک ایک عورت اپنی اپنی پڑوسن سے اور اپنے اپنے گھر کے مہمان سے سونے چاندی کے زیور اور لباس مانگ لے گی۔ ان کو تم اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو پہناؤ گے اور مصریوں کو لوٹ لو گے۔“ (خروج، باب ۳، درس ۲۲)

مندرجہ بالا مثالیں اس امر کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ یہود کی نظر میں ان کے خداوند خدا کا کیا مقام تھا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ بت پرست نہ تھے، ایک خدا کے قائل تھے، جس کی الوہیت میں فرشتے بھی شریک تھے۔ ان کے نظریہ توحید اور بت پرستوں کے دیومالائی قصوں میں کافی مماثلت پائی جاتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہود کسی مورت کو سامنے نہیں رکھتے تھے۔

نظریہ توحید کا ارتقاء: یہود کا نظریہ توحید ہزار ہا سال کے ارتقائی منازل کا حامل نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰ

سے قبل کثرت پرستی پائی جاتی تھی۔ مشاہیر پرستی اور آباء پرستی بھی ہوتی تھی۔ ہر خاندان کے دیوتا جدا جدا تھے۔ شجر اور حیوان، مثلاً سانپ بھی معبود تصور ہوتے تھے۔ توحید کی تجدید کے بعد دیوتاؤں کے نام مٹو ہو گئے، تاہم عمل

اور مولک کے نام کتاب مقدس میں پائے جاتے ہیں جن کی پرستش ممنوع قرار دی گئی۔ ایک قدیم دیوتا ایل شدوا کی تھا۔ یہی آگے چل کر 'یہواہ' ہوا۔

”یہواہ“: یہواہ کب اسرائیلیوں کا معبود بنا اس میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک حضرت موسیٰ کے زمانے میں، کیونکہ تورات کے مطابق حضرت یعقوب کے زمانے تک بنی اسرائیل اس کے نام سے ناواقف تھے۔ ایک طبقے کے نزدیک یہ میدان کا قبائلی دیوتا تھا۔ بہر حال 'یہواہ' کی ذات پر یہود کا اجماع، توحید ناقص پر دلیل ہے۔ گو وہ خود صرف اسی کی عبادت کرتے تھے مگر یہ یقین بھی رکھتے تھے کہ دوسری اقوام کے معبود جدا جدا ہیں۔ گویا وہ یہواہ کے علاوہ بھی دیگر معبودوں کے وجود کے قائل تھے اور لا الہ کے مقام سے ناواقف تھے۔ اس اعتبار سے وہ صرف اپنے قومی خدا کی پرستش کرتے تھے جو ان کا محافظ تھا اور انہیں فتح و نصرت سے ہمکنار کرتا تھا۔ اس توحید میں آفاقیت نہیں صرف قبائلیت کا رفرما تھی۔ تصور یہ تھا کہ یہواہ دیگر معبودوں سے زیادہ مقتدر ہے۔ یہواہ کا ایک حریف 'الوہ' تھا، چنانچہ تورات میں دونوں کا ہی نام آتا ہے۔ اور آخر میں 'الوہ' کا نام ختم ہو کر یہواہ کا ہی نام رہ گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہواہ اور 'الوہ' کے پرستاروں میں کشمکش ہوئی۔ 'الوہ' کے پرستار ہار گئے اور یہواہ کا اقتدار مسلم ہو گیا۔ یہواہ انسانی صفات کا حامل تھا۔ ابتداء پتھر پر، پھر چٹان پر اور پھر خیمے میں مقیم رہتا تھا۔ جب بیکل سلیمانی بن گیا تو اس میں مستطاب سکونت پذیر ہوا۔ یہ خدائے جنگ تھا۔ اس کا اختیار صرف زندہ لوگوں پر نظر آتا ہے۔ موت کے بعد اس کا کسی سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

بعد کے ادوار میں یہواہ کی صفات میں اضافہ ہوا۔ اس کے باوجود وہ شام کو ہوا خوری کے لیے نکلتا۔ اس نے حضرت نوح کو شرف ہمر کا بی بخشا۔ حضرت یعقوب کو زور آزمائی سے مشرف کیا اور حضرت ابراہیم سے ہم طعام ہوا۔ قومی تکیہ نظر کے باعث یہواہ صرف یہود کا خدا تھا اور یہود صرف یہواہ کی قوم تھی۔ اس کی منظور نظر، اس کی روحانی اولاد، اس کی اکلوتی قوم۔ جب ارتقائی منازل طے کرنے کے بعد یہواہ خدائے واحد کے مقام پر فائز ہو گیا تب یہ عقیدہ عام ہوا کہ وہی سب کچھ کرتا ہے۔ حمد و ثنا کے ساتھ دعائیں بھی شریک ہوئیں اور خوف کے ساتھ خجست کا عنصر بھی جھلکا۔

عرب جاہلیہ: عرب جاہلیہ کی توحید جس کا ذکر مغرب کرتا ہے، سرے سے توحید ہی نہ تھی۔ عرب میں پوجے جانے والے چوبیس بتوں کے نام تاریخ نے محفوظ رکھے ہیں۔ ان کے علاوہ سورج، چاند، شعری، عطار اور مشتری کی پرستش کا بھی رواج تھا۔ بعض شجر بھی پوجے جاتے تھے۔ اللہ کو بھی وہ معبود اعظم کی حیثیت سے جانتے تھے، جس کا کہیں کوئی بت نہیں تھا اور جس کی عبادت کے کوئی آثار نہیں ملتے۔ تصور یہ تھا کہ تمام بڑے کاموں کی تدبیر اللہ کرتا ہے لیکن چھوٹے امور ان دیوی دیوتاؤں کے سپرد تھے جن سے مختلف صفات الوہیت منسوب کر رکھی تھیں۔ یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ ان کے ذریعے قرب الہی میسر آ سکتا ہے اور ان کی سفارش موجب نجات ہے۔ محض اللہ کے نام سے واقفیت اور اس کو معبود تسلیم کرنے کو مغرب توحید قرار دیتا ہے گویا شرک جلی اور توحید مطلق میں انہیں کوئی امتیاز ہی محسوس نہیں ہوتا۔

نصاری کی توحید: اسلامی عقیدہ توحید کی رو سے نصاریٰ کا عقیدہ، توحید نہیں تثلیث ہے۔ انہوں نے یہودی عقیدہ توحید سے بھی صریحاً روگردانی کی۔ ایک انسان کو صفات الوہیت سے متصف کر کے اسے خدا کا بیٹا بنالیا۔ اور ایک فرشتے سے یہی صفات متصف کر کے تثلیث کے اقامیم ثلاثہ میں اسے داخل کیا۔ اگر یسوع اور روح مقدس کی الوہیت سے انکار کریں تو عیسائی نہیں رہ جاتے اور اگر اقرار کرتے ہیں تو موحد کی تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں۔ لیکن دعویٰ توحید کا عیسائی بھی کرتے ہیں۔ توحید فی التثلیث اور تثلیث فی التوحید کے لفظی ہیر پھیر کے ذریعے وہ یہ باور کراتے ہیں کہ یسوع اور روح القدس ایک ہی ذات کے مظہر ہیں اور اسی کے جزو ہیں۔ اسی ایک سے یہ تین ہوئے اور ان تینوں سے وہ ایک ہے۔ عیسائی توحید سے اگر اسلام متاثر ہوتا تو روح القدس اور یسوع کی الوہیت کا بھی قائل ہوتا۔ (یہ کیسا اثر ہے کہ بنیادی عناصر کو ہی غائب کر دیا گیا ہے۔) یہاں تو توحید مطلق کے بارے میں ”لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُولَدْ“ کے الفاظ نے اس قسم کی کسی بھی فلسفیانہ موشگافی کی گنجائش بالکل ہی ختم کر کے رکھ دی ہے۔ یہ تو واضح طور پر عیسائی نظریے کی تردید ہے نہ کہ خوش چینی۔

عیسائی تثلیث بھی ایک ممتہ ہے۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ اول سنہ عیسوی سے چار یا سات سال قبل، یہود میں ایک نبی پیدا ہوا۔ یہود ایک میسحی آمد کے منتظر تھے۔ انہوں نے اپنی توقعات اس نبی (حضرت عیسیٰ) سے وابستہ کیں لیکن جب وہ پوری ہوئی نظر نہیں آئیں تو ان کی نبوت پر شک کیا۔ یہودی شریعت کی رو سے جھوٹا مدعی نبوت موت کا سزاوار ہوتا ہے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ پر مقدمہ چلا کر اپنی دانست میں شریعت کے تقاضے پورے کر لیے۔ تو رات صرف ایک خدا کا تذکرہ کرتی ہے۔ اس کے بیٹے کے تصور سے نا آشنا ہے۔ لہذا کوئی یہودی اپنے آپ کو معنوی بیٹے سے بڑھ کر جسمانی یا حقیقی بیٹا تصور نہیں کرتا۔ حضرت عیسیٰ نے تورات کی تصدیق کی اور اس کی توحید کا احیاء کیا۔ وہ کس طرح خدائی کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ ان کے چلے جانے کے بعد ایک دوسرا یہودی پال اٹھا۔ اس نے یہودی نبی کو خدا بنا ڈالا۔ پال افلاطون کے فلسفے سے بخوبی واقف تھا۔ مشرق وسطیٰ، مصر، یونان اور روما کے عقائد سے واقف تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اگر تثلیث کا عقیدہ پیش کیا جائے تو اس کی قبولیت عامہ کے امکانات روشن ہیں۔ وہ افلاطون کے فلسفہ تثلیث کو اس وقت تک عملی جامہ نہیں پہنا سکتا تھا جب تک یہودی مذہب سے قطع تعلق نہ کر لے۔ چنانچہ اس نے یہودی خول کو توڑا، اور تورات کی شریعت کو لخت قرار دیکر اس سے پیچھا چھڑایا۔ اس نے ایک ایسا عقیدہ تثلیث دیا جس میں شام، فرسیجا، مصر، عراق، یونان اور رومہ کے مروجہ عقائد تثلیث کو ضم کرنے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ پرانے دیوی دیوتاؤں کے ناموں کی جگہ پال کے اقامیم ثلاثہ نے لے لی۔ صرف نام بدلے، کافرانہ عقائد جن کے توں قائم رہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ عقیدہ توحید کا تثلیث سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا توحید کو عیسائیت کے اثرات کہنا آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہے۔

پس ہم اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ اسلام کو عقیدہ توحید کسی بھی مروجہ مذہب سے وراثت میں نہیں ملا۔

اس کا تعلق انسانی فکر کے ارتقاء سے نہیں ہے بلکہ براہ راست وحی سے ہے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اسلام کے ارکانِ عبادت

مستشرقین کی جانب سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ قرآن کی مختلف اصطلاحات غیر مذاہب اور غیر زبانوں سے مستعار ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ برآمد کرنا مقصود ہوتا ہے کہ جب الفاظ مستعار ہیں تو ان کے معنی اور مفہوم بھی درآمد کیے گئے ہیں۔ گویا اسلام دیگر مذاہب کا محض چرہ بہ ہے۔ پچھلے باب میں کریم کا تذکرہ آچکا ہے جس میں اس نے اسلام کو ایک ایسا مذہب قرار دیا ہے جو مختلف مذاہب کے اشتراک سے بنا ہے۔ شارٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں قرآن کے مختلف الفاظ اور اصطلاحات کو ہیرونی الفاظ اور اصطلاحات کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔

۔ (cf. Shorter Encyclopedia of Islam; article 'Quran', pp. 273-274)

مثلاً

ارامی سے مشتق اللہ-الابا، اُمت-اُمتہ، سجدہ-سکد، کرسی-کریسا، مدینہ-مدینہ، مسجد-مسکد، ملت-ملا
عبرانی سے مشتق اُمت-امہ، آیت-اوت، جبروت-حمروت، جہنم-گہنم، صدقہ-صداقہ،
صلوٰۃ-صلوتا، عاشوراء-عاشور، قرآن-کریانا، قربان-قوربان، کروبیون-کروبین،
ملت-ملہ، مہر-موہار، نبی-نابی
سریانی سے مشتق دجال-دگالے یا دعالے، فرقان-فرکانا، مہر-مہرہ
حبشی سے مشتق سجدہ-مگاد، منافق-منافق
فارسی سے مشتق برزخ-فرخ
سامی سے مشتق ملائک-ملک

ان کا مابانی الضمیر یہ ہے کہ جس مذہب کے پاس اس کے اپنے الفاظ نہیں ہیں وہ ان تصورات سے بھی بیگانہ تھا۔ چونکہ اللہ، قرآن، صلوٰۃ، سجدہ، ملائکہ، مسجد، آیت اور قربان جیسے بنیادی الفاظ مستعار ہیں اس لیے یہ سارے تخیلات اور ارکانِ عبادت ان مذاہب سے مستعار ہیں جن میں یہ الفاظ پائے جاتے تھے۔ ان الفاظ میں سے بیشتر چونکہ عبرانی سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے یہ سب اثرات یہود کے مذہب سے قبول کیے گئے ہیں۔ اسی اندازِ فکر کے باعث کاتبانی، وینسک اور بول (Buhl) نے روزے کو عیسائی، مجوسی اور عرب بت پرستوں کی عبادت قرار دیا۔ (cf. Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.203)

بول نے جنگِ بدر کو حضرت موسیٰ کے خروج کی مناسبت سے فرقان کہا کہ جس طرح حضرت موسیٰ نے خروج کی کامیابی پر عاشوراء کے روزے رکھنے کا حکم دیا تھا اسی طرح بدر میں کامیابی پر رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا گیا۔ (cf. Buhl; Origin of Islam, p.124)۔ حالانکہ روزے جب بدر سے قبل فرض

ہو چکے تھے اور ۱۷ رمضان ۳ھ کو جب جنگ بدر ہوئی تو روزے رکھنے جارہے تھے۔ بیت المقدس کو قبلہ قرار دینے میں بھی انہیں یہی اثرات کا فرما نظر آتے ہیں۔ مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کو یہود کے ہیکل کا اثر کہا گیا۔

(cf. Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.200)

کعبے کی حرمت، طواف اور حج کو تو شعائر جاہلیہ قرار دیا ہی جا چکا تھا، زکوٰۃ کو سریانی اور عبرانی زبانوں کا لفظ قرار دیکر جس کے معنی ان زبانوں میں اعلیٰ اخلاق کے آتے ہیں، اسے بھی سریونی اثر قرار دیا گیا۔ جہاد تو ان کے نزدیک نہایت ہی ناپسندیدہ فعل ہمیشہ سے رہا ہے، اسے تو مذہبی عمل سے خارج قرار دیا گیا۔ حنیف کے لفظ سے عرب واقف ہی نہ تھے، یہ لفظ سریونی زبانوں میں بے دین، بدعتی اور منافق کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا، لہذا اسلام، جو خود کو دین حنیف کہتا ہے، بے دینی، بدعت اور منافقت کا دین ہوا۔

تارا ندرے نے اخلاق کے موضوع پر یہ فیصلہ کر دیا کہ اسلام کی مذہبی قدریں، مثلاً دنیاوی مال و دولت سے بیزاری، غرور سے نفرت، بے دینوں سے لاتعلقی، ہنسی ٹھٹھے سے گریز، مذاق اور غیر محتاط گفتگو سے پرہیز، خیرات کی اہمیت پر زور، گناہوں کا کفارہ، جنت کا تحنیل، یہ سب کے سب شامی عیسائیوں (نسطوریوں) کی تحریروں سے بھرپور مماثلت رکھتی ہیں۔ (Shorter Encyclopedia of Islam, p.393)

الفاظ کی مماثلت : ۵۲۰۰ قبل مسیح تا ۱۵۰۰ قبل مسیح جو تو میں شام، فلسطین، عراق، عرب، فنیشیہ، اور مصر میں آباد تھیں ان کے کردار، زبان، عقاید اور معاشرت میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس کے سبب یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ تمام اقوام جو بابلی، آسوری، کلدی، آموری، عبری، عربی اور مصری کہلاتی تھیں، سب کی سب ایک نسل سامی سے تھیں۔ سامی نسل کا اصل وطن کہاں تھا، ماہرین اس ضمن میں مختلف الحیال ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ یہ شمالی افریقہ سے پھیلے۔ دوسرا گروہ جو عہد نامہ متیق سے متاثر ہے ان کا اصل وطن دجلہ و فرات کی وادی کو قرار دیتا ہے۔ ان دعویٰ کو قبول کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسانی معاشرے نے زرعی زندگی اختیار کرنے کے بعد بدوی زندگی اختیار کی۔ یہ طریقہ عمل قانون ارتقاء کے خلاف ہے۔

اب مؤرخین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ،

”سامی تہذیب کا گہوارہ یہی خطہ عرب تھا۔ اسی نے ان سپوتوں کو پروان چڑھایا جو ترک وطن کر کے ہلال تہذیب میں آئے اور بعدہ فنیقی، شامی اور بابلی کہلائے۔ یہی لوگ تاریخ کے عبرانی لوگ ہیں۔ سامی تہذیب کی اسی سرزمین سے یہودیت کے آثار نمایاں ہوئے۔ یہیں عیسائیت پروان چڑھی۔ اسی ریگزار سے ایک نیا مذہب اسلام ابھرا۔“ (Phillips K. Hitti; History of Arabs, p.3)

جب سامی نسل عرب کے ریگزاروں سے نکلی ہوگی تو وہی زبان لے کر نکلی ہوگی جو اس دور میں عرب میں بولی جاتی تھی۔ بعد کے ادوار میں ان زبانوں میں تبدیلی آتی گئی اور یہ زبان آرامی کہلائی۔ یہ حقیقت ہے کہ شام و عراق اور عرب تینوں جگہ آرامی رائج تھی۔ شامی آرامی سے عبرانی، بابلی آرامی سے کلدانی، اور عربی آرامی سے عربی وجود میں آئی۔ عرب کے یمنی قبائل نے حبشہ میں اپنی نوآبادیاں قائم کیں تو ان کی زبان اور مقامی زبان

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

کے اشتراک سے حبشی زبان نے ترقی کی۔ یہاں تک کہ علمائے لسانیات حبشی زبان کو عربی زبان کی شاخ قرار دیتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو مولانا سید سلیمان ندوی: 'ارض القرآن'، باب 'زبانیں')۔

وہ قومیں جو عرب سے باہر نکل گئیں اور جنہیں بیرونی اقوام سے سابقہ پڑا، ان کی زبانیں آہستہ آہستہ بیرونی اثرات کے تحت تبدیل و تغیر کا شکار ہوئیں، لیکن وہ لوگ جنہوں نے عرب میں ہی بود و باش رکھی ان کی زبان بیرونی اثرات سے بڑی حد تک محفوظ رہی۔ گویا انہوں نے اصل سامی زبان یا آرامی زبان کو تغیر و تبدل سے محفوظ رکھا۔ لہذا ایک ہی اصل زبان کی مختلف شاخوں میں اگر الفاظ مشترک ملتے ہیں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ جس طرح مغرب ان الفاظ کو غیر زبانوں کے الفاظ کہنے پر مصر ہے اسی طرح اگر دعویٰ کیا جائے کہ یہ سارے اصلا عربی الفاظ ہیں، جنہیں حبشی، آرامی، سریانی اور عبرانی زبانوں نے مستعار لے رکھا ہے تو بعید از قیاس نہ ہوگا۔

بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ الفاظ سے پہلے ان کے اصطلاحی معنی اور مطالب اخذ کیے گئے، اور چونکہ ان کے لیے متبادل الفاظ میسر نہ تھے اس لیے انہی الفاظ کو قائم رکھا گیا۔ لیکن اگر عربی لغات اور عبرانی لغات کا موازنہ کیا جائے تو روزمرہ کے استعمال اور بنیادی ضروریات کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ مشترک پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آب، ارض، اسیر، امر، ام، امہ، برد، برق، برکت، بطن، بکا، بکر، بن، بنت، بہق، بہیمہ، بئر، بیت، بیضہ، تلمیذ، تنور، جبل، جبل، حرم، حکمت، حشر، حکیم، دم، ذنب، زرع، ستر، سفیل، سفینہ، سکت، طعم، طعن، طہر، طول، عبد، عتیق، عقب، عقد، عقرب، عمل، عنب، عتق، عین، کبد، کبش، کبیر، کتاب، کذب، کرم، کنز، کوکب، لبن، لحم، لعب، لعن، لہب، ماء، ملح، مر، مسکن، ملک، ملبوس، من، موت، نصر، نہار، نہر، نور، ہوا، ولد، ید، یلد، یم، یمنین، یوم، وغیرہ وغیرہ۔

کیا ان کے اور ان جیسے الفاظ کے مشترک ہونے کے معنی یہ لیے جاسکتے ہیں کہ عربوں کو ان بنیادی الفاظ کے لیے عبرانی کا منت کش ہونا پڑا، اور ان الفاظ کے متوازی الفاظ عربی میں موجود نہیں تھے۔ یا یہ کہ چونکہ یہ الفاظ عبرانی سے لیے گئے اس لیے ان الفاظ سے متعلق معنی اور تصور بھی مستعار لیا گیا۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ایک ہی شاخ کی دو زبانیں اگر مشترک الفاظ رکھتی ہیں تو اس میں طعن کیا ہے۔ چلیے اگر مغرب کا یہ دعویٰ صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو یہ دیکھنا ہوگا کہ متنازعہ الفاظ عربی میں پہلے سے مستعمل تھے کہ نہیں۔ اس کا جواب خود توری کی زبان سے یہ ہے کہ،

"All the properties of the Quranic diction including the foreign words and proper names, had been familiar in Mekka before he appeared on the scene." (C.C. Torrey; The Jewish Foundation of Islam, 2nd Lecture, 'Genesis of the New Faith'.)

[قرآنی لغت کے تمام عناصر، بمعہ بیرونی الفاظ و اسمائے خاص، ان (محمد ﷺ) کے منظر عام پر آنے سے پہلے سے مکے میں عمومی طور پر رائج تھے۔]

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی کتاب 'الاتقان' میں ایک باب (نوع-۲۸)، قرآن میں مستعمل غیر عربی الفاظ کے لیے وقف کیا ہے، اور تقریباً سو (۱۰۰) ایسے الفاظ بیان کیے ہیں جو عربی الاصل نہیں ہیں۔ امام شافعیؒ، ابو عبیدہؒ اور ابن اوسؒ قرآن میں غیر عربی الفاظ کے استعمال کی سختی سے تردید کرتے ہیں۔ ابن جریر کا قول ہے کہ ان الفاظ میں تو وارد ہو گیا ہے۔ بیشتر علماء اور مفسرین کا مسلک یہ ہے کہ الفاظ معرب ہو چکے تھے۔ عربی بول چال اور اشعار میں کثرت سے استعمال ہونے لگے تھے۔ اس اعتبار سے ایسے تمام الفاظ عربی ہی شمار ہوتے ہیں۔

ارکان عبادت : یوں تو معاندین کی طرف سے اسلام کی تمام عبادتوں کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے لیکن حج اور جہاد خاص طور پر زیر بحث آتے ہیں۔ جب اسلام کا نظریہ یہی ہے کہ آدم سے لیکر خاتم النبیین ﷺ تک تمام انبیائے صادق اللہ کے ہی مبعوث کیے ہوئے ہیں اور ان سب کی تعلیم مشترک ہے، لہذا اگر عبادتوں میں مماثلت پائی جاتی ہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟ یہ حیرت تو اس وقت بجا ہوتی اگر اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ ہوتا کہ یہ ہندو مذہب سے مطلق جدا گانہ ایک نیا مذہب ہے اور اسے کسی اور نبی کی تعلیمات یا دستور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

عبادت معبود کی عظمت و جلال اور قوت و جبروت کے اعتراف اور بندے کی کمتری اور بندگی کے اظہار کا نام ہے۔ یہ اظہار مختلف جذبات کے اظہار کی طرح فطری ہے۔ مختلف جذبات کا اظہار بلا استثناء زمان و مکان انسان، ایک جیسے انداز میں کرتا ہے۔ غصہ ہو خوشی ہو یا رنج، پشیمانی تاسف و ندامت، ہمدردی، محبت و دشمنی، ان سب جذبات کے اظہار میں ہر فرد کی کیفیت کم و بیش یکساں ہوتی ہے۔ ان کیفیات اور اس کے اظہار میں کوئی حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ یہ ایک دوسرے کی تقاضی ہے۔ یہ تو انسانی فطرت کی یکسانیت ہے۔ بندگی بھی فطری جذبہ ہے۔ اس کے اظہار میں بھی یکسانیت فطری ہے۔

اسلام کا دوسرا نام دین ابراہیمی و دین حنیفہ ہے۔ یہودیت و عیسائیت بھی حضرت ابراہیمؑ سے اپنے آپ کو منسوب کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے ان کے ارکان عبادت میں مماثلت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ ان سب کے باوجود علماء اسلام اور دیگر مذاہب کے طریق عبادت میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ [واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی عبادت کی کوشش ہوتی تھی کہ عبادت میں خصوصاً یہودی کی مماثلت سے بچا جائے۔]

اذان : اسلام میں اذان عبادت کے سلسلے کا پہلا قدم ہے۔ یہ فضائے عالم میں بلا انقطاع چوبیس گھنٹے گونجتی رہتی ہے۔ اسے ناقوس، قمرنوں یا گھنٹیوں سے کوئی تعلق نہیں۔

صلوٰۃ : دوسرے مذاہب میں پیشہ و افراد اور معبود کے درمیان حائل ہیں۔ وہاں کوئی عامی اپنے رب سے براہ راست تعلق نہیں پیدا کر سکتا ہے۔ کوئی عیسائی بلا پادری کے عبادت نہیں کر سکتا۔ اور عامی کی عبادت بھی اس کے سوا کیا ہے کہ اتوار (یوم الشمس) کو گر بے میں کچھ دیر کے لیے حاضری دے لے۔ ایک خطبہ سنے۔ اگر استغراق کا اہل ہے تو کچھ دیر استغراق کی کوشش کرے اور پھر لوٹ جائے۔

جماعت، امامت، تکبیر، تثنیہ، قرأت، قیام، رکوع، سجود، قعدہ و سلام کی جو کیفیت اسلام میں ہے، یہ سب کی مماثلت نہیں۔ سب سے اہم یہ کہ ہر فرد اپنی عبادت کے لیے کسی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

پیشہ ورینڈت یا پادری کا محتاج نہیں ہے۔ یہاں چرچ کا کوئی وجود نہیں۔ علماء کا وجود نہایت اہم اور ضروری ہے، لیکن وہ پیشہ ور نہ ہی کارندے نہیں ہیں۔ ان کی عدم موجودگی کے باعث کوئی عبادت بھی متاثر نہیں ہوتی۔

روزہ: روزہ بھی کسی نہ کسی شکل میں ہر مذہب میں پایا جاتا ہے جس کا انشاء تزکیہ نفس ہے۔ اس اشتراک کے علاوہ اور کوئی مماثلت اس عبادت کی کسی اور مذہب سے نہیں۔ ایک ماہ کے مسلسل روزے، فجر نئے لیکر مغرب تک خورد و نوش سے پرہیز، ہر برائی سے دامن کشی، عبادت میں انہماک، اور کہاں ہے؟ پھر یہ عبادت اختیاری نہیں بلکہ ہر بالغ مسلمان مرد و عورت پر فرض عین ہے۔ پوری امت ساری دنیا میں بیک وقت اللہ کے حکم کی بجا آوری میں صائم ہو جائے، اس کی نظیر دیگر ادیان میں اگر پائی جائے تب ہی اس کا مستعار ہونا محال غور ہو سکتا ہے۔

زکوٰۃ: یہ ایک مالی عبادت ہے، ٹیکس نہیں۔ صدقہ اور خیرات نہیں۔ حکم خداوندی کے تحت مال کو بھی پاک کیا جاتا ہے۔ اگر مال کا تزکیہ نہ کیا تو وہ مال طیب نہیں رہ جاتا۔ نہ جانے اس تصور کو کس اعتبار سے شامی عیسائیوں سے منسوب کیا جاسکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان میں بھی خیر خیرات کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ دان پن کا تصور نہایت قدیم سہی لیکن تزکیہ مال کا تصور اسلام کے سوا اور کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔

جہاد: مسبب الاسباب پر کھلی توکل کا فطری نتیجہ یہی ہے کہ انسان کے ذمے صرف پر خلوص کوشش رہ جاتی ہے۔ اس کوشش کے نتائج و عواقب کو اس اللہ کی مرضی کا تابع گردان کر، جو فاعل حقیقی، افعال و آثار کا مرجع، حول و قوت کا مبداء ہے، اور تمام امور اس کو تفویض کر کے اس کے احکامات کے مطابق جد و جہد کی ذمہ داری فرد و ملت پر رہ گئی۔ اس ذمہ داری سے پر خلوص، انتھک کوشش کے ذریعے عہدہ برآ ہونے کا نام جہاد ہے۔ جہاد کے متعدد دائرہ ہائے عمل ہیں۔ یہ افراد سے شروع ہوتا ہے اور معاشرے پر محیط ہوتا ہوا بین الملکی حدود تک پہنچتا ہے۔ فرد کا جہاد یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے۔ کردار کی صحیح خطوط پر تعمیر کرے اور حصول سعادت کے لیے کوشاں ہو۔ اندرونی کشمکش میں حق کو باطل پر غالب کرے۔ اپنی قوت بھیمہ کو مغلوب اور قوت ملکیہ کو مستحکم کرے۔ جہاد کا دوسرا دائرہ عمل یہ ہے کہ صرف اپنی ہی نہیں بلکہ معاشرے کی اصلاح کو مد نظر رکھے۔ معاشرے کو باطل اثرات سے پاک کرے اور حق کی سر بلندی کی جد و جہد کرے۔ تیسرے دائرہ کار میں ملت کی فلاح و بہبود آتی ہے۔ پوری ملت اسلامیہ میں باطل کے مقابلے میں حق کی جد و جہد کرنا۔ چوتھا دائرہ کار اسلام اور ملت اسلامیہ کو بیرونی جارحیت سے محفوظ رکھنا ہے۔

جہاد محض قلم سے ہی نہیں، زبان، قلم اور ارادے سے بھی کیا جاتا ہے۔ اللہ کی راہ میں ہر جد و جہد جہاد ہے۔ جہاد صرف وہ ہے جو خالصتاً اللہ کے لیے ہو۔ وہ شخص جو کسی اور نیت سے قتال کرتا ہے مثلاً اپنی شجاعت کے اظہار کے لیے یا قبائلی غیرت کے سبب مجاہدین کے ساتھ ہو، اور وہ اس میں اپنی جان بھی دیدے، تو اس کا یہ عمل جہاد ہرگز نہیں ہوگا۔ کیونکہ نیت کے اعتبار سے وہ راہ خدا میں مخلص نہیں تھا۔ غرضیکہ جہاد ایک عبادت ہے اور دیگر عبادتوں سے افضل۔ اور جہاد کا اعلیٰ ترین مقام حق کی حفاظت کے لیے باطل کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جانا ہے۔

جج : عام طور پر حج کے بارے میں یہ باد کرایا جاتا ہے کہ یہ مشرکین عرب کی ایک رسم تھی، جسے اسلام نے مقامی اثرات کے تحت یا مشرکین عرب کو خوش کرنے کے لیے اپنایا۔ واٹ نے اس مغربی تصور کی ترجمانی یوں کی کہ،
"When one religion replaces another, it usually finds it advantageous to take over the previous observance of sacred places and sacred times and gives it justification from its own tradition. In Islam pre-Islamic rites connected with the pilgrimage to Mecca have been taken over in their external forms, but have been given an Islamic significance."

(Watt, M.; Truth in the Religions, pp. 28-29)

اجب ایک مذہب دوسرے کی جگہ لیتا ہے تو عموماً اسے پچھلے مذہب کے مقدس مقامات اور مقدس ایام کو اپنانے میں فوائد نظر آتے ہیں، لیکن ان ماخوذ چیزوں کو نیا مذہب اپنی تاویلات دیتا ہے۔ اسلام میں زمانہ قبل از اسلام کی مکہ کی زیارت کی رسوم اپنی ظاہری شکل میں اپنالی گئی ہیں۔ لیکن انہیں اسلامی اہمیت دے دی گئی ہے۔

شارٹرانسائیکلو پیڈیا نے ڈوزی کے حوالے سے تمام رسوم حج کو اسرائیلی رسوم سے مماثل قرار دیا۔
 (Shorter Encyclopedia of Islam, p.124)۔ اور مضمون حج میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ حضور ﷺ کا حج کے بارے میں عقیدہ یکساں نہ تھا۔ مکی اور ابتدائی مدنی سورتوں میں حج کے بارے میں کوئی حکم نہیں ملتا۔ نیز یہ کہ مدینے میں بھی حج میں دلچسپی بدر کے بعد نظر آتی ہے۔ چونکہ یہود مدینہ کے معاملے میں سخت ناکامی ہوئی اس لیے ان سے مذہبی رشتہ توڑا۔ اس دور میں مذہب ابراہیمی کا تذکرہ سامنے آیا، اور دعویٰ کیا گیا کہ اسلام اور یہودیت کی حقیقی شکل دین حنیفہ تھا۔ تعمیر کعبہ حضرت ابراہیم و حضرت اسمعیل سے منسوب کی اور کعبہ کو مرکزیت دی۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۲۳)۔ ولہوزن نے حج کو موسیٰ تہوار قرار دیا جو عرب کھجوروں کے پک جانے کے بعد منایا کرتے تھے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۱۲۳)۔

انسائیکلو پیڈیا کا یہ تبصرہ پریشان خیالی اور تضاد بیانی کا شاہکار ہے۔ ولہوزن کی بات مانی جائے تو ڈوزی کا نظریہ مسترد ہو جاتا ہے۔ ڈوزی کا نظریہ قبول کیا جاتا ہے تو انسائیکلو پیڈیا کی ماہرانہ رائے بے معنی ہو جاتی ہے۔ اگر حج یہود سے مستعار ہوتا تو یہود سے مذہبی ناطہ توڑنے کے بعد اس کو اپنانے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی ناطہ کون سا تھا جو توڑ لیا گیا۔ کیا پہلے اسرائیل کے خدا کو خدا کہا گیا پھر اسے تخت الوہیت سے برطرف کر دیا گیا یا اس کا کوئی رقیب کھڑا کر دیا گیا۔ یا شریعت یہود کو تسلیم کرنے کے بعد اس کو لغتی قرار دیا گیا۔ یہ سب کچھ ہوا ضرور، لیکن الحمد للہ کہ یہ داعی اسلام ﷺ نے نہیں بلکہ ساؤل یاپال نے کیا۔

توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانے کی ضرورت ہے کہ حج، خانہ کعبہ، طواف اور قربانی کا احترام ابتدائے اسلام سے ہی پایا جاتا ہے۔ سورۃ قریش جو ابتدائی مکی سورتوں میں ہے، خانہ کعبہ کو بیت اللہ قرار دیتی ہے۔ سورۃ کوثر قرآن کی مختصر ترین سورۃ، جو مکی ہے اس میں نخل یعنی قربانی کا حکم موجود ہے۔ اسلام میں قربانی کا تعلق صرف حج سے ہے۔ کسی اور عبادت کے ساتھ قربانی وابستہ نہیں۔ مکی دور میں حضور ﷺ اور ان کے اصحاب کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

کے طواف کعبہ کے تذکرے موجود ہیں۔ ہجرت مدینہ سے قبل انصار سے دو مرتبہ بیعت لی گئی۔ یہ دونوں بیعتیں بیعت عقبہ کہلاتی ہیں۔ یہ کس مقام پر ہوئیں۔ کیا عقبہ منیٰ کی ایک گھائی کا نام نہیں، اور منیٰ صرف حج کے دوران آباد ہوتا ہے۔ اگر حضور اور ان کے اصحاب عقبہ میں موجود تھے تو یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ مناسک حج ادا کرنا مقصود نہیں تھا۔ تبلیغ تو اور مقامات پر بھی ہو سکتی تھی کہ شرکائے حج، حج سے پہلے اور حج کے بعد مختلف بازاروں اور میلوں میں خاصی مدت قیام کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حج کے واضح احکامات موجود نہ ہونے کے باوجود ہجرت سے قبل بھی حج کو اسلامی عبادت کا مرتبہ حاصل تھا۔

بیعت عقبہ سے قبل چھ [۶] انصار مدینہ نے دعوت اسلام قبول کی تھی۔ بیعت عقبہ اولیٰ میں ان میں سے پانچ [۵] موجود تھے۔ بیعت عقبہ ثانی میں تہتر [۷۳] انصار نے بیعت کی، جن میں گیارہ [۱۱] افراد وہ بھی شریک تھے جو بیعت اولیٰ میں مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ درج ذیل جدول سے یہ کیفیت نمایاں ہوتی ہے۔

شمار	قبل بیعت ایمان لائے	بیعت عقبہ اولیٰ ۱۲؎ نبوی کے شرکاء	بیعت عقبہ اولیٰ اور ثانی ۳۱؎ نبوی میں مشترک
۱	اسعد بن زرارہ	اسعد بن زرارہ	اسعد بن زرارہ
۲	عوف بن حرث	عوف بن حرث	عوف بن حرث
۳	رافع بن مالک	رافع بن مالک	رافع بن مالک
۴	قطبہ بن عامر	قطبہ بن عامر	قطبہ بن عامر
۵	عقبہ بن عامر	عقبہ بن عامر	-
۶	جابر بن عبد اللہ	-	جابر بن عبد اللہ
۷	-	ذکوان بن عبد قیس	ذکوان بن عبد قیس
۸	-	عبادہ بن صامت	عبادہ بن صامت
۹	-	ابو عبد الرحمنؓ یزید بن ثعلبہ	ابو عبد الرحمنؓ یزید بن ثعلبہ
۱۰	-	عباس بن عبادہ	عباس بن عبادہ
۱۱	-	ابو الہیثمؓ مالک بن تیہان	ابو الہیثمؓ مالک بن تیہان
۱۲	-	معاذ بن الحرث	معاذ بن الحرث

(ناموں کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو سیرۃ ابن ہشام، مرتبہ السلیل پانی پتی، صفحات ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۲۳-۲۲۶)

یہ جدول ظاہر کرتی ہے کہ ان چھ [۶] افراد میں سے جنہوں نے اللہ نبوی میں اسلام قبول کیا، پانچ [۵] نے ۱۲ نبوی میں حج کیا۔ اور بیعت عقبہ اولیٰ کے بارہ [۱۲] میں سے گیارہ [۱۱] شرکاء سنہ ۱۳ نبوی میں فریضہ حج ادا کیا۔ اس جدول کی رو سے ایک اشکال اب بھی باقی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ شرکاء ممکن ہے حج کی نیت سے نہ آئے ہوں، بلکہ چونکہ مدینے میں اسلام کی تبلیغ جاری تھی اس لیے تبلیغ کے سرگرم ارکان نے محض تبلیغی مقاصد کے لیے یارِ رابط پیدا کرنے کے لیے شرکت کی ہو۔

یہ اشکال بھی شرکاء کے اپنے بیان سے ختم ہو جاتا ہے۔ حضرت کعب بن مالک جو بیعت ثانی کے شرکاء میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

”ہم اپنی قوم کے ساتھ جس میں مسلمان بھی تھے اور مشرکین بھی، حج کرنے کے لیے چلے۔ اور ہم ہمارے بزرگ اور سردار براء بن معرور بھی تھے۔ اور ہم لوگ نماز بھی پڑھتے تھے اور دین کی باتوں سے بھی واقف ہو چکے تھے۔“ (ابن ہشام، صفحہ ۲۱۵)

ابن ہشام اور دیگر علمائے سیر نے بیعت ثانیہ کے موقع پر مسلمانوں کی آمد کا مقصد ادائیگی حج بیان کیا ہے۔ ہجرت کے بعد بھی ابتدائی ایام میں زیارت بیت اللہ کے واقعات کا پتہ چلتا ہے۔ ہجرت کے بعد حضرت سعد بن معاذ کعبہ کے طواف میں مصروف تھے کہ ابو جہل سے مدبھیڑ ہو گئی۔ ابو جہل نے انہیں دھمکایا کہ تم لوگوں نے ہمارے مقابلے میں محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کو پناہ دی ہے اس لیے تم لوگوں کا وجود مکے میں برداشت نہیں کر سکتے۔ جس کے جواب میں حضرت سعد نے فرمایا کہ اگر تم نے ہم لوگوں کی مناسک حج کی ادائیگی میں رکاوٹ پیدا کی تو ہم بھی تمہارے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت اپنے علاقوں میں روک دیں گے۔

جنگ بدر کے بعد قریش اور مسلمانوں کی دشمنی اتنی شدید ہو چکی تھی کہ اگر کوئی اتحاد کا مسلمان ہتھے چڑھ جاتا تھا تو قریش اسے جنگ بدر کے مقتولین کے انتقام میں قتل کر ڈالتے تھے۔ چنانچہ ۳ ہجری میں بنی قارہ نے، اسلام کی تعلیم دینے کے لیے، حضور ﷺ سے کچھ معلمین کو روانہ کرنے کی پرفریب درخواست کی۔ پھر حج کے مقام پر اس گروہ پر حملہ کر کے تین معلمین کو قیدی بنالیا اور باقی کو شہید کر ڈالا۔ ان تین اسیروں میں سے ایک، عبداللہ بن طارق، اپنی رہائی کی کوشش کرتے ہوئے شہید ہوئے اور باقی دو، غیب بن عدی اور یزید بن دھنہ کو مکے میں قریش کے ہاتھوں فروخت کیا گیا، جہاں انہیں بھی مقتولین بدر کے انتقام میں شہید کر دیا گیا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لیے فریضہ حج ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ تک اس فریضے کی ادائیگی نہیں ہو سکی۔

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب مسلمان مکہ کے قرب و جوار تک پہنچے تو انہیں روکنے کی کوشش صرف مکہ کے قریش نے کی اور اس رکاوٹ کی وجہ بھی محض قریش کی قومی حیثیت تھی۔ اس میں کوئی مذہبی جذبہ کارفرما نہیں تھا قرآن میں جس انداز سے اس واقعے کا تذکرہ آیا ہے اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قریش کی یہ حرکت نہایت معیوب بلکہ مجرمانہ تھی۔

هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيِ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحَلَّهُ ط
وَلَوْ لَارْجَالُ الْمُؤْمِنُونَ وَنِسَاءُ الْمُؤْمِنَاتِ لَمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبُكُمْ مِنْهُمْ
مَعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَبْنَا الَّذِينَ
كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا (سورۃ الفتح، آیت ۲۵)

(یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد الحرام سے اور قربانی کو اس کے مقام تک پہنچنے سے روکا۔ اور اگر ایسے مومن مرد نہ ہوتے اور ایسی مومن عورتیں نہ ہوتیں، جنہیں تم نہیں جانتے ہو، اور اگر انہیں ضرر پہنچتا تو بے خبری میں تمہیں ہی نقصان پہنچتا۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے۔ اگر یہ جدا جدا ہوتے تو کافروں کو ہم سخت عذاب دیتے۔)

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر مسلمان زیارت بیت اللہ کو فریضہ دین سمجھتے تھے۔ اس موقع پر تمام شرکاء کا بیعت رضوان کرنا بھی واضح کرتا ہے کہ وہ اس رکاوٹ کو اپنے حق میں شدید نا انصافی تصور کر رہے تھے۔ اگر مسلمان معاشرہ حج و عمرے کو مشرکانہ رسم تصور کرتا تو اس طرح جاں نثاری کے عزم کا اظہار کرنے کے بجائے کسی نہ کسی طرح سے بے چینی کا اظہار کرتا۔

حج، رسم ابراہیمی: ہم نے دیکھا کہ حج بیت اللہ کسی مرحلے پر بھی مسلمانوں کے لیے اجنبی نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بنی اسرائیل کی کچھ رسمن اور حج میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ مماثلت صرف اس لیے ہے کہ عرب بنی اسماعیل تھے اور یہودی اسرائیل۔ ان دونوں کا نسب تعلق حضرت ابراہیم سے تھا۔ بنی اسرائیل نے بنی اسماعیل کو اپنے دشمن کی حیثیت دی۔ ان کا تذکرہ حقارت کے ساتھ کیا۔ ان کی والدہ کولونڈی ہونے کی تہمت دی۔ سب کچھ کیا مگر یہ جرات نہ کی کہ قریش کو بنو اسماعیل کے سوا کچھ اور کہیں۔ حضرت ابراہیم کے عبرانی ہونے سے کوئی منکر نہیں ہے اور ہم جانتے ہیں کہ سامی نسل کا گہوارہ عرب تھا۔ سامی نسل کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اپنی تہذیب سے وابستگی ہمیشہ برقرار رکھتی ہے۔ جس جگہ جاتی ہے اپنا تہذیبی ورثہ ساتھ لے جاتی ہے۔ اور اپنی زبان، اپنا کیریکٹر، اپنا دین ہر جگہ اور ہر حال میں برقرار رکھتی ہے۔ تہذیب سے وابستگی آبائی وطن کی یاد دل سے محو نہیں ہونے دیتی۔

حضرت ابراہیم نے شمع تو حید روشن کی تو اس کی روشنی سے کلدانیہ، آسوریہ، لبنان، فلسطین اور مصر کو متاثر فرمایا۔ اسی نور کی ایک مشعل آپ نے اپنے اصلی وطن عرب کو حضرت اسماعیل کی شکل میں دی۔ حضرت اسماعیل خود اپنے پدر بزرگوار سے تربیت یافتہ تھے اس لیے وہ تمام مذہبی احکام و رسوم جو حضرت ابراہیم سے حعلق تھے اپنے ساتھ عرب لائے۔ اس امر سے کسی کو بھی انکار کی جرات نہیں کہ حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کو اپنے سے جدا علیحدہ ملک عرب میں بسایا۔ (ملاحظہ ہو کتاب پیدائش، باب ۲۱، درس ۱۲ تا ۲۱)۔ حضرت اسماعیل کو کیوں الگ کیا اس کی جو وجہ کتاب پیدائش میں بیان کی گئی ہے اس میں صرف رقابت کی بو آتی ہے، اور یہ چنداں معتبر نہیں۔ کتاب پیدائش کے مطابق حضرت اسماعیل نے (خود سے سولہ سال چھوٹے) حضرت اسحاق کا مذاق اڑایا، جسے حضرت اسحاق کی والدہ برداشت نہیں کر سکیں اور انہوں نے حضرت اسماعیل اور انکی والدہ کو گھر سے کیا، ملک سے بھی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

نکلوادیا۔ انبیائے عظام کے بارے میں ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ایسی معمولی بات پر ایسا انتہائی اقدام کریں۔ اس قسم کا اقدام مزاجِ نبوت تو کیا، ایک عام سمجھدار آدمی کے عدل کے بھی منافی ہے۔ آئیے تورات کی ہی روشنی میں اس کی وجوہات دیکھیں۔

- ۱۔ بنی اسرائیل میں آدمی اور جانور کا پہلوٹا بچہ خدا کے لیے وقف ہوتا ہے۔ (گنتی-۸، ۱۷)۔
- حضرت اسمٰعیل، حضرت اخیث سے سولہ سال بڑے تھے، لہذا پہلوٹے تھے، اور خدا کے لیے وقف تھے۔
- ۲۔ پہلوٹے کی فضیلت کسی طور ضائع نہیں ہو سکتی۔ جب ایک عام اسرائیلی کے لیے حکمِ خداوندی ہے کہ ”محبوبہ کے بیٹے کو غیر محبوبہ کے بیٹے پر جو فی الحقیقت پہلوٹا ہے، فوقیت دیکر پہلوٹا نہ ٹھہرائے۔“ (استثناء-۲۱، ۱۶)۔ تو ایسا فعل حضرت ابراہیم سے منسوب کرنا کہاں کا انصاف ہے۔
- ۳۔ جو اولاد خدا کے لیے نذر کر دی جاتی تھی اسے ترک نہ ملتا تھا۔ ”تب خدا نے لادی کی اولاد کو اس لیے مخصوص کر لیا کہ خدا کے عہد کا تابوت اٹھائے اور تاکہ خدا کے آگے کھڑا ہو کر وہ خدا کی خدمت کرے۔ اس کے نام سے برکت لے۔ یہی وجہ ہے کہ لادیوں کو اپنے بھائیوں کے ساتھ کوئی حصہ اور ترک نہیں ملا۔ کیونکہ ان کا حصہ خدا ہے۔“ (استثناء-۱۰، ۹ تا ۸)
- ۴۔ حضرت ابراہیم کو اس بیٹے کی قربانی کا حکم دیا گیا جو اکلوتا اور محبوب تھا۔ (پیدائش-۲۲)

تورات کے ان عام احکامات کی روشنی میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے پہلوٹے کو، (خواہ وہ غیر محبوبہ سے ہی رہا ہو)، خدا کے لیے وقف کیا۔ انہی کو قربانی کے لیے پیش کیا۔ تب پتہ چلا کہ یہ قربانی تمثیلی تھی اور جسمانی قربانی درکار نہیں تھی، بلکہ ساری زندگی خدا کے لیے وقف کرنے کا حکم تھا۔ ان کا حصہ خدا تھا۔ دنیاوی وراثت درکار نہیں تھی۔ حضرت اخیث کی پیدائش تک حضرت اسمٰعیل کی تربیت مکمل ہو چکی تھی، اس لیے حضرت ابوالانبیاء نے عملی زندگی کی ابتداء کرنے اور راہِ خدا میں گامزن ہونے اور نشانے خداوندی کی تکمیل کے لیے انہیں ان کی مادرِ شفقت کے ساتھ عرب کی سرزمین میں بسایا تاکہ وہ یہاں نورِ ہدایت پھیلانیں۔

قریش کا دعویٰ صرف یہی تو ہے کہ وہ اسمٰعیلی ہیں۔ خود تورات نے بنی اسمٰعیل کے بارہ قبائل بیان کیے ہیں۔ قریش کے جدِ امجد قیدار حضرت اسمٰعیل کے صاحبزادے تھے۔ ان کا مسکن بنی نابت کے جنوب (حجاز) میں مقرر کیا۔ عہدِ وسطیٰ کے مؤرخین نے سراسر کو اسمٰعیلی قرار دیا۔ پھر کون سا امر مانع رہ جاتا ہے کہ یہ بار نہ کیا جائے کہ عربوں میں جو رسوم رائج تھیں ان میں سے کچھ حضرت اسمٰعیل کی یادگار بھی تھیں، جو حضرت ابراہیم کا روحانی ورثہ تھیں۔

شارٹرانسا نکلو پیڈیا آف اسلام میں حج کے بارے میں تحریر کیا گیا کہ،

”لفظ حج کے معنوں کے بارے میں کچھ زیادہ تحقیق نہیں ہو سکی۔ عربی (زبان کے) علماء اس لفظ کے معنی اپنے آپ کو پیش کرنا بیان کرتے ہیں جو لفظ زیارت (Pilgrimage) کے ہم معنی ہے۔ لیکن اس لفظ سے قریب تر عبرانی لفظ ہیگ (Hag) موجود ہے، جس کے معنی شمال اور جنوب دونوں جگہ طواف کرنے کے ہیں۔ اس سے بھی ہمیں

کچھ زیادہ معلومات میسر نہیں آتیں، کیونکہ ہمیں یہ بھی نہیں پتہ کہ یہ طواف فریضہ حج تھا بھی کہ نہیں۔ کیونکہ اس دور میں دو میلے، ایک ذی قعدہ میں عکاظ کے مقام پر، اور دوسرا ذی الحجہ میں ذوالحجاز پر لگتا تھا۔ یہاں سے لوگ سیدھے عرفات جاتے تھے۔ اور عرفات میں طواف سے نہ اسلام واقف ہے، نہ ہم۔ مقامات مقدسہ کی زیارت ایک قدیم سامی دستور ہے جو تورات کے قدیم اجزاء میں بھی تحریر کیا گیا ہے۔ 'تو سال بھر میں تین بار میرے لئے عید (Haq) منانا'۔ (خروج-۲۳، ۱۷)۔ 'تیرے سب مرد سال میں تین بار خداوند خدا کے آگے جو اسرائیل کا خدا ہے حاضر ہوں'۔ (خروج-۲۳، ۳۴)۔

اس دور (جالبیہ) میں بھی عرفات میں وقوف یا قیام لازمی تھا۔ یہی وقوف اسرائیل کے قیام طور میں بھی پایا جاتا ہے۔ اس قیام کے لیے اسرائیل کو جنابت سے دور رہنا پڑتا ہے اور غسل کرنا پڑتا ہے۔ اور وہاں وہ خدا کے منتظر رہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی جنابت سے پرہیز کرتے ہیں۔ غسل کر کے احرام باندھتے ہیں اور خدا کے حضور کھڑے ہوتے ہیں'۔ (Shorter Encyclopedia of Islam; p.124)۔

مندرجہ بالا مماثلت اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ یہ تمام رسوم ایک ہی اصل سے دونوں شامی شاخوں میں منتقل ہوئیں۔ اس سے یہ قطعی گمان نہیں کیا جاسکتا کہ کوئی رسم ایک دوسرے سے مستعار ہے۔ کیونکہ مرکزی عرب یہود کے مرکزی پیروی سے قطعی آزاد تھا۔ وہ واضح طور پر یہودیت کو ایک غیر مذہب تصور کرتے تھے، جن کے مذہبی شعائر کو مقامی رسوم میں کوئی دخل نہ تھا۔ واقعہً اصحاب الاخذہ سے مترشح ہے کہ یہودیت سے عام عربوں کو ایک نفرت سی تھی۔ ان حالات میں یہ قابل قیاس نہیں کہ عرب کے بت پرستوں نے حج کو ایک چنا گزیر اقلیت سے اپنایا ہو۔ عرب جالبیت میں صرف اپنے آباء و اجداد کی رسوم کے پابند تھے، اور حج کی رسم انہیں اپنے جد امجد حضرت اسمعیل سے ملی، جسے انہوں نے ہمیشہ زندہ رکھا اور اسی ناطے سے اسلام نے اسے فریضہ دین بنایا۔

اسلام اور شمشیر

مغرب نے اپنا سارا زور قلم اس پروپیگنڈے پر صرف کیا ہے کہ اسلام کو بزور شمشیر پھیلا یا گیا ہے۔ اس سفید جھوٹ سے دنیا کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا انہوں نے برضا و رغبت نہیں، بلکہ ظلم و جور اور خوف و ہیبت سے مجبور ہو کر اس مذہب کو قبول کیا ورنہ اس مذہب میں ایسی کوئی کشش نہیں جس کے باعث دنیا اسے بطیب خاطر قبول کرتی۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کے روشن خیال دور میں بھی یہ پروپیگنڈہ عام ہے۔ امریکہ سے شائع ہونے والی کتاب (Our World Through Ages)، جو ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ منظر نامہ پر آئی، اس کے باب ششم کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

1. "Above all Mohammed urged his followers to spread their faith, even by sword, if necessary." (p.146)

2. "(Accept) the Quran, (pay) tribute or (die by) the sword. This was the warning to unbelievers." (p.147)
3. "In India, many Hindus and Budhists were converted to Islam by force." (p.148)

مذہب کو بزدل شمشیر رائج کرنا خود مغرب کا شیوہ رہا ہے۔ گزشتہ ابواب میں شارلمین کے قانون کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ ہنسا ایٹیس (Hansa States) کے قیام کی تفصیلات باب اول میں بیان کی جا چکی ہیں۔ روسن دورِ عیسائیت کی ترویج بالخصوص نظر سے گزر چکی ہے۔ مغربی معاشرے میں کسی مذہبی اقلیت کا وجود کبھی برداشت نہیں کیا گیا۔ عیسائیت کی ترویج کے لیے صدیوں خونریزی کی گئی۔ کیتھولک کلیسا میں دوسو سال قبل تک باقاعدہ ایسے ادارے تھے جن کا کام ہی ان لوگوں کی واروگیر تھا جو کیتھولک عقائد سے متفق نہ تھے۔ کلیسا انہیں گرفتار کر کے قید و بند، اذیت ناک سزاؤں، یہاں تک کہ موت سے بھی ہمکنار کرتا تھا۔ غیر عیسائی بلکہ غیر کیتھولک کے لیے مغرب کی سرزمین تنگ تھی۔ مذہب کے نام پر جن لوگوں کا قتل کیا گیا، ان کی تعداد لاکھوں میں ہے۔

شارلمین کے قتل عام سے لیکرامر یکہ میں ریڈانڈیز کی نسل کشی تک ترویج بالخصوص کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آتا ہے، جس میں ہر قتل عام کلیسا کی برکت اور مکمل تائید حاصل ہوتی تھی۔ اس ضمن میں وہ مسیحی بھی نہیں بخشے گئے جو رومن کیتھولک فرقے سے غیر متعلق تھے۔ عیسائیت کی پوری تاریخ انسانی خون سے رنگین نظر آتی ہے۔

(For details see: Millman; Latin Christianity, Vol. 1, p. 352; and Lecky; History of Nationalism in Europe, especially Chapter on Persecution)

اپنے اس گھناؤنے جرم کو انہوں نے اسلام کے سرمنڈھا، ورنہ اسلام میں کسی قسم کا کوئی جبر نہیں ہے۔ یہ وہ واحد مذہب ہے جو دنیا کو قبولیت کی دعوت دیتا ہے اور اسلامی مملکت کی حدود میں بسنے والے ہر فرد کو اجازت دیتا ہے کہ غور و فکر کرنے کے بعد جب دلجمعی ہو جائے تو اسے قبول کر کے دوسرے مسلمانوں کے برابر حقوق حاصل کر لے اور اگر اس کا دل نہ مانے تو ذمی کی حیثیت سے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے زندگی گزار دے۔ اس نے کبھی کسی مذہب کے عقائد میں دخل اندازی نہیں کی۔ کبھی مذہبی دارو و گیر نہیں کی۔ اسلام کی تاریخ میں غیر مذہب پر مقدمات اور احتساب کا کوئی ادارہ، کسی دور میں کسی جگہ نہیں پایا جاتا۔

اسلام ایک دین ہے جو مغرب کی تین جداگانہ اقدار کا بیک وقت احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یہ مذہب بھی ہے، سیاست بھی ہے اور کلچر بھی ہے۔ عیسائیت اور اسلام میں بنیادی فرق یہ ہے کہ عیسائیت کی تعمیر و ترویج مغربی اسٹیٹ اور کلچر نے کی۔ جبکہ اسلامی اسٹیٹ اور کلچر کی تعمیر مذہب نے کی۔ وہاں معاشرتی قدروں کے مطابق مذہب کو ڈھالا گیا اور اسٹیٹ کی قوت پر اسے رائج کیا گیا جبکہ یہاں مذہبی اقدار کے مطابق معاشرہ بنایا گیا، اور اس معاشرے نے اسلامی احکامات کی روشنی میں اسٹیٹ کی تشکیل کی۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اسٹیٹ اور ایمپائر شمشیر کے بل بوتے پر ہی قائم ہوتی ہیں۔ ان کی مدافعت، استحکام اور استقلال سب ہی کے لیے شمشیر ناگزیر ہے۔ حضور ﷺ کے وصال کے بعد ایک عظیم

مسلم امپائر کے قیام میں شمشیر نے جو کارنامہ انجام دیا، مغرب اسے اسلام سے منسوب کرتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مسلم امپائر تلوار کے زور پر قائم ہوئی اور اس کی توسیع و مدافعت شمشیر کی مرہون منت ہے تو اس میں کوئی کام نہیں، لیکن یہ کہنا کہ اسلام شمشیر کے زور پر پھیلا یا گیا، حقیقت کو مسخ کرنا ہے۔

داعی اسلام سے لیکر آج تک اسلام کسی پر بالآخر مسقط نہیں کیا گیا۔ دلوں کو تلوار سے مسخ نہیں کیا جاسکتا۔ کردار کی تعمیر جبر سے نہیں ہوتی۔ حضور ﷺ نے تبلیغ کی ابتدا فرمائی تو تنہا تھے۔ کیا یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ تلوار کے زور پر ایک ایک فرد کو اپنا تابع بنا رہے تھے۔ اس کے برعکس معاشرے کی تلواریں ان کے اور انکے مشبعین کے خلاف بے نیام ہو گئیں۔ قریش نے انہیں مٹا ڈالنے میں کوئی کسر اٹھانیں رکھی۔ ظلم کا کوئی حربہ نہیں تھا جو آزما یا نہ گیا ہو۔ جو مسلمان ہو گئے ان پر قیامت توڑی گئی۔ خود حضور ﷺ کو بے آب و گیاہ گھاٹی میں برسوں محصور رہنے پر مجبور کیا گیا۔ جسم اطہر خون سے رنگین ہوا۔ ترک وطن تک کی نوبت آئی۔ جائیدادیں ضبط ہوئیں، لیکن ایک بھی صاحب ایمان ایسا نہیں تھا جس نے ان شدائد سے بچ آ کر اسلام کو ترک کر دیا ہو۔ آخر ان سابقوں والا دلون کو اسلام سے وابستہ رکھنے میں کوئی قوت، کونسا جبر یا کوئی تلوار کا فرما تھی۔ کیا یہ قوت محض اسلام کی کشش نہ تھی۔ اسلام بذات خود ایک قوت تھا جو ہر بیرونی قوت سے مدافعت کرنے کا ولولہ عطا کرتا تھا۔

اسلام کے ابتدائی تیرہ سال تلوار کے نام سے واقف نہیں ہوئے۔ تیرہ سال کی مدت ایک طویل عرصہ ہے۔ اٹھی تلواروں اور کھچی کمانوں کی زد میں مہر و ثبات کے ساتھ تبلیغ صرف داعی اسلام کا ہی حصہ ہے۔ جبکہ حضرت عیسیٰ جیسے امن پسند نبی، جنکا معاشرہ ان کی تبلیغ کے لیے پر امن اور سازگار تھا، صرف تین سال کی کاوشوں کے بعد تلوار کے استعمال پر غور کرنے لگے تھے۔ حضرت عیسیٰ اور ان کے ہمراہیوں پر نہ کوئی ظلم ہوا، نہ کھانا پانی بند ہوا، نہ مقاطعہ ہوا۔ نہ انہوں نے کسی کے خداؤں کو باطل ٹھہرایا، نہ ہموطوں کو روم کے خلاف ابھارا، نہ غریب کی غربت دور کرنے کے لیے جد و جہد کی کہ معاشرے کا کوئی طبقہ انکا مخالف ہو جاتا، نہ مرد و جد مذاہب کی مخالفت کی۔ وہ تو صرف قدیم شریعت کا احیاء کرنا چاہتے تھے۔ ان کی جو بھی مخالفت یہود کی طرف سے ہوئی، وہ صرف زبانی کارروائی تک محدود تھی۔

کیا اندازہ موازنہ ہے کہ جو صرف تین سال کی مدت میں تلوار اٹھانے پر غور کرنے لگے، اس کے پیرو، اس ذات اقدس پر جو تیرہ سال تک ہیبت ناک مظالم کا ہدف بنے اور قوت کے استعمال پر غور بھی نہ کرے، بہتان باندھیں کہ انہوں نے اپنا دین بزرگ شمشیر پھیلا یا۔

ہجرت کے بعد جب مدینے میں شمع رسالت کے گرد اس کے پروانے جمع ہو گئے اور اسلام کی روشنی نے ماحول کو متوثر کرنا شروع کر دیا تو تاریکی نے ناپاک ارداوں کے ساتھ اس شمع کی جانب یلغار کی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں جو اختیار کی جاسکتی تھیں۔ یسوع کے شاگردوں کی طرح، محض اس لیے کہ مستقبل کا مغربی قید کا تلوار کے استعمال کا الزام عائد کرے گا، پروانے اس شمع کو چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچانے کی فکر کرتے یا پھر بے سروسامانی کے باوجود طوفانوں سے ٹکڑے لیتے۔ بے عملی کی صورت میں کفار عرب کی خوں آشام تلواریں مٹھی بھر موحدین کی

جماعت کو نیست و نابود کر دیتیں۔ اسلام کا نام و نشان مٹ جاتا۔ ایک عظیم ملت، عظیم تہذیب، ایک عظیم نظریہ، ایک عظیم فکر، ایک عظیم ترین ایمپائر، وجود میں آنے سے قبل ہی معدوم ہو جاتی۔ انسانیت کا ارتقاء ختم جاتا۔ تہذیب جامد ہو جاتی۔ علوم کے سرپرست نہ پیدا ہوتے۔ غلامی انسان کا مقدر بن جاتی اور روح نجات کی تلاش میں بھٹکتی رہتی۔ لیکن یہ محسن انسانیت ﷺ طاغوتی طاقتوں کے آگے جھکنے کو ہرگز تیار نہ تھے۔ اسلام کو سر بلند رکھنے کے لیے اڈا قریش، اس کے بعد عرب، اور آخر کار ساری دنیا کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ حق کی حفاظت کے لیے کمزوری کے باوجود ہر قوت سے ٹکرائے۔

کس قدر پاکیزہ جذبہ تھا۔ اسی جذبے اور عمل کا نام جہاد ہے۔ یہی وہ لفظ ہے جس سے مغرب کو خوف آتا ہے۔ اسی جذبے کے طفیل بدر کے میدان میں تین سو تیرہ [۳۱۳] نیم مسلح افراد نے ایک ہزار [۱۰۰۰] پوری طرح اسلحہ سے لیس قریشی سپاہ پر کامل برتری حاصل کی۔ تین ہزار کی جمعیت کا صرف سات سو [۷۰۰] افراد نے میدانِ احد میں منہ پھیر دیا۔ جنگِ احزاب میں سولہ ہزار [۱۶,۰۰۰] سے زیادہ مشترکہ عرب افواج سے محض تین ہزار افراد نے کامیاب مدافعتی جنگ لڑی۔

یہی وہ جذبہ تھا جس کے سبب چالیس ہزار [۴۰,۰۰۰] کی نیم مسلح، غیر تربیت یافتہ، اور بے قاعدہ فوج نے یرموک کے میدان میں سلطنتِ روم کی تین لاکھ [۳,۰۰,۰۰۰] مسلح تربیت یافتہ اور باقاعدہ پیشہ و فوج کو منہ توڑ شکست دی۔ یہی وہ جنگیں ہیں جن کی کامیابی کی وجہ سے اسلام کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے بزورِ شمشیر پھیلایا گیا ہے۔ کیا منطقی ہے کہ انھی تلوار اور کھنچی کمان کو مظلوم اگر اپنی مدافعت میں توڑ ڈالے تو اس کے اس فعل کو مذموم گردانا جائے۔

کیا فتحِ مکہ اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلانے کی پرزور تردید نہیں کرتی، کہ اس وقت اسلام کے خلاف اٹھنے والی تلواریں نوٹ چکی تھیں۔ کوئی قوت ایسی نہیں رہ گئی تھی جو خود کو اسلام کے حریف کے طور پر پیش کرتی۔ مفتوحینِ مکہ میں سے جو بھی تھا اسلام کا دشمن تھا۔ فاتحین وہ تھے جن پر تیرہ سالہ مکہ کی دور میں اور آٹھ سالہ مدنی دور میں اس شہر کے باسیوں نے ستم ڈھائے تھے۔ فاتحین کے دل ان کے تیر و نشتر سے خونچکاں تھے۔ اس کے باوجود فاتحین نے ایک قطرہ خون نہیں گرایا۔ رحمت اللعالمین نے ہر جرم سے چشم پوشی فرمائی۔ باز پرس کے بجائے یہ اعلان فرما دیا کہ ہر فرد کا جرم معاف کر دیا گیا ہے۔ لوگوں کو تلوار کے ذریعے سے مجبور کرنا ہوتا تو اس سے بہتر موقع اور کونسا ہوتا۔ لیکن اس موقع پر بھی کسی ایک فرد کو بھی بالجبر مسلمان نہیں بنایا گیا۔ جو لوگ بھی مسلمان ہوئے بلا جبر و اکراہ ہوئے۔ فتحِ مکہ کے بعد بھی بعض مشرکینِ مکہ کا اپنے قدیم مذہب پر قائم رہنے اور اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کے لیے غور و فکر کی مہلت طلب کرنے کے شواہد قدیم ماخذ میں ملتے ہیں۔

واٹ نے فتحِ مکہ کے باب میں تحریر کیا کہ،

”محمد (ﷺ) نے صفوان سے پچاس ہزار (۵۰,۰۰۰) درہم، اور عبداللہ بن ربیعہ اور حویطب سے فی کس چالیس ہزار (۴۰,۰۰۰) درہم قرض لیے اور ضرورت مندوں میں فی کس پچاس درہم تقسیم کیے۔ ان رؤساء کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ یہ اور بہت سے دوسرے کفر پر ہی قائم رہے۔“

(Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.67)

حضور ﷺ کا ہر لفظ اور ہر عمل ملت اسلامیہ کے لیے قانون اور نظیر کا درجہ رکھتا ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے موقع پر حضور ﷺ کے طریقہ عمل سے جہاں کئی اور فقہی قوانین کا استنباط ہوا، وہیں یہ بھی منج ہوا کہ جو شہر خود کو از روئے صلح حوالے کر دے وہ مامون ہوتا ہے۔ نہ وہاں خونریزی کی جاسکتی ہے، نہ لوگوں کو غلام بنایا جاسکتا ہے، نہ ان کے اموال و اسباب ضبط کیے جاسکتے ہیں۔ ہاں بحرین کو ان کے ذاتی جرائم کی پاداش میں سزا دی جاسکتی ہے۔

اگر اس موقع پر یا کسی اور موقع پر ایک فرد کو بھی بالجبر مسلمان کیا گیا ہوتا تو یہ ایک نظیر بن جاتی۔ مغرب کی ہی طرح، کسی مسلم ملک میں کسی مذہبی اقلیت کا وجود نہ ہوتا۔ ابنین پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال قبضہ رکھا، وہاں عیسائی باقی نہ رہ سکتے تھے۔ ساتویں صدی تا بیسویں صدی لبنان پر مسلم اقتدار رہا، آج وہاں عیسائیت کا نام لیوانہ ہوتا۔ ایران میں مجوس، عراق میں صابی، اور برصغیر میں ہندوؤں اور بدھوں کا وجود نہ ہوتا۔ بیسویں صدی میں ترکیہ میں یونانی نہ پائے جاتے۔ اس کے برخلاف مسلمانوں کی رواداری کا اعتراف ہر سلعے ہوئے موثر نے کیا ہے۔

قرآن کے احکامات کی خلاف ورزی کوئی دیدار مسلمان نہیں کر سکتا۔ اس معاملے میں قرآن کی نفع صریح موجود ہے کہ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ۔ ان چار الفاظ نے عالم اسلام کی ہر اقلیت کو سپر مہیا کر دی ہے۔ اس حکم کی خلاف ورزی کی جرأت کسی مسلمان کو نہیں ہو سکتی۔ اور اگر کسی نے خلاف ورزی کی بھی تو یہ اس کا اپنا کمروہ فعل تھا، جس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں عائد ہوتی۔

واضح رہے کہ اسلام حضور ﷺ کے دور مبارک میں مکمل ہو گیا تھا۔ جس کے بعد کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی قانون وضع کر سکے۔ جب قرآنی حکم امتناعی موجود ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ کا عمل یہی رہا ہے کہ کسی پر اسلام قبول کرنے کے لیے کوئی دباؤ نہیں ڈالا تو اس قانون میں رد و بدل کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اسلام اور داعی اسلام ﷺ نے تو دین کے معاملے میں اس قدر احتیاط برتی ہے کہ مسلمانوں کو کافروں کے جھوٹے خداؤں کو بھی برا کہنے سے منع فرمایا ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مغرب جزیہ کے سلسلے میں بھی شدت سے لے دے کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ جزیہ کون ادا کرتا تھا۔ وہی غیر مسلم جو مملکت اسلامیہ میں رہتے بستے تھے اور جن سے مسلمانوں سے پہلے رومن امپائر صدیوں پول نکس وصول کرتی رہی۔ اگر ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار کا بہیمانہ قانون تھا تو یہ جزیہ دینے والے کون تھے۔ کیا یہ جزیہ سال بہ سال وہ مردے ادا کرتے تھے جنہیں اسلام نہ لانے کے جرم میں (بقول مقررین کے) قتل کیا جا چکا تھا۔ جذبات کی رو میں حقائق کو مسخ کرنا ایک بڑا اخلاقی جرم ہے۔

خوف و دہشت کی فضا میں جو عقائد قائم ہوتے ہیں ناپائدار ہوتے ہیں۔ جیسے ہی خوف ختم ہوتا ہے، جبر کمزور پڑتا ہے، لوگ ان عقائد اور نظریات سے نجات حاصل کر لیتے ہیں۔ کیا اسلام کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ مغرب نے صلیبی جنگوں میں وسیع مسلم علاقے پر قبضہ کیا۔ انہیں کیا تجربہ ہوا؟ کتنے مسلمان ایسے تھے جنہوں نے اسلام ترک کر کے کفر یا عیسائیت اختیار کی۔ تاتاریوں نے عالم اسلام کو پامال کر ڈالا۔ فاتح تھے لیکن عالم اسلام کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے بجائے خود حلقہٴ بغاوت اسلام ہو گئے۔ ان پر کون سی تلوار مسلط تھی جس کے خوف سے انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اٹھارویں صدی سے مغرب کو پورے عالم اسلام پر تسلط حاصل ہونے لگا تھا۔ مسلمانوں کی سیاسی اور عسکری قوت ختم ہو چکی تھی لیکن اس کا اثر اسلام پر کیا پڑا؟ کیا اسلام مرجھا گیا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ تلوار کے بل پر پھیلنے والے مذہب کے نہ مٹنے کا راز کیا ہے؟ راز صرف اتنا ہے کہ اسلام کو لوگوں نے بلا جبر و اکراہ، بطیب خاطر قبول کیا تھا اور اس سے مجبوراً نہیں بلکہ صدق دلی سے وابستہ ہوئے تھے۔ اسلام ان کے لیے پرکشش تھا۔ اس کی ہدایات و تعلیمات سے وہ مطمئن تھے۔ کسی اور مذہب کی تعلیمات ان کے لیے قابل قبول نہ رہ گئی تھیں۔ اسلام ان کے لیے بوجھ نہ تھا بلکہ تقویت تھا۔ مغرب مسلمان فاتحین پر الزام دھرتا ہے کہ انہوں نے کونے کونے میں اسلام پھیلایا، ہمیں انہی فاتحین سے یہ شکایت ہے کہ وہ مفتوحہ علاقوں میں تبلیغ کا حق ادا نہ کر سکے۔ تلوار اور قرآن کا الزام مسلمانوں پر صرف بہتان ہے۔ ورنہ یہ قانون خود مغرب کی مذہبی کتب میں آج بھی پوری آب و تاب کے ساتھ ملتا ہے کہ مفتوحین کا قتل عام کر کے انہیں نیست و نابود کر دیا جائے۔ ملاحظہ ہو،

۱۔ ”اور جب انکو تیرا خدا تیرے آگے شکست دلائے اور تو انکو مار لے تو انکو بالکل نابود کر ڈالنا۔“ (استثناء، باب ۷، درس ۲)

۲۔ ”اور تو ان سب قوموں کو جنکو خداوند تیرا خدا تیرے قابو میں کر دے گا نابود کر ڈالنا۔“ (استثناء، باب ۷، درس ۱۶)

۳۔ ”جب خداوند تیرا خدا اسکو تیرے قبضے میں کر دے تو وہاں کے ہر مرد کو تلوار سے قتل کر ڈالنا۔ لیکن عورتوں اور بال بچوں اور چوپایوں اور اس شہر کو سب مال اور لوٹ کو تو اپنے لیے رکھ لینا اور تو اپنے دشمن کی لوٹ کو جو خداوند تیرے خدا نے تجھ کو دی کھانا۔“ (استثناء، باب ۲، درس ۱۳-۱۴)

اسلام کی شکل میں تاریخ نے پہلی بار دیکھا کہ مفتوح کو بھی کوئی مذہب فاتح کے حقوق عطا کرتا ہے۔ کیا اس سے قبل کسی فاتح نے کسی مفتوح سے کہا تھا کہ میرے مذہب کی رو سے تمہاری حفاظت کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ تمہیں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ تمہارے وہی حقوق ہونگے جو میرے ہیں۔ تمہیں اپنے عقیدے اور مذہب کی بری آزادی حاصل ہے۔ چاہو تو اپنے عقیدے پر قائم رہو اور اگر ہمارے مذہب کو چٹا جانو تو ہمارے ساتھ شامل ہو کر خود فاتح بن جاؤ۔

جو لوگ معترض ہیں کاش وہ خود اپنی تاریخ کلیسا پر نظر ڈالیں۔ پوری تاریخ اس امر کی گواہی دیتی ہے کہ کتب مقدسہ مسیحی کے دیکھنے والے لکھنے والے اور اذوالاسلامی کے لکھنے والے سب سے پہلے جھپٹتی گھنڈ

کلیسا نے خود انسان کو کیا دیا۔ اس نے بدرجہٴ مجبوری صرف عیسائیوں کو انسانی حقوق عطا کیے۔ بقیہ نوع انسانی کو صرف دہشت، ہرزہ سرائی، اتہامات اور احساس کمتری عطا کیا۔ دوسرے مذاہب کے مقتولین کی فہرست مرتب کی جائے تو اس سے کہیں طویل تر فہرست کلیسا کے قتل عام کی نکلے گی۔ خود مغربی مبصرین کو اقرار ہے کہ:

”مسیحی کلیسا جس قدر سنگدل رہا ہے اور اس نے جس قدر خونریزی کی ہے، اس قدر، ساری دنیا میں، شامدہی کسی مذہب یا ادارے نے کبھی کی ہو۔“

(Willman; Constitutional History of England, Vol. I, Chapter II, p.62)

غرضیکہ اسلام پر تلوار کی تہمت مسخ عہد کی بدترین مثال ہے۔ اسلام کو بڑو شمشیر نہ داعی اسلام ﷺ کے زمانے میں پھیلا یا گیا نہ اس کے بعد کسی دور میں یہ مذموم کوشش کی گئی۔

قرآن اور حدیث

دنیا کی تمام مذہبی کتب پر قرآن کو ہر حیثیت سے فوقیت حاصل ہے۔ عہد نامہ قدیم کی تدوین میں کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ لگا۔ بادشاہوں سے لیکر فقیہوں تک ہزاروں افراد نے اسکی تدوین میں حصہ لیا۔ اسکا مستند ترین حصہ تورات (پنٹا ٹوئش)، دوجداگانہ مذہبی کتب (الوہی اور یسوی) کا اشتراک ہے، اور تحریف اور تصرف سے پر ہے۔ اسے حضرت موسیٰ سے منسوب کیا جاتا ہے جبکہ اس میں وہ واقعات بھی درج ہیں جو ان کے بعد وقوع پزیر ہوئے۔ عہد نامہ قدیم کی حقیقی اہمیت صرف یہ ہے کہ وہ یہودی مذہبی تاریخ کو بیان کرتا ہے۔ عہد نامہ جدید کی حقیقی نوعیت یہ ہے کہ متعدد نامعلوم افراد نے حضرت عیسیٰ کی سوانح حیات اپنے اپنے نقطہ نظر سے ترتیب دے لی۔ یہ مؤلفین خود یعنی شاہد تک نہیں۔ صدیوں بعد سنی سنائی باتوں کو ایک تسلسل دے دیا، اور یہ کتب آسمانی قرار پا گئیں۔ جبکہ قرآن ایک فرد واحد پر نازل شدہ وحی کا مجموعہ ہے، جس کی حفاظت کا شعوری اہتمام دور نبوی سے ہی ملحوظ رہا ہے۔ اسے نہ صرف تحریری طور پر محفوظ رکھا گیا بلکہ حضور ﷺ کی زندگی میں سینکڑوں افراد نے اسے حفظ کیا۔ وصال نبوی کے دو سال لے اندر اندر، خلیفہ اؤل نے اسکے تمام اجزاء کو جمع کر کے اسکا مکمل نسخہ مدون کیا۔ دنیا میں پائے جانے والا کوئی نسخہ اس اولین نسخے سے سرسرقاوت نہیں رکھتا۔

قرآن عظیم تقدس کا حامل، جسے سوائے حالت طہارت کے چھوا نہیں جاسکتا، جس کی قرأت باعث ثواب، جس پر عمل باعث نجات، جس کی آیات باعث برکت، زینت محراب، وجہ سر بلندی، جس کے الفاظ کی کتابت کے لیے حروف طلائی اور زمردی روشنائی زیب۔ یہی تعلیم کی بنیاد، یہی زندگی کا رہبر، پیدائش سے موت تک اس دنیا میں اور موت کے بعد دوسری دنیا میں رہنما، صراط مستقیم، کلام الہی، قانون اعظم، حکمت کے قوانین اور شاہی فرامین سب اس کے تحت، یہی عبادت و روحانی سکون کا منبع، اسلام اسکے بل پر قائم، موت کا شیرازہ اس

سے دائم، یہی غلم، یہی میدانِ عمل، یہی زندگی کا شرارہ، اسی پر زندگی قربان، اربوں کھربوں افراد کو گزشتہ چودہ سو سال سے ملکوئی فعالیت عطا کرنے والا۔ اس نے عظیم تہذیب چگائی۔ اس کا فیض صرف مسلمانوں تک محدود نہیں، کافروں اور مشرکوں کو بھی سیراب کرتا ہے۔ جس کی مخالفت کے طفیل یورپ، یورپ بن گیا۔ عیسائیت کی تثلیث کا نام تو حید ہوا۔ جس کے توسط سے یہ ہم تک پہنچا، اس نے خود اس کے مصنف ہونے سے انکار کیا۔ لیکن مستشرق اس کو تصنیف نبوی قرار دینے پر مصر، اس کی تعلیمات اور اس کے اخلاق پر حملہ آور ہوتا ہے۔ اس کی بیان کردہ نعمتوں پر طنز کرتا ہے۔ کارلائل جس نے داعی اسلام کو انبیاء کا ہیرو تسلیم کیا، جو اسلام کی موافقت میں قلم اٹھانے میں سرفہرست ہے، جب قرآن کا ذکر آتا ہے تو ساری خوش فہمی رفع کر دیتا ہے۔ اس نے لکھا، (نعوذ باللہ)

"As toilsome reading as I ever undertook, a wearisome confused jumble, crude, incondite, endless iterations, long-windedness, entanglements, most crude incondite, insupportable stupidity; in short nothing but a sense of duty could carry any European through Koran." (Thomas Carlyle; On Heros, Hero-worship and the Heroic in History, pp. 64-65)

[میری زندگی کی سب سے زیادہ محنت طلب خواندگی، ایک اکتا دینے والا، پریشان بے ترتیب مجموعہ، خام، ناپختہ، لاتناہی تکرار، طول طویل گفتگو، الجھاؤ، انتہائی خام اور غیر نفیس، ناقابل دفاع حماقت، مختصر اُیہ کہ سوائے ادائے فرض کے احساس کے، کسی یورپین کو کوئی چیز قرآن کو پڑھ جانے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔]

[ملاحظہ ہو یورپین ہونے کا غرور، کہ کوئی یورپین، چاہے جاہل مطلق ہی کیوں نہ ہو، غیر یورپی علماء پر بھی کیسی فوقیت رکھتا ہے۔]

بیشتر مستشرقین کا مکتفہ فیصلہ ہے کہ قرآن داعی اسلام کی تصنیف ہے۔ آراءے نگلسن کے نزدیک ایک ادبی کارنامے کی حیثیت سے اس میں کئی خامیاں پائی جاتی ہیں، اور قرآنی جنت میں مادی عیش و عشرت کا تذکرہ اصل میں بت پرستوں کے تخلیات کی مشابہت ہے۔ [R.A. Nicholson; Introduction to the]

[Koran, Translation of Quran by R.N. Palmer]۔ انکے خیال میں داعی اسلام میں بھرپور صلاحیت نہیں تھی کہ وہ عروض میں شعر کہہ سکیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی رائے شعراء کے بارے میں اچھی نہیں تھی۔ قرآن کا یہ دعویٰ کہ وہ انبیاء سابق کی تعلیمات کی توثیق اور تصحیح کرتا ہے، کم وزن رکھتا ہے۔ قرآن کی باتیں سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ اس میں مستعار اشاروں پر دکھاوے کے قلعے تعمیر کیے گئے ہیں۔ جن میں سے بیشتر یہود کی بیانیہ مذہبی روایات (Haggadah) اور غیر متند (Apocrypha) مواد پر مشتمل ہیں۔ (ملاحظہ ہو حوالہ بالا)۔

مستشرقین کے نزدیک قرآن کے ذرائع معلومات بلاشبہ یہودیّت، عیسائیت اور مشرکین کے مروجہ مذاہب تھے۔ قرآن کے بیشتر انبیاء، تورات کے کردار ہیں، جنہیں قرآن نے نبی بنا دیا ہے۔ اٹھائیس میں سے انھارہ انبیاء تورات کے کردار ہیں، جبکہ عہدِ تامہ قدیم کے انبیاء جیسے عاموس، یرمیاہ اور یسعیاہ کا کوئی تذکرہ نہیں کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

پایا جاتا۔ قرآنی مواد چونکہ سنی باتوں پر مشتمل ہے، اس وجہ سے اس میں مستند اور غیر مستند باتوں میں تمیز مفقود ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کا پالنے میں لوگوں سے گفتگو کرنا، مٹی سے بنائے ہوئے پرندوں کا زندہ کرنا، مریم عذرا اور مریم اخت ہارون کو ایک ہی شخصیت سمجھنا، بائبل کے ایک کردار ہامان کو جو شہنشاہ اخسویس کا مقرب تھا لاعلمی کے باعث فرعون کا وزیر بیان کرنا، وغیرہ۔

(For details see: George Sale; The Quran: J.H. Rodwell; The Quran: E.H. Palme; The Koran: Dr. Tesdall; Sources of Quran)

تدوین قرآن: میور، نولد کی اور سیل نے جمع و تدوین قرآن پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت زید عالم عادل تھے۔ ان سے تحریف و تصرف کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ انہوں نے دو گواہوں کی شہادت پر قرآن میں سورتیں درج کیں۔ مطالب و معانی سے قطع نظر انہوں نے متن بلا کم و کاست درج کیا، لیکن ان کے مجموعے میں پورا قرآن مدون نہ ہو سکا۔ ان کے ایڈیشن کو پوری ملت نے تسلیم نہیں کیا۔ تاہم یہ ایک اہم کام تھا اور اسی کی بنیاد پر دوسرا نسخہ ترتیب دیا گیا۔

(cf. Muir; Life of Mohammed, pp. 555: Noldeke; Dictionary of Islam, pp. 486-487: Sale; Essays on Islam, pp. 218-224)

شعراء کا دیوان: کلائن (F.A. Klein) نے بزعم خود قرآن کو عرب شعراء کے دیوان سے مطابقت دی، اور دونوں کا سطحی موازنہ کیا۔

قرآن	دیوان
مجموعہ عجمی	مجموعہ کلام شعری
سورۃ = بڑا حصہ	قصیدہ = بڑا حصہ
آیت = چھوٹا حصہ	بیت = چھوٹا حصہ
فصلہ = آخری حرف	قافیہ = آخری حرف

ریورینڈ مذکور نے مندرجہ بالا موازنے کی بنیاد پر قرآن کو جمع قرار دیا، اور اسے قدیم عرب کا ہنوں کا انداز بتایا۔

(cf. Klein; The Religion of Islam, p.4)

یہی مصنف قرآن کو یہودی اور عیسائی مواد کا مجموعہ بیان فرماتے ہیں۔ انہوں نے تحریر کیا،

"Though Mohammed pretended that every word of the Quran was the result of the divine inspiration, it must become evident that by far the greater portion of it consists of material collected from Jews, Christians, Sabaeans, Magi and Pagan Arabs". (cf. Klein; The Religion of Islam, p.21)

[گو محمد (ﷺ) انہما تو یہی کرتے تھے کہ قرآن کا ایک ایک لفظ وحی الہی کا نتیجہ تھا، لیکن اس بات کو واضح ہو جانا چاہیے کہ بڑی حد تک اس کا ایک معتد بہ حصہ اس مواد پر مشتمل ہے جو یہودیوں، عیسائیوں، صابیوں، مجوسیوں اور بت پرست عربوں سے لیا گیا تھا۔]

جبکہ وہ یہ بھی یقین دلاتے ہیں کہ داعی اسلام ﷺ کی دسترس میں تورات یا انجیل کا کوئی جز نہیں تھا۔

"That he did not, however, possess any part of old or new tetament from which he might have derived much of his information, is pretty certain".

(cf. Klein; The Religion of Islam, p.21)

[یہ بات بہر حال یقینی ہے کہ ان کے پاس عہد نامہ قدیم یا عہد نامہ جدید کا کوئی بھی حصہ نہیں تھا، جس سے انہوں نے اپنی کچھ زیادہ معلومات اخذ کی ہوں۔]

مستشرقین نے قرآن وحدیث میں ایسے الفاظ تلاش کیے جو غیر زبانوں میں بھی مستعمل تھے، اور یہ باور کرایا کہ ان الفاظ کے توسط سے مفہوم بھی مستعار لیا گیا، مثلاً جہنم کے لیے قرآن میں سات مختلف الفاظ آئے ہیں۔ ان میں سے سیر اور ستر کو شامی، جہیم کو حبشی، جہنم اور لفظ صلوة کو عبرانی اور لفظ سجدہ کو حبشی لفظ بتایا گیا۔

حدیث وفقہ: قرآن کے ساتھ حدیث وفقہ پر بھی حسب استطاعت زور قلم صرف ہوا۔ فقہ چونکہ قرآن وسنت پر مبنی ہے، اس لیے فقہ کو مغرب اللہ کا قانون کہتا ہے، اور سیاسی تبدیلیوں کے باعث مسلم ممالک میں قانون شریعت سے بے توجہی کو اللہ کے قانون کی ناکامی کا نام دیا گیا۔ بعض اصحاب قلم کو اسلام میں بھی ثنویت نظر آنے لگی، اور یہاں بھی انہوں نے دوہرے نظام اقتدار کو ثابت کرنے کی سعی کی۔

"Thus the Government of Allah and the Government of Sultan grew apart. Social and political life was lived on two planes. The law of God failed because it neglected the factor of change to which Allah had subjected his creatures. To this very day the failure continues".

(G.E. von Grunebaum; Mediaeval Islam, pp. 143-144)

[نتیجۃً اللہ کی حکومت اور سلطان کی حکومت الگ الگ پروان چڑھنے لگیں۔ سیاسی اور سماجی زندگیاں دو سطحوں پر برسر کی جانے لگیں۔ اللہ کا قانون، جو اس نے اپنے بندوں کے لیے وضع کیا تھا، (نعوذ باللہ) ناکام ہو گیا کیونکہ اس نے تبدیلی کے عنصر کو نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ ناکامی آج تک جاری چلی آ رہی ہے۔]

اس قسم کے سطحی تبصرے صرف یہ واضح کرتے ہیں کہ مبصر اصول وفقہ سے یکسر نابلد ہے۔ فقہ کوئی جامد شے نہیں ہے۔ اجتہاد کے دروازے اسلام نے ہمیشہ سے کھول رکھے ہیں۔ قرآن نے اصولی قانون سازی دیے ہیں، قانونی جزئیات نہیں دی ہیں۔ حدود و اصول میں رہتے ہوئے حسب ضرورت جزئیات کی تدوین ہو سکتی ہے۔ پس اگر قانون ناکام بھی ہوا تو یہ ناکامی صرف فقیہ کی ہے جو وقت کا ساتھ نہیں دے سکا۔ اسے قانون الہی کی ناکامی قرار دینا محض تنگ نظری ہے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

گريو نے باؤم کو نہ جانے کہاں سے یہ شواہد نظر آئے کہ اس نے بڑے دُشوک کے ساتھ یہ تحریر کر ڈالا کہ،

"Muslim Law leaves the idolators only the choice between conversion and death". (G.E. von Grunebaum; Mediaeval Islam, pp. 145)

[اسلامی قانون بت پرستوں کو صرف تبدیلی مذہب یا موت کا اختیار ہی بخشتا ہے۔]

غالباً شارلمین کے قانون کو اس نے مسلم قانون تھوڑا کر لیا۔ اگر ایسا تھا تو اسپین اور سسلی کی بازیابی، ہندوستان اور مسلم ممالک میں اقلیتوں کے وجود کی کیا توضیح ہوگی۔ اور امریکہ اور آسٹریلیا کے باشندوں کی نسل کشی کیا اسی اسلامی قانون کے ماننے والوں کا کارنامہ ہے۔

تدوین حدیث کے بارے میں مستشرقین ایک زبان نظر آتے ہیں کہ سب حدیث دوسری صدی کی تحریریں ہیں جو مسلمانوں نے اپنے پیغمبر کی عظمت بڑھانے اور بیرونی تھوڑی رات کی اسلام میں گنجائش پیدا کرنے کے سلسلے میں وضع کر لی ہیں۔

"It (Hadith) served as a means for introducing into Islam alien traditions and concepts." (Philips, K. Hitti; Islam and the West, p.105)

[اس (حدیث) نے اسلام میں اجنبی روایات اور تھوڑی رات کو متعارف کرانے کے لیے ایک ذریعہ کا کام کیا۔]

حدیث کی جانب خصوصی توجہ کا نکتہ، اسپرنگر اور گولڈ زیہرنے دی۔ مستشرقین کے تجربے کے مطابق، ”حدیث نے قرونِ اہل کے مسلمانوں کو عقائد اور قیود کی بندشوں کو نرم کرنے میں مدد دی۔ عقائد اور رسم و رواج میں تبدیلی کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے حسب ضرورت احادیث وضع کی گئیں۔ الفاظِ دہنِ مبارک سے منسوب کیے گئے۔ حسب منشاء افعالِ حیاتِ طیبہ سے متعلق بیان کیے گئے۔ احادیث کے ذریعے سیرتِ طیبہ کو تائید بنانے کا کام لیا گیا۔ قرآن نے داعیِ اسلام (ﷺ) سے کوئی معجزہ منسوب نہیں کیا، جبکہ احادیث معجزات کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتی ہیں۔ قرآنی مباحث میں جب کوئی نزاع پیدا ہوا، احادیث وضع کر کے طے کیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ متضاد احادیث پائی جاتی ہیں۔“

اس قسم کے تبصرے بھی یہ واضح کرتے ہیں کہ مبصرین کو اصولی حدیث کا علم نہیں۔ اگر وہ تاریخِ تدوین حدیث پر ہی نظر ڈالتے تو اس صدی میں حدیث کے بارے میں یہ تحریر کرنے سے گریز کرتے کہ،

"About one hundred years after Mohammed, the Khalif Umer II (99-101 a.h.) gave orders to have them collected and committed to writing".

(F.A. Klein; The Religion of Islam, pp.25-26)

[محمد (ﷺ) کے تقریباً ایک سو سال بعد، خلیفہ عمر ثانی (۹۹ تا ۱۰۱ھ جری)، نے انہیں جمع کرنے اور ضبطِ تحریر میں لانے کے احکامات جاری کیے۔]

مستشرقین نے فن حدیث کو فنِ تاریخ تھوڑا کر لیا۔ یا پھر دیگر مذاہب کی کتب سے مماثل سمجھا کہ مجہول الحال مؤرخین کی تحریروں کو بلا کسی تفتیش کے تاریخی وثیقہ مان لیا جائے۔ بائبل کے گمنام مصنفین کے افکار کو

صحیفہ ساوی تسلیم کر لیا جائے یا خجے گاڑی بان کی روایت پر بھگوت گیتا کو کرشن بھگوان کی تصنیف سمجھ لیا جائے۔ یہاں لاکھوں چشم دید شاہد ہیں جن کی نظریں حیاتِ طیبہ کی ہر خفیف جنبش پر لگی ہوئی ہیں۔ جن کے گوشِ منظرِ سماعت ہیں، اور ہر لفظ کو حاصلِ کلام جان کر محفوظ کر رہے ہیں۔ ان لاکھوں کیمروں اور ٹیپ ریکارڈروں کی موجودگی میں کسی غلط بیانی کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ ہر غلط بیانی یا سہو دوسرے گواہ کے بیان کی روشنی میں خود بخود دور ہو جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ صحاحِ ستہ کی تالیف دوسری صدی میں ہوئی لیکن یہ ان کی اپنی تصانیف نہ تھیں کہ حدیث کی ابتدا ان کے مولفین سے سمجھی جائے۔ اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا کہ صحاحِ ستہ سے قبل حدیثیں تحریری شکل میں موجود نہیں تھیں۔ جبکہ اس امر کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ احادیث خود دو ربِ نبویؐ میں کتابی شکل اختیار کرنے لگی تھیں۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی ’تدوینِ حدیث‘ محدثین کے کارناموں، انکی احتیاط، انکے زہد و تقویٰ، اور اہتمامِ حفاظت حدیث کا مرقع ہے۔ یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ کوئی حدیث کسی محدث کے لیے اس وقت تک قابلِ قبول نہیں تھی جب تک اس کا راوی خود قابلِ اعتماد نہ ہو۔ وہ خود شاہد ہو یا اس نے کسی شاہد سے راست سماعت کی ہو۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ عہدِ صحابہ ایک صدی سے زیادہ بسیط ہے۔ حضرت انسؓ عہدِ نبوی کے بعد سو [۱۰۰] سال سے زیادہ حیات رہے۔ حضرت ہر ماسؓ بن زیادہ باہلی ایک سو بارہ [۱۱۲] سال، حضرت محمود بن ربیع عہدِ نبوی کے بعد ایک سو نو [۱۰۹] سال زندہ رہے۔ ایسے صحابہ جو عہدِ نبوی کے بعد سو [۱۰۰] سال سے کم لیکن ساٹھ [۶۰] سال سے زیادہ حیات رہے، ان کی تعداد تیس [۳۰] سے تجاوز کرتی ہے۔ (ملاحظہ ہو مناظر احسن گیلانی، ’تدوینِ حدیث‘، صفحات ۵۱ تا ۶۵، طبع دوم، کراچی، ۱۳۹۰ھ)۔

ان حالات میں یہ تصور کرنا کہ حضرت عمر ثانی جیسے دیندار خلیفہ متدین علماء سے احادیث جمع کرنے کے لیے کہیں اور غیر مستند مشکوک یا وضعی احادیث جمع کر دی جائیں، اور انہیں بے شمار اصحابِ رسول اللہ ﷺ من و عن قبول کر لیں یا عمداً خاموشی اختیار کر لیں، محض سوءِ ظن ہوگا۔ عمر بن عبد العزیز اسلام کے ”پال“ نہ تھے جنہیں اپنے چرچے کے استحکام کے لیے متی، لوقا یا مرقس کی انجیل درکار ہوتی۔ انکا مقصد محض اقوالِ رسول اللہ ﷺ کو کتابی شکل میں محفوظ کرنا تھا۔ لہذا اس مجموعے کی تصدیق و توثیق ہر ممکن ذریعے سے کرانا ناگزیر تھا۔ ان حالات میں محض بعدِ زمانی، شک و شبہ کی بنیاد نہیں بن سکتا۔

قرآن اور دیگر صحفِ سماوی

پال یہودی تھا۔ اس کے ابتدائی متبعین رومیوں اور یونانیوں کے بجائے وہاں کے یہودی تارکینِ وطن تھے۔ اس کی تبلیغ کو نئے اور جداگانہ مذہب کے پیغام کے بجائے قدیم یہودیت کی تجدید تصور کیا گیا۔ اگر ابتدا سے ہی عیسائیت کو جداگانہ مذہب کی حیثیت حاصل ہوتی تو رومیوں اور یونانیوں کی طرح یہودی بھی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اس سے غیر متعلق رہتے۔ یہود کو وابستہ رکھنے کے لیے عہد نامہ قدیم کو شامل ایمان رکھنا ناگزیر تھا۔ یہود کی کوششوں سے ہی عیسائیت نے یورپ کی سر زمین پر استحکام حاصل کیا۔ مرور زمانہ نے یہود کو عیسائیت سے بے دخل کر دیا۔ لیکن یہود کی تورات (عہد نامہ قدیم) عیسائی بائبل کا جزو لاینفک بن گئی۔

جس طرح عیسائیت نے یہود کے صحف سماوی کو من و عن تسلیم کر کے شریکِ بائبل کیا اسی طرح یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اگرچہ قرآن میں بائبل کی کتب کو شامل نہیں کیا گیا، لیکن اس کے سارے کے سارے مضامین بائبل سے ہی ماخوذ ہیں۔ ماخوذ! کس نے اخذ کیا؟ کیا ایک ایسے عربی باشندے نے جس نے کبھی مدرسہ کی شکل بھی نہیں دیکھی، جس کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہ آئی، جو قرآن کو کبھی اپنے قلم سے نہ لکھ سکا، اور جو عربی کے سوا کسی زبان سے نا آشنا تھا؟ عربی کا لٹریچر قبل از اسلام کیا تھا؟ سب سے معلقات کے سوا کسی اور تحریر کا ذکر تک تاریخ میں نہیں پایا جاتا۔ سوائے شعراء کے اشعار کے، جن میں جنگ و جدل، حمیت جالبہ، فخر و مباہات، تشبیہ، غزل، ہجر و وصال کے علاوہ اور کچھ نہیں پایا جاتا تھا، اور کوئی سرمایہ ادب نہ تھا۔

کیا مغربی مستشرقین یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ عرب میں اس زمانے میں کتنی لائبریریاں تھیں اور ان میں کتنی کتابیں تھیں؟ مٹہ کی بے آب و گیاہ پہاڑیوں میں کتنے کالج تھے اور ان میں کتنے پروفیسر تھے؟ کوئی انتھارٹی وہاں موجود تھی جو تورات و زبور کی حقیقی تعلیم دے سکتی تھی۔ کہتے ہیں کہ عرب میں یہود موجود تھے اور ان کے پاس تورات اور زبور موجود تھی، ان ہی سے تعلیم حاصل کی ہوگی۔ مگر یہ کبھی نہیں کہتے کہ یہود اپنی مذہبی تعلیم کسی غیر یہودی کو دینا گناہ تصور کرتے تھے۔ پھر یہودی تعلیم اور حرمت عیسیٰ دو متضاد باتیں ہیں، اور حجاز میں عیسائیوں کا وجود نہیں تھا۔ پھر عیسائی تعلیم کے بعد تشکیث سے انحراف کیونکر ممکن ہو سکتا؟ الوہیت عیسیٰ سے انکار کس طور ممکن ہوتا؟

عرب کا ماحول علمی ماحول نہ تھا۔ ایک علمی مقالہ، ایک علمی ماحول میں برسوں کے متیق مطالعے کے بعد تحریر ہو پاتا ہے۔ قرآن جیسا عظیم کارنامہ، جو عرب تو کجا ساری دنیا میں نہ اس سے قبل نظر آتا ہے نہ اس کے بعد، عرب کے بدوی ماحول میں جہاں گلہ بانی، صحراوردی، فقر و فجور، جنگ و جدل اور اخلاقی پستی کے سوا کچھ نہ تھا، کس طرح انجام پایا؟ وہ مخالف ماحول جو دشمنی اور عناد پر کمر بستہ تھا، کیوں اس معلم یا ذریعہ تعلیم کو دریافت نہ کر سکا جس سے قرآن (ہزعم دشمنان) ترتیب پارتھا؟ دشمنوں کے لیے اپنی توانائیاں مخالفت میں صرف کرے کے بجائے یہ زیادہ ہل ہوتا کہ وہ اس معلم یا ذریعہ تعلیم کی نشاندہی کر کے اپنا درِ خرم کر لیتے۔ قرآن کے اس ڈوے کو بے اثر کر دکھاتے کہ قرآن کی ایک سورۃ بھی انسان کے لیے ناقابلِ تدوین ہے۔

عرب کے ماحول میں دنیا کی عظیم ترین کتاب کی تصنیف ناممکن تھی۔ پھر آخر قرآن کیسے ظہور پذیر ہوا؟ یہ مسئلہ اس وقت تک حل طلب ہی رہے گا جب تک وحی الہی کو ذریعہ علم تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اور جو نبی وحی کو اسکا ذریعہ تسلیم کر لیا جائے، تمام مسائل خود بخود حل ہو جاتے ہیں کہ تمام صحف سماوی کا تعلق ایک ہی سرچشمہ ہدایت سے ہے جس کے باعث ان میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ قرآن میں عہد نامہ قدیم و جدید کے مذکور انبیاء کا تذکرہ اسی لیے بار بار ہوتا ہے کہ وہ بھی انسان اور عالمِ بالا کے درمیان واسطہ تھے۔ جس طرح پیشہ ور طبیب

مثلاً: مورخ، سائنس دان، اطباء، فلسفی، سب کے سب اپنے پیشرو و مشاہیر سے اپنا تعلق قائم رکھتے ہیں اسی طرح اگر سلسلہ توحید میں یہی تعلق نظر آتا ہے تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے؟ کوئی بھی شخص جو کسی صحیفہ سماوی کا قائل ہو، قرآن کے صحیفہ سماوی ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔ قرآن ہر پہلو سے دیگر صحیفہ سماوی سے اعلیٰ اور ارفع ہے۔

عہد نامہ قدیم و جدید کسی ایک دور یا ایک شخص کی الہامی واردات کا نتیجہ نہیں ہیں۔ ان کے بے شمار گمنام نعتیہ ہیں، جو بیڑہ ہزار سال کی مدت میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کتابوں کی تاریخی حیثیت غیر تسلی بخش ہے اور یہ ہر دور میں اداری کاوشوں سے مجروح ہوتی رہی ہیں۔ عہد نامہ قدیم کی کتابیں قابل اعتراض مواد سے لبریز ہیں۔ ان میں عوامی داستانیں بھی ہیں اور ناقص تاریخ بھی۔ خلاف عقل واقعات، سائنسی نقطہ نظر سے لغویات، نیم وحشی اخلاقیات، اور غیر اخلاقی بلکہ فحاشی کی حدود کو چھونے والے افسانے بھی ہیں۔ ان کتابوں کی اہمیت صرف اس قدر ہے کہ ان سے وحدانیت کا تصور وابستہ ہے۔ ورنہ ان کی وضعی کہانیوں سے خود عیسائیت پریشان ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے والے معصوم بچے بڑے ہو کر جب آگاہ ہوں گے کہ یہ سب قصے کہانیاں محض وضعی ہیں تو ان کتابوں پر مبنی مذاہب کا تقدس کس قدر مجروح ہوگا۔ یورپ کے ماہرین تعلیم اس امر کا مشورہ دے رہے ہیں کہ اسکولوں کے نصاب سے عہد نامہ قدیم کو خارج کر دیا جائے کیونکہ جیسے جیسے انسانی علم کامل ہوتا جاتا ہے، عہد نامہ قدیم کی کتب کی زبانوں حالی بڑھتی جاتی ہے۔

کیا قرآن میں بھی اس قسم کی کوئی کمزوری پائی جاتی ہے؟ ڈاکٹر بوکاٹی نے اپنی کتاب 'سائنس، بائبل اور قرآن' میں سائنسی نکتہ نظر سے دونوں کا جائزہ لیا ہے۔ اس میں جہاں انہوں نے بائبل کو سائنسی نکتہ نظر سے غلط کا مجموعہ قرار دیا ہے، وہیں انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ:

"It was only when I examined the text (of Quran) very closely in Arabic and I kept a list of them (scientific statements) that at the end of which I had to acknowledge the evidence in front of me. The Quran did not contain a single statement that was questionable from a modern scientific point of view".

(Dr. Boucaille; The Bible, The Quran and Science, p.viii)

[یہ صرف اسی وقت ہوا جب میں نے قرآن کے متن کا عربی زبان میں ان (سائنسی بیانات) کی ایک فہرست مرتب کرتے ہوئے انتہائی عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا، کہ بالآخر مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ میرے سامنے (الہامی کتاب ہونے کی) گواہی موجود ہے۔ قرآن میں کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو جدید سائنس کے نقطہ نظر سے قابل اعتراض ٹھہرتی ہو۔]

قرآن کے کسی بیان کی اب تک سائنسی نقطہ نظر سے تردید نہیں کی جاسکی ہے۔ اس کے برخلاف ایسے دعوے بکثرت پائے جاتے ہیں جن کی صحت کی سائنس نے اس صدی [بیسویں صدی] میں تصدیق کی ہے۔

مغرب نے عموماً قرآن پر بڑی سطحی تنقیدیں کی ہیں، مثلاً مضامین قرآن کا دیگر صحف سے مماثل ہونا، انبیاء کا مشترک ہونا، مضامین کی تکرار، موضوعات کی جلد جلد تبدیلی، قرأت میں اکتاہٹ کا احساس، زبان کی سختی وغیرہ۔ اس بارے میں صرف یہی کہا جاسکتا ہے کہ کسی صحیفہ ساوی سے اگر کوئی ذہن ہم آہنگ نہ ہو سکے تو یہ صرف اس ذہن کا ہی قصور ہو سکتا ہے۔ تاہم کچھ اعتراضات ایسے بھی ملتے ہیں جنہیں وہ حاصل کلام تھوڑے کرتے ہیں۔

مریم اور میریا کی الجھن: ان میں سے ایک الزام یہ عائد کیا جاتا ہے کہ صاحب قرآن عہد نامہ کی کتب سے راست واقفیت نہ رکھتے تھے۔ ان کی معلومات کا ذریعہ سنی سنائی باتیں تھیں جس کے باعث ان سے مختلف شخصیات کے بارے میں (نعوذ باللہ) سبھو ہوا۔ مثلاً سورہ آل عمران میں حضرت مریم کے والد کا اسم گرامی عمران بیان کیا گیا ہے جبکہ تورات کی کتاب پیدائش میں حضرت موسیٰ کے والد کا نام عمرام پایا جاتا ہے۔ اور حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کی ایک بہن تھیں جن کا نام بھی مریم تھا۔ مغرب اؤل الذکر کو ”میری“ اور ثانی الذکر کو مریم کہتا ہے۔ نیز قرآن میں سورہ مریم کی آیت ۲۸ میں حضرت مریم کو احوٹ ہارون کہا گیا ہے۔ ان محقق اشارات کی مدد سے مغرب نے یہ دعویٰ کیا کہ،

"A confusion seems to have existed in the mind of Mohammed between the virgin Mary and Miriam the sister of Moses".

(E.H. Palmer; The Koran, p.45)

[محمد ﷺ کے ذہن میں (نعوذ باللہ) ایسا لگتا ہے کہ کنواری میری اور موسیٰ کی بہن مریم (کی شخصیات) کے درمیان ایک ابہام سا تھا۔]

اس ایک اعتراض میں دو خامیاں ہیں۔ اؤل تو یہ کہ ذہن نبوی خود قرآن کے تابع تھا، قرآن ذہن نبوی کی تخلیق نہیں۔ دوسری خامی یہ ہے کہ مغرب خود اپنی الجھن اور کم فہمی کو ذہن نبوی سے منسوب کرنے کی ناشائستہ جسارت کر رہا ہے۔ بالفرض اگر ہر دو ہستیوں کو ایک تھوڑا جا رہا تھا تو اس کے دور رس اثرات کسی نہ کسی اور مقام پر ظاہر ہونے چاہیے تھے۔ ہر وہ فرد جو حضرت مریم کو حضرت موسیٰ کی بہن تھوڑے کر تا وہ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کو ہم عصر سمجھتا، اور نتیجتاً دین عیسوی اور دین موسوی کو ایک ہی دور کے مذاہب قرار دیتا، اور انہیں یا تو ایک ہی مذہب تھوڑے کر تا یا پھر ایک دوسرے کے رقیب۔ اس یکسانیت یا رقابت کے اظہار کے لیے کسی نہ کسی واقعے کا اشارہ تو ملتا۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے باہمی تعلقات کا تذکرہ ہوتا۔ لیکن پورے قرآن کے دقیق ترین مطالعے سے بھی اس امر کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس دور موسوی اور دور عیسوی کے بعد زمانی کا واضح تھوڑے رہتا ہے۔ فرعون کا زمانہ، مصر و سینا کا ماحول، بنی اسرائیل کی مظلومیت، [حضرت موسیٰ کے] ہم عصروں میں حضرت شعیب اور حضرت ہارون کے تذکرے، اس دور کی معاشرتی جھلکیاں، جادو اور سحر، گاؤں پرستی، بے راہ روی، جدوجہد آزادی، خروج، صحرانوردی، آب و دانہ کی کمیابی، عبادت کا انداز، عبادت گاہوں کی نایابی، شریعت کا نفاذ، لشکر کشی اور فتوحات، ارض کنعان کی جانب پیش قدمی، یہ ساری تفصیلات دور موسوی کی غیر مبہم تصویر کھینچتی ہیں۔

حضرت عیسیٰ اور ان کے دور کی منظر کشی مندرجہ بالا تصویر سے قطعی جدا ہے۔ نہ فراغت ہیں نہ مصر و سینا کا ماحول، بنی اسرائیل مظلوم اقلیت یا خانہ بدوش نہیں، بلکہ متمدن شہری ہیں۔ جتنے بیکل ہیں جہاں خدا رسیدہ لوگ گوشہ نشینی اختیار کرتے ہیں۔ یہ وہ دور ہے جب شرع کے مطابق پرسکون انداز میں عبادت کی جارہی ہے۔ [حضرت عیسیٰ کے اہم عصر بزرگوں میں حضرت زکریا اور ہم عمروں میں حضرت یحییٰ ہیں۔ معاشرتی جھلکیوں میں جادوؤں کی جگہ طب کا چرچا ہے۔ فوج کشی کی جگہ تزکیہ نفس ہے۔ من و سلوئی کے بجائے کھجور اور میوؤں کا چلن ہے۔ خیوں کی جگہ پختہ عمارتیں ہیں۔ الواح کے بدلے کتاب، کسی نئے مذہب اور نئے شرعی احکامات کی جگہ قدیم شرع کی تجدید کی کوشش۔ کیا یہ تفصیلات ایک جداگانہ دور کی منظر کشی کرنے میں کوئی مدد نہیں دیتیں؟ ان جداگانہ ادوار کے تعین کے بعد شاید ہی کوئی صحیح الدماغ شخص ہو جو یہ کہے کہ مریم بنت عمران اور مریم بنت عمار دونوں کے تخصّص میں کسی قسم کا الجھاؤ پایا جاتا ہے۔ ناموں کے تلفظ میں اختلاف تو ایک عام سی بات ہے۔ عہد نامہ قدیم و جدید کے بیشتر بزرگ یونانی اور لاطینی تلفظ کے سبب اجنبی سے ہو گئے۔ ابراہام، یسوعیل، جیکب، جوزف، جوذا، ڈیوڈ، سولومن، ایلیا یا الیسیا، جاب، جان، موزز اور جیسس یہ سارے تلفظ ابراہیم، اسمعیل، یعقوب، یوسف، یہودا، داؤد، سلیمان، الیاس، ایوب، یحییٰ، موسیٰ اور عیسیٰ کے اسمائے گرامی کی بدلی ہوئی شکلیں ہی تو ہیں۔ پھر اگر مریم کو میری یا میریا کر دیا تو اس میں قصور وار کون ہے؟ قرآن نے تو انہیں ان کے صحیح ناموں سے یاد کیا۔ یہ تو مغرب ہے جو اپنے تلفظ کو قدر بنا کر صحیح کو غلط قرار دے رہا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ قرآن نے مریم بنت عمران کو اخت بارون کیوں کہا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے والد کا نام عمار تھا، عمران نہ تھا۔ قرآن نے مریم بنت عمار کو نہیں مریم بنت عمران کو حضرت عیسیٰ کی والدہ کہا ہے، اور ان کو اخت بارون کی کنیت سے ایک بلیغ انداز میں یاد کیا ہے۔ اس انداز کی لطافت سے نا آشنا ہونے کے سبب سے ہی زبان طعن دراز ہو سکی۔

عرب اور عبر دونوں ہی اپنے آپ کو اپنے اجداد سے منسوب کرنے میں فخر محسوس کرتے آئے ہیں۔ مشاہیر عرب اپنے ذاتی ناموں سے کم ہی معروف ہیں اور زیادہ تر اپنی کنیت سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ابن رشد، ابن سینا، ابن العربی، ابن بطار، ابن جنبل، ابن میمون، ابن ماجہ، ابن خلدون سے کون واقف نہیں، لیکن ان کے ذاتی ناموں سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔ ان کے لیے اپنے آباء و اجداد سے موسوم ہونا باعث افتخار تھا۔ اسی طرح باعزت مخاطبت کے لیے اجداد کی مناسبت دی جاتی تھی۔ مثلاً حضور ﷺ نے اپنی ذات گرامی کے لیے فرمایا،

”أَنَا دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ وَبُشْرَى أَخِي عِيسَى“

[میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا اور اپنے بھائی عیسیٰ کی بشارت ہوں۔]

(ملاحظہ ہو کہ حضرت ابراہیمؑ کو والد اور حضرت عیسیٰؑ کو بھائی فرمایا)

حلیہ سعدیہ سے شہنشاہ کی جو روایت بیان کی جاتی ہے، اس میں حضور ﷺ کے لیے حلیمہ کے بیٹے

نے ’زخ قریش‘ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

اس پس منظر میں دیکھئے سے قرآن میں حضرت مریم کے لیے استعمال کیے گئے احب ہارون کے الفاظ کے معنی ہی بدل جاتے ہیں۔ جب حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی تو،

فَآتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُہٗ ۖ قَالُوْۤا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْئًا فَرِیًّا ۝ یٰۤاَحْبَتِ ھٰرُوْنُ مَا کَانَ اَبُوْلَہٗ اَمْرًا سَوَیًّا ۚ وَ مَا کَانَتِ اُمْلٰتِ بَغِیًّا ۝ (القرآن، سورۃ مریم، آیہ ۲۷-۲۸)

”(مریم گود میں) انہیں لیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں۔ لوگوں نے کہا اے مریم یہ تو نے کیا طوفان پیا کیا۔ اے احب ہارون! نہ تیرا باپ کوئی برا آدمی تھا نہ تیری ماں بدکار تھی۔.....“

اس پس منظر میں یہ بات کوئی دھکی چھپی نہیں رہ جاتی کہ حضرت مریم کی قوم نے جہاں انکا اسم ذاتی استعمال کیا وہیں انکو دوسری نسبت سے بھی یاد کیا۔ اب سوال صرف یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس دوسری نسبت کی حقیقت کیا ہے؟ کیا انہیں حقیقی اعتبار سے احب ہارون کہا گیا یا یہ مجازی اعتبار سے تھا؟

حقیقی اعتبار سے انہیں احب ہارون نہیں کہا گیا۔ یہ بات ہمیں حضرت مغیرہ بن شعبہ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتی ہے جسے مسلم نے روایت کیا اور علامہ جلال الدین سیوطی نے الاثقان کی نوع ۸۰ میں سورہ مریم کے متعلق تفسیری احادیث میں نقل کیا۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا،

”مجھ کو رسول اللہ ﷺ نے نجران کی طرف بھیجا تو وہاں کے لوگوں (عیسائیوں) نے کہا، کیا تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ تم لوگ یا احب ہارون پڑھتے ہو حالانکہ حضرت موسیٰ حضرت عیسیٰ سے اتنے اتنے زمانے قبل گزرے ہیں۔ پھر میں واپس آیا تو میں نے اس بات کا ذکر رسول اللہ ﷺ سے کیا۔ رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا، تم نے ان کو یہ خبر کیوں نہ دی کہ وہ (بنی اسرائیل) انبیاء قبل اور صالحین کے ناموں پر ہی بچوں کے نام رکھا کرتے تھے۔“

اس حدیث کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ دور نبوی میں ہی عرب اس امر سے واقف تھے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان خاصا بعد زمانی تھا۔ یہ علم خود حضور ﷺ کو بھی تھا۔ لہذا یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ان دو شخصیتوں کے تشخص میں کوئی الجھن رہی ہو۔

مزید برآں خود پامر نے سورہ حجرات کی آیت کی شان نزول یہ نقل کی کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے ام المومنین حضرت صفیہؓ کو یہودی النسل ہونے کا طعنہ دیا، جسکی شکایت حضرت صفیہؓ نے حضور ﷺ سے کی۔ جس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ ہارون میرے باپ، موسیٰ میرے چچا اور محمد ﷺ میرے شوہر ہیں۔

کیا کوئی شخص اس انداز بیان سے یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ چونکہ یہاں صیغہ حال استعمال ہوا ہے لہذا یہ ساری شخصیتیں ایک ہی دور کی ہیں۔ یا یہ کہ متکلم کو شخصیتوں کے تشخص میں کوئی غلط فہمی تھی۔ یا یہ کہ اگر حضرت ہارون کی کسی بیٹی کا نام اتفاقاً صفیہ ہوتا تو ام المومنین صفیہؓ کو حضرت ہارون کی حقیقی دختر تصور کیا جاتا۔ ایسا تصور کرنا یقیناً کم علمی کی دلیل مانا جائے گا۔

ملاحظہ فرمائیے کہ قرآن کا حضرت مریمؑ کو 'یا احسب بارون' سے خطاب کرنا کسی قدر لطافت رکھتا ہے۔ تورات کی کتب خروج، احبار اور گنتی حضرت بارونؑ کی فضیلت اور تقدس سے بھری پڑی ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد انہیں سب سے بڑا درجہ حاصل ہے۔ یہود میں ہیکل کی تمام مذہبی خدمات حضرت بارونؑ کی اولاد کے لیے وقف ہیں۔ اسی طرح کسی کی حضرت بارونؑ سے نسبت اس کی عالیٰ نبی، مذہبی تقدس اور علمی فضیلت کے اظہار کے لیے کافی ہے۔ ان کے گھرانے کی ہر خاتون خود کو نبیہٗ بارون کہتی ہے۔

حضرت بارونؑ کی ایک بہن مریم تھیں۔ جنکا تذکرہ تورات کی متعدد کتب مثلاً خروج باب ۱۵-درس ۲۰، باب ۲-درس ۴، قضاۃ باب ۴-درس ۴، میکاہ باب ۶-درس ۴، گنتی باب ۱۲-درس ۱ تا درس ۱۶ میں آیا ہے۔ ان میں بیان کردہ واقعات کے مطابق یہ خاتون نبیہ تھیں (واضح رہے کہ اسلام ان کو یا کسی اور خاتون کو نبی نہیں مانتا)۔ اور اپنے بھائیوں کے ساتھ مل کر دینی کاموں میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتی تھیں۔ یہ واحد خاتون تھیں جو خداوند یہود کے مسکن میں باریاب تھیں۔ گویا بنی اسرائیل کی خواتین میں انہیں عظیم ترین مذہبی حیثیت حاصل تھی۔ تورات ہی کی کتاب گنتی باب ۱۲ کے مطابق انہیں یہ خیال گزرا کہ جب انہیں اور حضرت بارونؑ کو حضرت موسیٰؑ کے برابر درجہ میسر تھا تو آخر حضرت موسیٰؑ کو ہر معاملے میں کیونکر فضیلت دی جاتی تھی۔ ان کی بدگمانی کے سبب خدا کا قبران پر کوڑھ کی شکل میں نازل ہوا، جس کے بعد انہوں نے توبہ کی اور پھر انہیں اس عذاب سے نجات ملی۔

ان واقعات کی روشنی میں اس منظر کا مشاہدہ کیجیے کہ حضرت مریمؑ کی قوم غلط فہمی کی بنیاد پر ان کی مذمت کرنے پر اترتی ہوئی ہے۔ اگر قوم کا مافی الضمیر بیان کیا جائے تو یہ حضرت مریمؑ پر تہمت ہوتی اور اگر مافی الضمیر کی جانب کنایہ نہ کیا جائے تو قوم کے جذبات کی عکاسی نہ ہو سکے۔ لطافت و اعجاز بیان یہی ہے کہ انکی حرمت بھی برقرار رہی اور قوم کے جذبات کا اظہار بھی ہو گیا۔ احسب بارون سے تشبیہ دے کر انہیں تقدس و حرمت میں عظیم ترین مقام پر فائز رکھا گیا۔ اور عامیانہ ذہن کی فرسودگی کی نشاندہی بھی کر دی۔ برگزیدہ بندوں کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ فطرتاً معصوم ہوتے ہیں۔ اور بازارِ لوگ بے جھجک ان پر بہتان باندھتے ہیں۔ اس پوری کیفیت کا صرف ایک مجاز سے اظہار اپنی مثال آپ ہے۔

ہامان: قرآن میں حسب ذیل مقامات پر ہامان کا ذکر فرعون کے ساتھ آیا ہے۔ سورۃ القصص، آیات ۶ تا ۸ اور ۳۸، سورۃ غنکبوت، آیت ۳۹۔

عبدنامہ قدیم کی کتاب 'استر' کے ایک کردار کا نام بھی ہامان ہے، جو ایران کے شاہ اخویرس کا وزیر اور یہود کا سخت دشمن تھا۔ اس نے شہنشاہ سے پوری مملکت میں یہود کے قتل عام کی اجازت حاصل کی لیکن یہود 'استر' اور یہودی 'مردوکی' کے جوڑ توڑ کے باعث ہامان کو اس سولی پر لٹکایا گیا جو اس نے مردوکی کے لیے تیار کی تھی۔ (عبدنامہ قدیم، استر، باب ۱-۷)

مستشرقین نے اس نکتہ کو بھی خاصا اچھا لایا ہے اور نہایت تمسخرانہ انداز میں بیان کیا ہے کہ 'قرآن نے ہامان کو فرعون کا وزیر اعظم بنادیا'۔ (E.H. Palmer; TheKoran, p.45)۔ اس ایک جملے میں

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

پورا ایک تنقیدی باب بند ہے۔ مراد یہ کہ قرآن چونکہ، مستشرقین کی نظر میں، انسانی تصنیف ہے، اس لیے اس کے مصنف نے محض اپنی اعلیٰ کے باعث بائبل کے اس کردار کو فرعون کا وزیر اعظم بنا دیا۔ گویا تاریخ میں ایک نام کے دوافراد کا وجود ان مستشرقین نے خارج از امکان قرار دے دیا۔

بیسویں صدی کی تحقیقات کی روشنی میں بعض ایسے حقائق سامنے آئے ہیں جن کی بنیاد پر بلا کسی شک و شبہ کے یہ کہا جاسکتا ہے کہ فرعون کے وزیر مذہبی امور کا نام 'ہامان' تھا۔ انسا نکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون "مصر" کے چند متعلقہ اقتباسات حسب ذیل ہیں۔

۱- "۱۹۲۲ء میں مغربی تھیس کی وادی مقابر شامان میں ایک صحیح سالم مقبرے کی دریافت نے اخبارات کو شہ سرخیوں سے بھر دیا۔ یہ مقبرہ تو تنک ہامان کا تھا۔"

۲- "آمن دیوتا کا مندر تھیس میں تھا۔ اس کی پرستش ہر دور میں نظر آتی ہے۔ یہ خدائے شمس تھا۔ یا تو فرعون خود اس کا مہا پجاری ہوتا تھا، یا پھر فرعون کا وزیر کبیر اس عہدے پر فائز ہوتا تھا۔ چنانچہ اختان کو اس قدر مذہبی لگاؤ تھا کہ وہ خود ہی آمن دیوتا کا مہا پجاری تھا۔"

۳- "اختان ۱۳۶۲ ق۔ م کے لگ بھگ مرا۔ اس کی کوئی اولاد نہ رہی۔ چھ لڑکیاں ہی لڑکیاں تھیں۔ اس لیے اس کے بعد اس کے داماد حکمران ہوئے۔ پہلا داماد صرف ایک قلیل مدت ہی حکومت کر سکا۔ دوسرا تو تنک ہامان تھا، جس کا مقبرہ ۱۹۲۲ء میں دریافت ہوا۔ اکیسویں خاندان کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ آمن کے مہا پجاری کی قوت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ راست فرعون سے ٹکر لے رہا تھا۔"

۴- "شدید شورش یا شانہ خانہ جنگی کے بعد بیر یہور نے جو آمن کا مہا پجاری، گش کا وائسرائے اور فوج کا سپہ سالار تھا، رعیمیس کی حیات میں ہی شاہی لقب اختیار کیا۔ اس کے زمانے کا ایک منفرد نوشتہ پایا جاتا ہے جسے تاریخی رومان کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ قصہ ون آمن' کہلاتا ہے۔ اس کے مطابق بیر یہور نے ون آمن کو شام روانہ کیا جہاں اسے پتہ چلا کہ مصر کی ساکھ بیرونی دنیا میں ختم ہو چکی ہے۔"

۵- " (آمن کے) مہا پجاری کو ملک میں فراغ کے بعد سب سے بڑا درجہ حاصل تھا۔ کبھی خود فرعون اس مندر کا مہا پجاری ہوتا تھا۔"

۶- "فرعون کے بعد ملک کا اہم ترین عہدہ وزارت امور مذہبی کا تھا۔ یہ وزارت ہمیشہ آمن کے مہا پجاری کو تفویض کی جاتی تھی۔"

(For details of the above cited points see; Encyclopedia Britanica, essay 'Egypt', Vol. VIII, pp.33-44)

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ فراغ کے وزرائے اعظم آمن کے مہا پجاری ہوا کرتے تھے۔ اور فراغ کے بعد مقتدر ترین شخصیت آمن کے ان پجاریوں کی تھی۔ لفظ آمن کا استعمال کبھی کبھی مرکب شکل میں بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً آمن۔ رے۔ مصری زبان میں رے یا راسورج کو کہتے تھے۔ سورج بذات کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

خود دیوتا تھا۔ لہذا محسوس ہوتا ہے کہ لفظ آ من دیوتا کے علاوہ کسی وصف کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جیسے مذہب، قانون، امن، طریقہ، اقتدار وغیرہ۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون ہیر وگلف کے مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ پجاریوں کو ان کے دیوتاؤں سے نسبت دینے کے لیے لفظ 'ہم' دیوتا کے نام سے پہلے یا بعد میں لگایا جاتا تھا۔ انسائیکلو پیڈیا نے ہم نسر کے معنی 'عبد نسر' بیان کیے ہیں۔

ہیر وگلفی تحریر میں ہم نسر کے لیے 𐎲𐎠 اشارات استعمال کیے گئے ہیں۔

NCR HM

اور ماہرین نے اس اشارے کی حسب ذیل تصریح کی ہے۔

'HM - NCR , Servant of God (A type of Priest), written NCR-HM'

(Encyclopedia Britanica; essay 'Hiero Glyphs'. Vol. 11, p.479)

ان معلومات کی روشنی میں یہ کہنا خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ جس طرح 'ہم نسر' اس پجاری کو کہا جاتا تھا جو نسر کی خدمت پر مامور تھا اسی طرح دیگر پجاریوں کو بھی اسکے دیوتاؤں کے ناموں سے ملقب کیا جاتا رہا ہوگا۔ اس طرح آ من کے پجاری کو ہم آ من کہا جاتا ہوگا، جو رفتہ رفتہ 'ہامان' میں تبدیل ہو گیا ہوگا۔ اگر آ من اسم خاص متصور ہو تو ہامان عبد آ من کے مترادف ہوگا۔ اور اگر آ من کے کوئی وصفی معنی رہے ہوں گے تو ہامان ایسی با اقتدار شخصیت نظر آئے گی جو آ من کے تقاضوں کی تکمیل کی ذمہ دار ہو۔

لفظی بحث سے قطع نظر، ہامان ایک نہایت اہم عہدیدار کو کہا جاتا تھا۔ جس کا مرتبہ فرعون کے سوا کسی اور سے کم نہیں تھا۔ یہ محض اتفاق ہے اس نام کا ایک کردار کتاب 'آستر' میں بھی پایا جاتا ہے۔ جس کے سبب اس قسم کے اعتراض کو راہل سکی۔ ورنہ حقائق کی روشنی میں ان مستشرقین کا اعتراض انکی اپنی کم علمی کی دلیل ہے۔

جنت اور مغرب؟ نظریہ بنوئیت اور عقیدہ معاد میں ایک گہرا تضاد ہے۔ بنوئیت کے مطابق روح پاک اور بدن ناپاک ہے۔ روح کی آزادی بدن کے فنا ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ روح بدن کے بنجرے میں مقید ہے۔ اگر حیات بعد الہمات میں روح دوبارہ بدن میں قید ہو جائے تو یہ نجات کے تصور کے منافی ہے۔ جبکہ عقیدہ معاد کے مطابق بلا بدن کے حیات بعد الہمات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ روح لافانی ہے اور غیر مادی ہے۔ اسکے اظہار کے لیے بدن لازمی ہے۔ عیسائیت نے ان دونوں متضاد نظریات کو اپنایا اور اشکال کو دور کرنے کے لیے یہ تاثر دیا کہ حیات بعد الہمات مادی جسم میں نہیں بلکہ ایک غیر مادی جسم میں ہوگی۔ اس تصور کے سبب آخرت کی زندگی میں دنیاوی احتیاجات مثلاً کھانا پینا یا جسمانی مسرت کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

یہی وجہ ہے کہ عیسائی جب قرآن میں ایسی جنت کا تذکرہ پاتا ہے جہاں رہنے کے لیے مکانات، کھانے پینے کے اعلیٰ انتظامات اور عیش جاودانی کے سامان میسر ہیں تو اسے سخت قباح محسوس ہوتی ہے اور وہ اس

پر تنقید، طنز اور طعن کرتا ہے۔ جنت کے اسباب مسرت کو وہ غیر فطری قرار دیتا ہے اور تان یہاں ٹوٹتی ہے کہ غیر فطری باتیں کسی الہامی کتاب کا جز نہیں ہو سکتیں۔

یہ تنقید صرف اس لیے کچھ وزنی محسوس ہوتی ہے کہ مغربی قدر کو صحیح بنایا و تقابل کی حیثیت دی جاتی ہے۔ لیکن یہ قدر خود اس کے اپنے مذہب اور کتب سماوی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ غیر مادی جسم کا تصور پال نے یونانی اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے دیا تھا۔ لیکن پال کے اس تصور کی تائید میں عہد نامہ قدیم یا عہد نامہ جدید میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔ جبکہ انجیل متی، انجیل لوقا اور انجیل یوحنا میں جنت، اس کے محل اور اسکے مشاغل میں خور و نوش کا ذکر پال کے نظریے کی واضح تردید ہے۔ وہاں صرف ایماندار ہی نہیں بلکہ خود خدا بھی دعوت میں شریک نظر آتا ہے۔ انجیل متی کے مطابق یسوع نے کہا:

”میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم اس شہرہ اب اس وقت تک نہ بیٹے گا جب تک کہ تمہارے ساتھ اپنے باپ کی بادشاہی میں دوبارہ نہ بیٹے۔“ (متی ۲۶-۲۹)

خدا کی بادشاہت کی توضیح مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے۔ ابتدائی ایام میں یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ جلد ہی دوبارہ نزول کریں گے۔ ان کی آمد قیامت کا پیش خیمہ ہوگی جس کے بعد خدا کی بادشاہت شروع ہو جائے گی۔ صدیوں و روایتی کا انتظار ہوا، پھر قیامت کا تصور رپس منظر میں چلا گیا اور اسکی نئی نئی تاویلیں ہوئیں۔ کبھی اس بادشاہت کو ایمان سے اور کبھی چرچ سے تعبیر کیا گیا۔ اور بالا خر خدا کی بادشاہت آسمانی قرار پائی، جس میں انسان موت کے بعد زندہ ہو کر داخل ہوگا۔

انجیل لوقا کے مطابق یسوع نے کہا، ”تا کہ تم باپ کی میز پر بیٹھ کر کھاؤ بیٹے۔“ (لوقا ۲۲، ۳۰)

”تمہارا دل نہ گھرائے۔ تم خدا پر ایمان رکھتے ہو۔ مجھ پر ایمان رکھو۔ میرے باپ کے بہت سے محل اور مکان ہیں۔ اگر نہ ہوتے تو میں تم سے کہہ دیتا۔“ (یوحنا ۱۴، ۲-۱)

مندرجہ بالا اشارات معاد کا یقینا ایسا تصور پیش کرتے ہیں جس میں ایماندار محلوں میں رہیں گے اور خور و نوش سے لطف اندوز ہوں گے۔ خدائے پدر کے دستِ خواں پر دعوت سے سرفراز ہوں گے۔ معاد کا یہ عقیدہ عیسائیت کے ابتدائی ایام میں مسلّمہ تھا۔ چنانچہ سینٹ افرم متو ۳۷۷ء نے مقام سعادت کی منظر کشی میں سارے زمینی رنگ استعمال کیے ہیں۔ (G. E. von Grunebaum, Mediaeval Islam, p.13)

یونانی اثرات کے تحت جنس کو عیسائیت نے ہر صورت میں سفلی جذبہ تصور کیا ہے لیکن اسلام اسے ایک فطری تقاضہ قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنت میں اناث کا ذکر عیسائیوں کو غیر اخلاقی محسوس ہوتا ہے۔

عہد نامہ قدیم چونکہ یونانی اثرات سے آزاد تھا اس لیے اس میں آدم کے ساتھ جنت میں ۷۰ کی موجودگی موجب عار تصور نہیں کی گئی۔ عیسائیت نے ہر دو یعنی یونانی تصور کو بھی اپنایا اور عہد نامہ قدیم کے تصور کو بھی، اس لیے تضاد پیدا ہوا، جس کے سبب جنت قدیم میں تو عورت کا وجود باقی رہا لیکن اس جنت میں جسے عیسائیت نے یونانی تصور کو قبول کرنے کے بعد ہتسمہ دیا، عورت کا وجود غیر اخلاقی بن گیا۔

پس قرآن میں بخت کی جو تفصیلات پائی جاتی ہیں اور جنہیں مغرب اچھی طرح سے دیکھتا ہے، ساری کی ساری خود عہد نامہ قدیم و جدید میں مجمل طور پر موجود ہیں۔ خود اپنی کتابوں پر انہیں کوئی استغباب نہیں ہوتا، لیکن یہی باتیں اگر قرآن میں پاتے ہیں تو انگشت نمائی کرتے ہیں۔ کیا یہ صرف اس وجہ سے نہیں ہے کہ قرآن انکی اپنی مذہبی کتاب نہیں ہے۔ لہذا کوشش یہی ہوتی ہے کہ جس طور بھی ممکن ہو اس کی اہمیت کو مجروح کیا جائے۔

متن قرآن: متعدد مستشرقین نے متن قرآن میں شبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نکلسن نے دعویٰ کیا کہ حضور

اپنی وحی کو کسی کتاب کا حصہ تھو نہیں کرتے تھے۔ [cf. R.A. Nicholson; Introduction to E. H.] (Palmer's Translation of Quran)۔ یہ اس کتاب کے بارے میں کہا جا رہا ہے جس کی ابتدا ہی 'ذَلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ' کے الفاظ سے ہوتی ہے۔

نولد کی، میو اور رسیل نے جمع و مد و سن قرآن میں تحریف و تصرف کے شبہ سے گریز کیا تاہم یہ الزام ضرور لگایا کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں پورا قرآن مدون نہیں ہو۔ کا اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انکا ایڈیشن ملت نے تسلیم نہیں کیا۔ بارنہوت مدعی پر ہوتا ہے اور بلا شہوت دعویٰ دینا ان کی بڑے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ قرآن کو اصحاب رسول ﷺ نے ابتدا سے ہی محفوظ کرنا شروع کر دیا تھا۔ انکی حفاظت نہ صرف ذہنی یادداشت، بلکہ تحریری ریکارڈ کے طور پر ملکی دور سے ہی شروع ہو چکی تھی۔ حضرت عمرؓ کے ایمان لانے کے واقعہ میں صراحتاً یہ حقیقت پائی جاتی ہے کہ جب وہ اپنی بہن کے گھر پہنچے تو ان کی بہن اور بہنوئی قرآن کی تلاوت کر رہے تھے۔ حضرت عمرؓ کی دہشت سے انہوں نے اور اق چھپا دیے اور جب حضرت کا غصہ رفع ہو گیا تو انکے طلب کرنے پر یہ اور اق انہیں دیے گئے، جو ان کے ایمان لانے کا باعث بنے۔ اسی طرح نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر اور سورۃ مریم کی تلاوت ابتدائی حفظ قرآن کی مثال ہے۔ مدنی دور میں سینکڑوں حافظ قرآن موجود تھے۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس قرآن کا تحریری نسخہ حضرت ابوبکرؓ کے دور میں موجود تھا۔ ان کے عہد کی جنگوں میں بہت سے حافظ قرآن شہید ہوئے جس کے سبب انہیں فکر پیدا ہوئی کہ حفاظ کی شہادت سے کہیں قرآن کا کوئی حصہ محو نہ ہو جائے۔ چنانچہ حضور ﷺ کے کاتب وحی حضرت زید بن ثابت کو قرآن جمع کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ واضح رہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی مدت خلافت صرف دو سال کے قریب ہے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد حکومت میں چونکہ مملکت کی حدود نہایت وسیع ہو چکی تھیں اور لوگ کثرت سے مسلمان ہو چکے تھے اس لیے قرآن کے نسخوں کی بکثرت ضرورت پڑی۔ امکان اس امر کا تھا کہ اگر مناسب انتظام نہ کیا گیا تو اغلاط سے بھرپور نسخہ مملکت میں عام ہو جائیں گے اور مور و زمانہ کے بعد صحیح اور غلط کے فتنے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس اہم ضرورت کی تکمیل ۶۵۱ء میں حضرت عثمانؓ نے فرمائی۔ مستند نسخے صوبوں میں روانہ کیے گئے تاکہ وہاں سے انکی نقول جاری ہوں۔

دنیا کی شائد ہی کوئی دوسری کتاب ہو جس کی حفاظت اس اہتمام سے کی گئی ہو۔ مستشرقین کا یہ دعویٰ کہ پوری امت نے اس ایڈیشن کو تسلیم نہ کیا، مضحکہ خیز ہے۔ عالم اسلام میں ابتدا سے لیکر آج تک صرف ایک کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

قرآن رائج رہا ہے۔ دنیا میں قرآن کا ایسا کوئی نسخہ نہیں جو اپنے اصل سے مختلف ہو۔ قرآن اسلام کی بنیاد ہے۔ دور خلافت میں نبی اکرم ﷺ کا صالح معاشرہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ حضرت عمرؓ جیسے بارعب خلیفہ پر تنقید کرنے کی لوگوں میں ہمت موجود تھی۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ قرآن کی تدوین حضور ﷺ کے وصال کے دو سال کے اندر اندر ہو اور یہ معاشرہ جسے قرآن کا ایک ایک لفظ از بر تھا، کسی غلطی کو روکار سکے۔ حضرت عمرؓ جو حق کے معاملے میں انتہائی یباک تھے اس بنیادی مسئلے سے کس طرح چشم پوشی کر سکتے تھے؟ کیا یہ وہی صحیفہ نہیں تھا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جنگ صفین میں اسے نیزوں پر بلند کیا گیا اور صرف اس کی حرمت کے پیش نظر بے نیام تلواریں، نیام میں چلی گئیں۔ اگر امت نے اس صحیفے کو تسلیم نہ کیا ہوتا تو جنگ صفین، جسمیں مسلم امت کے دو مخالف گروہ آپس میں برسرِ پیکار تھے کبھی نہ رک سکتی تھی۔ گروہ معادیہ حضرت عثمانؓ کے قصاص کا طلبگار تھا، اور گروہ ثانی اس سے گریزاں تھا۔ اگر قرآن پر اس مخالف گروہ کا ایمان نہ ہوتا تو اس کی خاطر تلواریں میان میں نہ جاسکتی تھیں۔

قرآن کے مختلف ایڈیشن اور ان میں کمی بیشی کا شاخسانہ، صرف اپنی مذہبی کتابوں سے مماثلت پیدا کرنے کی ایک مذموم کوشش ہے۔ عہد نامہ قدیم کا تعلق تیرہویں چودھویں صدی قبل مسیح یا اس سے بھی پہلے کے دور سے ہے۔ یہ کتاب متعدد بار ضبط تحریر میں آئی۔ اسکے مصنفین میں بادشاہوں سے لیکر چرواہے تک شریک ہیں۔ اس کی تحریر کی مدت کم بیش ایک ہزار سال پر محیط ہے۔ اس کے اصل نسخے ناپید ہیں۔ مسوراتی عہد نامہ قدیم کا متن عذرا (عزیر) نے تحریر کیا۔ اور عذرا کی واپسی ۱۰۰۰ ق م کے لگ بھگ ہوئی۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'Bible', Vol III, p.570)

موجودہ مسوراتی متن کی تحریر دوسری صدی ق م کی متصور ہوتی ہے۔

(cf. ibid; article 'Text of Old Testament' , Vol III, p.570)

گویا بائبل کے موجودہ نسخے اصل واقعات کے ایک ہزار سال کے بعد تحریر کیے گئے۔ نہ ان کی کوئی تاریخی حیثیت ہے نہ صحت۔ ان کے متعدد نسخے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ عہد نامہ قدیم میں شامل کتابوں پر بھی شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔

سپٹا جنٹ (Septuagint) کے قدیم یونانی نسخوں کی فہرست کتب (Canon)، عبرانی نسخوں کی فہرست سے جدا گانہ ہے۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کئی ایسی کتب کو وضعی قرار دیتا ہے، جو کہ تھولک بائبل میں شریک ہیں۔

(cf. ibid; article 'Canon and Text' , Vol III, p.576)

بحرِ مردار کے قرب و جوار سے کھدائیوں کے دوران دستیاب ہونے والے خریطوں نے سپٹا جنٹ کے بعض حصوں کی صحت کو واضح کیا تو عبرانی نسخوں کے بعض اجزاء کی صحت غیر معمولی طور پر ثابت کی ہے، گویا یہ دونوں اجزاء جڑی طور پر صحیح اور جڑی طور پر غیر صحیح ہیں۔ گویا دونوں ہی غیر ثقہ ہیں۔

عہد نامہ جدید میں شامل کتب (Canon) بھی نزاعی ہیں۔ اناجیل کے نام سے کم و بیش پچاس کتابیں ضبط تحریر میں آئی تھیں۔ ان سب کی حیثیت صرف سیرت عیسیٰ کی ہے۔ کاتھج (قرطاجنہ) اور اسکندر یہ کے

کلیساؤں نے ابتدائی دور (تقریباً ۲۰۰ء) میں اناجیل متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کو مستند اناجیل تسلیم کیا اور باقی ساری اناجیل غیر مستند قرار دی گئیں۔ ان [مفروضہ] مستند اناجیل میں پال کی کئی تحریروں کو بھی شریک اناجیل کیا گیا۔

۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون عہد نامہ جدید میں غیر مسلمہ نزاعی اور اختلافی کتب کی تفصیلات پائی جاتی ہیں۔ اس مضمون میں ایسویس کے حوالے سے بیان کیا گیا کہ کینن (یعنی کتب سماوی کو تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا عمل) کی تکمیل چوتھی صدی عیسوی میں ہو رہی تھی۔ اور مسلمہ کتب کی اولین فہرست چوتھی صدی کے نصف کے بعد منظر عام پر آئی۔ انطاکیہ کے چرچ نے چرچ آف روم کے برخلاف اناجیل جیمس، اناجیل بطرس اور اناجیل یوحنا کو تسلیم کیا۔ ۳۸۲ء میں روم میں ایک مجلس سائنود (Synod) طلب کی گئی جہاں جروم کے زیر اثر کتب مقدسہ کی فہرست مرتب ہوئی۔ آخری مرتبہ کینن کے تعین کے لئے ۶۹۲ء میں کونسل منعقد ہوئی جس نے حتمی فیصلہ دیا کہ کوئی کتب شریک بائبل ہیں اور کوئی نہیں۔

اس کے باوجود چرچ سے یہ نزاع رفع نہیں ہو سکا کہ کوئی کتابیں مستند ہیں اور کوئی غیر مستند۔ لو تھر نے اپنے دور میں اس مسئلہ کو شدت سے اٹھایا جس کے نتیجے میں موجودہ فہرست ظہور پذیر ہوئی۔ اب بھی کئی نزاعی مسائل باقی ہیں جو طے نہیں ہو سکے۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'New Testament' , Vol III, p.570)

اس سرسری موازنے کے بعد بیان کرنے کی حاجت نہیں رہ جاتی کہ بائبل میں پائی جانے والی کمزوریوں کو قرآن سے منسوب کرنے کی کوشش کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرآن کی عظمت پر کچڑا اچھالا جائے تاکہ صرف ان کی مذہبی کتب پر ہی انگشت نمائی نہ ہو۔

•

حیاتِ طیبہ اور مستشرقین

تاریخ مذاہب کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ جب بھی کسی خطے یا قوم میں کوئی نیا مذہب رونما ہوا تو اسے مروجہ مذاہب کی جگہ لینے کے لیے شدید کشش کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کشش کے باعث گروہ اور فرقے پیدا ہوئے جن میں ہمیشہ اختلاف رہا۔ متحارب مذاہب کے پیرووں نے ایک دوسرے پر گندگی اچھالی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہا، جب تک دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ با اقتدار رہے۔ مصر میں یہ اختلاف پیدا ہوا تو آتن کے پجاریوں نے آتن کے منادر کو ڈھا ڈالا اور آتن کے پجاریوں کو غلبہ میسر ہوا تو آتن کا وجود مٹ گیا۔ ایران میں مغربی آریوں میں سیتاما، زرتشترا کا مذہب مستحکم ہوا تو انہوں نے مشرقی آریوں کو پسپا کر کے ہندوستان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا اور قدیم آریا مذاہب کو یکسر منسوخ قرار دیا۔ ان کے دیوتا واسے کا مجسمہ بن گئے اور ان کے پجاری گمراہ اور بے دین قرار دے دیے گئے۔ ہندی کے لفظ 'دیو' اور فارسی کے لفظ 'دیو' کے معنوں میں بعدالمشرقیین اسی اختلاف کی یادگار ہے۔ جبکہ ویدوں نے زرتشترا کے آہورہ مزدا کو شیطان کہہ کر خدا کا مخالف ٹھہرایا اور زرتشترا پر اعتراضات کے انبار لگا دیے۔

عیسائیت نے جنم لیا تو یہود بلائے بے درماں بن کر ٹوٹ پڑے۔ عیسائیوں پر جینا دو بھر کر دیا۔ عیسائیوں نے اگر حضرت عیسیٰ کو الوہیت کے مقام پر فائز کیا تو یہود نے انکی والدہ محترمہ پر تہمت باندھی۔ عیسائیت کی مسکنت کا دور ختم ہوا تو اس نے دیکھتے دیکھتے قدیم مذاہب کا خاتمہ کر ڈالا۔ پھر اس میں بھی فرقہ بندی ہوئی۔ چھوٹے فرقوں کو بڑے فرقے نگل گئے۔ پھر بڑے فرقے ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ مشرقی اور مغربی عیسائیت نے اپنے اپنے علاقے تقسیم کر لیے۔ ایک دوسرے سے متحارب ہوئے۔ ایک دوسرے کو بے دین، بدعتی اور جہنمی قرار دیا۔ جب مغرب میں پروٹسٹنٹ چرچ ابھرا تو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ چرچ نے دل کھول کر ایک دوسرے پر گندگی اچھالی۔ مذاہب کے اس اختلاف میں نہ صرف مذہبی عقائد اور اقدار زبرد پر آئے بلکہ ان کے بانیوں کو بھی تضحیک و توہین کا نشانہ بنایا گیا۔ جب عیسائیت اور اسلام دو دہو ہوئے تو تاریخ نے پوری شدت سے اسی قدیم انداز کو دہرایا اور مغرب نے اسلام کی ہر اعلیٰ قدر پر ضرب لگائی۔ اس مہم میں دیگر بانیان مذاہب کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا اسکی گرد کو بہت پیچھے چھوڑ دیا گیا۔

وہ عظیم ہستی جس نے تیسویں [۲۳] سال کی قلیل مدت میں بت پرست، بدکردار، خوں آشام، وحشی اور خود سرعریوں کو بطلِ اقوام بنادیا، روحانیت سے نا آشنا رگیزار جس کے نقش پا کے طفیل فرشتوں کی بندہ گاہ بن گیا، جسکی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر یہ وحشی قوم دنیا کی متمدن اور مہذب اقوام کی رہبر بن گئی، جو صحر اظلمت کدہ تھا،

اور جہاں قانون، انصاف، انسانیت اور روحانی مراتب دیوانے کا خواب تھے، الفت و مرؤت، انسانیت و محبت کا گہوارہ بن گیا، وہ جس نے ایک عظیم تہذیب کی بنیاد رکھی اور ایک قلیل عرصے میں اس تہذیب کو صدیوں کے ارتقائی مراحل سے گزار کر اس مقام پر پہنچا دیا جہاں ہزار ہا سال سے پرورش پانے والی سرفلک تہذیبیں بونی نظر آنے لگیں، جس نے اقوامِ عالم سے مصری، شامی، ایرانی، تورانی، حبشی اور رومی کے نسلی امتیازات اور کالے گورے کا فرق مٹا کر انہیں ایک ملت بنا دیا، جس نے انسان کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلائی، جس نے طلب علم کا حکم دیکر عالمی تحریک علمی قائم کی، وہ جس نے شعور انسانی کو اسباب و علل پر غور کرنے کی راہ پر لگایا، وہ اولین شخصیت جس نے تسخیر کائنات کی تعلیم دی، وہ جس نے ہر شعبہ زندگی کو حکم خداوندی کے تابع کیا، جس نے سیاست، معاشرت، اقتصادیات، عمرانیات، تہذیب و تمدن، کردار و اخلاق، احساسات و جذبات کو معتدل و ضابطہ کا پابند کیا، جس نے انسانی مساوات قائم کی، جو قواعد اس نے دوسروں کو دیے خود بھی ان پر پابند رہا، جس نے حق کی خاطر تنہا حوادثِ زمانہ کا مقابلہ کیا، بے یار و مددگار تھا تو بھی پائے استقامت میں جنبش نہ آئی، اقوامِ عالم کی زمامِ اقتدار ملی تو بھی ناقابلِ تغیر رہا، اس کا مہر کردار بے داغ، عمل بے ریا، احساسِ نزاکتوں سے بھرپور، دلِ آفت و رحمت سے لبریز، جس کو کسی دشمن کی دشمنی جاوہِ انصاف سے سرمونہ ہٹا سکی، شجاعت و سخاوت جس پر ہمتی دنیا تک فخر کرتی رہے گی، جس کے گھر قناعت نے پرورش پائی، استغنیٰ نے جس کی قدم بوسی کی، دیکرِ صدق و صفا، بحکمِ تسلیم و رضا، شب بیدار، کم آرام، بے نفس، حق کوش و حق طلب، دنگیر، متقی، مقدس، سادگی پسند، دوسروں کی تکلیف میں بے چین ہو جانے والا، رہبر و رہنما، میر کا روانِ ملت، عالی نسب، والا حسب، ہاشمی، مطلق، قریشی و مکی و مدنی و عربی، قبلہ دین، کعبہ ایمان، محمد الرسول اللہ ﷺ، جن کے نام پر خدا ہو جانا ہر مسلمان کے لیے فخرِ عظیم، چرخ گردون کی یہ عجب ستم ظریفی ہے کہ اس ذات والا صفات کا جو خاکہ اس کے مغربی دشمنوں نے اپنی من گھڑت تحریروں میں پیش کیا اس کا حقائق سے دور و رتبہ کوئی تعلق نہیں نظر آتا۔

صدیوں تک تو مغرب نے نبوت کو ہی تسلیم نہیں کیا۔ پھر جب دانشوروں کو انکار میں دقت ہونے لگی تو انہوں نے نبوت کو مقامی قرار دیا، جو محض بطحا، حجاز یا عربوں تک محدود تھی۔ ہوتی آئی ہے کہ لوگ اپنے عیوب دوسروں سے منسوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی اسلام کے ساتھ بھی کیا گیا۔ بائبل کے سارے انبیاء یہاں تک کہ یسوع مسیح بھی اپنے دائرہ کار کو صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بیھڑوں تک محدود رکھنے کا اعلان کرتے رہے۔ جواز کوں کی روئی کتوں کو دینے کے قائل نہیں کہے جاتے، ان کی مسیحائی تو عالمی قرار دی جاتی ہے اور جو روزِ اول سے عالمی دعوت کے مدعی ہوں ان کی دعوت کو مقامی ٹھہرایا جائے، کیا یہ بوالعجبی بائبل کی خامی کو قرآن سے منسوب کرنے کی جسارت نہیں ہے؟ (اسلام میں نبوت کی عالمیت کے لیے ملاحظہ ہو، قرآن مجید، سورۃ آل عمران-۹۶، ۱۰۴؛ سورۃ مائدہ-۶۷؛ سورۃ الانبیاء-۱۰۷؛ سورۃ الفرقان-۱؛ سورۃ ص-۸۷؛ سورۃ اقلیم-۵۲؛ سورۃ التکویر-۹؛ وغیرہ)

قرآن نے آنحضرت ﷺ کی ذات کو مومنوں کے لیے اسوہ حسنہ قرار دیا کیونکہ ان کی ذات گرامی مجسم اخلاق قرآنی تھی۔ لیکن چونکہ مغرب نے ہزار سال سے زیادہ کذب بیانی کی تھی اس لیے یہ کذب اس طرح ان کے رگ وریشہ میں بس گیا تھا کہ جب اسلام کی حقیقت ان کے سامنے آئی تو اسے بھی جھٹلانے لگے۔ انہوں نے جہاں اس بات کو تسلیم کیا کہ متعصب مغربی، اسلام کی تصویر میں غلط رنگ اور بحدہے نقوش عمداً استعمال کرتے ہیں وہیں یہ بھی کہنے سے باز نہ آئے کہ یہ مثالی کردار سیرت اور مغازی کی مدد سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس تجسیم میں احادیث کا ہاتھ ہے جن کے ذریعے کردار کے اہم پہلو نمایاں کیے گئے ہیں۔ مغربی اسکالر نے خصوصیت کے ساتھ احادیث کا تنقیدی مطالعہ کیا۔ انہوں نے اس میں تاریخت کی تلاش کی اور پھر یہ حکم لگا دیا کہ بیشتر احادیث ناقابل اعتبار ہیں، شاید اس لیے کہ مغربی تصور کی تائید نہیں کر سکتیں۔

رسول اللہ ﷺ کے بارے میں وہ جب کوئی واقعہ پڑھتے ہیں تو منطق کے بل پر کوئی نہ کوئی اعتراض پیدا کر لیتے ہیں۔ حالانکہ حضرت عیسیٰ کے بارے میں اگر کوئی ایسا واقعہ اناجیل میں نظر آتا ہے جس کی توجیہ نہ کر سکیں تو اس کے دفاع میں کہتے ہیں کہ،

" Even if Jesus did not act in this way, (say towards the women taken in adultery), this is how his followers must have thought he would have acted." (M. Wat:, What is Islam, p. 229)

[اگر یسوع نے ایسا نہیں بھی کیا (مثلاً عورتوں کی بے حرمتی کے معاملے میں) تو یہ وہ عمل ہے جو یقیناً انکے معتقدین نے گمان کیا ہوگا کہ ان حالات میں وہ ایسا ہی کرتے۔]

ایک ہی نوعیت کے معاملات میں مختلف فیصلے منصف کی جانبداری کا بین ثبوت ہوتے ہیں اور اور جانبداری کے فیصلے واضح طور پر عدل و انصاف سے محروم ہوتے ہیں۔

داعی اسلام کی مخالفت کیوں؟ تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی انقلاب آفریں فکر کو بلا شدید

مخالفت کے تسلیم کر لیا گیا ہو۔ ایسی فکر چونکہ معاشرتی ڈھانچے کو متاثر کرتی ہے، جس کے باعث انفرادی اور اجتماعی مفادات پر ضرب پڑتی ہے، اس لیے معاشرے کا مقتدر طبقہ اس فکر کو بالجبر روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ سقراط کو یونان کا عظیم ترین مفکر سمجھا جاتا ہے، اس کی فکر اگرچہ کوئی عملی تحریک نہیں تھی اس کے باوجود اسے اپنے ہی ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ بائبل کے مطابق حضرت عیسیٰ کی تبلیغ کا سیاست سے کوئی تعلق نہ تھا، انہوں نے نہ صرف سیزر کو تسلیم کیا بلکہ اس کے حلقہ اقتدار کو اپنے دائرہ کار سے خارج بھی کیا، اور اپنے شاگردوں کو طاقت کے استعمال سے حکم روکا، اس کے باوجود انہیں سزائے موت سنادی گئی۔ آخر کیوں؟ انکا جرم کیا تھا؟ تلاش جرم و خطا کے لیے ہمیں سیزر کا انداز فکر اختیار کرنا ہوگا۔ اس کے علاقے میں صرف اسی کا اقتدار ہوتا ہے۔ کوئی گردن اٹھانے تو خود سز، کوئی زبان کھولے تو باغی۔ ہر شخص کے دل و دماغ میں صرف سیزر کی عظمت کا احساس ہونا چاہیے۔ یہ عظمت کا احساس جس سر میں نہ ہو وہ سبک سر ٹھہرے۔ ہر فرد کو صرف اسی کے قانون کا پابند ہونا چاہیے، اگر پابند نہ ہو تو

قانونی مجرم۔ قانون سازی صرف اسی کا حق ہے، کوئی دوسرا قانون یا قانون ساز اس کی مملکت میں ناقابلِ برداشت۔ حق و صداقت صرف وہ ہے جسے سیزر تسلیم کر لے۔ با اختیار اندازِ گفتگو صرف سیزر کے لیے ہی وقف ہے، کوئی دوسرا اس کی مملکت کی حدود میں یہ انداز اختیار نہیں کر سکتا۔

انبیاء تو کیا مفکرین بھی مہینہ پابندیوں کو پرکھ کر حاشیت نہیں دیتے۔ ان کا ایک مقصدِ حیات ہوتا ہے اور اس کی تکمیل انہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ وہ سیزر کو نظر انداز کرتے ہیں۔ قیصریت اور نبوت میں چھڑ جاتی ہے۔ کبھی قیصریت بندہ حق کو راہ سے ہٹانے میں کامیاب ہو جاتی ہے تو اس کی مخالفت کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ان کے افکار کبھی تو پروان چڑھ جاتے ہیں اور کبھی صرف کتابوں کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس طریقہ کار میں کسی سیزر کو رعایت دینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کبھی موسیٰ فرعون کو کفرِ کردار تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور کبھی ابراہیمؑ نمرود کی مملکت سے ہجرت کر جاتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حالات کے مطابق طریقہ کار جدا ہیں لیکن ان سب میں جو قدر مشترک ہے وہ اعلائے کلمۃ الحق ہے۔ اور بے باک، آزاد اور خود مختار اندازِ کلام کو معاشرہ اور اس کا سربراہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہی تحکمِ کلام ان کا جرم بن جاتا تھا۔

حضور ﷺ کا ہر انداز منفرد، با اختیار، با اقتدار اور پر عظمت ہے۔ دیگر انبیاء کی طرح ان کی بھی مخالفت کی گئی۔ اوروں کی مخالفت اس لیے ختم ہو گئی کہ یا تو معاشرہ ان پر حاوی آ گیا یا پھر انکی فکر و تعلیمات کو معاشرے نے اپنے مفاد کے مطابق ڈھال لیا۔ لیکن آنحضرت ﷺ نہ تو مغلوب ہو سکے نہ ہی انکی محکم تعلیمات میں معاشرہ کوئی تبدیلی لاسکا۔

مسلم معاشرے کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا گیا اتنے ہی اجنبی معاشروں سے اسکا واسطہ پڑتا گیا۔ ہر اجنبی معاشرے نے اسلام کو انقلاب آفریں پایا، اور جس معاشرے نے جتنی شدت سے ضرب محسوس کی اسی مناسبت سے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا۔

انفرادی اعتراضات

اس عنوان کے تحت وہ اعتراضات درج کیے جا رہے ہیں جنکی نوعیت انفرادی ہے، یعنی مختلف

مستشرقین نے اپنی انفرادی حیثیت میں کیے ہیں۔ ہر کس بحالِ خویش خطبے دار

مغرب کا مثالی مذہبی کردار حضرت عیسیٰ کی ذات گرامی ہے۔ نتیجہ یہ کہ انکے یہاں عظمتِ کردار نیکی، مسکن، ترک دنیا، خود آزاری اور قربانی میں ہے۔ نوٹن بی اسی ذہنی تیقن کے باعث کردارِ نبوی ﷺ کے بارے میں (نعوذ باللہ) تحریر کرتا ہے،

"Instead of sealing his prophetic message with his blood by becoming Caesars' victim, it was Mohammed's ironic destiny to compromise and debase his prophetic message by becoming an Arabian Caesar himself." (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. III, p.470)

[جبائے قیصر کا مقہور بن کر اپنی پیغمبرانہ تعلیمات پر اپنے خون سے مہر ثبت کرنے کے، یہ محمد کی بد نصیبی ہی تھی، کہ انہوں نے مفاہمت کی اور خود عرب کے قیصر بن کر اپنی تعلیمات کو گراؤت سے ہمکنار کیا۔]

گویا ضرورت ہو یا نہ ہو، نبی کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ میسر سے ایک صلیب تیار کر دوائے اور اپنے پیروؤں کے ہمراہ ایک جلوس کی شکل میں جا کر دھوم دھام سے اس صلیب پر چڑھ جائے۔ دوسری شکل میں، نبی کا فرض، ٹوئن بی کے نظریات کی رو سے یہ ہوا کہ وہ ساری زندگی معاشرے کی تطہیر کرتا رہے، جب معاشرہ پاک و صاف ہو جائے، قوانین مرتب ہو جائیں، لوگ انہیں تسلیم کر لیں تو وہ میسر کے نام روم کے پتے پر ایک درخواست روانہ کرے کہ اب آپ تشریف لائیں تاکہ جلوس میمنت لزوم کے ساتھ تاجپوشی ہو سکے۔ اور اس کے بعد معاشرے کو میسر کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود کسی غار میں گم ہو جائے۔

برائے عقل و دانش بایاد گریخت، کہ اس ظاہر معاشرے کی نگرانی اور اس کا مثالی استحکام، مغرب کی دانش کو قیصریت نظر آتی ہے۔

مغربی تصویرِ مثنویت نے پیغامِ خداوندی کو پہنچانے اور اس پر عمل درآمد کرانے میں ایک بُد پیدا کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس پیغام کا پہنچانا تو نبی کا فرض منصبی تصویر کیا گیا لیکن اس پر عمل درآمد کرانے کی ذمہ داری مصیبت کے منافی قرار دی گئی۔ ٹوئن بی کے حسب ذیل تبصرے کے ہر لفظ میں نظریہ مثنویت جھلکتا ہے۔ (نعوذ باللہ)

"No doubt when he accepted the invitation to organize a government in Medina, Mohammed assured his own conscience that he was acting as single heartedly as ever in the cause of God. Had not God laid upon him the duty of conveying the revelation of God's truth to his fellow men? And would he not be executing this duty if he embraced this heaven-sent opportunity of providing the new religion whose path had been distracted for ten years, by human force majeure.... No doubt Mohammed reasoned with his conscience thus and no doubt he was deceiving himself, in yielding to his own arguments."

(Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. III, p.471)

[بلاشبہ جب انہوں نے مدینہ میں حکومت قائم کرنے کی دعوت قبول کی، تو انہوں نے اپنے ضمیر کو یہی کہہ کر مطمئن کیا کہ وہ ہمیشہ کی طرح خدا کے راستے میں ہی یکسوئی سے کام کر رہے ہیں۔ کیا خدا نے ان پر لوگوں تک اسکا سچا کلام پہنچانے کی ذمہ داری عائد نہیں کی تھی؟ اور کیا وہ اس خدا داد موقع کو استعمال کر کے اس نئے مذہب کو پھیلانے کی

ذمہ داری کو پورا نہیں کر رہے ہیں، جسے دس سال تک انسانی جبری طاقتوں نے اپنی راہ سے ہٹا رکھا تھا۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے ضمیر کو ایسے ہی مطمئن کیا اور بلاشبہ وہ اپنے دلائل سے مطمئن ہو کر اپنے آپ کو ہی دھوکہ دے رہے تھے۔ [زور قلم، مہارت بیان اور طرز استدلال سے قطع نظر بنیادی نکتہ کلام یہی ہے کہ نبی صرف معلن ہے، آلہ نشر ہے اور اس کا کام صرف اعلان کرنا ہے۔ خود عمل پیرا ہونا یا پیغام حق کو رائج کرنے کے وسائل اختیار کرنا حدود نبوت سے متجاوز ہونا ہے۔ یہ ادھورا تصور، نبی کو محض ایک ریڈیوسٹ بنا دیتا ہے جو فضا سے برقی لہریں وصول کر کے انہیں صوتی شکل دیدے۔ جسے اس سے کوئی غرض نہ ہو کہ کسی نے سنا بھی یا نہیں۔ جس نے سنا اس پر عمل پیرا بھی ہوا یا نہیں۔ جس نے عمل پیرا ہونے کی کوشش کی اسے کیا دقتیں پیش آئیں اور ان دقتوں کو کیسے دور کیا جائے۔ اسلام مذہبِ عمل ہے۔ اس کی تعلیمات محض علمی نظریات نہیں بلکہ ہدایاتِ عمل ہیں۔ یہاں نجات کا انحصار عمل پر ہے۔ جب تک آزادی عمل نہ ہو کوئی معاشرہ اپنے اصولوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔ اسلام معاشرے کو مرککز کرتا ہے۔ ترک دنیا کی تعلیم دے کر فرد کو معاشرے سے منتر نہیں کرتا۔

مرکز معاشرے میں مستحکم انتظامیہ ناگزیر ہے۔ اسلامی معاشرہ ایک نظریاتی معاشرہ تھا۔ نظریاتی معاشرے کی انتظامیہ ہمیشہ نظریاتی گروہ کے سرکردہ ارکان پر مشتمل ہوتی ہے۔ اب ٹوئن بی کے مطابق یہ ہونا چاہیے تھا کہ اسلامی نظریاتی معاشرے کے قیام کے بعد نظریاتی گروہ کے تمام سرکردہ ارکان انتظامیہ کو غیر نظریاتی گروہ کے حوالے کر کے خود اس معاشرے کی تباہی کا تماشا دیکھتے۔

سیاست اور دین، اسلام میں دو جدا گانہ عالم نہیں ہیں۔ لیکن چونکہ مغرب احساس برتری میں مبتلا ہے اور تصور کرتا ہے کہ عیسائیت ہی کا کائناتی سچائی ہے اس لیے اپنی قدروں پر دوسروں کو جا بختا ہے۔ جبکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جسے جانچا جا رہا ہے اسی کی قدریں بھی پیش نظر رہیں۔ اسی بد عنوانی کا نتیجہ ہے کہ اس نے مرید لکھا،

"The truth then seems to be that, in the invitation to Medina, Mohammed was confronted with a challenge to which his spirit failed to rise. In accepting the invitation he was renouncing the sublime role of the nobly un-honoured prophet and contenting himself with the common place role of the magnificiently successful statesman. The prospects of effective practical action which the call to Medina opened up for the prophet's long repressed and thwarted practical genius blinded the prophet's vision.....Mohammed had been content with the faithful performance of a prophet's duty, as is shown by his apostrophe to the idolators; as ought to be laid upon God's Messengers but a plain delivery of the messages: This simple understanding and acceptance of his prophetic mission were thrown to winds by the prophet when a new career was offered to him." (Toynbee A.J; A Study of History, Vol. III, p.472)

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ارجح تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ مدینے سے ملنے والی دعوت نے محمد ﷺ کو ایک ایسی آزمائش میں ڈال دیا تھا، جس میں انکی ذات پوری نہیں اتر سکی۔ اس دعوت کو قبول کر کے انہوں نے 'خوار' پیغمبر کے کریمانہ کردار کو ترک کر دیا اور خود کو ایک عام سے کامیاب باجبروت حکمران کے روپ میں ڈھال کر مطمئن ہو گئے۔ موثر عملی اقدامات کی کشش نے، جو مدینے کی دعوت نے ان کی طویل مدت سے رکی ہوئی اور مسدود عملی کارروائیوں کے لیے جیتاب فطرت کے لیے پیدا کر دی تھی، انکے پیغمبرانہ نصب العین کو دھندلا دیا تھا۔ محمد ﷺ (اس سے پہلے) ایک پیغمبر کی سچی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے مطمئن تھے، جیسا کہ انکے بت پرستوں کو لاکارنے سے واضح ہے، یعنی سیدھی سادی پیغام رسانی جو ایک نبی کا فرض ہوتا ہے۔ پیغمبرانہ نصب العین کا یہ احساس اور اسکا اقبال، اس وقت پس پشت ڈال دیا گیا جب انہیں ایک نیا کردار ادا کرنے کی دعوت دی گئی۔ [نعوذ باللہ]

ہر وہ شخص جو عیسائی نظریات سے ناواقف ہو، نوٹن بی کی اس تحریر کا مدعا سمجھنے سے قاصر رہے گا۔ مکے سے مدینے منتقل ہونے کے باعث نبوت کیسے متاثر ہو گئی؟ ناکامی کے کون سے آثار نظر آئے؟ فرائض نبوت میں کون سی کوتاہی ہوئی؟ ان سب کا جواب یہ ہے کہ یہ سارے دعوے بلا دلیل ہیں۔ یہ الزامات محض اس لیے عائد کیے جا رہے ہیں کہ عیسائی شویت کی نگاہ میں ایسا کرنا ثواب کا کام نہیں تھا۔ یہ الگ شان ہے کہ کھیسائے مقدس خود جب تک سیاست پر مسلط رہا اس میں کوئی عیب نہ تھا۔

عیسائیت میں سیاست اور مذہب دو جداگانہ میدان ابتدا ہی سے چلے آتے ہیں۔ یہ عقیدہ اس دور کے حالات کی پیداوار تھا، جب عیسائیت اپنا پرچار رومن ایمپائر میں کر رہی تھی۔ رومن معاشرہ ہر اعتبار سے مستحکم معاشرہ تھا۔ عیسائیت میں یہ دم ختم نہ تھا کہ وہ اس معاشرے کی کسی قدر کولاکارتی حکومت کی سخت گیری سے محفوظ رہنے کے لیے اسے بحیثیت عقیدہ یہ اعلان کرنا پڑا کہ سیاست اور معاشرتی قدروں سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اور عیسائی دعوت تو محض روحانی تسکین کا بے ضرر ذریعہ ہے، لیکن جب عیسائیت نے قدم جما لیے تو رومن معاشرے کا اقتدار غصب کر لیا۔ لیکن اسلام نے اس قسم کی کوئی سودے بازی نہیں کی۔ اس کا کوئی عقیدہ مصلحت کوشی کا نتیجہ نہ تھا۔ اس نے اپنا معاشرہ خود تعمیر کیا۔ اس کی تہذیب غیر کی منت کش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں خدا اور قیصر کے حصے کی تقسیم نہیں۔ قیصر کا حصہ بھی خدا کے تحت ہے۔

سیاست اور مذہب کے جداگانہ تصور کی آڑ میں معاندین نے داعی اسلام پر کڑی نکتہ چینی کی ہے، اور انہیں نبی کے بجائے محض دنیا دار فاتح کے روپ میں پیش کیا ہے۔

تجارت و نبوت: نوٹن بی کے نزدیک حضور ﷺ کی توجہ مذہب کی جانب اس لیے مبذول ہوئی کہ ۶۰۳ء تا ۶۰۹ء شام، ایران کی غارتگری کا شکار رہا۔ اس دور میں شام کو ایران نے معاشی طور پر تباہ کر ڈالا ہوگا۔ ان جنگوں نے یکا یک اور غیر متوقع طور پر سفر شام میں رکاوٹ ڈالی ہوگی اور مکے کی تجارت کو معطل کر ڈالا ہوگا۔ عرب میں تجارت ایک چھوٹی سی اقلیت کا پیشہ تھی اور حضور ﷺ اس اقلیت کے فرد تھے جسکا ذریعہ معاش ہی بیرونی تجارت تھی۔ اس نے مزید لکھا کہ داعی اسلام اپنی برادری میں کوئی خاص مقام نہ رکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ مکے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اس نے یہ بھی تحریر کیا کہ داعی اسلام کی حیات کے دو حصے ہیں۔ مکے میں انہوں نے صرف مذہب کے لیے کوشش کی اور دوسرے حصے میں مذہب کو پس پشت ڈال دیا گیا اور سیاسی امور نے غلبہ حاصل کر لیا۔ (Toynbee A.J.; A Study of History, Vol. III, p.478)۔ گویا اسلام کا ظہور بے کاری کا مشغلہ تھا۔ پتہ نہیں اس کے خیال میں دیگر مذاہب کے ظہور میں بے کاری کو کتنا دخل رہا ہوگا۔ اور پھر غالباً ہر بڑا کارنامہ بے کاری کے سبب ہی وقوع پذیر ہوا ہوگا۔ یسوع مسیح اور پال دونوں نے مذہب کو وقت گزاری کا ذریعہ بنایا ہوگا۔ بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ کے لیے بھی کوئی کام دھندا نہیں تھا اس لیے غور و فکر کا مشغلہ لے بیٹھے۔ خود موصوف بھی بے کاری کا شکار تھے کہ مطالعہ تاریخ کھنے بیٹھ گئے۔

عرب کی تجارت صرف شام سے وابستہ نہ تھی۔ مصر، یمن، حبشہ و عراق، ہندو چین، اور غرہ کی سینائی جنگی کے ذریعے رومن ایمپائر سے بھی ہوا کرتی تھی۔ اگر تجارت ہی مقصد حیات ہوتا تو دیگر ممالک کی طرف بھی رخ کیا جاسکتا تھا۔ نوٹس بی جیسا صاحبِ نظر، مکی دور کی ناکامی کو معاشرتی مقام سے وابستہ کرے تو حیرت ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا کے کسی عالمی مذہب کی کامیابی اس کے بانی کے معاشرتی مقام کی مرہون منت نہیں۔ ہر وہ مذہب جو اسکے بانی کی معاشرتی حیثیت کے سبب قائم ہوا، بانی کی موت کے بعد زوال پذیر ہو گیا۔ اکبر کا دین الہی اس کے بعد نیست و نابود ہو گیا۔ مصر میں فرعون اثناتون نے اپنی معاشرتی حیثیت کے بل بوتے پر آتن کی پرستش کو رواج دیا جو صرف اس کی زندگی تک ہی باقی رہی۔ اس کی موت کے دس سال کے اندر اندر قدیم مذہب امان نے مذہب آتن کی جگہ لے لی۔

رومن شہنشاہوں میں سے بیشتر نے اپنے معاشرتی مقام کے بل بوتے پر سیزر پرستی کروانے کی کوششیں کیں لیکن یہ پرستش روم میں بھی باقی نہ رہ سکی۔ قسطنطین نے رومن کیتھولک عقیدہ تثلیث کو عیسائی دنیا پر مسلط کیا، لیکن یہ عقیدہ مغرب سے باہر بار نہ پاسکا۔ قسطنطین کا شہر قسطنطنیہ تک اسے قبول کرنے کو تیار نہ ہوا۔ بازنطینی شہنشاہ 'لیو' نے اپنے معاشرتی مقام کے بل بوتے پر عیسائیت میں اصلاحات کرنی چاہیں تو پوپ آتش زیر پا ہو گیا اور اس نے حقارت کے ساتھ شہنشاہ کی کوششوں کو پامال کر دیا۔

اس کے برخلاف ہر مٹ پیڑ جسکا کوئی معاشرتی مقام نہ تھا، جب دوسری صلیبی جنگ کا آتشیں پیغام لیکر مغرب پہنچا تو مغرب پر صلیبی بخار مسلط ہو گیا۔ عالمی مذاہب کے اوصاف میں گہری کشش ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ دل و جان سے ان پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ ان کی مدافعت کے لیے جان لڑا دیتے ہیں۔ یہ مدافعتی جذبہ اسلام ہو کہ عیسائیت، ہر مذہب کے افراد میں شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ مکی زندگی اور مدنی زندگی میں مغربی معاشرے کو جو فرق محسوس ہوتا ہے، وہ محض مغربی ثنویت کا اثر ہے، ورنہ عہد نامہ قدیم کے ہر مقتدر کردار میں مذہب اور سیاست بیک وقت مجتمع نظر آتے ہیں، صرف غیر مقتدر کردار خالص مذہب کے لیے وقف ہیں۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت یوسف، کتاب سیمویل، کتاب سلاطین، کتاب توارخ اور

کتاب قضاۃ کے تمام اہم کردار مذہب اور سیاست دونوں میں بیک وقت حصہ لیتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں یہ نہیں کہا جاتا کہ انہوں نے مذہب کو پس پشت ڈال کر سیاست کو محض نظر بنالیا۔

ملکی زندگی اگر مذہبی تھی اور مدنی زندگی محض سیاسی تھی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر مذہب اسلام کو مستحکم کس نے اور کب کیا؟ فکر مغرب اپنے ذہنی حقیقات کے باعث اس جانب مبذول ہونے سے قاصر رہتی ہے کہ ملکی دور لوگوں کی ذہنی تربیت کا زمانہ تھا جبکہ مدنی دور اس تربیت کو روکا رانے اور عملی شکل دینے کا دور ہے۔ اسلام ایک دین ہے جو نہ صرف افراد کی تربیت کرتا ہے بلکہ تربیت یافتہ افراد سے نظریاتی معاشرہ بھی ترتیب دیتا ہے۔ اس معاشرے کو اسلامی نظریات پر کاربند رکھتا ہے۔ نظریاتی ریاست اور نظریاتی معاشرے کی سیادت ہمیشہ نظریاتی اکابر کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور جس کی سربراہی ان اکابر کے سربراہ کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ سیدھی سادی منطق جس کے سبب داعی اسلام ﷺ اپنے معاشرے کے سربراہ تھے۔ اس معاشرے میں ان سے عظیم تر کوئی بھی نہ تھا۔ اس معاشرے کی تعمیر اور استحکام ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ ان کی موجودگی میں کون سربراہی کر سکتا تھا؟ یہ سربراہی بھی جزو نبوت تھی۔ اسلام میں نبوت و رسالت کا تصور رعیتیت اور یہودیت کے تصور سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ یہاں صرف پیشین گوئی کرنا ہی نبوت نہیں ہے، نذارت، بشارت، ہدایت، انھت، تعلیم و تربیت، عبادت، شریعت، سیاست، حکومت و عدالت، اقتصاد و معاش ہر شعبہ نبوت سے متعلق ہے۔ مغربی تصور نبوت چونکہ محض پیشین گوئی تک محدود ہے اس لیے اس سے بڑا دائرہ کار انہیں غیر متعلق محسوس ہوتا ہے۔

مغربی اہل قلم نے جب داعی اسلام کو اسلامی معاشرے کے مرکز کی حیثیت میں دیکھا تو اس ارتکاز معاشرہ کو انہوں نے دنیاوی اقتدار تصور کیا، اور اس غلط فہمی کی بنیاد پر یہ الزام وارد ہوا کہ، (نعوذ باللہ)

"Mohammed was a deliberate propagator of false doctrine, thinking only of increasing his own power." (Montgomery Watt; What is Islam, p.2)

[محمد ﷺ] صرف اپنی طاقت میں اضافے کے خیال سے، دانستہ جھوٹے عقائد کو پھیلاتے تھے۔

یہ ساری پریشان خیالی محض خام تصور نبوت کی پیداوار ہے۔ مغرب کو ابھی تک باور نہیں آیا کہ زمان و مکان انکے تصور رات کے پابند نہیں۔

دوسری ہجرت حبشہ: فان گریو نے باؤم (von Grunebaum) نے دوسری ہجرت حبشہ میں، جس میں ایک سو تراسی [۱۸۳] افراد نے ۱۱۵ء میں حبشہ میں پناہ لی، مہاجرین کی اس تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ نظریہ پیش کیا کہ یہ ہجرت ابتدائی مسلمانوں میں انفریق ختم کرنے کی کوشش تھی۔ اس نے لکھا، (نعوذ باللہ)،

"Probably this hijra, the immigration to Abyssinia, was motivated to be an attempt to smooth out a split that was beginning inside the community, perhaps between Mohammed and a group, that from his point of view was hyperascetic."

(G.E. von Grunebaum; Classical Islam, p.31)

[غالباً یہ ہجرت، یعنی ہجرت حبشہ، مسلم گروہ میں پیدا ہونے والی اس تفریق کو ختم کرنے کی ایک ترغیبی کوشش تھی، جو محمد ﷺ) اور ان کے کچھ ساتھیوں کے درمیان، جو ان کے نکتہ نظر سے زیادہ بی رہبانیت پسند تھے، پیدا ہو گئی تھی۔] اول تو اسلام میں رہبانیت اور ترک دنیا کا کوئی وجود ہی نہیں، کہ کسی گروہ کو ہم شدید رہبانیت پسند تصور کر سکیں، اور اگر ایسا تھا بھی تو اس کے معنی یہ ہونے کہ نعوذ باللہ یہ گروہ داعی اسلام ﷺ کا پیرو نہ تھا، بلکہ داعی اسلام ﷺ سے اپنی روش منوانا چاہتا تھا۔ اس مرحلے پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس گروہ نے اپنی مرضی سے ہجرت کی یا حکم رسول ﷺ کی تعمیل کی۔ اگر مشائے رسول کے خلاف ہجرت کی تھی تو پھر حبشہ میں قریش کے وفد کی مخالفت اور اسلام اور داعی اسلام ﷺ کی پر جوش حمایت کے کیا معنی ہونگے۔ اور اگر تعمیل حکم تھی تو وہ گروہ جو رسول اللہ ﷺ کے حکم پر گھربار، ملک و وطن، کار و بار سب کچھ چھوڑ سکتا ہے، وہ اپنے ہادی کی مخالفت پر کس طرح آمادہ ہو سکتا ہے۔

یہ اتنے گریو نے باؤم کی اس ذہنی خلش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے کہ آخر اصحاب رسول اللہ ﷺ میں اس قدر یقین محکم، غیر متزلزل ایمان اور پابندی احکام کیوں تھی؟
غرائق: واقعہ غرائق کا ذکر کرتے ہوئے گریو نے باؤم نے تحریر کیا، (نعوذ باللہ)

"It is said that he had recognised as the daughters of Allah, the three great Goddesses; al-Lat, who was honoured in Taif, al-Uzza who was worshiped in Hakala near Mecca and Manat whose sanctuary lay in Qudaid between Mecca and Medina. This stand he now revoked and made a sharp distinction between the faithful and those who associated Allah with other Gods. (G.E. von Grunebaum Classical Islam, p.31)

[کہا جاتا ہے کہ انہوں نے (محمد ﷺ نے) تین عظیم دیویوں کو اللہ کی بیٹیاں مان لیا تھا۔ یہ لات (جسکی تعظیم طائف میں کی جاتی تھی)، عزیٰ، (جسکی عبادت مکہ کے قریب واقع بکلا میں کی جاتی تھی) اور منات (جسکا مندر قدید میں تھا جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہے) تھیں۔ اب وہ اس موقف سے پھر گئے اور انہوں نے مونین کے اور ان لوگوں کے درمیان، جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے، واضح امتیاز قائم کیا۔]

غرائق پر تفصیلی گفتگو ہم بعد میں کریں گے، کیونکہ یہ موضوع مغربی اہل قلم کا نہایت پسندیدہ بحث ہے۔ گریو نے باؤم کا تبصرہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ غرائق گویا ایک مسلمہ واقعہ ہے۔ اس افسانے میں متذکرہ بالاتین دیویوں کو غرائق سے تشبیہ دی گئی ہے، اور ان کی شفاعت کو مقبول کہا گیا ہے۔ گریو نے باؤم نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ لات و منات و عزیٰ کو نعوذ باللہ حضور ﷺ نے خدا کی بیٹیاں تسلیم کیا۔ اپنا گناہ دوسروں کے سر۔ عیسائیت نے حضرت مریم کو اگر خدا کی ماں بنایا تو اسلام سے خدا کی بیٹیاں منسوب کر کے اپنی خفت ہی کم کی جائے۔ پھر اس افسانے کو سب میل قرار دیا کہ اس کے بعد مومن اور مشرک میں شدید امتیاز پیدا ہو گیا۔ جب تک یہ ثابت نہ کیا جائے کہ اس مینہ واقعے سے پیشتر متوہد اور مشرک میں تمیز نہ تھی، یہ دعویٰ محض سوئے ظن

ہی ہے۔ گریونے باؤم نے ثبوت پیش کرنے کی زحمت نہیں کی۔ یہ تیز تو اسی دن پیدا ہو گئی تھی جس دن غارِ حرا میں داعی اسلام ﷺ پر وحی نازل ہوئی تھی۔ ابتدائی تین سال خفیہ تبلیغ کیوں ہوئی؟ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ عرب معاشرے کے اندر نظریاتی تبدیلی پیدا کی جا رہی تھی بلکہ اس مبلغ اور اس پر ایمان لانے والے چھوٹے سے گروہ کو یہ علم تھا کہ مشرک معاشرہ اس تبلیغ کو برداشت نہ کر سکے گا۔ یہ راز داری خود کہہ رہی ہے کہ یہ گروہ خود میں اور معاشرے میں ایک واضح امتیاز سے شعوری طور پر واقف تھا۔

لوٹ: عام مغربی اصحابِ قلم کی طرح گریونے باؤم نے بھی ملکی کاروانوں سے تعارض کو لوٹ کہا ہے۔ اس نے تحریر کیا،

"To accomplish his main task and unite a population torn asunder Mohammed needed the harmonious cooperation of Muhajirun with the Medinian 'helpers', Ansar. This in turn required the economic independence by raids on Meccan caravans."

(G.E. von Grunebaum; Classical Islam, p.35)

[اپنے اصل نصب العین کو حاصل کرنے اور ایک منتشر برادری کو متحد کرنے کے لیے محمد ﷺ کو مہاجرین اور انصار کے مابین ایک ہم آہنگ تعاون چاہتے تھے۔ نتیجتاً اس کے لیے ملکی قافلوں پر حملوں کے ذریعے حاصل کردہ (مہاجرین کی) اقتصادی خود مختاری کی ضرورت تھی۔]

مکہ کے تجارتی کاروانوں سے تعارض پر آئندہ صفحات پر بحث کی جا رہی ہے۔ یہاں محلِ غور یہ ہے کہ لوٹ کے ذریعے آزاد معیشت قائم کرنے کے جو مقاصد بیان کیے گئے ہیں وہ کہاں تک پورے ہو سکتے تھے یا ہوئے۔ کیا لوٹ کے ذریعے مہاجرین کی آزاد معیشت قائم ہوئی یا ہو سکتی تھی؟ آیا مہاجرین اور انصار میں خوشگوار تعاون تھا یا نہیں؟ ان ہی سوالات کے پس منظر میں یہ واضح ہو سکے گا کہ اعتراض کس حد تک بحل یا بحل ہے۔

ہم نے نوٹن بی کے تبصرے میں دیکھا، نیز خود گریونے باؤم نے اعتراف کیا کہ رسول اللہ ﷺ کو مکہ کی رہائش ترک کر کے مدینے میں قیام کی دعوت خود انصار نے دی تھی۔ [G.E. von Grunebaum; Classical Islam, p.35]

[Classical Islam, p.35]۔ دعوت دینے والے ہجرت سے قبل اسلام قبول کر چکے تھے۔ انہوں نے حضور ﷺ کی نبوت تسلیم کر کے انہیں بحیثیت نبی مدینے بلایا تھا۔ ان سے مکہ کی اسلام سے مخالفت اور دشمنی چھین ہوئی نہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ حضور ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے باعث ان کے شہر میں اسلامی معاشرے کا قیام عمل میں آئے گا۔ یہ نیا معاشرہ عرب کے عام معاشرے سے مختلف ہوگا۔ جس کے سبب قریش اور عالمِ عرب کی دشمنی مول لینا پڑے گی۔ بیعت عقبہ ثانیہ کی جو رمداد ہم تک پہنچی ہے اس میں حضرت عباسؓ بن عبادہ انصاری کی تقریر محفوظ ہے، جس میں انہوں نے فرمایا،

”اے معشر خزر ج تم جانتے بھی ہو کہ تم کس بات پر ان صاحب سے بیعت کر رہے ہو؟“ سب نے کہا کہ ہاں ہم جانتے ہیں۔ کہا ”یہ بیعت اس بات کی ہے کہ ہر سرخ و سیاہ آدمی سے تم کو لڑنا ہوگا۔ پس اگر تم یہ دیکھو کہ جب تمہارے مال اور اسباب برباد ہونگے اور تمہارے اشراف قتل ہو جائیں گے، اس وقت تم ان کی بیعت سے پھر جاؤ گے تو اسی وقت انکی بیعت کو ترک کر دو۔ قسم خدا کی اگر اس وقت تم نے ایسا کیا تو دنیا اور آخرت کی ذلت تم کو نصیب ہوگی۔ اور اگر تم یہ جانتے ہو کہ چاہے کسی ہی مصیبت تم کو پہنچے، مال برباد ہو یا اشراف قتل ہوں، تم اپنی بیعت پر قائم رہو گے تو پھر بسم اللہ کر کے بیعت کرو۔“

(سیرۃ ابن ہشام [اردو]، ۱۹۶۵، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، صفحہ ۲۱۹، لاہور)

تقریر کا ایک ایک لفظ واضح کرتا ہے کہ وہ عواقب و نتائج سے پوری طرح باخبر تھے۔ حضور ﷺ کی ہجرت سے قبل تقریباً تمام مہاجرین ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے جنکا پر تپاک استقبال کیا گیا تھا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ انصار اچھی طرح جانتے تھے کہ حضور ﷺ کے ہمراہ انکے اصحاب بھی ہجرت فرمائیں گے۔

پس مہاجرین انصار کے بن بلائے یا غیر متوقع مہمان نہ تھے۔ حضور جب مدینہ تشریف لائے تو آپ نے مہاجرین و انصار میں مواخات کا رشتہ قائم فرمایا جو ان کے لیے ہمیشہ قابل فخر رہا۔ اس مواخات کی بدولت مہاجرین اور انصار میں خود بخود ایک خوشگوار تعلق قائم ہو گیا۔

عرب مہمان نوازی اور اخوت کے جذبے سے مغرب ناواقف ہے۔ وگرنہ، گریونے باؤم کی زبان پر خوشگوار تعاون کے الفاظ نہ آتے۔ یہاں تو ہر وہ شخص جو قبیلے کے جوار میں آجاتا تھا قبیلے کا فرد محصور ہوتا تھا۔ اور ایسا ہر فرد قبیلے کے لیے اور قبیلہ فرد کے لیے جان دینے پر تیار ہوتا تھا۔

اسلام سے پہلے فرد کی وفا کا محور قبیلہ ہوتا تھا۔ اسلام نے اس مرکز وفا کو قبیلے سے دین میں منتقل کر دیا۔ انصار اور مہاجرین میں دو ہر رشتہ قائم ہو گیا۔ دین کا اشتراک اور نبی ﷺ کی قائم کردہ اخوت۔ خوشگوار تعاون کی اس سے بڑھ کر کیا بنیاد ہو سکتی تھی؟

پس یہ خیال کہ خوشگوار تعاون کے لیے آزاد معیشت درکار تھی، بر خود غلط ہے۔ مزید برآں مہاجرین معاشی طور پر انصار کے دست نگر نہ تھے۔ مہاجرین سب کے سب قریش تھے جن کا پیشہ تجارت تھا اور انصار زراعت پیشہ تھے۔ انصار کی زرعی معیشت برقرار رہی، اس میں کوئی فرق نہ آیا، جب کہ مہاجرین نے تجارت کو اپنا پیشہ بنایا۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے اکابر ملت کے تجارتی مشاغل کا ذکر متعدد کتب میں ملتا ہے۔ حضرت وحید کلبیؓ، حضرت زید بن حارثہؓ اور حضرت عبدالرحمنؓ بن عوفؓ کا روان تجارت لے کر شام جایا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ مہاجرین جن کی آزاد معیشت کا گریونے باؤم تذکرہ کرتا ہے تعداد میں کل نوے تھے۔ ان میں سے بیشتر تجارت کرتے تھے اور کچھ مزدوری کرتے تھے۔ ممکن ہے کہ کچھ انصار کے دست نگر بھی رہے ہوں۔ لیکن اس قلیل نفری کے لیے لوٹ کو ذریعہ معاش قرار دینا سراسر زیادتی ہے۔ غرض یہ کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے لوٹ کو بنیادی معیشت بیان کیا گیا ہے، وہ سارے مقاصد معاشی سہاروں کے محتاج نہ تھے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ مکے کے کتنے تجارتی کاروانوں سے تعارض کیا گیا، اور کتنے کاروان ایسے تھے جن سے کچھ مال غنیمت ملا۔ ذیل میں ان تمام بہمتا کا جدول پیش ہے جن میں قریش کے خلاف کارروائی کی گئی۔

قریش کے خلاف کارروائیوں کا جدول

شمار	مہم تاریخ	نتیجہ	شمار	مہم تاریخ	نتیجہ
۱	سیف البحر ۱ھ	جنگ نہ ہوئی	۱۰	غزوہ سویق ۲ھ	دشمن فرار ہو گیا
۲	راہی ۱ھ	جنگ نہ ہوئی	۱۱	سریہ قزوہ ۳ھ	کارواں گرفتار ہوا
۳	الحرار ۱ھ	جنگ نہ ہوئی	۱۲	غزوہ احد ۳ھ	مسلمانوں کا نقصان
۴	الابوار ۲ھ	مقابلہ نہیں ہوا	۱۳	حراء الاسد ۳ھ	دشمن پسپا
۵	بواط ۲ھ	مقابلہ نہیں ہوا	۱۴	بدر الموعید ۳ھ	مقابلہ نہیں ہوا
۶	مہم صفوان ۲ھ	دشمن بچ کر نکل گیا	۱۵	غزوۃ الخندق ۵ھ	دشمن ناکام ہو کر چلے گئے
۷	ذوالعشر ۲ھ	مقابلہ نہیں ہوا	۱۶	العس ۶ھ	کارواں گرفتار
۸	سریہ نخلہ ۲ھ	مال غنیمت ہاتھ آیا	۱۷	حدیبیہ ۶ھ	صلح، کوئی غنیمت نہیں
۹	غزوہ بدر ۲ھ	شاندار فتح، مال غنیمت	۱۸	فتح مکہ ۸ھ	فتح مبین، عام معافی، کوئی غنیمت نہیں

اس جدول پر ایک نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ قریش کے خلاف آٹھ [۸] سالوں میں کل اٹھارہ [۱۸] چھوٹی بڑی کارروائیاں کی گئیں۔ ان میں سے گیارہ [۱۱] بہمتا ایسی ہیں جن میں کسی قسم کا مقابلہ ہی نہیں ہوا، لہذا غنیمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چار مہمیں (بدر، احد، حراء الاسد اور خندق) دفاعی نوعیت کی تھیں۔ اگر غنیمت ملی بھی تو بدر میں، کہ احد میں مسلمانوں کی فتح نہیں ہوئی، خندق غیر فیصلہ جنگ تھی اور حراء الاسد کی مہم قریش کی احد سے واپسی پر ان کے تعاقب کے لیے تھی۔ بدر کی غنیمت میں مقتولین اور اسیروں کے ہتھیار تھے یا سواریاں تھیں، جنہیں کسی صورت آزاد معیشت کی بنیاد قرار نہیں دیا جاتا۔

اب محض تین مہمیں رہ گئیں جن میں کچھ مالی منفعت حاصل ہوئی۔

- ۱۔ پہلی مہم نخلہ کی تھی۔ اس مہم میں عبداللہ بن جحش کی سربراہی میں کل نو افراد تھے۔ یہ مہم حوالیہ مکہ میں قریش کی معاندانہ کارروائی کا پتہ چلانے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ دشمن کے علاقے میں اپنے مرکز سے تین سو میل [پانچ سو کلومیٹر] دور اتفاقاً ایک کارواں سے دوچار ہو گئے۔ اگر اس کارواں کو قابو میں نہ کرتے تو مہم کے شرکاء کی تباہی لازمی تھی کیونکہ یہ کارواں جیسے ہی مکہ میں داخل ہوتا، قریش پلٹ کر اس مہم پر ٹوٹ پڑتے۔ حفاظت خود اختیاری کے پیش نظر اس کارواں کو قابو کیا گیا۔ اس مہم میں جو غنیمت ملی

وہ کشمش، مٹھی اور چمڑے پر مشتمل تھی۔ یہ غنیمت صرف شرکائے مہم میں تقسیم کی گئی۔ اس غنیمت کے بل بوتے پر انصار کے مقابلے پر مہاجرین کی آزاد معیشت کے قیام کا تقصّر بھی مضحکہ خیز ہوگا۔

۲۔ دوسری مہم حضرت زید بن حارثہ کی سرکردگی میں روانہ کی گئی۔ اس مہم نے القرۃ کے مقام پر قریش کے ایک تجارتی قافلے سے تعارض کیا۔ جنگ بدر کی ہیبت باقی تھی۔ قریش اپنا سامان چھوڑ کر بھاگے جو ضبط کر کے مدینے پہنچایا گیا۔ اس مہم میں کتنا مال غنیمت میسر آیا اس کی تفصیلات نہیں مائیں۔ اس مہم کے شرکاء کی تعداد کم از کم ایک سو [۱۰۰] بیان کی جاتی ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ مہاجرین کے علاوہ انصار نے بھی اس مہم میں شرکت کی تھی۔ لہذا مال غنیمت کی تقسیم میں مہاجرین اور انصار دونوں شریک تھے۔ یہ غنیمت بھی مہاجرین کی آزاد معیشت قائم کرنے کے مقاصد پورے نہیں کرتی۔

۳۔ مہم العس کچھ اتنی غیر اہم تھی کہ بیشتر کتابوں میں اس کا ذکر تک نہیں ملتا۔ اس کے شرکاء کی تعداد ایک سو ستر [۱۷۰] بیان کی گئی ہے، جبکہ مال غنیمت کا کوئی تخمینہ نہیں ملتا۔ شرکاء کی تعداد کے پیش نظر مہاجرین اور انصار آدھے آدھے رہے ہونگے۔ اس مہم سے بھی مہاجرین کی ایسی معیشت کے قیام کا مقصد پورا نہیں ہوتا جو انصار کی معاشی حالت کے متوازی ہو۔ کیونکہ یقیناً یہ غنیمت انصار کو مہاجرین کے مقابلے میں بہتر معیشت کا حامل بناتی ہوگی۔

لہذا یہ نظریہ کہ قریش کے تجارتی کاروانوں کی اوٹ پر مہاجرین کی گزر بسر ہوتی ہوگی یا اس لوٹ کے ذریعہ مہاجرین کی معاشی حالت کو بہتر بنایا گیا تاکہ وہ خوشحال انصار کے ہمسر ہو سکیں، اور معاشرے میں ان کا درجہ ثانوی نہ رہ جائے یکسر غلط ہے۔ کاروانوں سے تعارض کو اوّل تو کسی طور لوٹ کہنا ہی لاعلمی کی دلیل ہے۔ ثانیاً پوری تاریخ نبوی میں ایک اہم اور دو معمولی کاروانوں کی گرفتاری کو ملت کی معاشی بنیاد قرار دینا محض تنگ نظری ہے۔ گریونے باؤم کا خیال یہ لگتا ہے کہ جیسے ملنے کے تجارتی کارواں قارون کا خزانہ لے کر چلتے تھے، جس پر مسلمان لوٹ پڑتے تھے اور یہ کہ مسلمان اسی خزانے پر گزر بسر کرتے تھے، ورنہ نہ ان کا کوئی ذریعہ معاش تھا اور نہ کسب کا انہیں کوئی اور طریقہ آتا تھا۔

قریش گانجھ کے پورے اور عقل کے اندھے نہ تھے۔ انہیں بھی علم تھا کہ جس راستے سے ان کے کارواں جاتے تھے وہ پر امن نہ تھا۔ وہاں یہ خطرہ موجود تھا کہ قافلہ لٹ جائے۔ ایسی صورت میں عقل سلیم کا تقاضا یہی تھا کہ حفاظت کا معقول انتظام ہو اور کارواں کی مالیت ایسی ہو کہ نقصان کی صورت میں اسے بہ آسانی برداشت کیا جاسکے اور فریق مخالف کو اس سے کم سے کم فائدہ پہنچے۔

مہاجرین کون تھے؟ کیا یہ مکہ کے قریش نہ تھے؟ کیا یہ ان صفات سے عاری تھے جو قریش مکہ میں پائی جاتی تھیں؟ اگر پورا مکہ محض تجارت پر گزر بسر کر سکتا تھا تو نوے [۹۰] افراد کے گروہ مہاجرین کے لیے کوئی رکاوٹ تھی کہ وہ تجارت نہ کر سکیں؟ مدینے میں اسلامی ریاست کے قیام نے مکہ کو شمالی تجارت سے بھی بیخصل کر دیا تھا تو اس خلا کو پر کرنے لیے مدینے کے مہاجرین سے بڑھ کر کس کے لیے موقع ہو سکتا تھا؟

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

یہی مہاجرین تھے جنہیں ہجرت کے دس [۱۰] سال کے اندر اندر پورے عرب پر اور بیس [۲۰] سال کے اندر اندر کسریٰ کی سلطنت پر قبضہ کرنا اور قیصر کو مشرق وسطیٰ سے بیدخل کرنا تھا۔ ان میں سے ہر فرد بیس سال خویوں کا مالک تھا۔ کوئی فاتح تھا اور کوئی قائد۔ کوئی بے نظیر منتظم تھا تو کوئی عسکری تاریخ کا منفرد ہیرو۔ ان فاتحین نے ایران اور شام کی فتوحات کے دوران مفتوحین کے ساتھ جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا، کیا اس کی کوئی نظیر کسی اور فاتح قوم یا اسکے قائدین میں ملتی ہے؟ کیا یہ لوگ محض لئیرے تھے؟

عجیب تضاد ہے کہ اپنی قوم کو تو لوٹتے تھے، لیکن جب شام اور ایران کو فتح کیا تو نہ تو کسی کو تاحق قتل کیا اور نہ ہی لوٹ مار کی۔ نہ غورتوں، بوڑھوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھایا، نہ دہشت گردی کی نہ آتش زنی۔ اگر کسی مفتوحہ شہر کو دفاعی حکمت عملی کے تحت چھوڑنا پڑا تو وصول کیا ہوا جزیہ تک لوٹا دیا۔ جب یہ گروہ لئیرا تھا تو ان سے ایسے معیاری اخلاق کا اظہار کیونکر ممکن ہوا۔

اقتدار اور فتح کا نشہ کسی بدکردار پر اخلاقی قیود نہیں قائم کرتا۔ اس کے برخلاف بے راہ روی کی مکمل آزادی دیتا ہے۔ اس گروہ کا اخلاقی اقتدار پرختی سے قائم رہنا بنیادی طور پر انکے مضبوط کردار کی دلیل ہے۔

لوٹ کی غلط فہمی

لوٹ کی غلط فہمی خود ہماری کتابوں کے اندازِ بیان سے پیدا ہوئی ہے۔ امام بخاریؒ نے حضرت کعب بن مالک سے جب بدر کی روایت یوں بیان کی ہے۔

إِنِّي كُنْتُ تَخَلَّفْتُ فِي غَزْوَةِ بَدْرٍ وَلَمْ يُعَاتِبْ أَحَدًا تَخَلَّفَ عَنْهَا - إِنَّمَا خَرَجَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُرِيدُ غَيْرَ قَرَيْشٍ -

[میں غزوہ بدر میں پیچھے رہ گیا اور کسی پیچھے رہ جانے والے پر کوئی عتاب نہیں ہوا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ قریش کے قافلے کی نیت سے نکلے تھے۔]

یہ نیت کیا تھی؟ بد قسمتی سے لوگوں نے اسے مکروہ لفظ لوٹ سے منسلک کیا ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ مغرب کو اس لفظ سے بڑھ کر کوئی دوسرا لفظ مرغوب نہیں ہو سکتا تھا۔ اس میں تصرف کر کے 'سراپین' کے معنی 'سراپین' کر دیے گئے۔ قوم لئیری ٹھہری۔ اس کے سردار ڈاکوؤں کے سردار قرار دیے گئے۔

عرب دستور: قبل اسلام عرب کا عام دستور تھا کہ وہ اپنے تجارتی قافلوں کے لیے علاقے کے قبائل سے حفاظت طلب کرتے تھے، جس کے لیے مناسب معاوضہ دیا کرتے تھے۔ [Watt, W.M.; Mohammed] (at Mecca, pp. 1-2) ہر علاقے میں بسنے والا قبیلہ خود مختار تھا جو اپنے حلیفوں کو اپنے علاقے سے تجارتی قافلوں کو بحفاظت لیجانے کی اجازت دیتا تھا۔ مد کے تاجر تو اپنی جگہ، عرب حکمرانوں تک کو ضرورت

محسوس ہوتی تھی کہ اپنے تجارتی قافلوں کی حفاظت کی ذمہ داری کسی نہ کسی بڑے قبیلے کو سونپیں۔

چنانچہ حیرہ کے عرب حکمران نعمان بن منذر نے بازار عکاظ میں جب اپنا تجارتی کارواں روانہ کرنا چاہا تو بنی کنانہ اور بنی قیس سے سوال کیا کہ ”تم میں سے ایسا کون بہادر ہے جو بہادری کے ساتھ میرے کارواں کو عکاظ تک لے جائے اور اسکی حفاظت کا ذمہ دار ہو۔ میں اس خدمت کا معقول معاوضہ ادا کرونگا۔“ (سیرۃ ابن ہشام [اردو]، ۱۹۶۵ء، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، صفحہ ۹۲، لاہور)۔ قبیلہ کنانہ کے ایک شخص براض نے یہ ذمہ داری قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اس کے مقابلے میں ایک دوسرا شخص عروہ کھڑا ہوا اور اس نے نہ صرف بنی کنانہ بلکہ پورے عرب کے مقابلے میں ذمہ داری قبول کرنے کا دعویٰ کیا۔ عروہ بنی قیس سے تعلق رکھتا تھا۔ نعمان نے عروہ کی پیشکش قبول کر کے کارواں اسکی نگرانی میں روانہ کیا۔ بنی کنانہ نے عروہ کو قتل کر کے اس کارواں پر قبضہ کر لیا۔ اس کے نتیجے میں جنگ فجار رونما ہوئی۔ یہ واقعہ بعثت نبوی سے بیس بائیس سال پہلے ہوا۔

اس واقعے سے چند نہایت اہم پہلو واضح ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ ہر علاقے پر قبائلی اقتدار مسلم تھا، اور کسی قبیلے کے علاقے سے کسی دوسرے قبیلے کا تجارتی قافلہ اجازت اور منظوری کے بغیر نہیں گزر سکتا تھا۔ دوم یہ کہ اس اجازت اور منظوری کے عوض معاوضہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اس صورتحال کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ تجارتی کاروانوں کی آمد و رفت کے لیے علاقائی معاہدے ہوتے تھے اور صرف معاہدے کی منظوری اور باقاعدہ معاوضے کی ادائیگی کے بعد ہی بیرونی کاروانوں کو یہ حق پہنچتا تھا کہ علاقائی حدود میں سے گزر سکیں۔

ہجرت کے بعد مدینے میں ایک ریاست قائم ہو چکی تھی۔ اس ریاست کے ساتھ مدینے کے آس پاس کے قبائل الحاق کر چکے تھے۔ اس کی حدود ساحل بحر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ قریش اس ریاست کے اقتدار کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ اس ریاست کے لیے قریش دشمن تھے۔ یہ دشمن کی سینہ زوری تھی کہ ریاست کے حدود کی خلاف ورزی کرنے پر تے ہوئے تھے۔ جب معمولی قبائل کا یہ حق تھا کہ ان کی منظوری کے بغیر ان کے علاقے سے کارواں تجارت نہ گزرے تو اسلامی ریاست کو بھی یہ حق تھا کہ وہ دشمن کو اپنے علاقے میں داخل ہونے سے باز و شمشیر روکے۔ قریش کے قافلوں کی حیثیت ریاست کے اقتدار سے تعارض، اور قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرنے والے اسمگلوں کی تھی۔ اسلامی ریاست کے پاس تنخواہ دار فوج یا پولیس نہ تھی، لہذا ان اسمگلوں کی سرکوبی کے لیے مہاجر و انصار روانہ کیے جاتے تھے۔ ان مہمات میں اکثر اوقات قریش بچ نکلنے میں بھی کامیاب ہو جاتے تھے۔

بدر کے موقع پر انہوں نے اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے جنگ بھی کی، جس میں مہاجرین سے دو گئے انصار نے حصہ لیا۔ بدر سے قبل کوئی قابل ذکر کارواں گرفتار بھی نہیں ہوا تھا کہ ان کی شرکت کی وجہ تحریریں کو قرار دیا جائے۔ جب بدر کے بعد دو کارواں گرفتار ہوئے۔ ان کی مالیت سے قطع نظر ان کاروانوں کی گرفتاری ریاست کا نہ صرف حق تھا بلکہ اقتدار کی حفاظت کے لیے ضروری بھی تھا۔ اگر ان کاروانوں سے تعارض نہ کیا جاتا تو ریاست کی کوتاہی ہوتی۔ تجارتی محصول کا دستور صرف عرب قبائل کا ہی نہیں بلکہ متمدن دنیا کا بھی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

مسئلہ قانون تھا۔ مالی تجارت بلا اجازت کسی بھی ملک سے نہ گزر سکتا تھا۔ حضور ﷺ کے بزرگوں نے شام، عراق اور حبشہ سے تجارت کے لیے وہاں کی حکومتوں سے باقاعدہ اجازت نامے حاصل کیے تھے۔ رومن امپائر میں مالی تجارت کی درآمد اور برآمد پر محصول وصول کیا جاتا تھا۔ اناجیل میں محصول وصول کرنے والوں کا جگہ جگہ ذکر آیا ہے۔

غرض یہ کہ کسی ریاست کی حدود میں ناپسندیدہ افراد کا داخلہ اور غیر قانونی تجارتی سرگرمیاں ایک مسئلہ جرم تھا۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والے مجرموں کو گرفتار کرنا یا مالی تجارت کو سختی سرکار ضبط کرنا ایک قانونی کارروائی تھی جسے لوٹ کہنار ریاست کے اقتدار کا مذاق اڑانا ہے۔

موقع پرستی

انیسویں صدی کے مستشرقین نے حضور ﷺ پر موقع پرستی کا الزام بھی لگایا ہے۔
ویب (Weber) نے لکھا۔

"Mohammed was an opportunist and that the original adherents to Islam were motivated solely in terms of prospects of booty and conquest"
(Quoted by Bryan S. Turner; Weber and Islam, p.23)

[محمد ﷺ] (نعوذ باللہ) ایک موقع پرست شخص تھے اور اسلام کے ابتدائی ماننے والے صرف اور صرف مالی غنیمت اور فتوحات کی لالچ میں ان کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔]

حضور ﷺ کی تریسٹھ سالہ زندگی کے دو حصے ہیں، قبل نبوت اور بعد نبوت۔ قبل نبوت کی تفصیلات سے آگاہی بہت ہی کم ہے۔ اس دور کا کوئی واقعہ ایسا نظر نہیں آتا جس سے مغرب کے اس الزام کو کوئی سہارا میسر آ سکے۔ بعد نبوت کا دور بھی دو حصوں میں منقسم ہے۔ مکی دور اور مدنی دور۔ مکی دور تیرہ برس کی مدت پر محیط ہے۔ اس پورے دور میں حضور ﷺ کی سرگرمیاں تبلیغ تک محدود ہیں۔ یہ دور انتہائی شدید مصائب اور آزمائش کا دور تھا۔ فرد واحد بلا نصرت غیر، اپنے معاشرے میں خوش آئند تبدیلی پیدا کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔ اس کی دعوت کیا تھی۔ خدائے واحد ولا شریک کی الوہیت کا پیغام۔ اس پر ایمان لانے اور اسی کی عبادت کرنے کی تلقین۔ اس دعوت کے نتیجے میں انہیں اور ان پر ایمان لانے والوں کو اذیت کے سوا معاشرے نے کیا دیا؟ جان و مال خطرے میں پڑے، ہر طرح سے آزمائش کی گئی۔ معاشرے نے ترغیب و ترہیب کا ہر ہتھکنڈہ استعمال کیا۔ آزادی سے جینا دو بھر ہوا اور بالآخر ہجرت کرنا پڑی۔

سابقون الاولون اسی دور کے اصحاب ہیں۔ ان اصحاب نے راہ خدا میں جس طرح قربانیاں دیں، اس کے پیش نظر یہ تصور کرنا بھی دماغی خلل ہے کہ انہوں نے دنیاوی مفاد کے لیے اسلام قبول کیا تھا۔ وہ مجبور انسان جس کے سینے پر عرب کی پتی ہوئی ریت پر پتھر رکھے جا رہے ہوں اور وہ پھر بھی اعداد کیے جا رہا ہو، نہ معلوم کس غنیمت اور کون سی کشور کشائی کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ فرد جو ایسے مجبور انسانوں کو خرید کر آزاد کر رہا تھا، خدا معلوم کس سلطنت کا آرزو مند تھا۔ وہ شہید جن کا جرم صرف توحید کو قبول کرنا تھا، جب ان کا جسم اونٹوں سے باندھ کر چیرا جا رہا تھا تو نہ جانے وہ کونسی دنیاوی نعمتوں سے بہرہ مند ہو رہے تھے۔

خود سرور کائنات ﷺ کے ساتھ ان کی قوم نے کیا کیا۔ تیرہ سال کی طویل مدت شدید صبر آزمائی، کشمکش، بے چارگی، تنگی و عسرت کا دور ہے۔ اس میں اپنے بھی بیگانے ہو گئے۔ معاشرہ دشمن ہو گیا، اپنا شہر دیار غیر بن گیا۔ راہوں میں کانٹے بچھائے جاتے، گھر پر پتھر آتے۔ ادبаш ادباشی پر داد تحسین پاتے۔ کلمہ حق کے جواب میں سنگ و خشت برستے۔ کیا یہ سب کچھ موقع پرستی تھی۔ کیا کسی موقع پرست سے، حق کے لیے، ایسی استقامت کا بھی اظہار ہوا ہے؟ حقائق سے چشم پوشی اور بہتان تراشی صرف ان لوگوں کا ہی شیوہ ہو سکتی ہے جو یا تو اصلی کوائف سے ناواقف ہوں یا پھر واقعات کو عداً مسخ کرنا چاہتے ہوں۔

مکی دور کے بعد دس سالہ مدنی دور ہے۔ اس میں بے شمار ایسے واقعات ملتے ہیں جنہیں مسخ کر کے معاندین اپنے دعووں کو تقویت دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تجارتی قافلوں سے تعارض کو لوٹ کہنا، مثنویت کے عقیدے کے پیش نظر دنیاوی معاملات کو دین سے جدا قرار دے کر عسکری مہمات اور انتظامی امور کو نبوت کے دائرہ کار سے خارج قرار دینا، اور پھر ان پر زبان طعن دراز کرنا، یہی تو شیوہ مغرب ہے۔

مدنی دور حضور ﷺ کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ مدینے والوں نے ان کی نبوت کو تسلیم کر کے انہیں اپنے شہر آنے کی دعوت دی۔ ان کی آمد پر وہاں ہذا استقبال کیا۔ ان کے احکامات کی پابندی کرنے پر بیعت کی۔ ان کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ انہیں اپنا عادل و منصف تسلیم کیا۔ مدینے نے اسلامی معاشرے کی تعمیر کا میدان فراہم کیا اور یہاں اس معاشرے کے بنیادی خد و خال ابھرنے لگے۔ مکے کا پیغمبر ﷺ جو صرف تحمید و تہجد، انکساری، عبادت و ریاضت، صلح پسندی و صلح جوئی میں مصروف نظر آتا تھا، اب ان تمام صفات کو بہ تمام و کمال قائم رکھتے ہوئے ریاستی انتظام و انصرام، قانون سازی اور عدل گستری، تعلیم و تدریس اور ترویج و دفاع میں بھی متحرک نظر آتا ہے۔

چشمِ عناد کو زہد و تقویٰ، مخگانہ باجماعت نمازیں، روزے، شب بیداری، فقر وفاقے، کم آرمی، دل گدازی، جاں سپاری، خوفِ خدا، احساسِ ذمہ داری، رحمت و شفقت، تقدس و حرمت تو نظر نہیں آتی، انہیں صرف یہ تبدیلی کھلتی ہے کہ آخر مسکت نے اقتدار کیوں حاصل کر لیا۔ زبانی تبلیغ کے بعد اپنے دفاع کے لیے طاقت کیوں استعمال کی گئی اور تلوار کیوں اٹھائی۔ [جس کے نتیجے میں عرب ایک عظیم قوت بن کر رومی مقبوضات کو آزاد کرا سکے، پورے مغرب ہزار سال کے لیے اپنے استبدادی کردار سے محروم ہو گیا۔]

اسی تبدیلی کو موقع پرستی سے تعبیر کیا گیا۔ عناد کی سوچ کر یہہ ہوتی ہے، ورنہ یہ سارے مدارج فطری ہیں۔ ان تمام مدارج کو انبیائے سابق نے بھی طے کیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی تبلیغ بے اثر رہی۔ بالآخر انہوں نے بھی ہجرت کی، اور حفاظتِ خود اختیاری کی ضرورت ہوئی تو تلوار بھی اٹھائی۔ حضرت موسیٰؑ نے قوم کو متفق کیا اور فرعون کو صلح و آشتی پر مائل کرنے کی کوشش کی۔ چارہ کار نہ پایا تو پوری قوم کو لے کر مصر سے نکلے، اس کی تربیت فرمائی۔ قوم گمراہ ہوئی تو اس کے خلاف تلوار استعمال کی۔ ہر قبیلے کے مشرکین کو قتل کروایا، جن کی تعداد تین ہزار [۳،۰۰۰] کے لگ بھگ تھی۔ بقیۃ السیف کو قانون عطا کیا۔ ان کے انتظام و انصرام کی طرف توجہ دی۔ جب معاشرتی امور قابلِ اطمینان ہوئے تو ملک موعود کی طرف پیش قدمی کی، مخالفین پر تلوار اٹھائی۔ فتوحات حاصل کیں۔ قضائے الہی نے مہلت نہ دی کہ کنعان کو فتح کرتے۔ اگر فتح ان کی حیات میں ہوتی تو یقیناً انتظام و انصرام بھی کرتے، جیسا کہ ان کے جانشینوں نے کیا۔ اس نوزائیدہ مملکت اور نظریاتی معاشرے کو کسی اور کے رحم و کرم پر نہ چھوڑتے۔

حضرت عیسیٰؑ نے کیا کیا؟ صرف تبلیغ فرمائی۔ مگر کس لیے؟ اسی لیے تاکہ ایک صالح معاشرہ پیدا کیا جائے۔ یہ صالح معاشرہ اگر پیدا ہو جاتا تو پھر کیا کرتے؟ کیا اسے منظم و منضبط نہ کرتے؟ آسمانی سلطنت کے قیام کا جو نظریہ اناجیل میں پایا جاتا ہے، کیا حضرت عیسیٰؑ کا نظریہ نہ تھا؟ اگر یہ سلطنت قائم ہو جاتی تو انصاف کا انصرام کون کرتا؟ کیا ان سے بہتر کوئی اور شخصیت بھی تھی، جو اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دے سکتی؟ کم از کم قصور اور اسکے نمائندوں کو تو یہ اجازت ہرگز نہ ملتی۔

حضرت عیسیٰؑ کا دور نبوت صرف تین سال ہے۔ اس تمام عرصے میں وہ تبلیغ فرماتے رہے جس کا معاشرے نے خاطر خواہ اثر قبول نہ کیا۔ اس قلیل مدت میں تبلیغ کو بے اثر دیکھا تو وہ بھی تلوار کا سہارا لینے پر مجبور ہونے لگے۔ انجیل میں ہے،

”اس نے ان سے کہا مگر اب جسکے پاس بڑھ ہو وہ اسے لے اور اسی طرح جھولی بھی۔ اور جسکے پاس نہ ہو وہ اپنی پوشاک بیچ کر تلوار خریدے۔“ (لوقا باب ۲۲، ۳۶)

ان ہی فطری مدارج کو داعی اسلام ﷺ نے بھی طے فرمایا۔ عناد کی زبان اسے موقع پرستی کا نام دیتی ہے۔ جبکہ باندہ دار جائزہ اسے صالح معاشرے کے قیام کی جد و جہد کہے گا۔ اسی پر خلوص جد و جہد کا اصطلاحی نام جہاد ہے۔ مغرب کی نظر میں جہاد ایک شیطانی فعل ہے، اور محض خونریزی کا جسکے ہے جس میں سفلی خواہشات کا رفرما ہوتی ہیں۔

غور طلب امر یہ ہے کہ داعی اسلام ﷺ کے اصحاب ہمہ وقت اگلے گرد و پیش موجود تھے۔ ان کی تعلیمات سے آگاہ اور ان پر صدق دل سے عمل پیرا تھے۔ انہیں اللہ کا رسول تسلیم کرتے تھے۔ ان کے ہر لفظ کو سرچشمہ ہدایت سمجھتے تھے۔ ان کے ہر عمل کو صراطِ مستقیم کی حیثیت حاصل تھی۔ اس حالت میں کوئی سہو یا لغزش جو مقامِ نبوت سے مناسبت نہ رکھتی ہو، اصحاب کو دل برداشتہ کرنے کے لیے کافی ہوتی۔ آخر وقت تک اصحاب کی

گردیدگی اور وصالِ نبوی ﷺ کے بعد شدتِ جذبات سے ان کی وارفتگی اس امر کا ثبوت ہے کہ اللہ کا نبی ﷺ اس کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

قسم کی ہر کمزوری سے منزہ تھا۔ اس کی ذات اور اس کا کردار اس قدر بلند، مقدس، پاک اور اور بے ریا تھے کہ اس سے محبت، دیوانگی اور جنون کی حد تک بڑھ چکی تھی۔ عشق و محبت صرف حسن و خوبی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہی جذبہ ہے جو محبوب کو محبت کی ذات سے ارفع و اعلیٰ کر دیتا ہے۔ اسی جذبہ کے تحت محبت اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ داعی اسلام ﷺ، جن کا معاشرہ اپنے محبوب نبی ﷺ پر جان چھڑکتا ہے، اور یسوع، جن کے لیے کسی کی تکسیر بھی نہیں پھوٹی، مغرب جب ان دونوں کا موازنہ کرتا ہے تو کسی قدر کوشش کر نہیں رکھتا بلکہ دونوں کو اوزان بدل کر تو لا جاتا ہے۔ اور پیشگی تعین کے مطابق نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔

موقع پرستی کا الزام ہے تو موقع پرستی کے ثبوت کیا ہیں؟ جنگیں موقع پرستی نہیں، باطل کا تدارک تھیں۔ قافلوں کی گرفتاری موقع پرستی نہیں، ریاست کی تادیبی کارروائی تھی۔ معاہدات موقع پرستی نہیں، معاشرے میں قیام امن کے اقدامات تھے۔ معاہدات کی خلاف ورزی ملت اسلامیہ نے نہیں بلکہ ہمیشہ فریق ثانی نے ہی کی۔ اس خلاف ورزی کے نتائج و عواقب موقع پرستی نہیں، فریق ثانی کی شامت اعمال تھی۔ فتنہ پرور لوگ شہر بدر کیے گئے تو اپنی بد اعمالیوں اور جرائم کی پاداش میں۔ سنگین جرائم، مثلاً مملکت سے غدری، ریاست اور معاشرے کے خلاف سازشوں اور نظریاتی انتشار پیدا کرنے کی مذموم حرکتوں، کے مرتکب مجرموں کو سزائیں دی گئیں تو قانون اور سلامتی کے تقاضوں کے تحت۔ غدری، جاسوسی، غیر ملک کے لیے اپنے ملک کے مفاد کے خلاف سرگرمیوں میں حصہ لینا، یہ سب ایسے سنگین جرائم ہیں جنہیں ہر متمدن معاشرہ ناقابلِ معافی تصور کرتا ہے اور ان کی پاداش میں سخت سزائیں دیتا ہے۔

عہد نبوی میں معاشرے میں ان سزاؤں کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی۔ مجرمین کے قبائل اور ان کے حلیفوں نے بھی ان تادیبی کارروائیوں کو روکا رکھا۔ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ مجرمین ان سزاؤں کے حقدار تھے؟ بنی قریظہ شہر بدر کیے گئے تو دیگر یہود تماشائی رہے۔ بنی نضیر ملک بدر ہوئے تو معاشرے میں کوئی بے چینی پیدا نہیں ہوئی۔ بنو قریظہ گرفتار ہوئے تو ان کا فیصلہ ان کے حلیف نے یہود کے قانون کے مطابق کیا۔ پتہ نہیں ان میں سے کونسا عمل تھا جو مغربی مفکرین اپنے الزام کے ثبوت میں پیش کرنا چاہیں گے؟

مسخ کردہ حقائق

قبل ہجرت

حضور ﷺ سے متعلق تاریخی واقعات کو مسخ کرنا، ان میں شبہ پیدا کرنا یا انہیں غلط قرار دینا مغرب کی ایک شعوری کوشش رہی ہے۔ روایات کے مطابق حضور ﷺ کی پیدائش عام الفیل یعنی مکے پر ابرہہ کے حملے کے سال بتائی جاتی ہے۔ چونکہ ابرہہ کے حملے کا سال متعین نہیں ہے اس لیے مختلف اندازوں پر مختلف سنیں قیاس کیے جاتے ہیں۔ عام طور پر ۵۷۰ء کو سال پیدائش بیان کیا جاتا ہے۔

شارٹرانسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں اس موضوع پر حسب ذیل تبصرہ پایا جاتا ہے۔

”سال پیدائش ۵۷۰ء مشتبہ ہے کیونکہ روایات ان کی پیدائش عام الفیل میں بتلاتی ہیں، اور ابرہہ کا مکے پر حملہ اس سال سے قبل ہوا ہوگا۔ لیکن نے تاریخ پیدائش میں بہت سے شبہات اس بنا پر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ مدینہ آکر حضور ﷺ نے جس فعالیت کا ثبوت دیا ہے وہ کسی معمر اور پچاس سال سے زیادہ عمر والی شخصیت سے متوقع نہیں ہو سکتی۔ (اس قیاس کی بنا پر) اس وقت عمر بیس تیس سال ہونی چاہیے۔“

(Shorter Encyclopedia of Islam; article 'Mohammed', p.390)۔ کیا بوالعجبی ہے کہ انسائیکلو پیڈیا کے مؤلفین سنہ پیدائش ۵۷۰ء سے قبل قرار دیتے ہیں تو لیمن فعالیت کی بنیاد پر ہجرت کے وقت بیس سال کے لگ بھگ قیاس کرتا ہے، یعنی سال پیدائش (سال ہجرت ۶۲۲ء سے بیس [۲۰] سال منفی کرنے پر) ۶۰۲ء یا ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی سنیں مقرر کرتا نظر آتا ہے۔ اب اگر تیرہ سالہ مکئی دور کو نکالا جائے تو گویا بعثت صرف سات سے سترہ سال کی عمر کے درمیان ہوئی۔ پھر شادی کب ہوئی؟ قبل پیدائش یا دو برس کی عمر میں؟ گویا لیمن نے اپنے خود ساختہ مضحکہ خیز نظریے کی بنیاد پر حیات نبوی کی تینتیس سالہ تاریخ کو بیک جنبش قلم نا پید کر دیا۔ وہ تمام واقعات جن کا تعلق اس دور سے ہے کالعدم ہو گئے۔ نہ جنگ فجار ہوئی نہ حلف الفضول وقوع پذیر ہوا۔ نہ عبدالمطلب کا دور پایا نہ زبیر بن عبدالمطلب کی سرپرستی ملی۔ نہ حضرت خدیجہؓ سے شادی ہوئی نہ تعمیر کعبہ کے قصیے میں ثالثی کی۔ لیمن کا نظریہ تاریخ کو مسخ نہیں کر سکتا، ہاں تاریخ کی روشنی میں خود مسخ نظر آنے لگتا ہے۔

مؤلف مضمون (شارٹرانسائیکلو پیڈیا) کو ابرہہ کا حملہ ۵۷۰ء سے قبل کا واقعہ معلوم ہوتا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خود ابرہہ کی کوئی مستند تاریخ نہیں پائی جاتی ہے۔ عرب میں قبل اسلام ترتیب زمانی کے ساتھ تاریخ

نویسی کا وجود نہ تھا۔ غیر عربوں نے عرب کی کوئی تاریخ نہیں لکھی۔ پس خود ابرہہ کے حملے کے سن کا تعین نہیں، اس لیے کسی غیر معینہ سن کی بنیاد پر معینہ سن کو غلط قرار دینا بجائے خود ایک فاش غلطی ہے۔ سالی پیدائش کا تعلق اسلام کے کسی مذہبی عقیدہ سے نہیں۔ اگر تحقیق ۵۰ء کو بطور سالی پیدائش غلط بھی ثابت کر دے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ حضور ﷺ کی تاریخ پیدائش کو اسلام میں وہ اہمیت ہرگز حاصل نہیں ہے جو یسوع کی پیدائش کو عیسائیت میں حاصل ہے۔ ۱۲ ربیع الاول عام الفیل، ۲۵ دسمبر ۱ء عیسوی نہیں۔ اس دن کو تاریخ مذاہب سابق سے بھی کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ دن یوم شمس تھا نہ اس دن کسی مذہب کا کوئی خدا پیدا ہوا۔ تاریخ پیدائش جزو عقائد نہیں کہ اس کی تبدیلی سے کوئی انتشار پیدا ہو۔

عالی نسبی: عالی نسبی پر بھی بہت سے مستشرقین نے خامہ فرسائی کی ہے۔ جبکہ تمام ذرائع اس امر کی توثیق کرتے ہیں کہ ان کا نسبی تعلق بنو ہاشم سے تھا۔ اور یہ کہ بنو ہاشم نے ان کو ہمیشہ اپنا تسلیم کیا۔ یہ بات اگر قدیم ذرائع نہ بھی بیان کرتے تو اس حقیقت سے ثابت ہو جاتی کہ حضور ﷺ کو مکہ میں جو حالات درپیش ہوئے ان میں ان کی حفاظت صرف ایک صاحب حیثیت قبیلہ ہی کر سکتا تھا۔ یہ قبیلہ بنو ہاشم کا تھا جو خانہ کعبہ کا متولی تھا۔ یہ عزت قریش میں صرف بنو ہاشم کو میسر تھی۔ اور قریش تمام عرب میں معزز ترین تھے۔ پس آپ کا تعلق نسب عرب کے معزز ترین قبیلہ قریش اور قریش کی معزز ترین شاخ بنو ہاشم اور بنو ہاشم کے محترم ترین فرد عبدالمطلب سے تھا۔ اس قسم کی خامہ فرسائی محض تاریخی حقائق کو سوخ کرنے کی ایک بچکانہ کوشش ہے۔

ابتدائی حیات طیبہ: مورخین کو شکایت ہے کہ اگرچہ حضور ﷺ وہ واحد نبی ہیں جو تاریخ کے پورے روشن

دور میں تشریف لائے مگر ان کے بارے میں ہم بہت کم جانتے ہیں، خصوصاً ابتدائی حالات کا قطعاً پتہ نہیں چلتا۔

(cf. Phillips K. Hitti; History of Arabs, p.112)۔ کسی مورخ کی زبان سے ایسا تہرہ عجیب سا

معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ بیرون عرب تاریخی دور کتنا ہی روشن کیوں نہ رہا ہو، عرب تاریخی اعتبار سے قبل اسلام تاریخی کے دور میں ہی تھا۔ اس دور کے عرب کی کوئی تحریری تاریخ نہیں پائی جاتی۔ عرب تاریخ کے دور میں حضور ﷺ کے طفیل میں ہی آیا۔ جب تاریخ لکھنے کا رواج ہی نہ تھا تو تاریخی واقعات کے نایاب ہونے کی شکایت کرنے کا کیا محل ہو سکتا ہے؟

اس سے قطع نظر، تاریخ کا دائرہ کار اس دور میں کیا تھا؟ صرف عظام اور خصوصاً شاہوں کے واقعات کو قلمبند کرنے کا نام تاریخ تھا۔ آج بھی تاریخ یہی کرتی ہے۔ نکتہ نظر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہاں موضوعات میں وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ کیا تاریخ غیر اہم واقعات کو محفوظ رکھنے کی زحمت کرتی ہے؟

سوال یہ ہے کہ تاریخ سے مراد کیا ہے؟ تاریخ کیسے مرتب ہوتی ہے؟ کن واقعات اور کیسے افراد کا تذکرہ محفوظ رکھتی ہے؟ تاریخ واقعات گزشتہ کی یادداشت ہی تو ہے، جس میں اس دور کے اہم واقعات درج ہوتے ہیں۔ اور مورخ کے نقطہ نظر کے پابند ہوتے ہیں۔ اس میں صرف وہی واقعات درج ہوتے ہیں جن کی اہمیت مسئلہ ہوتی ہے۔ اس میں صرف وہی افراد جگہ پاتے ہیں جن کے تذکرے کے بغیر مرقومہ واقعہ تشہرہ جاتا ہو۔

تاریخ اپنے دور کی اہم شخصیتوں کے گرد گھومتی ہے۔ اس وضاحت کے پیش نظر اگر حضور ﷺ کی تاریخی شخصیت سے مراد یہ لی جائے کہ انہوں نے کیا کیا، کیا کیا اور کیسے کیا، تو اس کا کرنامہ اسلام ہے۔ اور کیسے کی مکمل تاریخ موجود ہے۔

عالمی تاریخ انکے ذکر سے بغیر نامکمل ہے۔ تاریخ اسلام تو انہی کے گرد گھومتی ہے۔ اب اگر تاریخ سے مراد یہ ہے کہ پیدائش اور بچپن کے واقعات اور نبوت سے پیشتر حالات زندگی واضح نہیں تو یہی تاریخ کا دستور ہے کہ جب تک کوئی شخصیت تاریخی نہ بن جائے اس کو تاریخ میں جگہ نہیں ملتی۔ سوچے کہ قریش کے ایک گھرانے میں ایک یتیم بچہ پیدا ہوا۔ گھرانے کے متعلقہ لوگوں کو بھی اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ اس کی تاریخ قلمبند کرتے۔ کسی ملک، شہر یا محلے میں روزانہ کتنے ہی بچے پیدا ہوتے ہیں اور کتنے افراد ہیں جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان نوزائیدہ بچوں میں مستقبل کے عظام بھی ہیں انکی تاریخ قلمبند کرتے ہیں۔ پھر اس در یتیم نے بچپن دوسرے بچوں سے ممتاز اور متمیز ہی کیوں نہ گزارا ہو، پھر بھی انکے ہم عمر بزاروں تھے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ خصوصیت سے ان کے حالات کو محفوظ کیا جاتا۔

لیکن جب یہ شخصیت تاریخی بنی تو پورا دور ان کی شخصیت پر مرکوز ہو گیا۔ اب کوئی مورخ یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ اس عظیم شخصیت کے تذکرے کے بغیر تاریخ مرتب کر سکے۔ اب جن لوگوں کو ماضی کے واقعات یاد آتے ہیں، وہ اپنے ذاتی علم کی بنا پر یہ شہادت دیتے ہیں کہ ماضی میں یہ واقعات رونما ہوئے اور اگر کوئی ایسی وجہ نہ ہو جو انکی شہادت کو ناقابل قبول بنا دے، تو یہی غیر مرتبہ واقعات جزو تاریخ بن جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر سوانح عمری اور ہر تاریخ کے اجزائے ترتیبی یہی شخصی شہادتیں اور بیانات ہوتے ہیں۔ جب کلیہ یہی ٹھہرا تو کسی ایک شخصیت پر اعتراض کرنا ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ ورنہ حضور ﷺ کی دور نبوت کی حیات طیبہ تو تاریخ میں اس قدر محفوظ اور روشن ہے کہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ قاری خود بھی اسی دور میں پہنچ گیا ہے۔ حضور ﷺ کی شخصیت تو وہ غیر تاریخ ہے کہ ان کی ضیا بار معیت میں جو آیا متور ہو گیا۔ محض انکے تعلق سے ان گنت گمنام شخصیتوں کو تاریخ میں لافانی مقام ملا۔ یہ تعلق دوستی اور پیروی تک محدود نہیں، بلکہ ایسے لوگ بھی لازوال شہرت پا گئے جن کا کرنامہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ انہوں نے شمع رسالت کی مخالفت کی۔ اگر ان مخالفین کے کارناموں سے ہنسی کا عنصر خارج کر دیا جائے تو وہ ایسے ہو جائیں گے جو یا پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔

عرب میں تاریخ نویسی کا دستور نہ تھا۔ صحابہؓ نے کوئی تاریخ نہیں لکھی۔ جب تاریخ نویسی کی طرف توجہ شروع ہوئی تو سیرت نگاروں نے بڑی کاوشوں کے ساتھ حالات زندگی معلوم کیے۔ تفصیلی مستند حالات نبوت کے بعد کے دور کے میسر آئے۔ انہیں تفصیل سے لکھا۔ قبل نبوت کے واقعات کم معلوم ہو سکے۔ لہذا جو معلوم ہو سکے وہی تحریر کیے گئے۔ حضور ﷺ کا تعلق معشر الانبیاء سے ہے۔ اور انبیاء میں سے کسی کے قبل نبوت کے تفصیلی واقعات نہیں پائے جاتے۔ وہ صفحات تاریخ پر نبوت کے بعد آتے ہیں۔ یہی شان رسول اللہ ﷺ کی بھی ہے۔

معراج

حضور ﷺ کی نبوت کو تسلیم کرنے سے گریز [کی مغربی روش] انے بے شمار پیچیدگیاں پیدا کی ہیں۔ عالم بالا سے تعلق، وحی کی کیفیات، روحانی وارداتیں، سب کی سب معرض بحث میں آئی ہیں۔ ہر شے تشکک کی نظر سے دیکھی گئی۔ وحی کو لاشعوری واہمہ، وحی کی کیفیات کو صرع، اور روحانی وارداتوں کو مغالطہ کا نام دیا گیا۔ حالانکہ ان تمام حقیقتوں کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے۔ انبیاء ہمیشہ سے مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ عالمی مذاہب کا وجود انکی کامیاب کاوشوں کا مظہر ہے۔ مذاہب عالیہ انسانی تہذیب و تمدن کے سرچشمے ہیں۔ انبیاء ہر مذہب کے عظیم اور اعلیٰ ترین افراد ہوتے ہیں۔ ہر نبی نے یہی اعلان کیا کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان واسطہ ہے۔ انہیں روحانی وسیلے سے عالم بالا سے پیغام پہنچتا ہے۔ جس پر وہ خود عمل پیرا ہوتے ہیں اور دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ آدم سے لے کر حضرت یحییٰ تک ہر نبی کا تعلق وحی سے پایا جاتا ہے۔ وحی کی کیفیات جدا جدا نظر آتی ہیں۔ کوئی خواب دیکھتا ہے، کوئی صرف آواز سنتا ہے، کوئی وحی لانے والے فرشتے کو مرنی حیثیت میں دیکھتا ہے اور اس سے پیغام سنتا ہے اور کوئی راست خدا سے شرف ہمکامی حاصل کرتا ہے۔ ان جداگانہ کیفیات کے باوجود یہ امر مشترک ہے کہ انبیاء علیہ السلام کا ایک غیر عام فہم تعلق عالم بالا سے ہوتا ہے اور یہ تعلق وحی کہلاتا ہے۔ پس انبیاء اور وحی کا تعلق لازم و ملزوم ہے۔ اسی طرح روحانی واردات کا بھی ایک مربوط تسلسل پایا جاتا ہے۔ بارگاہ ایزدی میں باریابی اور حضوری کے متعدد واقعات سے عہد نامہ مذہب مزین ہے۔ حضرت آدم کی جنت میں حضوری، حضرت نوح سے قبل طوفان ہمکامی، حضرت ابراہیمؑ تو گویا ہر لمحہ حضوری سے مشرف تھے۔ نازنمرد ہو یا فرزند کی قربانی، ہجرت کنعان ہو یا حضرت اسمعیلؑ کو جدا کر کے حجاز میں بسانا، قوم لوط کی تباہی ہو یا سدوم و عمورہ کی بربادی، ہر مرحلے پر شرف حضوری حاصل نظر آتا ہے۔

حضرت یعقوبؑ کی معراج: عبد یعقوبی تک ہمیں شرف حضوری اور ہم کلامی کا پتہ تو چلتا ہے لیکن یہ حضوری عالم بالا پر نہیں بلکہ ارض خاکی پر ہی نظر آتی ہے۔ کتاب پیدائش کے مطابق، حضرت یعقوبؑ وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے عالم بالا کا مشاہدہ ایک روحانی واردات کے ذریعے کیا۔

”اور یعقوبؑ پیر سبع سے نکل کر حاران کی طرف چلا۔ اور ایک جگہ پہنچ کر ساری رات وہاں رہا..... اور اسی جگہ سونے کو لیٹ گیا، اور خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک سیڑھی زمین پر کھڑی ہے اور اس کا سرا آسمان تک پہنچا ہوا ہے اور خدا کے فرشتے اس پر سے چڑھتے اترتے ہیں۔ اور خدا اس کے اوپر کھڑا ہوا کہہ رہا ہے کہ میں خداوند تیرے باپ ابرام کا خدا اور ائحق کا خدا ہوں۔“ (پیدائش، باب-۲۸، ۱۰ تا ۱۳)

اس روایہ کو ہم معراج یعقوبی کا نام دے سکتے ہیں۔ اس واقعہ سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ حضرت یعقوبؑ نے صرف فرشتوں کو چڑھتے اترتے دیکھا یا انہوں نے خود بھی اس سیڑھی سے مقامات عالیہ طے کیے۔ تاہم یہ

واقعہ اس اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے کہ یہ عالم بشریت اور عالم افلاک کے درمیان یابی جانے والی اولین معلومہ کڑی ہے۔

حضرت موسیٰ: حضرت موسیٰ کا کوہ طور پر تشریف لے جانا شریف ہم کلامی حاصل کرنا اور جلوہ طور دیکھنا، عالم بیداری میں تھا۔ یہاں معراج ایک اور ارتقائی منزل طے کرتی نظر آتی ہے یعنی عالم رویہ، بیداری میں تبدیل ہوا۔ بلندی نے فاصلے کم کیے، طور کی چوٹی اور افلاک کا فاصلہ کم ہوا ہوا یا نہ ہوا ہو، عبد اور معبود کے درمیانی فاصلے کم ہوئے۔ بشریت حضوری سے فیضیاب ہوئی اور ایک عظیم روحانی واردات وقوع پذیر ہوئی۔

دیگر انبیاء: روحانی وارداتوں کا سلسلہ ہمیں دیگر انبیاء کے واقعات میں بھی ملتا ہے۔ حضرت داؤد کے مزامیر میں حضوری اور معیت واضح طور پر مترشح ہے۔ حضرت سلیمان سے منسوب غزل الغزلات عشق حقیقی، ہجر و وصال، جذب و مستی اور روحانی وارداتوں سے پُر ہیں۔ یسعیاہ نے اپنی واردات ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ،

”میں نے خداوند کو ایک بڑی بلندی پر اونچے تخت پر بیٹھے دیکھا اور اس کے لباس کے دامن سے ہیکل معمور ہو گئی۔ اس کے آس پاس سرافیم کھڑے تھے۔ جن میں سے ہر ایک کے چھ بازو تھے۔ اور ہر ایک دو سے اپنا منہ ڈھانپے تھا، اور دو سے پاؤں، اور دو سے اڑتا تھا۔ اور ایک نے دوسرے کو پکارا اور کہا قَدَّوَس، قَدَّوَس، قَدَّوَس رب الافواج ہے۔ ساری زمین اس کے جلال سے معمور ہے۔ اور پکارنے والے کی آواز کے زور سے آستانوں کی بنیادیں ہل گئیں، اور مکان دھویں سے بھر گیا۔ تب میں بول اٹھا کہ مجھ پر افسوس میں تو برباد ہوا۔ کیونکہ میرے ہونٹ ناپاک ہیں اور نجس لب لوگوں میں بیتا ہوں۔ کیونکہ میری آنکھوں نے بادشاہ رب الافواج کو دیکھا۔ اس وقت سرافیم میں سے ایک، سلگا ہوا کیونکہ جو اس نے دست پناہ سے مدح پر سے اٹھالیا، اپنے ہاتھ میں لے کر اڑتا ہوا میرے پاس آیا اور اس سے میرے منہ کو چھوا اور کہا دیکھ اس نے تیرے لبوں کو چھوا، پس تیری بدکرداری دور ہوئی اور تیرے گناہ کا کفارہ ہو گیا۔ اس وقت میں نے خداوند کی آواز سنی جس نے فرمایا میں کس کو بھیجوں؟ اور ہماری طرف سے کون جائے گا؟ تب میں نے عرض کی میں حاضر ہوں، مجھے بھیج۔ اور اس نے فرمایا جان لوگوں سے کہہ.....“ (عہد نامہ قدیم، یسعیاہ، باب ۶، ۱-۹)

یسعیاہ کی یہ روحانی واردات بھی باعتبار مکان زمینی تھی لیکن سوائے اختلاف مکانی، بقیہ ہر اعتبار سے نہ صرف یہ واردات بلکہ متذکرہ بالا تمام وارداتیں معراج کی سب صفات کی حامل ہیں۔ ایلیاہ یا ایلجاہ کی واردات کی تفصیلات نہیں ملتیں، لیکن وہاں اختلاف مکانی بھی بلا شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

”اور وہ آگے چلتے اور باتیں کرتے جاتے تھے کہ دیکھو ایک آتش رتھ اور آتش گھوڑوں نے ان دونوں کو جدا کر دیا اور ایلیاہ بگو لے میں آسمان پر چلا گیا۔ الشع یہ دیکھ کر چلا آیا اے میرے باپ! میرے باپ! اسرائیل کے رتھ اور اس کے سوار.....“ (سلاطین ۲، باب ۲، ۱۲-۱۱)

ایلیاہ کی واردات میں اگر کسی بات کی کسر نظر آتی ہے تو وہ انکی واپسی ہے ورنہ معراج کی جو کیفیت حضرت یعقوب سے شروع ہوئی تھی اس میں مسلسل ارتقائی انداز نظر آتا ہے۔

حضرت عیسیٰ: حضرت عیسیٰ حضور ﷺ کے پیشرو انبیاء میں آخری نبی ہیں۔ ان کے دور میں کیفیت معراج مزید واضح ہوئی۔ قرآن کے بیان کے مطابق، ان کے گرد و پیش افراد کو دراصل ان کی مصلوبیت کا دھوکہ ہوا، ورنہ حقیقتاً انہیں آسمان پر اٹھایا گیا۔ یہ عالم بالا پر جانے کی دوسری مثال ہے۔ اناجیل کے مطابق انہیں مصلوبیت کے بعد دوبارہ حیات ملی اور پھر وہ اپنے جسد مادی کے ساتھ آسمان پر تشریف لے گئے۔ مصلوبیت کے وقوع سے یا عدم وقوع سے قطع نظر، ہر دو صحف سماوی اس امر پر متفق ہیں کہ وہ افلاک پر تشریف لے گئے۔

انجیل کی روایت کے مطابق شیطان نے آزمائش کرنے اور ترغیب و تحریص کے ذریعے حضرت عیسیٰ کو جادو حق سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اور اس غرض سے انہیں زمین سے اتنی بلندی پر لے گیا جہاں سے دنیا کی ساری سلطنتیں بل بھر میں دکھائی گئیں۔ (انجیل لوقا، باب ۴، درس ۱۳ تا ۱۴)

فضا میں بلند ہونے کے عام واقعات: جسم انسانی کے بلا کسی بیرونی سہارے کے ہوا میں بلند ہونے کے قصے دنیا کے ہر مذہب میں بیان کیے جاتے ہیں۔ ہندو، کرسچین اور چینی مذاہب میں اس کا ذکر خاص طور پر پایا جاتا ہے۔ جہاں مادہ پرست اس کے وقوع سے انکار کرتے ہیں وہیں اس کے اثبات کی بے شمار شہادتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اہم ذاتی طور پر اس کی تائید یا تردید کیے بغیر، کچھ حوالے درج کر رہے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے مضمون 'Levitation' میں تحریر کیا گیا کہ،

”انیسویں صدی میں اس قسم کے واقعات کی اطلاع ایک عینی شاہد نے دی، جس نے ڈینیئل ڈگلس ہومز کو فضا میں تین مرتبہ بلند ہوتے دیکھا۔ اس واقعے کے بارے میں سر ولیم کریمس نے لکھا کہ میں نے تین مختلف مواقع پر اسے کمرے کے فرش سے پوری طرح بلند ہوتے دیکھا۔ ہر موقع پر مجھے اس وقوع کو پوری طرح دیکھنے کا موقع ملا۔ اسی قسم کی رپورٹ ارل آف ڈنراول (Earl of Dunraven) نے دو گواہوں کے ساتھ دی کہ انہوں نے ہومز کو ایک ایسی کھڑکی سے جو ستر فیٹ کی بلندی پر تھی، ایک دوسری کھڑکی میں جو سات فیٹ دور تھی منتقل ہوتے دیکھا۔“

(Encyclopedia Britanica; article 'Levitation', Vol. 13, p.1003)

ان تحریری شہادتوں کی بنیاد پر، معراج نبوی پر شک و شبہ، حرف گیری یا تمسخر محض لغویت ہی کہلا سکتی ہے۔ ایک عام آدمی کے ہوا میں بلند ہونے کا ناقابل یقین واقعہ صرف اس لیے انسائیکلو پیڈیا میں جگہ پاسکتا ہے کہ اس کے راوی اور شاہد سب کے سب مغربی تھے۔ انبیاء بنی اسرائیل کی وارداتوں کو صرف اس لیے تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ وہ انجیل مقدس میں تحریر ہیں۔ لیکن تمام انبیاء کے سردار کی اس قسم کی واردات اس لیے زیر بحث آتی ہے کہ ان کا تعلق مغربی عقیدے سے نہیں۔ کیا خوب منطق ہے کہ اہل یسوع مسیح کو بلندیوں پر لے جاسکتا ہے، لیکن رب العالمین اپنے ایک رسول کو (نعوذ باللہ) معراج سے سرفراز نہیں کر سکتا۔ یہی واقعہ اسلامی لٹریچر میں ہو تو تیوری پر بل پڑنے لگیں، لیکن اگر اس کا چرچہ دانستے کا قلم اتارے تو عہد وسطی کا ادبی شہ پارہ کہلائے۔ اس میں کلام نہیں کہ معراج کا تجزیہ سائنسی انداز میں نہیں کیا جاسکتا اور آج کا انسان سائنس کو معراج صداقت تصور کرتا ہے۔ اور ہر وہ قدر جو سائنس کی کسوٹی پر نہ پرکھی جاسکے، اہمیت اور افادیت

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

سے محروم تصور کر لی جاتی ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ سائنس کا تعلق ذہن انسانی سے ہے۔ انسان، اسکا ذہن اور اسکا علم، کائنات کی وسعت کے مقابلے میں صفر کے برابر ہے۔ ہم جسے علم و سائنس کہتے ہیں، وہ ایک عظیم نامعلوم کائنات کے حقیر سے معلومہ حصے کا ہی احاطہ کرتی ہے۔ معلوم اور نامعلوم حقائق میں کوئی تناسب بھی قائم نہیں کیا جاسکتا۔ سائنس اس حقیر معلومہ حصے کے بھی کل سے نہیں بلکہ جزو سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ محض مادے سے بحث کرتی ہے۔ غیر مادی معاملات مثلاً جذبات، احساسات، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور عالم روحانیت وغیرہ سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ ابھی ان پر تحقیقات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جب سائنس ان دائروں سے بذات خود لاعلم ہے تو محض اپنی لاعلمی کی بنیاد پر وہ اس معاملے میں کسی فیصلے کو صادر کرنے کی ہرگز مجاز نہیں ہو سکتی۔

غرائق

ایک موقع پر داعی اسلام ﷺ صحن کعبہ میں سورۃ النجم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ جب ان آیات پر پہنچے جن میں لات و عزری اور منات کی الوہیت کی تردید ہے، تو کسی نے ہانک لگائی ”تلك الغرائق العلیٰ۔ والشفاعت لرحمٰی۔“ (یہ تو نہایت اعلیٰ دیویاں ہیں اور انکی شفاعت مقبول ہے)۔ کفار قریش نے خیال کیا کہ داعی اسلام ﷺ نے ان دیویوں کی الوہیت تسلیم کر لی۔ وہ بھی داعی اسلام ﷺ کے ساتھ جدہ ریز ہو گئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ خبر درودور تک پھیل گئی۔ حضور کو جب اس غلط فہمی کی اطلاع ہوئی تو فرمایا، ان دیویوں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ گڑھی ہوئی مورتیاں ہیں جنہیں قریش کے بڑوں نے غلطی سے مقدس بنا رکھا ہے۔

یہ سادہ سی غلط فہمی خاصی پیچیدگی کی حامل تھی۔ اس کی توجیہات مختلف انداز میں کی گئی ہوگی۔ لوگوں نے قریش کے سرداروں کو حضور کے پیچھے جدہ ریز دیکھا تو سمجھا ہوگا کہ قریشیوں نے دین اسلام قبول کر لیا۔ قریش نے اس کی تردید کی ہوگی کہ نہیں ہم نے نہیں بلکہ داعی اسلام ﷺ نے ہماری دیویوں کو تسلیم کر لیا۔ اب وہ پچھلی تبلیغ سے باز آ گئے ہیں اور دین قدیمی کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ہر رُوہ اپنی فکر کے مطابق اس واقعے کی توجیہ کر رہا ہوگا۔ جو لوگ اس کشمکش کو ختم کرنے کے حق میں ہوں گے انہوں نے اسے مصالحتی اقدام سے تعبیر کیا ہوگا۔ کہتے ہیں کہ یہ اطلاع جوش بھی پہنچی۔ وہاں مقیم مہاجرین نے اطلاعات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بالآخر قریش کو بھی حضور ﷺ نے مسلمان کر لیا۔ چنانچہ کچھ حضرات نے زحمت سفر باندھا اور مکہ واپس آ گئے۔

کلائن اور غرائق: جب یہی واقعہ مغرب کے علم میں آیا تو انہیں ڈرامہ ترتیب دینے کا من بھاتا مواد میسر آیا۔ کسی نے اسے وقتی جذبہٴ مفاہمت سے معنون کیا۔ دوسرے نے اسے اکتاہٹ سے تعبیر کیا۔ تیسرے نے اس کا نام سپردگی رکھا۔ کسی نے موقع پرستی کہا۔ کوئی اس واقعے سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام نہیں بلکہ داعی اسلام ﷺ کی تصنیف ہے کہ جب چاہا خدا کے نام سے ایک آیت بڑھا دی اور

جب چاہا اسے منسوخ قرار دے دیا۔ چنانچہ ریورینڈ کلائن نے ولیم میور اور نوئل کی کے حوالے سے لکھا،

"One very remarkable instance of the suppression of a verse, which Mohammed used to read for some time as part of the Quran is that of the verse ' Those idols (of the Meccan idolators) are the noble beings and verily their intercession may be looked for.'"

(Klein F. A. Rev.: The Religion of Islam , p. 19)

[کسی آیت کی تفسیح کا ایک نہایت اہم واقعہ، 'وہ دیویاں معزز ہیں اور انکی شفاعت مقبول ہے' والی آیت کی تفسیح ہے جسے کچھ عرصے تک محمد (ﷺ) قرآن کے جزو کے طور پر تلاوت کرتے رہے ہیں۔]

کلائن نے اس واقعے کو بت پرستی سے عارضی مصالحت کا نام دیا۔ (حوالہ بالا صفحہ ۱۶)۔

منظمری واٹ اور غرائف: گزشتہ صدیوں کی تحریروں کے اثرات اس صدی کے معقول اہل قلم میں بھی پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ منظمری واٹ نے اس واقعے کی صحت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ حضور نے ان دیویوں کی عبادت کی اجازت دی۔ (عیاذ باللہ)۔ اس نے لکھا،

"In this connection we must pay attention to the story of the satanic verse. The story must be true in essentials since no muslim would have dared to invent it about Mohammed and indeed confirmation of it is in Qur'an. The story is that ----- perhaps in about 615 or seven years before Hijra he received a revelation that 'These are the high-soaring ones, whose intercession is to be hoped for'. Mohammed at once announced this revelation and the permission for prayers to these dieties lead all the men in Kaba to join Mohammed in his worship. Later however Mohammed realized that these verses could not be correct and the true continuation of the passage was revealed to him."

(Montgomery Watt; What is Islam, p. 42)

[اس سلسلے میں ہمیں شیطانی آیت کی داستان کو مد نظر رکھنا چاہیے۔ اس قصہ کو بنیادی طور پر درست ہونا چاہیے کیونکہ کوئی بھی مسلمان اسے محمد (ﷺ) کے بارے میں گھڑنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا، اور بلاشبہ اس کی تصدیق قرآن میں موجود ہے۔ قصہ یہ ہے کہ غالباً ۱۱ھ یعنی ہجرت سے سات سال پہلے ان کے پاس وحی آئی کہ یہ بڑی پہنچ والیاں ہیں اور ان سے شفاعت کی امید ہے۔ محمد (ﷺ) نے فوراً اس وحی کو لوگوں تک پہنچا دیا اور ان کی عبادت کی اجازت نے مکہ کے باسیوں کو محمد (ﷺ) کے ساتھ عبادت میں شریک ہونے پر مائل کر دیا۔ بعد میں بہر حال محمد (ﷺ) کو یہ احساس ہوا کہ یہ آیات درست نہیں ہو سکتیں اور پھر ان پر آیتیں صحیح تسلسل میں نازل ہوئیں۔"

واٹ نے اس واقعے سے یہ منطقی نتیجہ برآمد کیا کہ کچھ عرصہ تک داعی اسلام (ﷺ) اور ان کے ہمراہی ایک خدا کے ساتھ دوسری دیویوں کی عبادت میں کوئی مضائقہ تصور نہ کرتے تھے۔ (حوالہ بالا)

واٹ نے اس واقعے کا ایک بار پھر تذکرہ کر کے اسے مصالحت کی کوشش قرار دیا اور اسی سانس میں اپنے دعوے کی تردید بھی کی۔ دعویٰ مخالفین کے لیے اور تردید موافقین کے لیے ایک تیر سے دو شمار کرنے کی اچھی کوشش ہے۔ تحریر کرتے ہیں کہ،

"Mohammed was attempting to come to some compromise with the leading Meccans. His realization to falsehood of the intruded words was ipso facto a realization that compromise was impossible" (Ibid, p.78)

[محمد (ﷺ) مکے کے سرکردہ لوگوں کے ساتھ کسی مصالحت کی کوششیں کر رہے تھے۔ ان کا مدخلہ الفاظ کی غلطی کا احساس دراصل اس بات کا احساس تھا کہ مصالحت ناممکن تھی۔]

گریو نے باؤم اور غرائبق: گریو نے باؤم نے واقعہ غرائبق کے بارے میں تحریر کیا،

"It is said that first he had recognized as the daughters of Allah, the three great goddesses: Al-Lat, who was honoured in Taif, Al-Uzza who was worshipped in Nakhla near Mecca, and Manat whose sanctuary lay in Qudaid between Mecca and Medina. This stand he now revoked and made a sharp distinction between the faithful and those who associated Allah with other gods. (G.E. von Grunebaum, Classical Islam, p. 31)

[کہا جاتا ہے کہ انہوں (محمد ﷺ) نے تین عظیم دیویوں کو اللہ کی بیٹیاں مان لیا تھا۔ یہ لات (جسکی تعظیم طائف میں کی جاتی تھی)، عزیٰ (جسکی عبادت مکے کے قریب واقع بکلاہ میں کی جاتی تھی) اور منات (جسکا مندر قدید میں تھا جو مکے اور مدینہ کے درمیان واقع ہے)، تھیں۔ اب وہ اس موقف سے پھر گئے اور انہوں نے مومنین کے اور ان لوگوں کے درمیان، جو اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے تھے، واضح امتیاز قائم کیا۔]

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام: شارٹر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں واقعہ غرائبق کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے کفر کی جانب مراجعت کی خواہش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حیات: "یہ کے ابتدائی واقعات بیان کرنے کے بعد اس امر پر بحث کی گئی کہ حضور ﷺ کے خیالات جن میں بیرونی ذات نمایاں ہیں کس طرح ان تک پہنچے۔ پھر متعدد الزامات کے بعد تحریر کیا گیا کہ،

"ابتدائی اعتقادات کی جھلک اس طرح بھی نظر آتی ہے کہ عربوں کی طرح انہیں بھی جن و شیطان پر عقیدہ تھا۔ مکہ اپنے حرم کے ساتھ ان کے نزدیک بھی مقدس تھا۔ جس کے تقدس اور رسوم کو انہوں نے اپنے مذہب میں باقی رکھا۔ پھر ایک مرتبہ کفر کی طرف لوٹ جانے کی خواہش نے زور کیا جس پر جلد ہی قابو پا لیا۔"

(Shorter Encyclopedia of Islam; edited by H. A. R. Gibbs, p.391)

لین پول: اسٹینے لین پول نے واقعہ غرانیق کو سیرت رسول عربی ﷺ کے ہمال کو تاباں کرنے میں استعمال کیا۔ اس نے لکھا،

”سارا مجمع اس مصالحت سے خوش ہو کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہو گیا۔ سارے شہر نے اس مشترک مذہب کو قبول کر لیا لیکن صحرا کا یہ رُویا دیکھنے والا، ایسا فرد نہ تھا کہ کسی جھوٹی بات پر توقف کرتا۔ مکے کا سارا شہر بھی اسکی نذر کر دیا جاتا تو وہ اپنی اندرونی صداقت کو چھٹاتے رہنے پر راضی نہ ہوتا۔ اس نے برسہا عام اقرار کیا کہ اس سے لغزش ہو گئی تھی۔ اسے شیطان نے ورغلا یا تھا۔ اس نے کھلم کھلا اپنے الفاظ واپس لیے اور کہا کہ جہاں تک ان صورتوں کا تعلق ہے وہ محض نام ہیں جنہیں انکے آباء و اجداد نے وضع کر لیا ہے۔“

(Stanley Lane-poole; Introduction to selection from Quran, p.XLIX)

لین پول کے مندرجہ بالا تبصرے سے اگر توصیفی جملے حذف کر دیے جائیں تو گویا وہ بھی یہ باور کرتا ہے کہ سورۃ النجم میں غلطی سے شیطانی کلمات داخل کر دیے گئے تھے جو بعد میں حذف کر دیے گئے۔ اس کے اس بیان میں اور دیگر معاندین کے بیان میں فرق نہیں رہ جاتا۔ مصالحت، اشتراک کفر، پچھتاوا، لغزش، ہر شے کو اس نے خوبصورت الفاظ میں سمیٹ لیا۔

مستشرقین کی تحریروں کی رو سے واقعہ غرانیق کے حسب ذیل نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ عقیدہ توحید اس وقت تک ارتقائی مدارج طے کر رہا تھا۔ اس کے خدوخال ترتیب پا رہے تھے۔ خود (نعوذ باللہ) ذہن نبوی میں یہ عقیدہ خام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ترمیم و تبدیلی کی گنجائش محسوس کرتے تھے۔

۲۔ قریش کے بتوں کو شریک الوہیت اس لیے کرنا چاہتے تھے تاکہ لات و منات و عزرائی کے پرستاروں کی حمایت حاصل ہو سکے اور خائفانہ انداز کا اثر و اقتدار قائم ہو جائے۔

۳۔ مسلمان قریش کے مقابل سے تنگ آچکے تھے۔ قریش کی جانب سے ایک پیشکش ہو چکی تھی کہ اگر قرآن میں ہماری دیویوں کا مناسب ذکر آجائے تو ہم آپ کو اپنی محفل میں مناسب مقام دیں گے۔ اس طرح عرب بد و اچھا تاثر لیں گے۔ لہذا قریش سے مراعات حاصل کرنے کے لیے یہ الفاظ سورۃ النجم میں شامل کر دیے۔ اور جب قریش سے مطلوبہ مراعات نہ ملیں تو ان کو منسوخ کر دیا۔

۴۔ نعوذ باللہ خدا نے بغیر سوچے سمجھے یہ آیت نازل کر دی۔

۵۔ اس واقعے سے استنباط کیا جاتا ہے کہ دنیا سازی کی رہنمائی بہتہ بہتہ تھم گئی۔

یہ تمام مفروضے صرف اس وقت قابل قبول ہو سکتے ہیں جب بنیادی واقعے کی صحت ثابت ہو جائے۔ اگر اس قسم کے واقعے کا امکان ہی نہ ہو تو پھر ان غرضات پر غور و تفتیش کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ محدثین کبار مثلاً تہجدی، قاضی عیاض، علامہ عینی، جاذبہ منزلی، اور علامہ نووی نے اس واقعے کو باطل اور موضوع قرار دیا ہے۔

طبری کی روایت: جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ مکے والے ان کے پیغام سے روگردانی کر رہے ہیں تو ان کی خواہش ہوئی کہ اسلام کو ان (مکے والوں) کے لیے آسان کریں۔ اس موقع پر سورۃ النجم نازل ہوئی۔ اور جب رسول اللہ ﷺ اس آیت پر پہنچے کیا تم نے لات اور عزیٰ اور تیسری منات کو بھی دیکھا ہے، تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ جاری کرا دیے۔ ”تک الغرائق العلیٰ، وان شفاعتھن لتری“۔ یعنی یہ عالی مرتبہ ہنس ہیں اور ان کی شفاعت مقبول ہو سکتی ہے۔ یہ سن کر مکہ والے بہت مسرور ہوئے اور جب رسول اللہ ﷺ نے سجدہ فرمایا تو سب کے سب ان کے ساتھ سجدے میں شریک ہو گئے۔ اس واقعے کی خبر حبشہ کے مسلمانوں تک بھی پہنچی۔ تب جبریل حضور ﷺ کی خدمت میں تشریف لائے اور ان کی غلطی واضح کی اور یہ آیت منسوخ ہو کر اس کی جگہ بایسویں آیت نازل ہوئی۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكُمُ اللَّهُ بَيْنَهُ ۖ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝

غور طلب پہلو: یہ واقعہ کب ہوا؟ تاریخ کا تعین نہیں۔ تاہم راویوں نے اس واقعے سے مہاجرین حبشہ کی واپسی منسوب کی ہے۔ مہاجرین حبشہ نے ۶؎ نبوی مطابق ۶۱۵ء میں ہجرت کی تھی۔ قریش کی سفارت جب حبشہ سے مہاجرین کی واپسی میں ناکام رہی تو قریش نے ۷؎ نبوی میں بالاتفاق یہ طے کیا کہ حضور کو اعلانہ (نمود بائد) قتل کر دیا جائے۔ (خصائص الکبری السیوطی بحوالہ بیہقی والوفیم۔ ملاحظہ ہو سیرت رسول عربی از نور بخش توکلی، صفحہ ۵۳، مطبوعہ تاج کمپنی لاہور)۔ ان کی حفاظت کی غرض سے بنو ہاشم شعب ابی طالب میں پناہ گزین ہوئے۔ جس کے بعد قریش نے اس وقت تک کے لیے بنی ہاشم سے ترک موالات کا اعلان کیا جب تک وہ تک آکر حضور کو قتل کے لیے قریش کے حوالے نہ کر دیں۔ (صحیح بخاری باب نزول النبی ﷺ)۔ لہذا ۹؎ نبوی تک، یعنی یزیکاٹ کے اختتام تک، یہ بات قرین قیاس نہیں ہے کہ حضور نے محن کعبہ میں قرأت بالجہر فرمائی ہو۔ پس یہ وقوعہ از روئے روایت ﷺ نبوی یا اس کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔

سورۃ النجم کب نازل ہوئی؟ - ولیم میر اور نوں دہی نے اس کا نزول مکہ دور کے چوتھے حصے کے اواخر میں قیاس کیا۔ (Muir, The Quran, pp. 43-47; Noldeke, Dictionary of Islam, p. 45)

اعلامہ عنایت اللہ مشرقی نے تکرملہ، جلد اول، صفحہ ۶ پر نولہ سبکی کے حوالہ سے سورۃ النجم کی ترتیب نزولی ۲۸ ویں اور وقت نزول یکم سنہ نبوی سے چار سنہ نبوی کے درمیان بیان کیا ہے۔ بشرطیکہ علامہ قمر یعنی صاحب ا۔ ان کے نزدیک یہ دور ۱۶ نبوی سے ۱۰ نبوی تک کا ہے۔ علمائے اذہر کے مطابق یہ سورۃ ترتیب نزولی کے اعتبار سے تین سو [۲۳] ہے۔ (القرآن، مکتبۃ الجمهوریۃ العربیۃ، ۱۹۷۲)۔ جبکہ سورۃ مریم چوالیسویں [۴۴] ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دربار حبشہ میں حضرت جعفر بن ابی طالب نے سورۃ مریم کی آیات کی تلاوت فرمائی تھی۔ لہذا یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہجرت حبشہ تک چوالیس سورتیں نازل ہو چکی تھیں۔ اور تین سو سورۃ النجم ہجرت حبشہ سے کئی برس پہلے اتر چکی تھی۔ چھ سال میں چوالیس سورتوں کا اوسط سات سورتیں سالانہ بنتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سورۃ النجم نبوت کے تیسرے یا چوتھے سال اتری ہوگی۔ اب یہ بات قرین قیاس نہیں کہ وہ سورۃ جو تیسرے یا چوتھے سال نازل ہوئی ہو، دسویں سال تک اسکی تلاوت نہ کی گئی ہو، یا اس میں دسویں سال ترمیم کی ضرورت محسوس کی گئی ہو۔ قرآن اس لیے اترتا تھا کہ اسے لوگوں کو سنایا جائے، لہذا حضور ﷺ نے اس سورۃ کی تلاوت اس کے نزول کے بعد بلا تاخیر کی ہوگی۔ اس اعتبار سے اس کی تلاوت ۳۶ نبوی میں ہی قرین قیاس ہے۔ یہی وہ دور ہے جب آپ نے اعلانیہ تبلیغ تو حید فرمائی۔ اور تو حید کے معنی ہی بت پرستی اور شرک سے اجتناب کے ہیں۔ اسلام کی ابتدا ہی کلمہ تو حید سے ہوتی ہے۔ اس کلمہ کا جزو اول ہی ”لا الہ“ ہے۔ جس کا مفہوم اور مقصود ہی بتوں اور زوات خلق غیر اللہ کی نفی ہے۔ اس تزیہہ کے بعد ذات اللہ کا اقرار ہے۔ لہذا تبلیغ کی ابتدا ہی غیر اللہ کی الوہیت کے انکار سے ہوتی ہے۔

یہی وجہ تھی کہ تبلیغ کی ابتدا میں ہی رؤسائے قریش نے ابوطالب سے فرمائش کی کہ حضور ﷺ کو منع کریں کہ ان کے بتوں کو براندہ کہیں۔ اسی موقع پر ابوطالب نے کمزور پرزہ حضور ﷺ سے کہا کہ ایسے کام کی مجھے تکلیف نہ دو جس کی مجھ میں طاقت نہیں۔ جس پر حضور ﷺ نے یہ تصویف فرمایا کہ اب ان کے چچا بھی ان کی مدد نہیں کر سکیں گے اور کلمہ بدیدہ ہو کر فرمایا،

”اے میرے چچا۔ اگر یہ لوگ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی لا کر رکھ دیں، تب بھی میں اس کام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہاں تک کہ اللہ اس کام کو پورا کر دے یا میں خود اس کوشش میں ہلاک ہو جاؤں۔“

بلاشبہ یہ واقعہ ابتدائے نبوت کا ہے اور اس کے بعد ہی ابوطالب نے داعی اسلام ﷺ کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس واقعے کے بعد بھی متعدد بار قریش نے تحریص و ترغیب، اور بعدہ ترہیب کے ذریعے تو حید سے باز رکھنے کی کوشش کی، جس میں انہیں قطعاً ناکامی ہوئی۔

حضور ﷺ کے انداز فکر میں اس قدر واضح تضاد کا امکان ہی نہیں۔ تو حید کلمہ اول ہے۔ پوری تحریک اسلام اسی مرکز پر گردش کرتی ہے۔ ایک عام مسلمان بھی کبھی اس نکتے سے منحرف نہیں ہوتا۔ یہ تصویف کرنا کہ عظیم ترین مفکر اس عقیدے سے متزلزل ہو سکتا ہے، مجموعی فکر انسانی کی توہین ہے۔ حیات طیبہ اس امر پر شاہد ہے کہ اصولوں پر ہر مصلحت کو قربان کیا گیا ہے۔ کبھی بھی مصلحت کسی اصول کو تبدیل نہیں کیا گیا۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی از دو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اگر واقعہ غرائیقِ حیرتِ حبشہ سے پیشتر نہیں ہوا تو پھر کبھی ظہور پذیر نہیں ہوا۔ ۱۰ نبوی تک طوفان اپنی انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ شرک و وحید میں دس سال رسہ کشی ہو چکی تھی۔ لوگ اس عقیدے پر اس قدر مستحکم ہو چکے تھے کہ وہ اس کے خلاف کہنا تو کجا سوچنے کے بھی روادار نہیں تھے۔ مغرب کی یہ ہرزہ سرائی کہ خدائے واحد کے ساتھ دیویوں کی عبادت میں مضائقہ نہ سمجھا جاتا تھا، اگر کوئی مان بھی لے تو بلال کی صدائے احد، یا سر کے اجزائے بدن کا انتشار، ام عمار کی نیزے سے شہادت، خود داعی اسلام ﷺ اور ان کے قبیلے پر مصائب، یہ سب کیا تھے اور کیوں تھے؟ قریش تو خود بھی اللہ اور دیگر بتوں کو مانتے تھے۔ اگر اسلام میں بھی یہی کچھ تھا تو وجہ مخالفت کیا تھی؟ لوگوں پر مئے کی زمین کیوں تنگ ہو رہی تھی۔ موعدین اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کر حبشہ کیوں جا رہے تھے۔

سورۃ الحج کی آیات: غرائیق کے موبیدین سورۃ الحج کا حوالہ دیتے ہیں کہ اس واقعے کی تائید میں قرآنی آیات موجود ہیں۔ پھر کیسے انکار؟ شاید یہی آیت تھی جس کے باعث موبیدین کو جرأت انکار نہ ہو سکی۔ لیکن یہ تو خیال فرمائیے کہ یہ سورۃ بذات خود کب نازل ہوئی؟ کیا اس واقعے کے فوراً بعد؟ جی نہیں! یہ سورۃ مدنی ہے۔ ترتیب نزولی کے اعتبار سے یہ ایک سو ساتویں [۱۰۷] سورۃ ہے۔ مدینہ میں کل اٹھائیس سو تیس سو تیس نازل ہوئیں۔ اس سورۃ کا نزول طویل سورتوں کے بعد ہوا، جب نصف سے زیادہ مدنی دور گزر چکا تھا۔

اگر واقعہ غرائیق کسی شکل میں ہوا بھی تھا تو اس کو کم از کم بارہ سال گزر چکے تھے۔ اگر یہ آیات تائید میں نازل ہوئی تھیں تو کیا اس واقعہ کی تائید کی ضرورت بارہ سال کے بعد محسوس ہوئی تھی۔ اگر یہ لغزش تھی تو لغزش کے اثرات کو دور کرنے کے لیے اس سورۃ کی حلقہ آیات اسی دور میں نازل ہونی چاہیے تھیں۔ قرآن کی ایسی تمام آیات جو کسی واقعے کے تعلق سے نازل ہوئیں، ہمیشہ موقع پر ہی نازل ہوئیں۔ ذرا سورۃ الحج کی آیات پر خالی الذہن ہو کر غور فرمائیے۔ اس میں یہ کہاں کہا گیا ہے کہ شیطان انبیاء کی زبان سے کلماتِ خبیثہ ادا کر داتا ہے۔ اس میں تو ایک کائناتی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ،

”جب رسول اور نبی پیغامِ حق لوگوں تک پہنچاتے ہیں تو شیطان اس کام میں دوسوے اور شبہات پیدا کرتا ہے۔ اپنی جانب سے کچھ آمیزش کرتا ہے۔ اور پھر اللہ تعالیٰ اپنے پیغام کو ان شیطانی شبہات، دوسوے اور آمیزشوں سے منزہ کرتے ہیں کہ وہ علیم و حکیم ہیں۔“

یہ آثارِ مقدسہ تو تاریخِ نبوت اور اصولِ ابلاغِ حق بیان کر رہی ہیں کہ آدم کے بعد ان کی تعلیمات، نوح کے بعد ان کی تعلیمات اور اسی طرح دیگر انبیاء کی تعلیمات کو شیطان نے مسخ کیا۔ اور جب بھی تعلیمِ حق مسخ ہوئی اللہ تعالیٰ نے محکم تر آیات نازل فرمائیں۔ اور اپنی تعلیمات کو شیطانی آمیزش سے پاک کیا۔ یہ تو اس امر کی اطلاع ہے کہ آخری رسول ﷺ کی تعلیمات کو بھی شیطان اسی طرح مسخ کرنے کی کوشش کرے گا۔ جسے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے ذریعے سے محفوظ رکھیں گے۔ ان آیات کو واقعہ غرائیق سے متعلق کرنا اگر دیدہ دلیری نہیں ہے تو بھی غلط فہمی ضرور ہے۔

سورۃ النجم: ”قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہونے لگے۔ یہ تمہارے صاحب نہ تو گمراہ ہیں نہ غلط راستے پر۔ نہ ہی آپ کوئی بات اپنے جی سے کہتے ہیں۔ وہ تو وہی کچھ کہتے ہیں جو ان پر وحی آتی ہے۔ ایک شدید التوئی انہیں تعلیم کرتا ہے جو فطرنازور آور ہے۔ وہ نمودار ہوا اور اس طرح کہ افق کی بلندیوں پر چھلایا ہوا تھا۔ پھر وہ نزدیک ہوا، اور نزدیک۔ یہاں تک کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کم کا فاصلہ رہ گیا۔ اپنے بندے پر جو وحی کرتی تھی، اللہ نے کی۔ قلب نے مشاہدے میں کوتاہی نہ کی۔ تو کیا (اے مخاطبین) ان کے مشاہدے کے بارے میں نزاع کرتے ہو۔ انہوں نے اسے ایک دفعہ اور بھی دیکھا۔ سدرۃ المنتہی کے قریب۔ جس کے پاس جنت المادنی ہے۔ جبکہ مرکز ہونے والے (انوار) سدرۃ پر مرکز ہو رہے تھے۔ نہ تو نگاہ ہٹی اور نہ ہی بڑھی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کے بڑے بڑے عجائبات دیکھے۔ پس کیا تم نے (بھی) لات اور عزرائی اور قیسری منات کے (اسی قسم کے انوار) دیکھے۔ کیا تمہارے لیے (تو) فرزند اور اللہ کے لیے بیٹیاں (ہوں)۔ یہ تو بڑی ہی بڑی ہمتیں تقسیم ہے۔ یہ تو نرے نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء نے (ان دیویوں کو) دے رکھے ہیں۔ یہ لوگ محض ظن اور نفس کی خواہش پر چل رہے ہیں۔ در آنحالیکہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی ہدایت آچکی ہے۔ بھلا کہیں انسان کی تمنا پوری ہو سکتی ہے؟ نہیں۔ بلکہ ہر تمنا اللہ کے اختیار میں ہے۔ خواہ آخرت کی ہو یا دنیا کی۔ اور بہت سے فرشتے آسمانوں میں ہیں لیکن ان کی سفارش کام نہیں آ سکتی۔“

خط کشیدہ آیات قرآنی کی جگہ اگر ہم مینہ عبارت داخل کر کے دیکھیں تو مسخ عمد کی بدترین شکل پیدا ہوگی۔ سیاق و سباق سے جدا تحمل میں ناٹ کا پیوند نظر آئے گا۔ نہ وہ لفظی و صوتی رعنائی، نہ وہ اعجاز بیان، نہ ہی کسی قسم کی معنوی مناسبت۔ کہاں احسن الکلام اور کہاں بے ربط ہذیان۔ یہ تصور کرنا کہ خط کشیدہ آیات کی جگہ ”ملک الغرائق السنی۔ وان شفا کتھن لتری“ کے الفاظ تھے، عقل و خرد کا دیوا یہ بن ہوگا۔

ذرا سورۃ کی ابتدا پر غور کیجیے۔ صاحب کے مقامات عالیہ کا تذکرہ کر کے ان کی عظمت کا اظہار کیا گیا۔ عالم بالا سے انکے تعلق کا ذکر کیا گیا۔ ان کے مشاہدات کی تصدیق کی گئی۔ اس عظیم تعارف کے بعد کلام ہوا کہ یہ جس بات کی دعوت دیتے ہیں، جس عالم کی خبر دیتے ہیں، جس ہستی کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے ہیں اس سے تو انہیں ذاتی تعلق ہے۔ اس کے عجائبات کا تو وہ ذاتی مشاہدہ کر چکے ہیں۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ کیا تم نے بھی ایسی کوئی بات ان دیویوں میں دیکھی....

تم نے ان سے شفاعت وابستہ کر رکھی ہے۔ صرف اس لیے کہ تمہارے نزدیک یہ مقدس ہیں۔ تم جانتے ہو کہ آسمان کے فرشتے مستمہ طور پر مقدس ہیں لیکن انہیں بھی شفاعت کا یا را نہیں۔ لات و منات و عزرائی سے جو تمنا تم نے وابستہ کر رکھی ہے، ان کی کیا حقیقت، کہ ساری تمناؤں کی تکمیل صرف قادر مطلق کی بنا پر ہی مختصر ہے۔

کیا یہ سیاق و سباق ان دیویوں کی الوہیت کے اقرار کی کوئی گنجائش چھوڑتا ہے۔ یہاں اگر ذکر صریح نہ بھی ہوتا تو بھی ان کی مذمت کے سوا کسی اور پہلو کی گنجائش نہیں۔ اس سورۃ سے دیویوں کی الوہیت کے اثبات یا لات و منات و عزریٰ کی خدا سے رشتہ داری وابستہ کرنے والوں کی عقل و خرد کے ماتم کے سوا کیا کیا جاسکتا ہے۔
وقوعے کا امکان: اگر ہم اس دور کے حالات پر غور کریں اور اس امر پر نظر رکھیں کہ ایسے وقوعے کا کیا امکان ہو سکتا ہے تو چشم تصور میں واقعات کچھ اس طرح سے ترتیب پائیں گے۔

ترک تعلقات کا دور شروع نہیں ہوا۔ علانیہ تبلیغ شروع ہو چکی ہے۔ خانہ کعبہ حرم ہے۔ اس میں ہر شخص کو عبادت کی آزادی ہے۔ لوگوں نے ابھی تک اسلام کو اپنے لیے حقیقی خطرہ تصور کرنا شروع نہیں کیا ہے۔ داعی اسلام ﷺ کے بارے میں عام لوگوں کی رائے بنی ہوئی ہے۔ لوگ انہیں صادق و امین مانتے ہیں لیکن یہ نیا پیغام ان کے لیے قابل فہم نہیں ہے۔ معاشرے میں بحیثیت مجموعی نبوت کا کوئی تصور نہیں۔ قرآن کے ذریعے انہیں نبوت کے تصور سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ نبی کو کوئی کاہن سمجھ رہا ہے، کوئی شاعر اور کوئی مجنون۔ کسی کا خیال ہے کہ گمراہ ہو گئے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ غلط راستے پر گامزن ہیں۔ کسی نے سمجھا کہ شاید اسی نبوت نے تسلط حاصل کر لیا ہے۔ یہ ساری کیفیات ابتدائی دور نبوت سے تعلق رکھتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی گئیں۔

سورۃ النجم ان تمام لغویات کی تردید کرتی نظر آتی ہے، اور ایک نئی حقیقی کیفیت پیش کرتی ہے کہ تمہارے صاحب نہ گمراہ ہیں نہ غلط راستے پر۔ وہ مہبط وحی ہیں۔ وحی ایک عظیم فرشتہ پہنچاتا ہے۔ اب تک دو بار وہ اس فرشتے کو اس کے ملکوتی جلال میں دیکھ چکے ہیں۔ تم بھی کیسے نادان ہو کہ ان کی باتوں پر جھگڑتے ہو۔ گو کہ وہ ان اسرار کے شاہد ہیں اور تم ناواقف۔

نبوت کے اس تصور سے آگاہ کرنے کے لیے یقیناً یہ سورۃ موقع بہ موقع حرم میں تلاوت کی جاتی تھی۔ قرآن کا اسلوب فصاحت و بلاغت، شوکت و عظمت بیان، اور پھر قرأت نبوی عربوں کا دل اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ کلام کو سجدہ گاہ سمجھنے والا عرب مسرور ہو رہا ہے۔ لیکن یہ کیا؟ اس میں تو بتوں کی نفی کی جارہی ہے۔ کلام کی خوبیوں کے باوجود اگر دیویاں ناراض ہو گئیں تو قسمت پھوٹ جائے گی۔ رزق بند ہو جائے گا۔ شفاعت سے محروم ہو جائیں گے۔ لوگ شور مچاتے ہیں۔ طے پاتا ہے کہ یا تو سنا ہی نہ جائے یا پھر دوران تلاوت اس قدر شور مچایا جائے کہ سنائی نہ پڑے۔ کشش کلام بے چین کرتی ہے۔ معاشرے کی باندی اذن سماعت نہیں دیتی۔ لیکن ایسے بھی ہیں جو چھپ کر غلاف کعبہ میں گھس جاتے ہیں اور روح کو کلام سے تسکین دیتے ہیں۔

پھر ایک دن حضور ﷺ صحن کعبہ میں تشریف لاتے ہیں۔ اپنے معینہ مقام پر کھڑے ہو کر نماز شروع فرماتے ہیں۔ تلاوت بالبحر ہے۔ سورۃ النجم زبان پر جاری ہے۔ لوگوں کا ہجوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ طائف کے رؤساء بھی شریک محفل تھے جنکے علاقے میں لات کا استھان تھا۔ دیگر عرب بد بھی تھے۔ سورۃ النجم سنی ہوئی تھی۔ لات و عزریٰ اور منات کا بھرم کھلنے والا تھا۔ خانہ کعبہ میں اہل طائف کی دیوی کی توہین قریش کی موجودگی میں ہونے والی تھی۔ سیاسی اور تجارتی مفادات۔ زبردستی۔ قریش نے صرف طائف بلکہ تمام عرب کو منہ دکھانے کے

قابل نہ رہ جاتے۔ اہل طائف کی موجودگی میں ان دیویوں کو تخت الوہیت سے اتارا جانے والا تھا۔ کیا کیا جائے؟ کس طرح روکیں؟ اگر صرف ایک آیت نہ پڑھی جائے یا نہ سنی جاسکے تو کام بن سکتا تھا۔ حضور ﷺ کی نماز کے باعث کفار قریش کا طواف تو بند نہ ہوا تھا۔ ان کے شعار پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ لوگ طواف میں مصروف تھے۔ رہ رہ کر آواز بلند ہوتی تھی،

”الْمَلَأْتُ وَالْعَزَىٰ وَمَنُوءَةُ النَّالِثَةِ الْاُخْرَىٰ۔ تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَىٰ۔ وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتَرْتَجَىٰ“۔ (یا قوت کی معجم البلدان میں عَزَىٰ کی تشریح دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ قریش کا شعار تھا کہ طواف کرتے وقت یہ فقرے بلند آواز سے بطور تلبیہ ادا کرتے تھے۔)

کوئی شاطر منصوبہ ساز اٹھا اور غلاف کعبہ میں جا کر چھپ گیا تاکہ آواز دینے والا نظر نہ آسکے۔ (ابن ہشام نے رؤسائے قریش کے بارے میں یہ تحریر کیا ہے کہ، قرآن کی کشش کے سبب، رات کے سائے میں تلاوت قرآن سننے کے لیے غلاف کعبہ میں چھپ کر حضور کے قریب پہنچنے اور گھنٹوں کلام ربانی سماعت کرتے)۔ یا پھر طواف کعبہ کرنا شروع کر دیا اور جب حضور ﷺ اس آیت پر پہنچے جولاٹ وعَزَىٰ و مناعت کی تردید کرتی ہے یعنی ”اَفَرَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّىٰ وَمَنُوءَةَ النَّالِثَةِ الْاُخْرَىٰ“ تو منصوبہ ساز نے آواز میں آواز ملائی اور اسی انداز میں بانگ لگائی ”تِلْكَ الْغَرَانِيقُ الْعُلَىٰ۔ وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتَرْتَجَىٰ“۔ یہ بانگ کوئی نئی بات نہ تھی۔ نہ تو اس سے عبادت میں خلل پڑا نہ اس جانب توجہ گئی۔ عام سادستور تھا لیکن اس سے قریش کا منشا پورا ہو گیا۔ ان کے نزدیک معاملہ بحسن و خوبی سلجھ گیا۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ سب کے سب سجدہ ریز ہو گئے۔ معاملہ اتنا سنگین نہ ہوتا تو اتنی سی بات پر سجدہ ریز نہ ہوتے کہ دیویوں کی الوہیت تسلیم کر لی گئی۔ یہ تو انکے نزدیک پہلے ہی مسئلہ تھی۔

جب حضور ﷺ کو پتہ چلا کہ وہ ہانک بے مقصد اور معمولات قریش میں سے تھی بلکہ ایک منصوبہ کی کڑی تھی اور اس سے لوگ اسلام کی بنیادی قدر تو حید کو مجروح کر رہے ہیں تو فخرنا آپ نے اپنی برأت کا اظہار فرمایا۔ اس فعل کو شیطانی، اس کے فاعل کو شیطان اور اس کلمے کو شیطانی کلمہ قرار دیا۔

طبری نے عروہ بن زبیر کے ایک خط کا حوالہ دیا ہے جو انہوں نے اموی خلیفہ عبد الملک بن مروان (۶۵ھ تا ۸۶ھ) کے نام لکھا۔ اس میں انہوں نے تحریر کیا کہ طائف کے رؤساء جو اس موقع پر مکہ میں موجود تھے حضور ﷺ کی تردید سے بے حد برہم ہوئے۔ اس برہمی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تردید میں تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ ثانیاً یہ کہ اس وقت تک طائف والوں کو بھی حضور ﷺ کے عقائد تو حید سے آگاہی نہیں ہوئی تھی۔ یہ بات اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ یہ واقعہ اگر ہوا تو نبوت کے ابتدائی دور میں ہی پیش آیا ہوگا۔ تردید میں تاخیر کے نہ ہونے سے مغرب کے ان تمام الزامات کا خود بخود بطلان ہو جاتا ہے کہ کچھ عرصے داعی اسلام ﷺ نے اس شیطانی کلمے کو سورۃ النجم میں شامل رکھا اور پھر اثرات مابعد کو محسوس کر کے اسے منسوخ کر دیا۔ یا یہ کہ خدا کے ساتھ دیویوں کی شرکت میں مضائقہ نہ سمجھا جاتا تھا یا ان دیویوں کی پرستش کی اجازت تھی۔ ابتدائی دور کے اس واقعے کا جو کسی سازشی ذہن کی پیداوار تھا، کسی طور مہاجرین حبشہ کی واپسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

واقعے کے محرکات: اس پس منظر سے واضح ہوتا ہے کہ اس واقعے سے اگر کسی کے اغراض و مقاصد پورے ہو سکتے تھے تو وہ صرف قریش کے۔ خاتمِ بدین اگر حضور ﷺ نے دانستہ ایسا کیا ہوتا تو اس کے محرکات کیا ہو سکتے تھے؟ وہ کون سے اغراض و مقاصد تھے جو اس سے حاصل کیے جاسکتے تھے؟

۱۔ مفاد: مائی مفاد کے لیے کردار نبوی میں کوئی گنجائش نہیں، دولت کی پیشکش قریش کی طرف سے بار بار ہوئی، جسے ہمیشہ رد کیا گیا۔ زندگی سادگی اور فقر و فاقہ میں بسر ہوئی۔ دولت کے انبار آتے رہے اور چشمِ زدوں میں تقسیم کر دیے گئے۔

سیاسی مفاد کے لحاظ سے، قریش کو جو سیاسی استحکام میسر تھا اس میں وہ اپنے ہم مذہب حلیفوں کو بھی جگہ دینے پر تیار نہ تھے۔ مسلمان قلیل اقلیت تھے۔ انہیں اگر سیاسی مقام میسر بھی آ جاتا تو وہ اس میدان میں قریش سے بازی نہ لے جاسکتے تھے۔ قریش کو بے بس کیے بغیر سیاست میں تبدیلی ممکن نہ تھی۔ پھر حضور ﷺ کی جانب سے مذہبی مصالحت کے عوض بادشاہت بھی ٹھکرائی جا چکی تھی۔

تجارت و معیشت کا کوئی مفاد بھی اس مصالحت سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ مکے کی معیشت تجارت تک محدود تھی۔ اور تجارتی اجارہ داری خود قریش کے ہاتھ میں تھی۔ جس کے آپ خود بھی رکن تھے۔ کسی پر یہ دروازہ بند نہ تھا۔

۲۔ مسلمانوں پر مظالم: مسلمانوں پر مظالم کے سداً باب کو واقعہ کا محرک تصور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن راویوں کے بقول اگر یہ واقعہ ہجرت حبشہ کے بعد کا ہے تو یہ جذبہ بھی محرک باقی نہیں رہ جاتا۔ کیونکہ جب ۳؎ نبوی میں مکے کے (مرد) مہاجرین کی تعداد نوے تھی، تو ۴؎ نبوی کے قریب تو یہ تعداد اس سے کم ہی رہی ہوگی۔ اور ان میں سے تراسی افراد حبشہ ہجرت کر چکے تھے۔ باقی صرف سات افراد رہ گئے تھے، جن میں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ بن حارثہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت سعدؓ بن ابی وقاصؓ جیسے اکابرین شامل تھے۔ ان میں سے ہر فرد کفار کی دسترس سے باہر تھا۔ پس مظالم کا سداً باب بھی اس واقعہ کا سبب نہیں ہو سکتا تھا۔

اور یہ واقعہ اگر قبل ہجرت حبشہ ظہور پذیر ہوا تب بھی مظالم قریش اس واقعے کے محرک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اوّل تین سال خفیہ تحریک کا سلسلہ رہا۔ علانیہ دعوت ۴؎ نبوی میں شروع ہوئی۔ اس کے بعد جب اسلام کسی طور قریش سے نہ تھا تب مظالم کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہر وہ مسلمان جو کسی طاقتور قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، گو کہ قبیلے کی مرضی کے خلاف مسلمان ہوا تھا لیکن اسے اپنے قبیلے کی حفاظت بدستور حاصل تھی۔ قبیلہ خود جو چاہتا تا دہی کارروائی کرتا، لیکن فرد، غیر قبیلے سے بہر حال مامون تھا۔ نیز جب یہ مظالم بڑھنے لگے تو ان کا تذکرہ ہجرت حبشہ کے ذریعے کیا گیا۔ جس کے سبب اصولوں پر سودے بازی کی نوبت کبھی بھی آئی نہیں سکی۔

نفسیاتی اثرات: پس کوئی مصلحت ایسی نظر نہیں آتی جس کے لیے اس قسم کے اقدام کی ضرورت محسوس کی جاتی۔ اب اگر کوئی بات رہ جاتی ہے تو صرف یہ کہ ذہنی انتشار، مایوسی، ناامیدی یا اعصابی دباؤ تھا، اور شہداء کے مقابلے کی سکت نہ رہ گئی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے اس دور کے کارنامے اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر فرد استقامت کا پیکر تھا۔ صرف وہ فرد ایمان ظاہر کرنے کی جرأت کرتا تھا جو معاشرے کی ہر زیادتی کو برداشت کرنے کی ہمت رکھتا تھا۔ عرب کا ماحول ہر قسم کی سختی برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ جسمانی صلاحیت کے ساتھ اگر ذہن بھی سختی برداشت کرنے کو تیار ہو جائے تو پھر کوئی زیادتی اسے جھکا نہیں سکتی۔ کردار نبوی عظیم ترین کردار ہے جس میں ایک لمحے کے لیے ایسا کوئی مقام نظر نہیں آتا جہاں پائے استقلال میں جنبش پیدا ہوئی ہو۔ عزم و استقامت، صبر و برداشت کی جو جو مثالیں آپ ﷺ کی زندگی میں پائی جاتی ہیں۔ کا عشرِ عشر بھی کسی اور انسان کی زندگی میں نہیں ملتا۔ مکی دور کے آخری سنیں اس سے بھی زیادہ مہم آزماتے تھے۔ سفر طائف سنگین ترین تھا کہ اس وقت سوائے ذات باری کے کوئی سہارا نہ رہ گیا تھا۔ اگر ذہنی تکان کا اظہار ہو سکتا تھا تو اسی مقام پر ہو سکتا تھا۔ مدنی دور میں بدر، احد، خندق یا حنین ان میں سے ہر واقعہ عام آدمی کے اوسان خطا کرنے کے لیے کافی ہے۔

حیاتِ طیبہ خدائے وحدہ لا شریک کی وحدانیت تسلیم کرانے اور اسلام کی اشاعت کے لیے وقف تھی۔ کلمہ لا الہ الا اللہ کے ہر دیوی دیوتا اور باطل خدا کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ اور اس حوصلے کے ساتھ بلند کیا گیا تھا کہ عالمی طاغوت کا مقابلہ کیا جائے گا۔ اس عزم کا اظہار بعثت کے فوری بعد ابوطالب کے سامنے کیا گیا۔

”يَا عَمَّ وَاللّٰهُ لَوْ وَضَعُوا الشَّمْسُ فِي يَمِينِي وَالْقَمَرُ فِي يَسَارِي عَلَيَّ اَنْ اَتْرَكَ هَذَا الْاَمْرَ حَتّٰى يَظْهَرَ اللّٰهُ اَوْ اَهْلَكَ فِيْهِ مَا اَتْرَكَتُ“

[اے چچا، اللہ کی قسم، خواہ میرے دائیں (ہاتھ پر) سورج اور بائیں (ہاتھ پر) چاند ہی کیوں نہ رکھ دیا جائے، کہ میں اس کام کو چھوڑ دوں، میں اسے نہیں چھوڑوں گا، جب تک اللہ اسے غالب نہ کر دے یا میں اس (کام) میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔]

جب ابتدا اس عزمِ محکم سے ہوئی اور انتہا اسی عزم کے مطابق ہوئی تو درمیان میں یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ عزم متزلزل ہو گیا۔ وہاں تو منزل مقصود ہی کامیابی یا اس کامیابی کے لیے مرثا تھا۔ جو منفرد نعرہ توحید بلند ہوا تھا وہ مذہب اسلام کا اہم ترین عقیدہ تھا۔ مذہبی عقائد کبھی آسانی سے نہیں بدلے جاسکتے۔ ان کی تبدیلی مذہب میں تفرقہ پیدا کر دیتی ہے۔ لوگ منتشر ہو جاتے ہیں۔ شکوک و شبہات یقین کا شیرازہ بکھیر دیتے ہیں۔ سعی راگناں ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کیفیت دور نبوی میں پیدا نہیں ہوئی تو یقیناً اس قسم کی لغویات محض وضع کردہ ہیں۔ حضور ﷺ کی پاکیزہ تعلیمات سے ایسا شرک و ابست کرنا بذاتِ خود ایک شیطانی فعل ہے۔

سخ کردہ حقائق - مدنی دور

مسلمانوں نے جن حالات میں ہجرت کی تھی ان کے پیش نظر وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کفار و مشرکین انہیں مدینے میں چین سے نہ بیٹھنے دیں گے۔ مدینے والوں پر مکہ و باؤ ڈالیں گے کہ مہاجرین کو اپنے شہر میں بود و باش نہ اختیار کرنے دیں۔ اور اس مقصد کے لیے مدینے پر حملے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ چنانچہ میثاق مدینہ کی متعدد دفعات اس خدشے کی پیش بینی کی تائید کرتی ہیں۔

دفعہ ۱۱ کی رو سے شرکائے معاہدہ میں سے کوئی فرد یا جماعت قریش مکہ کو اپنی پناہ میں نہ لے سکتا تھا۔ اور نہ ہی قریش کے کسی حلیف کی حمایت کر سکتا تھا۔

دفعہ ۱۸ کے مطابق مدینے پر حملے کی صورت میں شرکائے معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آور کے خلاف مدافعت کرنے کا پابند تھا۔ (میثاق مدینہ کی دفعات کے لیے ملاحظہ ہو ”سیاسی وثیقہ جات“ از ذاکر حمید اللہ خان، صفحہ ۱۹، لاہور، ۱۹۶۰ء)

یہ معاہدہ ہجرت کے پہلے سال ہوا۔ اور اس میثاق کے ذریعے مدینے کے دو بڑے اکثریتی قبائل اوس اور خزرج میں قدیم دشمنی مٹا کر ان میں خیر سگالی پیدا کی گئی۔ مدینے کی تیسری طاقت یہود کی تھی۔ یہ یہود متذکرہ بالا انصار قبیلوں میں سے کسی نہ کسی کے حلیف تھے۔ اور ان کے توسط سے شریک معاہدہ کیے گئے۔ اس طرح حضور ﷺ کی ذات گرامی پر مدینے کا معاشرہ متفق ہو گیا اور وہاں اسلامی معاشرے کی بنیادیں استوار ہونے لگیں۔ قریش نے مدینے پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ ان کے خط اور پیغامات انصار کے پاس پہنچنے لگے۔

جن میں دھمکی آمیز مطالبے تھے کہ مہاجرین کو شہر بدر کیا جائے۔ ورنہ مدینے پر حملہ کر کے اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔ قریش کے حملے کے خدشے کے پیش نظر مدینے کے آس پاس کے قبائل سے حضور ﷺ نے امن کے معاہدات فرمانے شروع کیے۔ چنانچہ ابتدائی دور کی جس نقل و حرکت کو جنگی مہمات تصور کیا جاتا ہے وہ سب کی سب قیام امن کی مساعی تھیں۔ یہ مساعی سات ماہ جاری رہیں۔ اس دور میں جن قبائل کے ساتھ معاہدے ہوئے ان کے متن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ معاہدات صلح تھے۔ چنانچہ بنو صمرہ اور بنو مدیج سے معاہدہ اس امر کا تھا کہ،

”نظرین میں سے کوئی ایک دوسرے پر حملہ نہیں کرے گا۔ اگر کوئی بیرونی دشمن کسی فریق پر حملہ کرے گا تو دونوں اس کے مد مقابل ہو گئے اور دونوں دشمن کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔“ (Tubqat-e-)

[Ibn-Saad, quoted by Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.4]

حضور کی ان مساعی امن کو مغرب دیدہ و دانستہ قریش کو مشتعل کرنے کا نام دیتا ہے (Ibid, p.4)۔

اسی دوران قریش کے قافلوں سے بھی تعارض ہونے لگا، جسے مستشرقین کی جانب سے لوٹ اور گزر بسر کا ذریعہ کہا گیا۔ اس موضوع پر بحث اسی باب میں ہو چکی ہے۔ جب مدینے اور اس کے نواح میں

صورت امن پیدا ہوگئی تو حضور ﷺ نے مکے کی جانب توجہ مبذول فرمائی تاکہ ان کے عزائم کا پتہ چلا جا سکے۔ آپ نے آٹھ تا بارہ افراد پر مشتمل ایک مختصر جماعت نواحِ مکہ کی طرف روانہ فرمائی تاکہ قریش کی جنگی تیاریوں کے بارے میں تفصیلات مل سکیں۔ اس جماعت کے دو افراد راہ بھٹک گئے۔ جس کے باعث انکی نفری اور بھی کم ہوگئی۔ یہ مختصر جماعت وادیِ نخلہ میں قریش کے ایک چھوٹے سے قافلے سے دو بدو ہوگئی۔ اپنی حفاظت کی خاطر انہیں اس قافلے کو قبضہ میں کرنا پڑا۔ بصورت دیگر کسی فرد کے زندہ بچ جانے کا امکان نہ رہ جاتا۔ اس اتفاقی واردات کو یورپ منصوبہ بند حملہ قرار دیتا ہے اور حضور ﷺ نے جو مکتوب گرامی حضرت عبداللہ بن جحش کو عنایت فرمایا تھا اس کے معنی منج کر کے بیان کرتا ہے۔ ابن ہشام نے احکامات نبوی کے جو الفاظ روایت کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

”اذا نظرت فی کتابی هذا فامض حتی تنزل نخلة بین مكة والطائف فترصدو بها قريشا و تعلم لنا من اخبارهم“

[جب تم اس تحریر کو دیکھو تو یہاں تک چلو کہ مکہ اور طائف کے درمیان نخلہ اترو۔ پھر قریش کی دیکھ بھال کرو اور ان کی خبروں سے ہمیں مطلع کرو۔]

ان واضح احکامات کے بارے میں واٹ نے لکھا:

”The essential part of Mohammed's orders to Abdullah bin Jahash was to go to Nakhla and ambush a caravan of Quraish.“

(Watt, Montgomery, 'Mohammed at Medina' , p. 6)

[عبداللہ بن جحش کو جاری کردہ محمد ﷺ کے احکامات کا بنیادی حصہ یہ تھا کہ وہ نخلہ جائیں اور کسی قافلے پر حملہ کریں۔]

حقیقت کو اس طرح منج کیا جا رہا ہے کہ جس بات کا کوئی شائبہ تک نہیں اسے بنیادی حصہ بتایا جا رہا ہے اور جس بات کا صریح حکم موجود ہے اس سے دانستہ اعراض برتا جا رہا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ کامیابی کے باوجود عبداللہ بن جحش کو مدینے میں مطعون کیا گیا۔ اگر مقصد چھاپہ مارنا ہوتا تو عبداللہ کا یہ کارنامہ قابلِ داد ہوتا۔ وہ مطعون تو اس لیے ہوئے کہ منشاء نبوی کے خلاف عمل پیرا ہوئے تھے کیونکہ ان کو صرف سراغ رسانی کے لیے مامور کیا گیا تھا۔ **جنگ بدر:** واقعہ نخلہ سے قریش مشتعل ہو گئے اور انہوں نے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ قریشی قافلے مسلسل سلطنتِ اسلامیہ کی حدود کی خلاف ورزی کر رہے تھے اور ان سے تعارض کیا جا رہا تھا۔ یوسفیان کا قافلہ تجارت فلسطین سے آنے کو تھا۔ قریش کو یقیناً یہ اندازہ تھا کہ اس قافلے سے بھی تعارض ہوگا۔ انہوں نے اس قافلے کی حفاظت کے بہانے مدینے کے خلاف فوجی کارروائی کا منصوبہ بنایا۔ وقت اور فاصلے اس منصوبے کو بے نقاب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حجاز کے نقشے پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ میدان بدر اگر مدینے سے نوے میل (ایک سو پچاس کلومیٹر) کے فاصلے پر ہے تو مکے سے اس کا فاصلہ اس سے تقریباً دو گنا ہے۔ لہذا یہ مسافت طے کرنے کے لیے مکہ والوں کو مدینہ والوں سے دو گنی مدت درکار ہوگی۔ ہمیں علم ہے کہ جنگ بدر کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

۱۷۔ رمضان ۲ھ کو ہوئی۔ مجاہد بن اسلام میدان بدر میں ۱۶ رمضان کی شام کو پہنچے تھے۔ مدینے سے ان کی روانگی چار یوم قبل یعنی ۱۲ رمضان کو ہوئی، اور ۱۶ رمضان کی شام کو قریش مکہ بھی بدر کے نواح میں پہنچے۔ لہذا وہ کم از کم آٹھ نو دن قبل مکہ سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ اس اعتبار سے قریش مکہ ۷ یا ۸ رمضان کو، یعنی مجاہدین کی نقل و حرکت سے کم از کم پانچ روز قبل اپنی پوری مسلح قوت کے ساتھ روانہ ہوئے۔

ابوسفیانؓ کے دھمکی آمیز پیغامات اور مکہ سے رازداری کے ساتھ مسلح فوج کی پیش قدمی، جنگی منصوبے کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ منصوبہ فوری نہ بنا ہوگا۔ فوجی قوت کی فراہمی اور نقل و حرکت کے انتظامات کے لیے درکار وقت کو بھی اس میں شریک کر لیا جائے تو یہ منصوبہ ایسے وقت تیار کیا گیا جب ابوسفیانؓ کا قافلہ ابھی شام سے روانہ بھی نہ ہوا تھا۔ نخلہ کی مہم کو اگر اس منصوبے کے پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ اس منصوبے کی تصدیق کے لیے ہی حضرت عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں جماعت روانہ کی گئی ہوگی۔

بہر کیف یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ عاتہ القریش کو اس منصوبے کا پورا علم نہیں تھا۔ انہیں صرف قافلہ تجارت کی حفاظت کی خاطر دعوتِ شرکت جنگ دی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ قافلہ تجارت کے بچ نکلنے کے بعد مکہ کے بعض قبائل نے جنگ میں حصہ لینے کے بجائے بدر سے واپسی اختیار کی۔ اب وجہ جنگ صرف عمرو بن حضری متغول نخلہ کا خون تھا۔ عتبہ بن ربیعہ اس کا خون بہا اور کر کے جنگ نالے کو تیار تھا لیکن ابوجہل اور اسکے ہم خیال گروہ نے جنگ ملتوی کرنے کی ہر کوشش کو ناکام بنایا کیونکہ اس سے اصل منصوبے کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ مکہ کی پوری جنگی قوت مجتمع تھی۔ حِمْیَر بپا تھا۔ بنو کنانہ سے بھی اسی موقع کے لیے کسی نہ کسی طرح یہ یقین دہانی حاصل کر لی گئی تھی کہ وہ مکہ پر حملہ نہیں کریں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان سازگار حالات میں وہ شخصیت اپنے منہی بھر جانثاروں کے ہمراہ وہیں موجود تھی جس کے خلاف گزشتہ پندرہ سال سے ہر کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ کامیابی یقینی نظر آتی تھی۔ ایسے حالات بار بار پیدا نہیں ہو سکتے تھے۔ ابوجہل ابتدا سے ہی حضور ﷺ کی جان کا دشمن تھا۔ وہ اس موقع پر مسلمانوں کا قلع قمع کر دینا چاہتا تھا۔

قرآن مجید کی سورۃ آل عمران کا مطالعہ یہ امر واضح کرتا ہے کہ حضور نہ صرف اس پورے منصوبے سے آگاہ تھے بلکہ مدینے سے روانگی سے قبل انہیں علم تھا کہ نہ صرف ابوسفیان کا قافلہ تجارت آ رہا ہے بلکہ قریشی افواج بھی مکہ سے روانہ ہو چکی ہیں۔ مجاہدین کی پیش قدمی بیک وقت ان دونوں کے خلاف تھی۔ ان تمام نامساعد حالات کے باوجود جنگ بدر میں اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو فتح عطا کی۔

یہ فتح مستشرقین کو بڑی ناگوار گزرتی ہے۔ لیمن نے فتح بدر کی وجوہات یہ تحریر کی ہیں کہ مکہ والے حقیقتاً جنگ جو نہ تھے۔ انہیں جنگی امور میں کوئی تجربہ نہ تھا۔ جنگوں میں انکا دار و مدار ”احابیش“ پر تھا، جو حبشی (نیکرو) غلاموں کی فوج تھی، جس میں بدوؤں کی باقاعدہ فوج بھی شریک تھی (Attributed to Lammens, H.)

مستشرقین اس مرحلے پر صرف یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ جنگ بدر میں تین سو تیرہ مسلمانوں کی ایک ہزار [۱،۰۰۰] مشرکین قریش پر کامیابی کوئی قابلِ فخر کارنامہ نہیں ہے، بلکہ قریش کے حالات اور کیفیت کے مطابق ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔

انہیں شرکائے بدر میں احابش کا تذکرہ ملا تو یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ یہ حبشی غلاموں کی کرائے کی فوج تھی۔ بھلا اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی کہ دلجمعی سے لڑتی، حالانکہ ”حبش“ ایک وادی کا نام ہے۔ وہاں ایک معاہدہ ہوا جسمیں بنی الحارث (کنناہ)، بنی خزیمہ (مدرکہ) اور بنی المصطلق (خزاعہ) شریک تھے۔ یہ سارے کے سارے عرب تھے۔ مستشرقین کو بعض رؤسائے قریش صلح پسندی پر مائل نظر آئے تو انہیں بزدل قرار دیا۔ جبکہ بزدلی سے بڑھ کر شائد ہی کوئی دوسرا عیب عرب کے نزدیک مکروہ ہو۔ یہ لفظ بزدلی ہی تھا، جس کا طعنہ ابو جہل نے عقبہ کو دیا تھا، جس کے نتیجے میں جنگ بدر لڑنے کے بجائے بھڑک اٹھی۔ قریش بزدل نہ تھے۔ فریقین میں ہر دو جانب قریشی ہی لڑ رہے تھے۔ سارے مہاجر مسلمان قریشی تھے۔ اسلام نے جب عرب سے باہر پیش قدمی کی تو ایران اور سلطنتِ روم سے نبرد آزما ہونے والے سارے ہیر و قریشی ہی تھے۔ بنو امیہ ہوں کہ بنو عباس، سب کے سب قریشی ہی تھے۔ بدر سے قبل، تاریخِ عرب میں ایک واقعہ بھی ایسا نظر نہیں آتا کہ کوئی گروہ قریش پر غالب آیا ہو۔ جنگ بدر میں قریش کے بعض معزز رؤساء بھی شریک نظر آتے ہیں۔ جس کی بنیاد پر یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ قریش کمزور اور بوڑھے تھے اور مسلمان اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ بوڑھے لڑ نہ سکیں گے۔ اسی لیے اپنی عددی کمتری کے باوجود وہ اس فوج سے بھر گئے۔ گویا قریشی فوج میں جن جن کمر صرف بوڑھے بھیجے گئے تھے تاکہ وہ اپنی مدافعت کیے بغیر ہی قتل ہو جائیں۔ فوج کا یہ تصوّر بھی نرالا ہی ہے۔

میدان بدر میں مسلمانوں اور مشرکین کی آمنے سامنے کی کیفیت بھی عجیب عجیب طرح سے پیش کی جاتی ہے۔ کوئی یہ باور کراتا ہے کہ مسلمانوں کو خلاف توقع قریش سے سابقہ پڑ گیا۔ کوئی یہ باور کراتا ہے کہ مدینے کی مختلف فوجی نقل و حرکت کا مدعا ہی یہ تھا کہ قریش مشتعل ہو کر چڑھ دوڑیں اور انصار اپنی مدافعت کے لیے مجبوراً مہاجرین کے دوش بدوش صف آرا ہوں، تاکہ اس طرح حضور ﷺ کی سیاسی قوت میں اضافہ ہو سکے۔ اس قسم کے دعوے بر خود غلط ہیں۔ اس لیے کہ اولاً جب انصار نے حضور ﷺ کی دستِ حق پرست پر بیعت کی تھی تو اس میں یہ وعدہ بھی شریک تھا کہ انصار حضور ﷺ کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ بدر کے موقع پر تین سو تیرہ [۳۱۳] جاٹاروں میں مہاجرین کی تعداد چھیسی [۸۶] تھی۔ یعنی دو سو ستائیس [۲۲۷] انصار اس لشکر میں شریک تھے۔ جنگ سے پیشتر حضور ﷺ نے ان سے مشورہ فرمایا تو بیک زبان انہوں نے اعلان کیا کہ وہ کھلتیا حضور ﷺ کی منشاء کے تابع ہیں۔ اگر انصار کی وفاداریاں متزلزل ہوتیں تو اس قسم کی غیر مشروط اطاعت کا امکان بھی نہ تھا۔ دور نبوی میں مدینے کا معاشرہ محض سیاسی معاشرہ نہ تھا بلکہ بنیادی طور پر ایک مذہبی معاشرہ تھا جو رسول اللہ ﷺ پر ایمان لا چکا تھا اور اور رسول اللہ ﷺ کا حکم اس معاشرے میں اللہ کے حکم کے مترادف تھا۔

جس سے سرگردانی دین و دنیا دونوں میں موجب گمراہی تھی۔ انہوں نے خون، نسل، قبیلہ، وطن اور قومی عصبیت کو قربان کر کے اسلامی برادری اختیار کر لی تھی۔ اب کسی کمتر مفاد کے لیے ملتی مفاد کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہ تھا۔

انیسویں صدی کی تحریروں کے زیر اثر بیسویں صدی کے بعض اہل قلم ایسے بھی ہیں جو ایک ہی وقت میں دو متضاد باتیں کر گزرتے ہیں۔ فنگمری واٹ نے جنگِ بدر کے سلسلے میں اسی قسم کی تضاد بیانی سے کام لیا ہے۔ اس نے اذلا کہا،

”مسلمان نکلے وقت یہ تصور بھی نہ کرتے ہوئے کہ جنگ درپیش ہے۔ اگر انہیں معلوم ہوتا تو شاید جیلوں بہانوں سے اس جنگ کو نال جاتے۔ جب انہیں قریش کی آمد کا علم ہوا تو وہ اس قدر قریب تھے کہ بھاگنے کی گنجائش بھی نہ تھی۔“ (Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.12)

ایک طرف وہ یہ تاثر پیدا کر رہا ہے کہ لاعلمی میں مسلمان نرنے میں آگئے تھے۔ مجبوراً جنگ اختیار کرنا پڑی۔ جرأت کا فقدان تھا۔ مسلمان راہ فرار اختیار کرنا چاہتے تھے لیکن یہ راہیں مسدود ہو چکی تھیں اور دوسرے ہی لمحے وہ کروٹ لیتا ہے اور اپنے ہی بیان کی تردید کرتا ہے کہ،

”محمد ﷺ نے پانی پر قبضہ کر کے دشمن کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کی مرضی کے مطابق جنگ لڑے۔ قریش پر چھاپہ نہیں مارا گیا۔ انہیں اس موقف میں رکھا گیا کہ وہ جنگ کرنے پر مجبور ہو گئے۔“

(Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.12)

عجیب متضاد منطق ہے کہ وہ فریقِ جوزغے میں پھنس گیا تھا، جنگ کو جیلوں بہانوں سے نالنا چاہتا تھا، اور اپنے لیے راہ فرار تلاش کر رہا تھا، وہی فریق اپنے قوی تر دشمن کو جنگ پر مجبور کر رہا تھا۔ یہ تضاد محض اس وجہ سے پیدا ہوا کہ دو مختلف نظریات کو بیک وقت پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک نظریہ تو یہ کہ اسلام کی وسعت تلواروں کی مہمونی منت ہے۔ دوسرا نظریہ یہ کہ بدر کی فتح محض اتفاقی تھی۔ جس کے زیر اثر اسے مسلم صفوں میں بے چینی کا فرضی نقشہ کھینچنا پڑا۔

جنگِ احد: جنگِ بدر کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا تھا۔ اس پر مستشرقین کے تبصرے اس انداز اور نوعیت کے ملتے ہیں جن کے ذریعے جنگِ بوئی، خون ریزی، جارحیت اور انتقامی کارروائی کے الزامات کو تقویت مل سکے۔ لیکن چونکہ جنگِ احد مسلمانوں کے حق میں نہ تھی اس لیے اس سے متعلق تبصروں میں طعن و شماتت کے جذبات جھلکتے ہیں۔

جنگِ احد کے بارے میں عام مغربی اندازِ فکر یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو عبرت ناک شکست ہوئی تھی۔ وہ باور کرتے ہیں کہ ابتدائی روایات میں اس جنگ سے ہونے والی تباہی اور اسکے اثرات کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور یہ کہ اس شکست نے مسلمانوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا تھا کہ جب اللہ نے فتح کا وعدہ کر لیا تھا تو یہ شکست کیوں ہوئی؟ جنگِ احد میں ابتدائی کامیابی کا دعویٰ بھی اس شکست کو چھپانے کی محض ایک کوشش ہے۔ ورنہ اس عبرت ناک شکست نے سارا بھرم کھول دیا تھا۔

دیکھنا یہ ہے کہ حملہ آوروں تھے؟ ان کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور یہ اغراض و مقاصد کس حد تک پورے ہوئے؟ شکست و فتح کا اندازہ اسی سے ہو سکے گا کہ قریش مکہ اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہے اور مدینے کو اس جنگ کے نتیجے میں کیا نقصانات اٹھانے پڑے۔

اغراض و مقاصد: قریش مکہ شیعہ رسالت کو بھگانے کی کوشش ہجرت سے قبل بھی کر رہے تھے۔ اسی غرض سے انہوں نے جب بدر پناہ کی۔ شکست نے اس طرح نظر میں تبدیلی نہ پیدا کی ہوگی، بلکہ یقیناً جذبہ انتقام نے مزید اشتعال پیدا کیا ہوگا۔ لہذا انکا اولین مقصد مسلمانوں کی قوت کا قلع قمع کرنا ہوگا۔ اور اسی لیے وہ مکہ سے تین ہزار [۳۰۰۰] کی فوج کے ساتھ، جس میں سات سو [۷۰۰] زرہ پوش اور دو سو [۲۰۰] گھوڑے تھے، مدینے پر حملہ آور ہوئے۔

اگر یہ تصور کیا جائے کہ جنگ احد میں مسلمانوں کو عبرت ناک شکست ہوئی تو کون سی قوت مانع تھی جس کے سبب قریش اپنے مقصد کو حاصل کیے بغیر واپس لوٹ گئے۔ درست کہ مسلمانوں کا شدید جانی نقصان ہوا لیکن حیرت انگیز امر یہ ہے کہ قریش ایک بھی جنگی قیدی حاصل نہ کر سکے۔ واپس ہوتے ہوئے قریش نے مقابلے سے گریز کیا لیکن مسلمانوں نے ان کے کم از کم تین افراد کو گرفتار کیا۔ نہ جانے قریش کو کیا جلدی تھی کہ بلا توقف اپنے خیمے تہہ کر کے شام سے پہلے ہی میدان جنگ سے کوچ کر گئے۔ جبکہ مسلمان دیر تک وہاں موجود رہے، شہداء کی لاشیں دفن کیں، زخمیوں کی دیکھ بھال کی اور اطمینان سے نہ صرف مدینے لوٹے بلکہ دشمن کے تعاقب میں بھی روانہ ہوئے۔ عجب تماشا ہے کہ خون کا پیا سا دشمن جو شاندار فتح حاصل کر چکا ہے، آگے آگے بھاگا چلا جا رہا ہے اور وہ فریق جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اسے عبرت ناک شکست ہو چکی ہے دشمن کا تعاقب کر کے اس کے آدمی گرفتار کر رہا ہے۔ رات ہوتی ہے تو مینہ شکست خوردہ فریق اپنے کیمپ میں جگہ جگہ آگ روشن کرتا ہے تاکہ دشمن کو اس کی موجودگی کا پتہ چل سکے۔ اور سکت ہو تو مقابلے کے لیے لوٹ آئے۔ یا اپنے قیدی ہی چھڑا لے جائے۔ ان واقعات کی روشنی میں تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ جب احد کروٹ لے رہی تھی۔ قریش کا پلہ ایک مرحلے پر بھاری ہوا۔ مسلم فوج میں انتشار پیدا ہو گیا، لیکن پھر یہ منتشر فوج ایک بار پھر مجتمع ہونے لگی۔ بیشتر اس کے کہ یہ منتشر قوت مجتمع ہو سکے قریش نے غایت اسی میں سمجھی کہ میدان جنگ چھوڑ کر فتح کے نعرے لگاتے ہوئے روانہ ہو جائیں۔ تاکہ اہل عرب کو یہ باور کرا سکیں کہ بدر کا انتقام لے لیا گیا اور بدر کے نتیجے میں ان کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا تھا اسے بحال کر سکیں۔

واقدی نے عمرو بن العاص سے جنگ احد سے واپسی کی جو روایت کی ہے [عمرؤ اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے] وہ بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس کی روشنی میں قریش کی نام نہاد فتح چارلس مارٹن کی فتح طورس سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ عمرو بن العاص نے کہا،

”جب ہم نے ان کے خلاف دوبارہ حملہ کیا تو ان کی خاصی بڑی تعداد ٹھکانے لگا دی اور وہ چہار جانب منتشر ہو گئے۔ پھر ان کی ایک جماعت نے صف بندی کر لی، تو قریش نے مشورہ کیا اور کہا کہ فتح ہماری ہو گئی ہے لہذا ہمیں روانہ ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ ابن ابی ایک تہائی فوج کے ساتھ لوٹ گیا تھا۔ اور کچھ اوس و خزرج

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ایسے بھی تھے جو اس جنگ میں شریک نہ ہوئے تھے۔ ہمیں یہ اطمینان نہ تھا کہ یہ لوگ ہم پر حملہ نہ کریں گے۔ پھر ہمارے آدمی بھی خاصے مجروح تھے۔ گھوڑے تیروں کے زخموں سے چور تھے لہذا ہم واپس روانہ ہو گئے۔ ابھی ہم الحراء بھی نہ پہنچے تھے کہ ان میں سے خاصی تعداد ہمارے تعاقب میں آگئی اور ہمیں سفر جاری رکھنا پڑا۔

(Waqdi; Kitab-ul-Maghazi, chapter 'Uhad', translated by Welhousen, Kolkata, 1856)

گویا قریش خود موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ لہذا یہ تصور کرنا کہ مسلمانوں کو ایسی عبرت ناک شکست ہوئی کہ انکا ایمان متزلزل ہو گیا تھا، محض خود فریبی ہے۔ ورنہ یہ جنگ نتائج کے اعتبار سے غیر فیصلہ جنگ تھی۔ مسلمانوں کا استیصال تو کجا قریش کو خود اپنے استیصال سے محفوظ رہنے کے اگلے پڑ گئے تھے۔

مسلمانوں کی ابتدائی کامیابی: مسلم افواج کی ابتدائی کامیابی پر بھی شکوک و شبہات کا اظہار کیا جاتا ہے، اور اسے صرف احد میں شکست کو کم کر کے دکھانے کی کوشش قرار دیا جاتا ہے۔ اس جنگ کی بعض تفصیلات ایسی ہیں جن کا تجزیہ یہ ثابت کرتا ہے کہ جنگ کے ابتدائی مرحلے میں مسلمانوں کا پلہ یقیناً بھاری تھا۔

قریش کا علم عبداللہ کے گھر آنے کے ہاتھ میں تھا۔ اس جنگ میں یکے بعد دیگرے نو علمبردار مارے گئے۔ اور جب علم اٹھانے والا کوئی اور نہ رہا تو اس گھر آنے کے ایک غلام نے علم سنبالے رکھنے کے لیے اپنی جان دیدی۔ عرب طریقہ جنگ میں علمبردار کا مقام قلب لشکر میں ہوتا تھا۔ یہاں تک مخالف فوج کی رسائی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب گھسان کا رن پڑے اور اس جنگ مغلوبہ میں فوج اس طرح پریشان ہو جائے کہ اپنے علم کی حفاظت سے بھی قاصر ہو۔ نو علمبرداروں کا مارا جانا اس امر کی دلیل ہے کہ قریش ایک ایسی جنگ مغلوبہ میں مصروف تھے کہ اپنے علم کی حفاظت بھی نہ کر سکتے تھے۔

قریش کی اصل طاقت ان کا سوار دستہ تھا۔ مسلم فوج کے لیے ایسا مقام منتخب کیا گیا تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے قریش کے سوار دستے کو ایک تنگ راستے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس راستے پر تیر اندازوں کی ایک مستعد جماعت ان کا راستہ روکنے کے لیے متعین تھی۔ اس جماعت کو یہ حکم تھا کہ کسی بھی صورت میں اپنی جگہ کو نہ چھوڑیں۔ چنانچہ اس جماعت نے سوار دستے کے ابتدائی حملوں کو پسپا کیا۔ جس کے سبب قریش کی سوار فوج عضو معطل ہو کر رہ گئی۔ جنگ مغلوبہ میں یہ سوار دستہ نہ لے سکتے تھے۔ سواروں کے حملے کے پیش نظر تیر انداز دستے کو اپنی اہمیت کا پورا احساس رہا ہوگا۔ اس نازک مقام سے ان کا بچاؤ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک جنگ کا فیصلہ ہونے ہی والا تھا۔ اور اب اس مقام پر ان کی موجودگی کی اہمیت ختم ہو چکی تھی۔ یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا تھا جب قریشی فوج میں انتشار اور بد نظمی کے آثار پوری طرح نظر آنے لگے ہوں۔ تیر اندازوں کے ہٹنے کے بعد مسلم فوج کی پشت سے قریش کے سوار دستے کے حملے نے عارضی طور پر جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔

روائے قریش اپنے ہمراہ اپنی خواتین کو بھی میدان جنگ میں لائے تھے۔ یہ خواتین لڑنے کے لیے نہیں، بلکہ روایتی طور پر، لڑنے والوں کی غیرت و حمیت کو ابھارنے کے لیے آئی تھیں، تاکہ کوئی شخص بزدلی

نہ دکھا سکے۔ ابن ہشام نے حضرت زبیرؓ بن عوام سے روایت نقل کی ہے کہ انہوں نے حضرت ابو دجانہؓ کو، جو حضور ﷺ کی عطا کردہ تلوار لیے جنگ میں مصروف تھے، دیکھا کہ انہوں نے کسی کے سر پر وار کرنے کے لیے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ روک لی۔ بعد میں حضرت ابو دجانہؓ نے یہ وضاحت کی جس پر تلوار اٹھائی تھی وہ ہند بنت عتبہ یعنی ابوسفیانؓ کی بیوی تھیں [جو فتح مکہ کے موقع پر ایمان لائیں]۔ اور یہ کہ انہوں نے ایک عورت کے خون سے شمشیر نبویؐ کو آلودہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

اس روایت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مسلم حملہ اس قدر شدید اور کاری تھا کہ قریشی فوج اپنی سربراہ وردہ خواتین کو بھی بچانے کے قابل نہیں تھی۔ یہ کیفیت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب فوج کے کس بل نکل چکے ہوں اور وہ سخت ابتری کا شکار ہو۔

اسی طرح جنگ احد کے بارے میں ابن اخیق نے جو اشعار جمع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوسفیانؓ کو حضرت حظلہؓ نے زرعے میں لے لیا تھا، قریب تھا کہ فیصلہ کر دیتے کہ اس درمیان ابن شعوب (شد اد ابن الاسود) نے مداخلت کی اور ابوسفیانؓ کی جان بچائی۔ ابن شعوب نے اپنے ایک شعر میں ابوسفیانؓ پر اپنے اس احسان کو بتایا تو انہوں نے جواب میں جو اشعار کہے ان میں یہ شعر بھی پایا جاتا ہے،

ولو شئت نجنتی کحمیت علفلہ ولم احمل النعماء لابن شعوب

(میں چاہتا تو میرا رقبہ رگھوزا مجھے بچالے جاتا۔ اور ابن شعوب کا احسان مجھے نہ اٹھانا پڑتا)

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قریش کا سپہ سالار تک مسلم افواج کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ واپسی سے پہلے ابوسفیانؓ کو طعن و تشنیع کے دوران یہ علم ہو چکا تھا کہ نہ صرف حضور اکرم ﷺ صحیح و سلامت تھے بلکہ حضرات حمزہؓ و مصعبؓ اور عبداللہؓ بن جحش کے سوا باقی تمام مہاجرین عظام بھی محفوظ و موجود تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے آئندہ سال میدان بدر میں ایک اور جنگ کی دعوت دے کر بجلت واپسی اختیار کی۔ یہ غلت بے سبب نہیں تھی۔ جس طرح ابتدائی جنگ میں قریش منتشر ہو کر پھر سنبھل چکے تھے، اسی طرح انہیں ممکن نظر آ رہا تھا کہ مسلمان سنبھل کر جوابی کارروائی شروع کریں گے۔ انہیں اس ممکنہ کارروائی سے پہلے ہی میدان جنگ سے مراجعت میں عافیت نظر آئی۔ یہ ذہنی کیفیت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ابتدائے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا ہو۔

پس مقصد کے اعتبار سے مسلمانوں کی مکمل تباہی میں قریش کو سخت ناکامی ہوئی۔ دوسرا ممکنہ مقصد یہ ہو سکتا تھا کہ شاہ راہ تجارت محفوظ کر لی جائے۔ لیکن اس میں بھی قریش کو کامیابی نہیں ہو سکی۔ یہ شاہ راہ صلح حدیبیہ سے قبل قریش استعمال نہ کر سکے۔

تیسرا مقصد جنگ بدر کا بدلہ ہو سکتا تھا، تو بدر قطعی عبرت ناک شکست تھی، جبکہ احدا ایک غیر فیصلہ جنگ تھی۔ اگر قریش کو کچھ کامیابی ہوئی تو صرف یہ کہ انہوں نے مقتولین کی تعداد تقریباً برابر کر لی تھی۔

۱۔ جنگ بدر میں مسلمان شہداء [۱۲]، اور قریش کے مقتولین [۷۰] اور اسیر بھی [۷۰] تھے۔

(یہ تین ابن ہشام، باب ۱۰۴، شہداء بدر اور مقتولین قریش)

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

۲۔ جنگِ احد میں مسلمان شہداء [۷۰]، اور قریش کے مقتولین [۲۲] اور اسیر [۳] تھے۔

(سیرت ابن ہشام، باب ۱۱۶، شہدائے احد اور مقتولین قریش)

دونوں جنگوں میں مسلمان شہداء کی کل تعداد [۸۴] تھی، جبکہ مقتولین قریش کی کل تعداد [۹۲] تھی۔ ان جنگوں میں [۷۳] قریشی اسیر ہوئے جبکہ کسی مسلمان اسیر کا تذکرہ نہیں پایا جاتا۔ اس اعتبار سے بھی قریشِ مکہ کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ قریش کے مقتول بیشتر ان کے سربراہِ آوردہ لوگ تھے، جبکہ مسلم سربراہِ آوردہ لوگوں میں صرف حضرت حمزہؓ، حضرت مصعبؓ اور حضرت عبداللہؓ بن جحش ہی ہیں۔ چونکہ قریش کو اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہو سکی اس لیے یہ جنگ بے نتیجہ تھی۔ [آنے والے سال میں ایک اور جنگ کی دعوت اسی لیے تھی۔] اسے مسلمانوں کی عبرت ناک شکست قرار دینا اور قریش کی عظیم فتح تھوڑا کرنا محض طفل تلسی ہے۔

جنگِ احزاب: بدر کے لیے جنگ کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ وہ اپنے قافلے کی حفاظت کرنا چاہتے تھے۔ جب قافلے کا بہانہ نہ رہ گیا تو عمرو بن الحضرمی کے خون کے بدلے کا نعرہ بلند کیا گیا۔ اور جنگِ احد اس لیے برپا ہوئی کہ بدر کی شکست کا بدلہ لینا تھا۔ جب احد میں قریش نے بدلہ لے لیا تو جنگِ احزاب یا خندق آ کر کیوں ہوئی؟ قریش اور یہود نے نہ صرف اپنی پوری طاقت بلکہ اپنے حلیفوں اور غیر محتلق بدوی قبائل کو بھی اس جنگ کے لیے مجتمع کر لیا۔ قریش اور ان کے حلیف دس ہزار [۱۰,۰۰۰]، بنو غطفان چار ہزار [۴,۰۰۰]، بنو فزارہ ایک ہزار [۱,۰۰۰]، بنو اسد تین ہزار سے زیادہ [۳,۰۰۰+]، بنو شعیب، بنو مرہ اور بنو سلیم ڈیڑھ ہزار [۱,۵۰۰] تھے۔ یہود نہ صرف خود شریک تھے بلکہ بنو غطفان کو بھی خیبر کی نصف پیداوار کی اجرت کے وعدے پر گھسیٹ لائے تھے۔ اتنی بڑی تعداد جو بیس تا تیس ہزار [۲۰,۰۰۰-۳۰,۰۰۰] بتلائی جاتی ہے آخر کس مقصد سے جمع ہوئی تھی۔ کیا اس کے سوا کوئی اور مقصد تھا کہ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو ختم کر دیا جائے۔ اور تلواروں کے بل پر اسلام کو نیست و نابود کر ڈالا جائے۔ اس طاقت کے مقابلے پر صرف تین ہزار [۳,۰۰۰] مسلمان تھے جو مدینہ کی مجموعی قوت تھی۔ قریش کی یہ پیش قدمی بے کار ثابت ہوئی کیونکہ اس مرتبہ طرزِ دفاع یکسر تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہر وہ سمت جدھر سے گھڑ سوار حملہ کر سکتے تھے، خندق کھود کر ناقابلِ عبور بنادی گئی تھی۔

[اتنی بڑی خندق کا کھودنا بذاتِ خود ایک معجزہ تھا۔ خندق کی کل لمبائی کم از کم تین [۳] کلومیٹر تھی، چوڑائی اوسطاً دو [۲] میٹر اور گہرائی بھی اوسطاً اتنی ہی تھی۔ اس طرح ایک مسلم سپاہی کے حصے میں کم از کم چار [۴] مکعب میٹر زمین کی کھدائی آئی تھی، جسے چند دنوں میں مکمل کرنا تھا۔ نامناسب اور ناکافی اوزاروں، پتھر بلی زمین اور فادہ کش فوج کے ساتھ جس میں بوڑھے اور بیمار بھی شامل تھے، اس کام کی بروقت تکمیل بہت بڑی بات تھی۔ اس میں زمین کھودنا اور فی کس تقریباً بارہ ٹن [۱۲] مٹی کو خندق سے باہر نکالنا بھی شامل ہے۔]

کہتے ہیں کہ عرب کے لیے خندق ایک نئی چیز تھی اور اس کا خیال ایک ایرانی غلام [سلمانِ فارسی] نے دیا تھا۔ لیکن یہ دعویٰ صحت سے قریب یوں نہیں معلوم ہوتا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب سیاسی وثیقہ جات میں دو خطوطِ بہم پہنچائے ہیں۔ ایک میں ابوسفیانؑ نے حضور ﷺ خندق کی تیاری پر طعنہ دیا اور کہا کہ ”آپ تو یہ طریقہ

نہیں جانتے تھے۔“ (ڈاکٹر حمید اللہ خان، سیاسی وثیقہ جات، خط-۶۰، لاہور، ۱۹۶۰)۔ حضور ﷺ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا کہ ”اور یہ جو تم نے لکھا کہ مجھے خندق کا طریقہ معلوم نہ تھا تو یہ طریقہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس وقت اللقاء فرمایا جب تمہارے ہمراہیوں کا غیظ و غضب اس قدر بڑھ گیا کہ تم لوگ مدینے کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تل گئے۔“ (ڈاکٹر حمید اللہ خان، سیاسی وثیقہ جات، خط-۷، لاہور، ۱۹۶۰)۔

خندق نے قریش اور غطفان کے چھ سو گھڑ سواروں کی حربی اہمیت ختم کر دی۔ قریش اپنے پیدل آگے بڑھانے سے بچ چکے تھے رہے۔ اس محاصرے نے طول پکڑا۔ دو ہفتے گزرے تو خوراک اور چارے کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میدانِ جنگ نے معاشی جنگ کی کیفیت اختیار کر لی۔ اب صرف ایک امید باقی رہ گئی تھی چاروں طرف سے بیک وقت بلہ بول دیا جائے۔ مدینے کے جنوب میں یہودی قبیلہ بنو قریظہ باقی تھا۔ اسے آمادہ کیا گیا کہ وہ جنوب کی سمت سے حملہ کر دے۔ ان کی جانب توجہ مبذول ہونے سے خندق پار کرنا آسان ہو جائے گا۔ اس ریشہ دوانی کی اٹھارہ مسلمانوں کو بھی مل گئی۔ بنو قریظہ قبیلہ اس کے حلیف تھے۔ سردارانِ اوس نے حقیقتِ حال کی دریافت کے لیے بنو قریظہ سے رابطہ قائم کیا تو وہاں آنکھیں بدلی پائیں۔

بنو قریظہ مسلمانوں کے معاہدہ تھے۔ یہود خیبر اور قریش نے انہیں غزاری اور بدعہدی پر آمادہ کر لیا تھا۔ نعیم بن مسعود بنو غطفان کے قبیلہ بنو نضیر کے ایک فرد تھے۔ ان کے اسلام سے ابھی ان کی قوم بھی واقف نہ ہوئی تھی۔ ان کے تعلقات بنو قریظہ سے بھی تھے۔ انہوں نے بنو قریظہ کو قریش سے غیر متعلق کرنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔ نعیم بن مسعود نے بنو قریظہ کو سمجھایا کہ ان کی حالت اور قریش کی حالت میں فرق ہے۔ قریش کے بال بچے مدینے سے دور مکے میں محفوظ ہیں۔ جبکہ بنو قریظہ قطعاً مدینے کے رحم و کرم پر ہیں۔ اگر قریش اور ان کے حلفاء جیت جائیں گے تو مدینے میں لوٹ مار ہوگی جس سے خود بنو قریظہ بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ اور اگر قریش ہار گئے تو خود تو چلے جائیں گے اور تمہیں چھوڑ جائیں گے۔ اور اس طرح تم قطعاً بے دست و پا ہو کر رہ جاؤ گے۔ لہذا قریش اور بنو غطفان کا ساتھ دینا کسی طرح سے بھی تمہارے مفاد میں نہیں ہے۔ نعیم بن مسعود کی یہ باتیں کسی بھی طرح حقیقت سے بعید نہ تھیں۔ بنو قریظہ نے جب معاملے پر غور کیا تو انہیں اپنی نازک پوزیشن کا احساس ہوا۔ کئی ہفتے گزر چکے تھے لیکن جنگ کا تعطل قائم تھا۔ محاصرہ مزید قائم رہنے کے امکانات کم تھے۔ آثار پیدا ہو چکے تھے کہ یہ لا حاصل محاصرہ ختم ہونے والا ہے۔ بنو غطفان قریش سے ٹوٹ جانے کے لیے تیار تھے۔ بشرطیکہ انہیں مدینے کی نصف یا تہائی پیداوار کی پیشکش ہو۔ احزاب میں پھوٹ پڑ رہی تھی جس کا نتیجہ اگر آپس میں مناقشت نہ بھی ہو تو رجعت ضرور ہوگا۔ بنو قریظہ غزاری کے مرتکب ہو چکے تھے، اور اب اپنی حفاظت کی ضمانت قریش سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ نعیم نے مشورہ دیا کہ ضمانت میں قریش کے اشراف طلب کیے جائیں۔ پھر انہوں نے قریش اور غطفان کو بنو قریظہ کی پیشانی سے آگاہ کیا اور کہا کہ وہ تمہارے اشراف بطور ضمانت طلب کرنے والے ہیں تاکہ انہیں مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔

بے عملی اور تعطل کے عالم میں شکوک و شبہات تیزی سے پروان چڑھنے لگے۔ قریش نے بنو قریظہ کو اعلانیہ شرکت جنگ کی دعوت دی۔ بنو قریظہ نے حفاظت کی ضمانت قریش سے طلب کی۔ اس مطالبے نے ایک دوسرے کا رابطہ ختم کر دیا۔ بنو قریظہ نے اندرونی محاذ نہ کھولا تو قریش اور ان کے حلیفوں نے ڈیرا اٹھایا اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

معاند مستشرقین نے جنگ احزاب پر متعدد انداز سے تبصرے کیے ہیں۔

ان کا مشترک اندازِ نظر یہ ہے کہ نعیم بن مسعود کی وہ کوششیں جو انہوں نے بنو قریظہ کو مدینے پر حملہ آور ہونے سے باز رکھنے کے لیے کیں، گویا ایک جرم تھا۔ یہ عمل صرف اسی شخص کے نزدیک جرم ہو سکتا ہے جو ذہنی اعتبار سے کفار قریش کا حلیف ہو۔ قریش نے کس کس جتن سے مدینے کی تباہی کے انتظامات کیے۔ بیرونی حملہ آوروں کو خندق نے روک دیا تو آخری امید یہ رہ گئی کہ مدینے میں موجود یہودی قبیلہ معاہدہ ہونے کے باوجود پانچواں کالم ثابت ہوگا اور بوقتِ ضرورت مدینے کے اندر ایک نیا محاذ کھولے گا۔ اس محاذ کی جانب رجوع کرنے کے باعث خندق پر مدافعت کمزور ہوگی۔ جس کے بعد بیرونی افواج، خصوصاً چھ سو [۶۰۰] سواروں کا دستہ پیش قدمی کر کے تین ہزار [۳,۰۰۰] افراد پر مشتمل دفاعی قوت کو پاش پاش کر دے گا۔ اگر ایسا ہو جاتا تو یہ واقعہ تاریخ اسلام کا آخری باب ہوتا۔ نعیم بن مسعود نے اللہ کی رضا سے اس پورے منصوبے پر پانی پھیر دیا۔ بنو قریظہ متحرک نہ ہو سکے۔ احزاب بے بسی کے عالم میں لوٹ گئے اور اسلام پر سے ہر دباؤ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد اسلام نے عالمگیری شروع کی۔ یہ سب کچھ نعیمؓ کی کارروائی کا نتیجہ تھا۔ اور پھر اتنے بڑے بڑے نتائج صرف چند الفاظ کے خرچ پر حاصل کیے جائیں۔ نعیم بن مسعود کا یہ کارنامہ صرف تعصب کی نظر میں ہی جرم ہو سکتا ہے۔ ورنہ فریقِ ثانی [اور غیر جانبدار ماہرینِ تزویر] اسے جس قدر سراہے کم ہے۔ نعیم بن مسعود بدو تھے۔ تازہ تازہ دولتِ ایمان سے سرفراز ہوئے تھے۔ ان کے ایمان کی خبر خود اکی قوم کو نہ تھی۔ انہوں نے بنو قریظہ کے سامنے آنے والے واقعات کا جو نقشہ کھینچا وہ بعدہ حرفِ صحیح ثابت ہوا۔ یہ بنو قریظہ کی ناکامی تھی کہ وہ قریش سے اپنی حفاظت کی ضمانت نہ حاصل کر سکے۔

ضمانت میں افراد کو ریغال بنانا اس عہد کا دستور تھا۔ چنانچہ اسی واقعہ احزاب میں ہم دیکھتے ہیں کہ بنو قریظہ کو بدعہدی پر آمادہ کرنے کے لیے مدینے کے جلاوطن یہودی قبیلے بنو نضیر کا سردار حنی بن اخطب خود پہنچا تھا۔ اور جب تک اس نے یہ یقین دہانی نہیں کرائی کہ وہ بنو قریظہ کے ہی قلعے میں مقیم رہے گا اور ان کے اچھے برے میں شریک رہے گا اس وقت تک بنو قریظہ مسلمانوں سے غذاری پر تیار نہیں ہوئے۔ قلعے میں بنو قریظہ کے ساتھ قیام کی شرط گویا کہ ریغال کی ہی ایک شکل تھی۔ پس بنو قریظہ کا قریش سے یہ مطالبہ کہ وہ اپنے سربراہ و درہ سرداروں کو حفاظت کی ضمانت کے طور پر ریغال میں دیں کوئی نئی بات نہ تھی۔ شکوک و شبہات کی فضا میں اس مطالبے کو قریش نے سازش تصور کیا۔ یہی باد کرنا نعیمؓ کی کامیابی تھی۔

ریغال بنانے کی ایک اور مثال ہمیں واقعہ خُلقہ میں ملتی ہے کہ اسیرانِ خُلقہ کو اس وقت تک مدینے میں بطور ریغال روکے رکھا گیا جب تک حضرت سعد بن وقاص اور حضرت عتبہ بن غزوہ ان صحیح سلامت مدینے واپس نہیں پہنچ گئے۔

صلح حدیبیہ: ذیقعدہ ۱ھ (مارچ ۶۲۸ء) میں حضور ﷺ نے ادائیگی عمرہ کا قصد فرمایا اور لوگوں کو اس عمرہ میں شرکت کی دعوت عام دی۔ بہت سے اہل بادیہ نے تاخیر کی۔ تاہم چودہ سو [۱۴۰۰] سے سولہ سو [۱۶۰۰] تک زائرین نے اس سفر میں شرکت کی۔ یہ سارے زائرین عمرے کے لباس میں لبوس تھے اور قربانی کے جانوران کے ساتھ تھے۔ جب قریش کو پتہ چلا تو انہیں بڑا شاق گزرا۔ دقت یہ تھی کہ اول تو زیارت بیت اللہ سے کسی کو روکا نہ جاسکتا تھا۔ ثانیاً یہ ماہ حرام تھا، جس میں جنگ و جدال کی ممانعت تھی۔ اس کے باوجود اگر وہ مسلمانوں کو زیارت کر لینے دیتے تو اس کے معنی یہ لیے جاتے کہ قریش میں اب اتنی سکت بھی نہ رہ گئی تھی کہ وہ اپنے دیرینہ دشمن کو روک سکیں۔ قریش پر قومی عصیت و حمیت غالب آگئی اور انہوں نے طے کیا کہ مسلمانوں کو حد و حرم میں داخل ہونے سے روکا جائے۔ چنانچہ قریش مکہ جنگ کے ارادے سے نکل آئے۔ مسلمانوں نے حدیبیہ کے مقام پر خیمے نصب کیے، دونوں جانب سے دُف دُف آنے جانے لگے، اور بالآخر ایسی شرائط پر صلح ہوئی جو بظاہر مسلمانوں کے حق میں نہ تھیں۔ صلح کے بعد حدیبیہ میں ہی قربانی کے جانور ذبح کیے گئے اور مدینے واپسی عمل میں آئی۔

مغرب اس واقعے کو مختلف طریقوں سے مسخ کرتا ہے۔ اول تو عمرے کو ہی ایک سیاسی بہانہ قرار دیتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ حج اور عمرے کا ذکر قرآنی تعلیمات میں اس واقعے سے قبل نہیں ملتا۔ اس نکتے پر بحث گزشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے کہ خانہ کعبہ کو ابتدا سے ہی بیت اللہ کی حیثیت حاصل تھی اور قربانی کی رسم بھی برقرار تھی، جس کا تعلق صرف حج اور عمرے سے ہے۔ حالات کے پیش نظر ۱ھ تک حج یا عمرہ ادا نہ کیا جاسکتا تھا۔ بعض لوگوں کو عمرہ مذہبی مصلحت نظر آتی ہے اور وہ اس عمرے کا مقصد یہ قرار دیتے ہیں کہ عربوں پر یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اسلام کوئی بیرونی مذہب نہ تھا بلکہ اصلاً عرب مذہب تھا جس کا مرکز مکہ میں ہی تھا۔ اور اس قسم کا مظاہرہ گویا مکہ والوں کو یہ باور کرانے کے لیے تھا کہ اسلام مکے کی عظمت کا دشمن نہ تھا۔

اس قسم کا دعویٰ تو صرف اس وقت قابل غور ہوتا جب اسلام کو کسی مزحلے پر کسی نے بیرونی مذہب تصور کیا ہوتا۔ اسلام میں داخل ہونے والے سب کے سب عرب تھے اور کسی نے اسلام قبول کرنے سے قبل یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ یہ مذہب ملکی ہے کہ بیرونی۔ اسلام ایک صداقت کا نام ہے۔ نہ یہ عربی ہے نہ عجمی۔ یہ ایک عالمی مذہب ہے۔ صداقت جب تسلیم کی جاتی ہے تو اسے اس لیے نہیں قبول کیا جاتا کہ اس کا تعلق کسی نسل یا نسل سے ہے، بلکہ صرف اس لیے قبول کی جاتی ہے کہ یہ صداقت ہے۔ اسلام کو دین ابراہیمی کہا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم بیرون عرب رہتے تھے۔ اس اعتبار سے کسی نے بھی یہ اعتراض نہ کیا کہ یہ بیرونی مذہب ہے لہذا قابل قبول نہیں۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آیا قریش کی دشمنی اس لیے تھی کہ اسلام کے باعث مکہ کی عظمت کو خطرہ تھا۔ دشمنی کی سب سے بڑی وجہ مذہبی عصیت تھی۔ اسی عصیت کے تحت مکے میں مسلمانوں پر مظالم ڈھائے گئے اور لوگوں کا جینا دو بھر کیا گیا۔ قریش مسلمانوں کے خون کے پیاتے ہوئے اور انہوں نے مدینے پر پے در پے حملے کیے۔

صلح حدیبیہ تک قریش مسلمانوں کے مٹانے کے درپے تھے۔ ان کو کسی بھی مرحلے پر یہ خدشہ نہ تھا کہ مسلمان مکے کی عظمت کے لیے خطرہ ہیں۔ لہذا عمرے کے مقصد کو سوائے عبادت کے کچھ اور بیان کرنا محض حقیقت کو مخ کرنا ہے۔ ایک طرزیہ بھی کیا جاتا ہے کہ حضور ﷺ کے عمرہ کرنے کا خواب اگر صحیح تھا تو اس خواب کی تعبیر غلط تھی۔ اس بات کا یہ پہلو ہے کہ انبیاء کے خواب الہامی ہوتے ہیں اور اس خواب کے پورا نہ ہونے کا مطلب نبوت پر حرف آنا ہے۔ جہاں تک خواب کا تعلق ہے دنیا کے کسی شخص کو یہ حق نہیں کہ کسی کے خواب کی تکذیب کرے۔ خواب کا تعلق صرف اس کے دیکھنے والے سے ہوتا ہے اور اس مشاہدے کا کوئی دوسرا شاہد نہیں ہو سکتا۔ جس طرح خواب کی تصدیق کے لیے شہادت نہیں پیش کی جاسکتی اسی طرح اس کی تکذیب کے لیے بھی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ دنیا کا ہر خواب صرف اس کے دیکھنے والے کے بیان پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ لہذا اس پر شبہ کا اظہار کرنا کہ خواب واقعی دیکھا بھی گیا یا نہیں، خلل دماغی کے سوا کچھ اور نہیں کہا جاسکتا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ اس کی تعبیر غلط تھی، صرف اس وقت مانی جاسکتی ہے جب اس خواب میں عمرے کے لیے کسی مدت کا تعین ہوتا۔ انبیاء کے کتنے ہی خواب ہیں جو عرصہ دراز کے بعد پورے ہوئے۔ صرف اس لیے کہ ان کی مدت متعین نہ تھی۔ حضرت یوسف کا معجزہ ہی یہ تھا کہ وہ خواب کی صحیح تعبیر بیان فرماتے تھے۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ چاند، سورج اور گیارہ ستارے انہیں سجدہ کر رہے ہیں۔ یہ خواب پورا ہوا لیکن کب؟ کیا اسی دن، اسی مہینے یا اسی سال؟ نہیں بلکہ کم از کم پچیس سال کے بعد۔ حضرت دانیال نبی نے جو خواب دیکھے وہ کب پورے ہوئے؟ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ ان کے خوابوں کو تعبیر ملنے میں صدیاں لگ گئیں۔ یوحنا کے مکاشفات کا کیا عالم ہے۔ ہزاروں سال گزر گئے اور وہ اب تک پورے نہیں ہو پاتے۔ تو پھر ختمی مرسلت ﷺ کا خواب اگر اسی وقت پورا نہ ہوا تو کون سی نئی بات ہو گئی۔ حرف گیری اور انگشت نمائی تو اسی وقت ہو سکتی تھی جب یہ خواب پورا ہی نہ ہوتا۔ قرآن نے اس خواب کا ذکر روایت صادقہ برحق کے طور پر کیا اور یہ ضمانت بھی دی کہ ضرور بالفرض پورا ہی طور پر عمرے کی ادائیگی ہوگی۔ نہ صرف اس کی تعبیر صحیح ہوگی بلکہ ادیان عالم پر اسلام کو سبقت حاصل ہوگی۔ قرآن کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

ایک طرف یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ عمرہ محض بہانہ تھا اور اصل مقصد محض مکہ پر چڑھائی تھا۔ دوسری ہی سانس میں یہ کہا جاتا ہے کہ بدوی قبائل کو اس مہم میں لوٹ کی کوئی امید نہ تھی۔ نیز یہ کہ وہ مسلمانوں کی فتح تو کجا بقا کی بھی امید نہ رکھتے تھے اسی وجہ سے انہوں نے شرکت سے گریز کیا۔ یہ دونوں مفروضے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اگر جنگ کی نیت ہوتی تو فتح اور شکست کا سوال پیدا ہوتا۔ اور اس سے بدوی قبائل کو لوٹ کی توقع پیدا ہو سکتی تھی۔ بدوی قبائل کی عدم شرکت اگر صرف اس وجہ سے تھی کہ لوٹ کی توقع نہ تھی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ قبائل اچھی طرح سے جانتے تھے کہ کہ یہ سفر جنگ کے لیے نہیں بلکہ محض عمرے کے لیے ہے۔

کچھ لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مسلمانوں نے یہ معاہدہ قریش سے دب کر کیا تھا کیونکہ صلح حدیبیہ کی شرائط مسلمانوں کے حق میں نہ تھیں۔ یہ انداز نظر سطحی ہے۔ اگر حضرت عثمان کی شہادت کی افواہ پر بیعت رضوان کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

ہو سکتی ہے، جو کہ محض ایک فرد کا معاملہ تھا، تو دینی اور ملی مفادات کی حفاظت کے لیے تلوار کا نہ اٹھانا بعید از قیاس ہے۔ صلح کی تمام شرائط صرف امن کی خاطر قبول کی گئی تھیں۔ مکے سے بھاگ کر مدینہ آنے والوں کی واپسی کی شرط قریش کے احساسات کی پاسداری کے لیے تھی۔ [جبکہ اسلام کے ماننے والوں کا مکہ میں موجود رہنا، خود اسلام کے حق میں تھا، کیونکہ ان سے بات چیت کر کے، اور انکی استقامت سے دوسرے لوگ بھی متاثر ہو سکتے تھے]۔ قبائل کو اپنے حلیف اختیار کرنے کی اجازت مشترک تھی۔ دس سالوں تک جنگ نہ کرنے کی شرط دونوں فریقوں پر عائد ہوتی تھی۔ اور ایک دوسرے کے خلاف تلخی کا اظہار نہ کرنے کی پابندی بھی دونوں فریقوں پر تھی۔

نبی اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد قریش پر سے تجارتی پابندیاں ختم کر دیں۔ حالانکہ یہ شرط صلح نامہ میں موجود نہ تھی۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ قریش کے ساتھ فراخ دلانہ سلوک کیا جا رہا تھا۔ اور نہ صرف ان کی شرطیں قبول کی گئیں بلکہ انہیں وہ بھی عطا ہوا جس کا مطالبہ نہیں ہوا تھا۔ لہذا یہ معاہدہ دباؤ کے تحت نہیں کیا گیا بلکہ اس میں بھی بالادستی کی شان پنہاں تھی۔ مدینے سے کسی مسلمان کے فرار ہو کر مکے میں پناہ لینے کا کوئی امکان ہی نہ تھا لہذا یہ شرط محض زینت قرطاس تھی۔ قریش اپنے آدمیوں پر اپنی گرفت مضبوط رکھنا چاہتے تھے، پس انکی درخواست قبول کر لی گئی۔

صلح حدیبیہ کے بعد جب مسلمانوں نے مکے سے آ کر مدینے میں پناہ حاصل کرنا چاہی تو انہیں معاہدہ کے مطابق قریش کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن جب ایک خاتون ام کلثوم بنت عقبہ نے ہجرت کی اور ان کے دو بھائی ان کے تعاقب میں مدینہ پہنچے تو خاتون کو واپس کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ معاندین کو یہ انکار معاہدے کی خلاف ورزی نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہ غلط فہمی ہے اور محض عربی زبان سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ متن معاہدہ میں صرف مردوں کا ہی تذکرہ ہے۔ عربی متن شرط حسب ذیل ہے:

”علیٰ انہ من اتی محمد من بغیر اذن ولینہ ردۃ علیہم“

[اور یہ کہ جو کوئی [مرد] محمد ﷺ کے پاس اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آئے گا، اس [مرد] کو انہیں لوٹا دیا جائے گا۔] اس شرط کی تمام ضمیریں مذکر کے لیے استعمال ہوئی ہیں اور عورتوں پر ان ضمیروں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ عورتیں اس شرط سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر انہیں بھی شامل تصور کیا جاتا تو ان کے لیے صراحت ہوتی یا جدا گانہ ضمیریں استعمال کی جاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ام کلثوم کی واپسی کے لیے قریش نے اصرار نہیں کیا۔

مردوں کی واپسی کی شرط بھی قریش کو منگی پڑی۔ کیونکہ قریش کے مسلمان مفروین نے جب یہ دیکھا کہ مدینے میں انہیں پناہ نہیں ملی تو مکے سے فرار ہو کر انہوں نے مقام عیسٰی کو اپنی پناہ گاہ بنالیا۔ جہاں سے انہوں نے قریش پر حملے کر کے انہیں عاجز کیا۔ قریش کی اپنی درخواست پر یہ شرط منسوخ ہوئی اور عیسٰی سے یہ گروہ مدینے پہنچا۔ معاندین کو اس گروہ کی کارروائیوں میں مدینے کی شہہ نظر آتی ہے حالانکہ یہ گروہ مکوں کا تھا۔ قریش کے سلوک سے تنگ آ کر یہ لوگ ایک ایک کر کے فرار ہوئے تھے۔ مدینے کے دروازے ان پر بند تھے۔

انہوں نے فطری طور پر اپنی کارروائیوں کا نشانہ قریش کو بنایا۔ ان کی پشت پناہی کا کوئی بھی ثبوت نہیں پایا جاتا۔ محض قیاس کی بنیاد پر ایسا الزام بھل ہے۔

شاہان عالم کے نام خطوط: صلح حدیبیہ کے بعد حضور ﷺ نے شاہان عالم کے نام تبلیغی خطوط اپنے سفیروں کے ہاتھ روانہ کیے۔ ان میں نجاشی (حبشہ)، مقوقس (مصر)، ہرقل (بازنطین) اور کسری (ایران) سر فہرست تھے۔ خطوط کے متن، سفیروں کے نام اور ان کی سرگزشتیں محفوظ ہیں۔ یہ سب کے سب مغربی مستشرقین کے نزدیک محض ایک کہانی ہے۔ ان کے لیے یہ امر ناقابل یقین ہے کہ مدینے جیسی چھوٹی سی ریاست کا حکمران، صلح حدیبیہ کی معمولی کامیابی حاصل ہونے پر ہرقل اور کسری جیسے شہنشاہوں کو دعوتِ اطاعت دے۔ اور یہ کہ کسری، قیصر اور نجاشی جیسے حکمرانوں کے بارے میں یہ باور نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے اس قسم کے پیغامات کو کوئی اہمیت دی ہوگی یا ان کے جوابات دیے ہونگے۔ خطوط کی تاریخی حیثیت مسخ کرنے کے لیے یہ بھی بیان کیا گیا کہ وہ خط جو کسری کو لکھا گیا اس تک پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ ۶۲۸ء میں کسری کا انتقال ہو چکا تھا۔ نتیجتاً کسری کے دربار کے واقعات اور باذان کے فرستادوں کی دربار نبوی میں آمد وغیرہ کے سارے واقعات محض افسانے بن کر رہ جاتے ہیں۔

دوسرے گروہ کے نزدیک خطوط کی روائی مسلم ہے لیکن وہ متن کے بارے میں شکوک پیدا کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خطوط تبلیغی نہ تھے، بلکہ حقیقی نکتہ نظر سیاسی رہا ہوگا۔ ان خطوط کے ذریعے مدینے کی اسلامی ریاست کو سرسری طور پر متعارف کرایا گیا ہوگا یا پھر ان کے ذریعے اس پر دپیگنڈے کی تردید کرنا مقصود ہوگا جو قریش نے ان ممالک میں کیا ہوگا یا ان حکومتوں کو قریش کی مدد سے باز رکھنا مقصود رہا ہوگا۔

یوں ہوا ہوگا یا یوں نہ ہوا ہوگا۔ یہ سب مفروضات ہیں جن کی کوئی بنیاد نہیں۔ ہم شاہان عالم کو اس قدر بے خبر تھوڑے نہیں کر سکتے کہ ۶۲۸ء تک انہیں یہ بھی خبر نہ ملی ہو کہ ان سے ملحقہ ملک عرب میں گزشتہ اٹھارہ ائیس سال سے کیا عظیم انقلاب برپا ہو رہا ہے۔ اس انقلاب کی حقیقی نوعیت کیا تھی اور اس کی کامیابی خود ان کے ملک کو کس انداز سے متاثر کر سکتی تھی۔

قیصر ہرقل جب ایران کے ہاتھوں شکست پر شکست کھا رہا تھا تو ۶۱۲ء میں بیت المقدس مع مقدس صلیب کے اس کئے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد سورۃ روم اترتی جس میں بشارت دی گئی کہ روم اگرچہ مغلوب ہو گیا لیکن چند برسوں میں پھر غلبہ حاصل کر لے گا۔ یہ بشارت کوئی راز نہ تھی اور اس بشارت میں سب سے بڑھ کر خود ہرقل کو دلچسپی ہو سکتی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ نو دس سال کا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہرقل تک یہ بشارت نہ پہنچی ہو۔ اور پھر جب ۶۲۲ء سے اس نے ایران کو پے در پے شکستیں دینا شروع کیں اور ۶۲۸ء میں اس نے آخر کار کسری کو دست گرد سے بھی نکال باہر کیا تو اسے اس بشارت کی صداقت کا کس قدر شہدات سے احساس ہوا ہوگا۔ اور اگر اسے اس ذات کی طرف سے ایک خط ملے جس کے توسط سے یہ بشارت ملی تھی تو اس کا رد عمل سوائے عزت و تکریم کے اظہار کے اور کیا ہو سکتا تھا۔

اسی طرح کسریٰ کو بھی قرآن کی ان آیات کی اطلاع مل سکتی تھی جن میں اس کے مخالف کی کامیابی کی بشارت دی گئی تھی۔ جب تک اسے شکست نہ ہوئی ہوگی، اس وقت تک وہ اسے انوہ سمجھتا رہا ہوگا لیکن شکستوں کے بعد جب تلخ حقیقت سامنے آئی تو کڑوے گھونٹ پینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا ہوگا۔ ایسے میں اگر اسے کوئی خط ملے تو اس نے تلخی کے اظہار کے سوا اور کیا کیا ہوگا۔

رہی یہ بات کہ خطوط لکھے گئے کہ نہیں، تو یہ تو اظہار من الشمس ہے کہ تحریر ہوئے تھے۔ اسی خط کے جواب کے ساتھ مقوقس، والی مصر، نے حصہ تحائف اور دو معزز قبطی خواتین بھی بھیجیں جن میں سے ایک ام المومنین حضرت ماریہ قبطیہ تھیں۔ جب ایک خط کی تاریخی حقیقت کو نہیں جھٹلایا جاسکتا تو دیگر خطوط کی حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا ہونا چاہیے۔

اب رہی یہ بات کہ ان خطوط کا مضمون کیا رہا ہوگا تو واضح رہے کہ حضور ﷺ کا مشن اسلام کی تبلیغ تھا۔ قرآن کے الفاظ میں مقصد بعثت اور مدعائے نزول قرآن یہ تھا،

لِيُنذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا وَيُحَقِّقَ الْقَوْلَ عَلَى الْكَافِرِينَ ۝

(تا کہ متنبہ کرو ہر اس شخص کو جو زندہ ہو، اور ثابت ہو بات منکروں پر) (سورۃ یس)

لہذا اگر شاہان عالم کو تبلیغی خطوط نہ تحریر ہوتے تو تبلیغ کا حق ادا نہ ہوتا۔ جب مشن ہی تبلیغ حق تھا تو ان خطوط کی نوعیت تبلیغی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخر بادشاہوں کو دعوت حق دینے میں کیا امر مانع ہو سکتا تھا۔ جلالی شاہی، اجنبیت، فاصلے، معاشرتی تفاوت، انتقامی کارروائی کا خدشہ، یہی تو وہ کیفیات ہو سکتی ہیں جو پیغام حق پہنچانے میں رکاوٹ بن سکتی تھیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی سربراہ اس قسم کے ہر احساس کس قدر سے بلند تر ہوتے ہیں۔ رعب شاہی انہیں اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں رکھ سکتا۔ حضرت ابراہیم و نمرود، حضرت موسیٰ اور فرعون، حضرت دانیال اور بخت نصر، سمون اور شاہ فلسطی، حضرت یحییٰ اور ہیرود، حضرت عیسیٰ اور پیلطس، ان میں سے ہر ایک کے درمیان سارے کے سارے تفاوت موجود تھے، لیکن شاہوں کا جلال نبوت کی عظمت کو نہ گہنا سکا۔ ان کی فوجی طاقت اعلائے کلمۃ الحق کو روکنے سے قاصر رہی۔ ان کی انتقامی کارروائیوں کے خوف سے تبلیغ متاثر نہ ہوئی۔ جلال خداوندی کے آگے جلال شاہی گرد ہوتا ہے۔ معاشرتی تفاوت بے معنی ہی شے ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حضوری اور معینیت جو مقام عطا کرتی ہے اس کے آگے دنیا اور اس کا ہر معاشرتی نظام بیچ نظر آنے لگتا ہے۔

پچھلے ابواب میں ہم نے دیکھا کہ عہد وسطیٰ کا پوپ خود کو شہنشاہ سے اعلیٰ و برتر تصور کرتا تھا۔ پاپا کا کوڑا شہنشاہوں کی پیٹھ پر صدیوں چنخا رہا۔ وہاں معاشرتی تفاوت، شاہی جلال اور اس کی انتقامی کارروائیوں کا خدشہ رکاوٹ کیوں نہ بنا؟ شاید اس کا جواب یہ ہو کہ پوپ کے لیے یہ شہنشاہ اجنبی نہیں تھے۔ اگر ایک شہنشاہ مخالف بھی ہو جاتا تو معاشرہ پوپ کی حفاظت کرنے کے لیے تیار تھا۔ معاشرے کی جانب سے مکمل تحفظ نبی اکرم ﷺ کو بھی حاصل تھا۔ لہذا بات صرف اجنبیت کی رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ ایسی کوئی شے نہیں جو تبلیغ کی راہ میں رکاوٹ بن سکے۔ سلطان محمد فاتح ہر اعتبار سے انجیئیس سلویس کے لیے اجنبی تھے۔ ان دونوں میں متذکرہ بالا تفاوت پوری شدت کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

سے پایا جاتا تھا۔ سلطان فاتح تھا اور یورپ کی مہر طاقت اسکے آگے سرنگوں ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود پوپ انیسیس سلوینس نے انہیں عیسائیت قبول کرنے کے لیے جو خط لکھا وہ گزشتہ باب میں نظروں سے گزر چکا ہے۔ لہذا اجتماعیت اور معاشرتی تفاوت ایسی کوئی شے نہیں جس کے باعث یہ باور کیا جاسکے کہ شاہان عالم کو خطوط نہیں لکھے جاسکتے تھے۔

کسریٰ کے نام خط: کسریٰ کو لکھے گئے خط کے بارے میں دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ کسریٰ کو نہیں مل سکا تھا۔ کیونکہ جس وقت یہ خط روانہ کیا گیا اس وقت تک کسریٰ کو قتل کیا جا چکا تھا۔ کسریٰ کا قتل ۶۲۸ء کے موسم خزاں میں (cf. Encyclopedia Britanica; article 'Heracilus', Vol. 4, p.520) ہوا۔ تاہم خزاں کے کس مہینے میں ہوا اس کا تعین نہیں ہے۔ حسب ذیل قرآن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ماہ اکتوبر کے اواخر یا نومبر کے اوائل میں ہوا ہوگا۔

۱۔ یروشلم پر قبضے کے بعد کسریٰ نے اصلی صلیب جس پر حضرت عیسیٰ کا [مفروضہ] مصلوب ہونا بیان کیا جاتا ہے، مدائن منتقل کر دی۔ جس کے باعث عیسائی دنیا میں کہرام برپا ہو گیا۔ اسی کی بازیابی کے لیے ۶۲۲ء سے شدید جنگیں شروع ہوئیں۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'True Cross', Vol. 22, p. 273)

۲۔ پے در پے شکستوں کے باعث جنوری ۶۲۸ء میں کسریٰ اپنا شاہی محل دست گرد اور پایہ تخت مدائن چھوڑ کر اصفہان منتقل ہو گیا۔ اس کے بعد عوام اور فوج میں مدد ملی پھیلنے لگی۔ اور بالآخر اسے اپنے بیٹے کے حق میں تاج و تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے چار دن کے بعد اسے قید خانے میں قتل کر دیا گیا۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'Khosrau II Pervez', Vol 13, p.334)

۳۔ کسریٰ کے جانشین قباد (دوم) یا شیروہ کی مدت حکومت صرف چھ ماہ ہے۔ اس نے اس درمیان روم سے صلح کی اور وہ صلیب جو کسریٰ پر ویز لے آیا تھا معاہدے کی رو سے واپس کی جسے ایک بڑی تقریب میں ہرقل نے ۶۲۹ء میں وصول کر کے بیت المقدس میں نصب کیا۔

(مقبول بیگ، تاریخ ایران، صفحہ ۲۲۷، لاہور، ۱۹۶۷ء)

مارچ ۶۲۹ء میں ہرقل نے اپنے آپ کو فاتح پایا لیکن ایرانیوں سے بازنطینی علاقے خالی کرانے کی بات چیت کہیں جون ۶۲۹ء میں مکمل ہوئی (Montgomery Watt; Mohammed at Medina p.114)۔ اور ستمبر میں ہرقل کی فتح کا جلوس قسطنطنیہ میں داخل ہوا۔

چونکہ یہ صلح قباد دوم نے کی تھی، اور اس کا عہد حکومت چھ ماہ تھا، اگر یہ سمجھا جائے کہ بازنطینی علاقے خالی کرانے کی بات چیت اس کے عہد میں ہوئی تھی تو وہ جون ۶۲۹ء میں زندہ تھا۔ اس اعتبار سے اس کی تخت نشینی اور کسریٰ کی موت دسمبر ۶۲۸ء میں ہوئی ہوگی اور اگر یہ تصور کیا جائے کہ اس نے صرف ہرقل کو فاتح تسلیم کیا تو بھی وہ مارچ ۶۲۹ء کے بعد مرا۔ اور اس اعتبار سے اس کی تخت نشینی اور کسریٰ کی موت اکتوبر، نومبر ۶۲۸ء یا اس کے بعد ہوئی ہوگی۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

صلح حدیبیہ مارچ ۶۲۸ء کا واقعہ ہے۔ اور کسریٰ کو خط صلح حدیبیہ کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔ پس صلح حدیبیہ کے بعد کسریٰ سات سے نو ماہ تک زندہ رہا۔ اگر اس کی موت کا زمانہ خزاں کا موسم تسلیم کر لیا جائے تو بھی اکتوبر ۶۲۸ء تک اس کا زندہ رہنا ثابت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے نامہ مبارک کا اس تک نہ پہنچنا تعجب انگیز ہے۔ نامہ مبارک کا چاک کرنا اس کی پریشان حالی، شکست خوردگی اور جھجھلاہٹ کا نتیجہ تھا۔ اگر یہ نامہ مبارک کسریٰ تک نہ پہنچا ہوتا تو خط کی توہین کی کہانی کم از کم کوئی مسلمان تو نہ گھڑ سکتا تھا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ کسریٰ نے اپنے یمنی گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ ارسال کنندہ کو گرفتار کر کے روانہ کیا جائے۔ چنانچہ اس نے اس مقصد کے لیے ایک چھوٹا دستہ مدینہ بھیجا جس نے اپنی آمد کی غرض بھی خدمت نبوی میں بیان کی۔ یہ واقعہ اگر حقیقی نہ ہوتا تو کسی اعتبار سے اس قابل نہ تھا کہ اسے نبی کریم ﷺ سے منسوب کیا جاتا۔

فتح مکہ: صلح حدیبیہ کی ایک شرط کے مطابق بدوی قبائل کو یہ آزادی تھی کہ مسلمانوں یا قریش میں سے جسے چاہیں اپنا حلیف مقرر کر لیں۔ چنانچہ بنو بکر نے قریش کے اور بنو خزاعہ نے مسلمانوں کے حلیف ہونے کا اعلان کیا۔ یہ صلح دس سال کے لیے ہوئی تھی اور اس میں دشمنی کے ہر اظہار سے گریز کا طرفین نے عہد کیا تھا۔ معاندین نے اس صلح کو ختم کرنے کا الزام مسلمانوں پر لگایا ہے، حالانکہ یہ صلح خود ملتے والوں نے ختم کی تھی۔ اس قسم کا الزام تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی دانستہ کوشش ہے۔

بنو خزاعہ پر، جو مسلمانوں کے حلیف تھے، بنو بکر نے شب خون مارا اور حدود حرم میں ان کا قتل عام کیا۔ بنو بکر کا یہ شب خون نہ صرف قریش کے علم میں تھا بلکہ ان کی شبہ پر ہی مارا گیا تھا۔ اس میں بنو خزاعہ کے سربراہ آردہ افراد نے بھی بدل کر حصہ لیا۔ اس حملے کے لیے نوفل بن معاویہ (عدی) نے خفیہ طور پر ہتھیار فراہم کیے اور یہ ہتھیار قریش کے تھے۔ اس سازش میں قریش کے رؤساء میں سے سہل، عکرمہ بن ابوجہل اور صفوان بن لعینہ بھی شریک تھے۔ قتل و خونریزی کے بعد قریش نے دکھاوے کے لیے بیچ بچاؤ بھی کیا، جنگ بند کرانی اور بنو بکر کو شہر سے نکالا۔

خزاعہ نے مدینہ پہنچ کر شب خون کی اطلاع حضور ﷺ کو دی۔ معاہدہ صلح کی خلاف ورزی کر کے قریش نے اس کا احترام ختم کر دیا تھا۔ اب صورت یہ رہ گئی تھی کہ،

۱۔ مقتولین کا خون بہا ادا کیا جاتا، بشرطیکہ قریش کا غرور اسکی اجازت دیتا اور یہ بنو خزاعہ کے لیے بھی قابل قبول ہوتا۔

۲۔ قریش بنو بکر کے حلف سے دست برداری کا اعلان کرتے تاکہ مسلمان ان کو ان کے کیسے کی سزا دیتے۔

۳۔ قریش ہتھیار ڈال دیتے یا جنگ کرتے۔

پہلی دو صورتیں قریش کے لیے قابل قبول نہیں تھیں۔ تیسری صورت یعنی جنگ کی قریش میں سکت نہ رہ گئی تھی۔ اسی لیے ابوسفیانؓ بلا تاخیر ملتے سے مدینہ پہنچے تاکہ کسی نہ کسی صورت اس صلح نامہ کی تجدید کر سکیں۔

ابوسفیان کی تجدید صلح کے لیے مدینے آمد اس امر کا ثبوت ہے کہ قریش نے جارحیت کی تھی اور ان کے ہاتھوں معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی تھی، اور وہ اس کے نتائج کو نالمانا چاہتے تھے۔ ان حقائق کی روشنی میں معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام مسلمانوں پر لگانا محض نا انصافی ہے۔

وفد طائف: فتح مکہ، جنگ حنین اور محاصرہ طائف کے بعد عرب کے گوشے گوشے سے خدمت نبوی میں وفود حاضر ہونے لگے۔ یہ سارے وفود ان عرب قبائل کے تھے جو مکمل طور پر دائرہ اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے۔ گوان سب کا مقصد اطاعت قبول کرنا تھا، لیکن اپنی جاہلی حمیت کے باعث اطاعت قبول کرنے سے پیشتر کچھ نہ کچھ مراعات کے طلب گار تھے۔ چنانچہ وفد طائف نے جو مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی ان میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ کچھ عرصے کے لیے ان کے بتوں کو باقی رہنے دیا جائے، اور ارکان عبادت میں انہیں رخصت دی جائے۔ اس وفد کی حاضری اور اسکے مکالموں کو معاندین نے ایک بدترین ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ جسے ہم اسپرنگر کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ (نعود باللہ)

”طائف کے بنو ثقیف نے اسلام لانے کے لیے چند شرائط پیش کیں۔ اول یہ کہ ان کا بت ’لات‘ تین سال تک باقی رہنے دیا جائے۔ اور اس مدت میں انہیں نماز کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔

محمد ﷺ نے جواب دیا کہ یہ مدت بہت طویل ہے۔ مزید برآں نماز کے بغیر دین ہی کیا ہے۔ اس پر نمائندوں نے اپنے مطالبات میں نرمی پیدا کی۔ اور آخر کار کافی رد و قدح کے بعد معاہدہ فریقین میں یہ شرائط طے ہوئیں کہ بنو ثقیف عشر ادا نہیں کریں گے، جہاد میں حصہ لینے سے مبرا ہوں گے اور نماز میں سجدہ نہیں کریں گے۔ ان کا بت ’لات‘ ایک سال تک باقی رہنے دیا جائے گا۔ اور اس مدت کے بعد انہیں مجبور نہ کیا جائے گا کہ خود اپنے ہاتھوں سے اسے تباہ کریں۔“

لیکن..... کو اب بھی تذبذب تھا۔ وہ رائے عامہ سے خوفزدہ تھے۔ اس پر وفد کے نمائندوں نے کہا کہ اس خیال کو آپ اپنے فیصلے میں رکاوٹ نہ بننے دیجیے۔ اگر عرب آپ سے پوچھیں گے کہ آپ نے اس قسم کا معاہدہ کیسے کیا تو آپ کو تو صرف یہ کہنا ہے کہ ایسا اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا گیا ہے۔ یہ استدلال اس نبی کو قابل قبول نظر آیا۔ اور انہوں نے حسب ذیل رسمی معاہدہ املا کرنا شروع کیا۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ رسول اللہ ﷺ اور بنو ثقیف کے درمیان یہ معاہدہ طے پایا ہے کہ موخر الذکر عشر و زکوٰۃ ادا کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ نہ ہی وہ جہاد میں حصہ لیں گے۔ اور نہ.....“

لیکن جب وہ یہ الفاظ ادا کر رہے تھے تو شرم و ندامت نے سلسلہ کلام منقطع کر دیا۔ ثقیف کے ایک نمائندے نے فوراً لقمہ دیا کہ ”اور نہ ہی وہ نماز میں سجدہ ادا کریں گے۔“

لیکن جب..... پھر بھی خاموش رہے تو نمائندے نے کاتب سے کہا کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں لکھو۔ کیونکہ یہ بات طے ہو چکی ہے۔ کاتب نے نبی کی طرف دیکھ کر ان کا حکم جاننا چاہا۔ لیکن اس درمیان عمرؓ، جواب تک خاموش تماشا شائی بنے ہوئے تھے، غیض و غضب میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی تلوار بے نیام کر کے چلائے تو نے

رسول اللہ ﷺ کے دل کو مملہ رکھ دیا۔ اللہ تم لوگوں کو واسلہ نعم کرے۔ اُقیقہ کے نمائندے جزبہ ہو کر بولے: ہمارا خطاب تم سے نہیں، ہم تو محمد ﷺ سے مخاطب ہیں۔
 'نہیں، نے آخر کار کہا۔ میں اس قسم کا کوئی معاہدہ نہیں کروں گا۔ تمہیں یا تو بلا کسی شرط و رخصت اسلام قبول کرنا ہوگا یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔' بنو ثقیف نے درخواست کی کہ 'اچھا ہمیں صرف چھ مہینے کی مہلت دیجیے کہ لات کو باقی رکھیں۔'

'نہیں!،' صرف ایک ماہ اور اس کے بعد ایک گھنٹے کے لیے بھی نہیں۔ یہ وفد اپنے قبیلے میں اس عالم میں پہنچا کہ اس کے ساتھ مسلمان سپاہی تھے جنہوں نے خواتین کی آہ و بکا کی فضا میں لات کو تباہ کر ڈالا۔'

(Springer; Life of Mohammad, p.186: Dozy R.; Spanish Islam, pp.18-19)

اسپرنگر نے یہ ذرا مدلل پہنچ کر کے عہد وسطیٰ کی تمام خرافات کو جمع کر دیا۔ ایک ایسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ گویا ایک نبی گفتگو نہیں کر رہا ہے بلکہ ایک سوداگر قسم کا آدمی سودے بازی کر رہا ہے، جس کے نزدیک دین کی کوئی اہمیت نہیں۔ ذاتی اقتدار کے لیے دین تک میں رد و بدل کرنے کے لیے تیار ہے۔ وحی محض ایک بہانہ ہے، جسے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ زبان کا کوئی پاس نہیں۔ استقامت کا کوئی وجود نہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ یہ ساری کارروائی مجمع عام میں ہو رہی ہے۔ گویا عام لوگ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام اور رسالت کی حقیقت کیا ہے۔ اور اس کے باوجود وہ سب منسلک ہیں۔ گویا اس پورے مجمع میں ایک بھی مخلص نہیں۔ مذہب کی آڑ میں نفس پرستوں کا ایک گروہ ہے جو بے بسوں کو مجبور کر رہا ہے کہ ان کی اطاعت کریں۔ حضرت عمرؓ کا جو کردار پیش کیا گیا ہے اس سے تاثر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس گروہ کو خائف کیے ہوئے ہیں اور اپنی ہیبت کے ذریعے حکمت عملی کی راہ متعین کرتے ہیں۔ رسالت اس گروہ کی قیادت نہیں کرتی بلکہ گروہ کے زبردست افراد رسالت کی رہنمائی کرتے ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ یوں جبراً اسلام قبول کرنے والے بنو ثقیف موقع ملنے پر اسلام سے منحرف کیوں نہیں ہوئے۔ وصال نبوی کے بعد جب عرب قبائل عام طور پر منحرف ہوئے تو ثقیف اسلام پر کیوں استقامت کے ساتھ قائم رہے؟ اگر ان واقعات میں ذرا سی بھی صداقت ہوتی تو ثقیف کو انحراف کرنے والوں کی صفِ اول میں ہونا چاہیے تھا۔ اس ڈرامے کی بھی وہی اصلیت ہے جو واقعہ غرانیق کی ہے۔ جس طرح غرانیق کی آڑ میں یہ کہا گیا کہ کفر کی حالت کی طرف لوٹ جانے کی خواہش تھی، اسی طرح یہاں الفاظ استعمال کیے بغیر وہی دعویٰ دہرایا جا رہا ہے۔ غرانیق کے حق میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ ناکامیوں، مظالم اور بے بسی کے باعث وقت کے تقاضوں سے صلح کرنے کی خواہش تھی، لیکن فتح مکہ کے بعد جب اقتدار قدم بوسی کر رہا تھا، اس قسم کی مصلحت کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔

کردارِ نبوی

اخلاقی الزامات

دنیا کی کسی اور عظیم شخصیت کو اس قدر متہم نہیں کیا گیا جتنا مغرب نے سرکارِ دو عالم ﷺ کو کیا۔ اس کی وجوہات ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اس کی تہہ میں صرف نفرت، دشمنی اور انتقام کا رفرما ہے۔ منفی جذبات ہمیشہ انصاف کا خون کرتے ہیں۔ مغرب کو حضور ﷺ کے بارے میں حقائق کا علم ہو چکا ہے لیکن تعصب اور دشمنی ابھی تک ذہن سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس کے باعث اس صدی میں بھی ایسی تحریروں کی کمی نہیں جن میں اخلاقی الزامات دہرائے گئے ہیں۔

اخلاقی الزامات کی فہرست طویل ہے۔ ہر صاحبِ قلم نے اس میدان میں ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے ایسے الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں جن کی صحت کا کوئی ثبوت تک نہیں ہے۔ مثلاً ڈوزی نے نسل پرستی کی تہمت لگائی اور یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ حضور ﷺ یعنی قبائل سے متفرق تھے۔ (R. Dozy; Spanish Islam, pp.16-17)۔ اپنے دعوے کے ثبوت میں تحریر کیا کہ کسی نے یہ شعر پڑھا کہ ”میرے آباء واجداد نہ مضر کی اولاد ہیں نہ ربیعہ کی“، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”تیری بدبختی کہ تیرا نسب تجھے اللہ اور اس کے رسول سے محروم کرتا ہے“۔ نہ جانے اس جملے میں نسل پرستی یا یمنی قبائل کی دشمنی کا پہلو کہاں سے ملا۔ شعر کے مفہوم اور ارشادِ نبوی کی مناسبت سے مترشح ہوتا ہے کہ مخاطب نے یہ شعر اسلام سے ریز کی خاطر پڑھا۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ میں یا میرے آباء واجداد مضر یا ربیعہ کی اولاد تو ہیں نہیں کہ میں کسی قریشی نبی پر ایمان لے آؤں۔ ہاں اگر یہ دعویٰ نوت کوئی ایسا شخص کرتا جو میرے قبائل کا ہوتا تو میں اسے قبول کر لیتا۔ اس کے جواب میں حضور ﷺ نے نسل پرستی کو بدبختی فرمایا۔ کیا تم ہے کہ تاریخِ انسانی میں جس شخص نے سب سے پہلے نسل پرستی اور نسلی غرور کی بیج کئی کی، اسی پر نسل پرستی اور قبائلی منافرت کی آبیاری کی تہمت دھری جا رہی ہے۔

اسی طرح اس نے یہ بھی افترا پروازی کی کہ حضور ﷺ نے طبقاتی منافرت کا اظہار فرمایا، اور وہ کسانوں سے نفرت کرتے تھے۔ اور یہ کہ ہجرت کے بعد اس نفرت کو ترک کرنا پڑا۔

(R. Dozy; Spanish Islam, p. 17)

اس نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ طبقہ اشرافیہ کے طرفدار تھے۔ (حوالہ بالا، صفحہ ۲۵)۔ ڈوزی کی یہ پریشان خیالی حقائق سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ کیونکہ عرب معاشرہ طبقات میں نہیں بلکہ قبائلی سسٹم میں کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

منقسم تھا۔ اشرافیہ یا کسان نام کے کسی طبقے کا کوئی وجود نہ تھا۔ معاشرے کی تقسیم پیشے کے اعتبار سے نہیں تھی۔ شرافت کا تعلق پیشے سے نہ تھا بلکہ ذاتی کردار سے تھا۔ عدل و انصاف، شجاعت و جواں مردی، ایثار و مروت، مہمان نوازی، ایفائے عہد اور قبائلی عصبيت وہ جوہر تھے جو شرافت کی تعمیر کرتے تھے۔ یہ ساری قدریں انفرادی ہیں، جن کا تعلق کسی طبقے سے نہیں ہوتا۔ [مغربی معاشرے میں یہ خصوصیات صرف شرفاء یعنی جاگیرداروں میں ہی متوقع ہوتی تھیں۔] معاندین کے یہ الزامات محض اس معاشرہ سے لاعلمی کی پیداوار ہیں۔

اس قسم کے انفرادی الزامات سے قطع نظر اجتماعی انداز کے الزامات کو چار بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- ۱۔ صدق و خلوص کی نایابی
 - ۲۔ خوں ریزی
 - ۳۔ عیش کوئی
 - ۴۔ عیش کوئی مذہب کا اجراء
- آنے والے صفحات میں ان الزامات کا تفصیلی جائزہ لیا جا رہا ہے۔

خلوص

عدم خلوص کے لیے مغرب نے بہرہ پ یا جعل (Imposture) کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ انیسویں صدی تک یہ الزام تو اتر کے ساتھ ملتا ہے۔ کارلائل نے اس الزام پر انیسویں صدی میں کاری ضرب لگائی۔ جس کے بعد اہل قلم اس الزام کی تردید پر مائل ہونے لگے۔ تاہم یہ الزام پوری طرح ساقط نہ ہو سکا۔ اس الزام کا لب لباب یہ ہے کہ حقیقی وحی کا وجود نہ تھا۔ یہ عدا تصنیف کر لی جاتی تھی۔

جب معاندین کے لیے بہرہ حرف ادا کرنے کی گنجائش نہ رہ گئی تو انہوں نے پرانی شراب نئی بوتلوں میں انڈیلی اور اسی پرانے نظریے کو نئے الفاظ عطا کر کے کہا کہ یہ وحی کوئی بیرونی القاء نہ تھی، بلکہ لاشعور کی پیداوار تھی جسے غلط فہمی کی بنا پر ملکوتی پیغام تصور کیا گیا۔ عہد وسطیٰ میں جو کام بہرہ پ کے لفظ سے لیا جاتا تھا عہد حاضر میں وہی کام عدم خلوص کے الفاظ سے لیا گیا۔ لیکن مقصد کلام وہی رہا کہ وحی، نبوت، قرآن اور دین، ہر شے کو مخ کیا جائے۔

خلوص ایک ذہنی کیفیت ہے جس کی تصدیق کا اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں کہ مدعی کے قول و فعل کا جائزہ لیا جائے۔ ان کے اثرات کے احاطے کی کوشش کی جائے۔ اور پھر اس سے جو نتائج حاصل ہوں ان کی بنیاد پر کوئی رائے قائم کی جائے۔ لیکن اس معاملے میں جو دقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب کے تصور عظمت میں بعد المشرقین ہے۔ مغرب اپنی عیسائی قدروں پر دیگر عظام کو پر کھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک ہر عظیم آدمی کو گوری رنگت کا ہونا چاہیے۔ مذہباً وہ عیسائی ہو اور صرف عیسائی ہی نہیں کیتھولک عیسائی ہو۔

اس کی زبان لاطینی ہو، اس کی فکر افلاطونی ہو۔ رہن بہن مغربی ہو، کردار افسانوی ہو۔ اگر یہ سب اس میں نہ ہو تو اس کی عظمت ناقابلِ تسلیم رہتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ان خود ساختہ پیالوں پر کوئی غیر مغربی پورا اثر ہی نہیں سکتا۔ یہ خامی پینے کی ہے، اور جب تک پینے کی خامی دور نہ ہوگی، پینش کی صحت کا تھوڑا بھی نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس خود پرستی کے پیش نظر عدم خلوص کا دعویٰ ایک کھوکھلا نعرہ ہے۔ حضور ﷺ جس معاشرے سے تعلق رکھتے تھے اس میں انہیں اور ان کے گھرانے کو باعزت مقام حاصل تھا۔ وحی کے نزول کے بعد انہیں گونا گوں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وحی نے ان کی جان و مال، عزت و آبرو کو آزمائش میں ڈالا۔ انہیں معاشرے سے منقطع کر کے، محض چند افراد پر مشتمل مظلوم اقلیت بنادیا۔ ان حالات میں بظاہر وحی نے کوئی دنیاوی فائدہ نہیں پہنچایا۔ نہ مقتدر رطبوں کی نظر میں عزت میں کوئی اضافہ ہوا۔ نہ کوئی مالی یا معاشی سہولت پیدا ہوئی۔ اس کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ اپنے مسلک پر سختی سے قائم رہے۔ مکی زندگی کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کی استقامت کون سا جذبہ عطا کر رہا تھا۔ کیا خلوص کے سوا کوئی دوسری قوت تھی جو ان مصائب کو بطیب خاطر جھیلنے کی طاقت عطا کر رہی تھی۔ ترن تنہا پورے معاشرے سے وہی شخصیت ٹکرا سکتی ہے جو اپنے مشن سے بے پناہ مخلص ہو۔

مکی دور کے بعد مدنی دور بھی ایک پر آشوب دور تھا۔ ہر طرف سے بیرونی دباؤ پڑ رہا تھا جسے ہر قیمت پر برداشت کیا جا رہا تھا۔ ان متحارب قوتوں میں مکہ اختلاف کیا تھا۔ محض مذہب۔ اگر اس میں کسی مرحلے پر ذرا سی چلک پیدا کر دی جاتی تو اختلافات نہ رہ جاتے۔ اصولوں کی سر بلندی کے لیے جان کی بازی سوائے خلوص کے اور کوئی دوسرا جذبہ نہیں لگا سکتا۔ اس مشن کی ابتدا اللہ کے نام سے ہوئی، اور دم واپس بھی زبان پر اللہ اللہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ بعثت تا وصال ہر لمحہ اللہ کی بندگی میں بسر ہوا۔ مکی دور ہو کہ مدنی، پوری حیات طیبہ اسلام کی ترویج و استحکام کے لیے وقف رہی۔ اسلام ہی مقصد حیات تھا۔ نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے اہل و عیال، اور اپنے متعصبین کی ساری توانائیاں اسی مقصد کے حصول کے لیے صرف ہوئیں۔

دوٹی اور دشمنی کا معیار اسلام تھا۔ کامیابی اور ناکامی کا تعین اسی میزان سے ہوتا تھا۔ جو قانون شریعت نازل ہوتا وہ صرف امت کے لیے ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ آپ ﷺ خود اس پر سب سے زیادہ سختی سے عمل پیرا ہوتے تھے۔ ان کا ہر عمل امت کے لیے مثال بن گیا۔ اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے، بات چیت، مخاطب، آداب، اخلاق، کردار، عبادت، ریاضت، حسن سلوک، غرضیکہ زندگی کی معمولی سے معمولی جزویات میں ان کی پیروی باعث سعادت ہوئی۔

یہ ان ہی کی عملی زندگی کا نمونہ تھا جسے اپنا کر ایسے لوگ سامنے آئے، جن کی عظمت، تقدس اور بلند کرداری ناقابلِ تردید ہے۔ جنہوں نے مسلسل ایک ہزار سال تک عالم انسانیت کی مثالی قیادت کی۔ تہذیب انسانی سے ارتقائی منازل طے کرائیں۔ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی اسوۂ حسنہ آج تک ہر مسلمان کے لیے، اور بہت سے غیر مسلموں کے لیے بھی، معراجِ کردار ہے۔ آج بھی عالم اسلام کردارِ نبوی میں وہی

تقدس محسوس کرتا ہے جو قرونِ اولیٰ میں محسوس کیا جاتا تھا۔ آج بھی ان کے نام پر مرعہ، ہر مسلمان کے لیے باعثِ افتخار ہے۔ ازران کے نقشِ قدم کی پیروی کرنا زندگی کا ماحصل ہے۔ ذاتِ نبوی کا، اور ان کے بعد مسلمانوں کی زندگی کا مطمح نظر دنیا نہیں بلکہ ہمیشہ آخرت رہا۔ آخرت کے لیے کسی ایسے عمل کا تقہر بھی نہیں کیا جاسکتا جس میں خلوص نہ ہو۔

حسنِ عمل کی تابانی اگر نظارہ سوز ہے تو جلوہ اقبالِ دنیا کے فکر کو منور کیے ہوئے ہے۔ ذاتِ نبوی کے سوا دنیا کا کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا جس کا بولا ہوا ہر لفظ محفوظ رکھا گیا ہو۔ جس کے ہر قول کو تقدس اور حُب بالذکر حیثیت حاصل ہو۔ انہوں نے جس بات سے منع فرمایا وہ حرام ہوگئی۔ جس بات کا حکم دیا وہ واجب ہوگئی۔ جس کا حکم نہ دیا لیکن روا رکھا وہ جائز ہوگئی۔ جس بات پر چہرہ مبارک پر ناگواری کے اثرات ظاہر ہوئے وہ مکروہ ہوگئی۔ نگاہِ شوق جن کی جنشِ ابرو پر ہر دم لگی رہتی۔ نظمِ ہستی جن کی آنکھوں کے اشاروں سے بننا اور نکھرتا۔ جن کا تکلم قانون، جن کی خاموشی تکلم، جن کی چشم پوشی جوازِ اباحت، جن کی توجہ حاصلِ دو عالم، جن کا ارجاء اشارہِ محرومی، جن کا تہنم بہاروں سے گراں بہا، جن کی توری کے بل تقدیر آدم کی شکن۔ کیا رسولِ عربی ﷺ کے علاوہ بھی دنیا کے کسی اور شخص کے افعال و اقوال کو یہ مرتبہ میسر آسکا؟

یہ سب محض اس لیے ہوا کہ پیغمبرِ اسلام ﷺ خلوص کا پیکر تھے۔ انہیں جو پیغام ملا وہ پیغامِ حق تھا۔ ان کی لازوالِ حقانیت عبدِ حقیر کے شک و شبہ سے بلند و بالا تھی۔ ان پر ایمان لانے والے لاکھوں تھے جو ان پر دل و جان سے فدا تھے۔ انہیں کسی لمحہ یہ گمان بھی نہ گزرا کہ کردارِ نبوی کے کسی پہلو پر شک و شبہ کی کوئی گنجائش بھی ہو سکتی ہے۔ اگر خلوصِ محلِ غور ہوتا تو یہ لوگ اس غیر متزلزل ایمان کے حامل نہ ہوتے جو اصحابِ رسول اللہ ﷺ کا خاصہ ہے۔ اصحاب کے بعد کروڑوں فرزندانِ توحید نے اپنے رسول ﷺ کے اقوال و افعال کو مشعلِ راہ بنایا۔ ان پر قلبِ صمیم کے ساتھ عمل پیرا ہوئے۔ ہر کسی تشویش کے انہیں متاعِ ایمان بنائے رکھا۔ اسلامی معاشرہ اندھی تقلید کرنے والوں کا معاشرہ نہیں بلکہ علماء، عقلاء اور حکماء کا معاشرہ رہا ہے۔ یہ علماء، عقلاء اور حکماء سب کے سب اصحابِ فکر و نظر رہے ہیں۔ یہی مغرب کے حقیقی اساتذہ ہیں۔ ان میں سے ایک بھی فرد نہیں جس نے کبھی خلوصِ نبوی پر شک و شبہ کیا ہو، اس کے برعکس انہوں نے رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ وحی کو علم و حکمت سے برتر تسلیم کیا۔ ان کے ادنیٰ غلام ہونے پر فخر کیا کہ عقل و حکمتِ حقانیت سے جنم لیتی ہیں، اور حقانیت کے سرچشمے صرف انبیاءِ کرام ہوتے ہیں۔ ان کے خلوص پر شک و شبہ حقانیت پر شک و شبہ کے مترادف ہے۔

عدمِ اخلاص کی تہمت جس معاشرے نے باندھی، یہ اب وہاں بھی قابلِ اعتناء نہیں رہ گئی ہے۔ تاریخِ انسانی کی ہر تہذیب متوازن فکر کے بل بوتے پر پروان چڑھی ہے۔ یہ فکر مذاہب نے فراہم کی۔ چنانچہ تمام عالمی تہذیبیں مذاہبِ عالیہ کی مرہونِ منت ہیں اور مذاہبِ عالیہ مذاہبِ وحی ہیں۔ مذاہبِ عالیہ کے ابطالِ نبی اور رسول کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر بطل نے مذہبی فکر کو وحی قرار دیا۔ اب اگر وہ مذاہبِ انبیاء پر وحی آتی تھی اور یقیناً آتی تھی، کیونکہ اس کی تردید انسانیت کی توہین ہوگی، تو کوئی وجہ نہیں کہ عظیم ترین عالمی مذہب کے

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

بطل اعظم پر نزول وحی نہ ہوتا ہو۔ اگر دیگر مذاہب کے انبیاء کو اپنی وحی کی صداقت پر یقین تھا اور انکی وحی داخلی نہیں بلکہ خارجی تحصیل حقانیت تھی تو کسی ایک عالمی مذہب کو اس سے مستثنیٰ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے۔

وحی کا مدعا ہمیشہ تعمیر انسانیت ہوتا ہے۔ وہ وحی جس نے عظیم ترین تعمیری کارنامہ انجام دیا، کیسے نظر انداز ہو سکتی ہے۔ وحی کے وجود اور اسکے تعمیری کردار سے صرف وہ شخص انکار کر سکتا ہے جس کا ذہن صرف مادہ کی حد تک محدود ہو۔ لیکن دیگر انبیاء کے لیے وحی کے قائل کی زبان سے محمد ﷺ کے لیے اس کی تردید باعث حیرت ہوتی ہے۔ یہودیت اور عیسائیت، دونوں ہی مذاہب وحی ہیں۔ کیا حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا مقصد سوائے فلاح و بہبود کے کچھ اور تھا؟ ان میں کون سی ایسی بات پائی جاتی ہے جس کے باعث انہیں تو نص تسلیم کیا جاتا ہے اور آنحضرت ﷺ ان سے کس اعتبار سے مختلف ہیں کہ ان کے خلوص پر شبہ کیا جائے۔ ان دونوں کی جد و جہد سے کہیں زیادہ سخت جد و جہد رسول عربی ﷺ کی ہے۔ کامیابی کے اعتبار سے سابقہ تمام انبیاء سے کامیاب ترین۔

اگر ناکامی سے خلوص متاثر نہیں ہو سکتا تو کامیابی کیسے خلوص کو متاثر کر سکتی ہے۔ سب نے صعوبتیں برداشت کیں، سب ایک ہی منزل کے راہی تھے۔ سب مذاہب عالیہ کے بانی ہیں۔ سب نے ان کے قیام کے لیے اپنی اپنی زندگی وقف کی۔ سب ایک خدا کے قائل، اسکے احکام کے پابند، سب کی تعلیمات مشترک، سب انسانیت کے عظیم محسن، ان کے بغیر انسانیت ناممکن، پھر کسی کے ساتھ انفرادی سلوک کیوں۔ اگر ایک پر خلوص ہے تو اسی راہ کے دوسرے مسافر کے خلوص پر شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہرگز نہیں ہو سکتی۔

خون ریزی

کردار نبوی پر دوسرا اہتمام خون ریزی کا ہے۔ اس لفظ کو ایسے عامیانہ انداز میں استعمال کیا جاتا ہے جو خون ناحق اور خونِ برحق کی تمیز مٹا ڈالتا ہے۔ اس الزام کے ضمن میں معاہدہ شفی، جو کہ دینی اور سفاکی جیسی گھناؤنی ہمتیں بھی لگائی جاتی ہیں۔

اس الزام کا محرک عیسائیت میں کارفرما شہوت ہے۔ جس کے باعث دنیاوی اور دینی دائرہ کار جدا جدا تصور کیے گئے ہیں۔ دنیاوی مشاغل اور اذکار کو دین سے جدا اور منافی سمجھا جاتا ہے۔ لشکر کشی، جہاد، کشور کشائی اور ہندوستان مملکت کو جزو سیاست قرار دیا جاتا ہے۔ اور سیاست کو دین سے خارج کر کے کلہاڑی دنیا سے متعلق کیا جاتا ہے۔ جبکہ اسلام میں یہ سارے امور دین سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اقدار کا یہ تضاد فیصلوں کے اختلاف کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔

عیسائیت کو امن پرست مذہب کہا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کے دو جدا گانہ رخ ہیں۔ دنیا میں جس قدر خون ریزی عیسائیت نے کی ہے اس کے آگے چنگیز اور اس کے جانشینوں کی خون ریزی گرد ہے۔

عیسائیت نے دو جدا گانہ صحائف کو اپنا رکھا ہے۔ عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید۔ ان دونوں کی تعلیمات اور عقائد میں شدید قسم کا تضاد پایا جاتا ہے۔ عہد نامہ قدیم کا خدا 'رب الافواج' ہے۔ اس کے تمام احکامات جنگی نوعیت کے ہیں۔ وہ اپنے اور اسرائیل کے دشمنوں کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ مفتوحہ علاقوں میں قتل عام، لوٹ مار اور آتش زنی کا حکم دیتا ہے۔ جبکہ عہد نامہ جدید کو خوریزی اور آدم کشی سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ عہد نامہ جدید کا خدا امن و سلامتی کا نشان ہے۔ مسکنت اور مظلومیت کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک رخسار پر چھو کھانے والے کو اپنا دوسرا رخسار بھی پیش کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اس تضاد سے عیسائیت بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ مغرب کی ہر قوم جنگجو ہے۔ جنگوں میں غالب آتی ہے تو عہد نامہ قدیم کے احکامات کی تعمیل میں ممکنہ خوریزی سے باز نہیں رہتی۔ اور اگر مغلوب ہوتی ہے تو عہد نامہ جدید کے احکامات یاد آتے ہیں۔ فریق غالب پر خوریزی کے الزامات عائد کر کے عیسائی اصولوں کی خلاف ورزی کا وادیا کرتی ہے۔ اسی دورخی کا شاطرانہ استعمال مستشرقین نے اسلام کے خلاف کیا۔ مغربی خوریزی پر شادمانی کا اظہار کیا اور اسے خداوند کی نصرت اور یسوع کی فتح مندی سے تعبیر کیا۔ عیسائیت کی سر بلندی کا نام دیا۔ اپنی جنگوں کو اور ان میں کی جانے والی بے پناہ خوریزی کو مقدس جنگ کہا۔ لیکن دوسروں کی مقدس جنگ کو عہد نامہ جدید کی روشنی میں سنگین جرم قرار دیا۔

عہد نبوی کی جنگیں

یہ درست کہ عہد نبوی میں جنگیں ہوئیں، جن میں طرفین کے افراد کام آئے۔ لیکن ان میں سے کوئی جنگ اس لیے نہیں ہوئی کہ اسلام کو خوریزی مطلوب تھی۔ جنگ بدر تا جنگ احزاب، ساری کی ساری جنگیں مدافعت تھیں۔ سب کی سب جنگیں، یا تو مدینے کے قریب یا خود مدینے میں لڑی گئیں۔ مقام جنگ اس بات کا ثبوت ہیں کہ حملہ آور مشرکین تھے، جو اسلام کے مٹانے کے ارادے سے آئے تھے۔ مدافعت کا حق دنیا کا ہر قانون تسلیم کرتا ہے۔ خود عیسائی کتب مقدسہ اس حق سے انکار نہیں کرتیں۔ عہد نامہ قدیم کی رو سے فیصلہ کیا جائے تو پورا مشرک عرب گردن زدنی قرار پائے گا۔ خود عہد نامہ جدید کی رو سے مسلمانوں کو مدافعت کا پورا پورا استحقاق میسر تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آخری ایام میں حضرت عیسیٰ نے اپنے حواریوں کو مسلح ہونے کی تلقین فرمائی تھی۔ یہ تلقین یقیناً مدافعت کے لیے تھی۔ چنانچہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاگردوں نے اس تلقین پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیا تھا۔

اناجیل میں تلوار یا مدافعت کا عمومی طور پر کوئی ذکر نہیں، لیکن حضرت عیسیٰ کی گرفتاری کے موقع پر نہ صرف شاگردوں کے پاس تلوار نظر آتی ہے، بلکہ ایک شاگرد حضرت کی مدافعت میں حملہ آور ہوتے بھی نظر آتا ہے۔ ”اور دیکھو یسوع کے ساتھیوں میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر اپنی تلوار کھینچی اور سروار کا بن کے نوکر پر چلا کر اس کا

کان اڑا دیا۔ اور یسوع نے کہا کہ اپنی تلوار میان میں کر لے کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کیے جائیں گے۔“ (متی ۲۶، ۵۱-۵۲)

اس سے یہ تو ثابت ہے کہ یسوع کے شاگرد ہتھیار بند ہونے لگے تھے۔ اور ان میں سے ایک نے مدافعت میں پیش قدمی بھی کی۔ لیکن امن عامہ کے پیش نظر حضرت عیسیٰ نے اسے روک دیا، کہ گیارہ شاگردوں کی مدافعت قطعی بے اثر ہوتی، اور اسے رومی حکومت بغاوت کا رنگ دے کر بے گناہ عوام کا قتل عام کر ڈالتی۔

اسلام کی ان مدافعتی جنگوں کے بعد دیگر جنگیں بھی جارحیت نہ تھیں، بلکہ وقت کی ضرورت تھیں۔ فتح مکہ قریش کی عہد شکنی کا نتیجہ تھی، جو بلا خوزیزی کے حاصل ہوئی۔ اور فتح کے بعد بجائے خوزیزی کے دشمنوں کو امن و سلامتی کا تحفہ عطا ہوا۔ اور ساتھ ہی دنیا کی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہوا کہ مفتوح خود فاح افواج کے ساتھ شامل ہو کر انتہائی جوش و خروش کے ساتھ مشترکہ دشمن کے خلاف جنگ میں حصہ لینے اور اپنی جائیں قربان کرنے لگے۔ جنگ حنین بھی مدافعتی جنگ تھی۔ صحرائی قبائل اور طائف کے باشندوں نے اجتماع کر کے بلا کسی جواز کے مکے پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ مسلمانوں کے لیے تو تھا ہی، خود مشرکین مکہ کے لیے بھی ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مشرکین مکہ نے بھی رضا کارانہ اس جنگ میں شرکت کی۔ فتح مکہ کے بعد قبائلی و فود کی آمد شروع ہوئی، جنہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ اس کے بعد عرب میں اسلام کی عملی مخالفت ختم ہو گئی۔ اس دور میں جتنی مہمات قبائل کی طرف روانہ کی گئیں، ان کی نوعیت تادیبی کارروائیوں کی تھی۔ انہیں پولیس ایکشن کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان مہمات میں شرکاء کی تعداد دس [۱۰] سے لیکر تین سو [۳۰۰] تک پائی جاتی ہے۔ اس قلیل تعداد کی مہم سے جنگ کا تصور تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس دور میں صرف ایک جنگی مہم تبوک کی نظر آتی ہے، جس کے شرکاء کی تعداد تیس ہزار [۳۰،۰۰۰] بیان کی جاتی ہے۔ لیکن یہ مہم بھی جارحانہ نوعیت کی نہ تھی۔ کیونکہ اطلاع ملی تھی کہ سرحد پر روم کی افواج مجتمع ہو رہی ہیں۔ اور جب لشکر تبوک پہنچا تو وہاں دشمن کا کوئی اجتماع نہ پا کر واپس آ گیا۔ اگر یہ اقدام مدافعتی نوعیت کا نہ ہوتا تو پرامن طور پر واپسی کے بجائے شام کی طرف پیش قدمی ہونی چاہیے تھی۔

یہود سے برتاؤ: خوزیزی کی تہمت کے ثبوت میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، وہ یہود مدینہ سے برتاؤ اور خصوصاً بنو قریظہ کے خلاف سخت کارروائی کے واقعات ہیں۔ ان واقعات کے محرکات کو مسخ کر کے اس طرح پیش کیا جاتا ہے گویا یہود مدینہ بے قصور، معصوم اور پرامن شہری تھے، اور ان پر صرف خوزیزی کے چسکے میں ظلم توڑے گئے تھے۔

ہجرت کے وقت مدینہ میں اور آس پاس بہت سے یہود آباد تھے۔ کچھ یہودی قبائل ایسے تھے جو سلاً عرب تھے اور غالباً انہوں نے صرف یہودی اعتقادات اپنا لیے تھے۔ مثلاً بنو مرجم (شاخ بنو ملی)، بنو معادیہ (شاخ بنو سلیم)، بنو ناعمرہ اور جندہ (یعنی عرب)، بنو ثعلبہ (غسان)، بنی زعورہ (غسان) وغیرہ۔ یہودی النسل قبائل عام طور پر صرف تین تسلیم کیے گئے ہیں۔ بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ بقیہ سب کے سب سلاً عرب تھے۔ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

عرب یہود میں اہم ترین قبیلہ بنو ندیل کا تھا، جو بنو قریظہ کا ہمسایہ بھی تھا۔ بنو قریظہ صنعت اور تجارت پیشہ تھے، جبکہ بنو قریظہ اور بنو نضیر زراعت پیشہ اور باغبان تھے۔ مدینے میں یہود کی مضبوط وفا کی حیثیت تھی۔ ان کے [۵۹] قلعے یا اطعم تھے۔ جبکہ اوس و خزرج کے قلعوں کی تعداد صرف پندرہ [۱۵] تھی۔ ان یہودی قبائل کے معاہدات اوس و خزرج سے تھے۔ بنو قریظہ اور بنو نضیر عبد اللہ بن ابی لہیع بن خزرج کے حلیف تھے اور بنو قریظہ کا معاہدہ حلف اوس کے ساتھ تھا۔ عربوں میں حلف کی حیثیت برادری میں شمولیت کے برابر تھی۔ وہ اپنے حلیف کی مدد ہر قیمت پر کرتے تھے۔ خود یہود میں وجہ اشتراک ان کا مذہب تھا۔ پس مدینے کے یہود خود اپنی قوت اور حلیفوں کی قوت کے پیش نظر کسی طور کمزور پوزیشن میں نہ تھے۔

ہجرت سے قبل، اوس اور خزرج کی آپس میں ٹھنی رہتی تھی، جس میں انہیں شدید جانی اور مالی نقصانات اٹھانے پڑتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہود نے اپنے حلف کے باوجود کبھی ان میں سے کسی کے ساتھ جنگ میں شرکت نہیں کی۔ کہا یہی جاتا ہے کہ یہود آپس میں ملے ہوئے تھے اور ان کی سیاست یہ تھی کہ عرب آپس میں لڑتے رہیں اور سیاسی اور معاشی طور پر ان کے زیر نگین رہیں۔ اس مقصد کے لیے یہود اپنی جوڑ توڑ کی مہارت کو پورے طور پر کام میں لاتے تھے۔

ہجرت کے بعد، مدینے کی حدود میں یہود کی یہ سیاست ختم ہو گئی۔ اوس و خزرج کا اتحاد اور الحاق، ان کے لیے ایک صدمہ ہی تھا۔ پھر بھی انہیں یہ امید تھی، اور اس کے لیے انہوں نے سازشیں بھی شروع کر دی تھیں، کہ جلد ہی قریش مدینے پر حملہ کر کے اسلام کا قلع قمع کر دیں گے۔ اسی لیے انہوں نے خود اسلام کی عملی مزاحمت کی زحمت نہیں کی۔

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد ہی یہود کے ساتھ امن سے رہنے کا معاہدہ، جو میثاق مدینہ کہلاتا ہے اور جس کا تذکرہ پچھلے ابواب میں ہو چکا ہے، کر لیا تھا۔ اس معاہدے پر یہود اس لیے مجبور تھے کہ اوس اور خزرج کے ساتھ ان کے پرانے معاہدے چلے آ رہے تھے، اور میثاق مدینہ انہی کی تجدید تھا۔ یہودی ان معاہدوں کی تجدید سے صرف اس لیے انکار نہیں کر سکتے تھے، کہ اوس و خزرج کی قیادت ان کے ایک نئے معاہدہ (رسول اللہ ﷺ) کے پاس آ گئی تھی، یا انہوں نے بت پرستی ترک کر دی تھی۔

جنگ بدر میں قریش کی فیصلہ کن شکست، جہاں سارے عرب کے لیے ایک حیران کن بات تھی، وہیں یہود مدینہ کے لیے بھی مایوس کن تھی۔ انکی ساری امیدیں خاک میں مل گئی تھیں، لیکن انہیں پھر بھی یہ امید تھی کہ شاید آئندہ برس، جس کا اعلان قریش کر گئے تھے، ان کی مراد بر آئے۔ یہود کی معیشت چونکہ مقامی عربوں کے ساتھ لین دین پر قائم تھی، اس لیے خود عملی اقدام کر کے وہ اسے تباہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال انہوں نے اپنی ریشہ دہانیاں جاری رکھیں، اور اس ضمن میں قریش کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھا۔

بنو قریظہ کا اخراج: بدر کے بعد آنحضرت ﷺ نے یہود کو دعوتِ اسلام دی، جس میں فرمایا کہ

وہ یہود، اللہ سے خوف کرو اور اسلام اختیار کرو۔ کہیں تمہارا حشر بھی قریش جیسا نہ ہو۔ فرمانِ نبوی کے یہ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہودی معاندانہ حرکتیں اتنی بڑھ چکی تھیں کہ وہ بھی قریش کے حشر کے سزاوار ہو چکے تھے۔ ورنہ اسلام لانے کے لیے کبھی کسی پر دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ اس دعوت کے جواب میں بنی قینقاع نے جو الفاظ استعمال کیے وہ جنگ آمیز اور بغاوت کے مترادف تھے۔ انہوں نے کہا:

”اے محمد ﷺ، تم سمجھتے ہو کہ ہم بھی تمہاری قوم (قریش) کی طرح ہیں۔ تم اس دھوکے میں نہ رہنا۔ تم نے ایسے لوگوں سے مقابلہ کیا جنہیں جنگ سے کوئی واقفیت نہ تھی، اسی لیے ان پر قابو پا لیا۔ ہماری حالت یہ ہے کہ واللہ اگر ہم تم سے جنگ کریں گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم خاص قسم کے لوگ ہیں۔“

مملکت کے سربراہ کی تنبیہ پر یہ جواب سوائے اعلان بغاوت کے اور کچھ نہ تھا۔ پھر جلد ہی ایک نہایت شرمناک واقعے نے فساد کی صورت اختیار کر لی۔ ایک عرب خاتون قینقاع کے بازار میں خرید و فروخت کرنے آئی۔ ایک یہودی سار نے اس کا چہرہ بے نقاب کرنا چاہا۔ جب اس خاتون نے انکار کیا تو اس شریر نے اس خاتون کے لہادے کا سرا کسی چیز سے کچھ اس طرح باندھ دیا کہ وہ جب انھی تو کپڑے پہن گیا۔ اس طرح اس کی سر بازار رسوائی ہوئی۔ خاتون کی فریاد پر وہاں موجود ایک مسلمان صحابی مشتعل ہو گئے اور انہوں نے سار پر حملہ کر کے اسے قتل کر ڈالا۔ رد عمل میں یہود نے ان مسلمان کو شہید کر ڈالا۔ فضا کشیدہ تھی ہی، مقتول مسلمان کے اقرباء اور ان کے حلیف بگڑے تو پوری یہودی آبادی مسلم آبادی پر ٹوٹ پڑی۔

اس فساد کو ختم کرنے کے لیے بنو قینقاع کے خلاف تادیبی کارروائی کی گئی تو انہوں نے قلعہ بندی کر کے حالت جنگ پیدا کر دی۔ ان کا محاصرہ کر لیا گیا، جس کے بعد بنو قینقاع نے ہتھیار ڈالے اور انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔ بنو قینقاع کے مدنی حلیفوں میں عبداللہ بن ابی، عبادہ بن صامت، المیز بن قدامہ، محمد بن مسلمہ اور سعد بن معاذ تھے۔ سوائے عبداللہ بن ابی کے بقیہ تمام حلیفوں نے اعلانیہ اظہارِ برأت کیا۔ عبداللہ بن ابی نے اس قبیلے کے حق میں وکالت کی اور خدمت نبوی میں اپیل کی کہ بنو قینقاع کے ساتھ نرم سلوک کیا جائے۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی کی شہ پر بنو قینقاع شیر مور ہے تھے۔ اسے توقع رہی ہوگی کہ یہود جب فساد برپا کریں گے تو بنو قینقاع کے عرب حلیف ان کی مدد کو اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس طرح یہود، خزرج اور اوس کی مجموعی قوت کے سامنے مہاجرین بے بس ہو جائیں گے اور مدینے کا اقتدار ان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ لیکن قینقاع کی سرکشی اس قدر قابلِ مذمت تھی کہ نہ تو دوسرے یہود نے ان کا ساتھ دیا اور نہ ہی کوئی عرب حلیف ان کی مدد کو پہنچا۔ سعد بن معاذ اور عبادہ بن صامت (سر دارِ اوس) کے اعلانِ برأت نے اوس کے حلف کو ختم کر دیا۔ جس کے باعث عبداللہ بن ابی بے دست و پا ہو گیا کہ اگر وہ اپنے قبیلے خزرج کے ہم خیال افراد [منافقین] کو یہودی مدد کے لیے صف آرا کرتا بھی ہے تو مسلمانوں کے آگے اس کی پیش نہ جاتی۔ اس لیے وہ بھی دبا گیا۔ بنو قینقاع کو جب خلافِ توقع عرب حلیفوں سے کوئی مدد نہ مل سکی تو انہیں ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔

کعب بن اشرف کا قتل: کعب کا باپ بنو طے کا ایک عرب اور اسکی ماں بنو نضیر کی ایک یہودن تھی۔ اس کا قیام مدینے کے جنوب میں ایک گڑھی میں تھا۔ مسلمانوں سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ بدر میں قریش کی شکست، کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

اور روسائے قریش کے قتل ہونے کی خبر پہنچی تو رنج و الم کا مجسمہ بن گیا۔ اس نے کہا کہ بخدا اگر محمد (ﷺ) نے قریش کے ان لوگوں کو قتل کر دیا ہے تو زمین کا شکم اسکی پشت کی بہ نسبت بہتر ہے۔ پھر جب اس خبر کی تصدیق ہو گئی تو مکے پہنچا۔ مقتولین بدر کے پرسوز مرچے کہے۔ قریش کے قبائل میں انتقام کی آگ بھڑکائی اور مسلمانوں کی ہجو کی۔ پھر مدینہ لوٹا تو اس درمیان بنو قریظہ کا اخراج ہو چکا تھا۔

بنو قریظہ نے فساد کی ابتداء ایک خاتون کی بے حرمتی سے کی تھی۔ کعب نے بھی اپنے اشعار کا موضوع مسلم خواتین کو بنایا۔ ان سے متعلق مکروہ اشعار لکھے اور ہر ممکنہ حد تک دل آزاری کی۔ چند ماہ پیشتر بنو قریظہ کا اخراج کے باعث جو فساد رُفَع ہوا تھا کعب اسی فتنے کو پھر ہوا دے رہا تھا۔ کعب بن اشرف کی ہر حرکت بغاوت اور غدار کی مترادف تھی۔

غدار کے جرم کی سزا، رومی قانون سے لے کر برطانوی قانون تک ہر دور میں موت رہی ہے۔ برطانیہ کے مرڈر ایکٹ ۱۹۶۵ء کے تحت موت کی سزا منسوخ کر دی گئی لیکن غدار کے جرم پر سزائے موت کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں مختلف ادوار میں غدار کی جو تعریضیں بیان کی گئی ہیں ان کی رو سے حسب ذیل افعال غدار کی تصور ہوتے تھے۔

(cf. Encyclopedia Britanica; article 'Treason', Vol. II, p.197)

- ۱۔ کسی قوم یا حکمران سے ایسے فعل کے ذریعے دغا کرنا جو اسکی سلامتی کے لیے خطرناک ہو۔
- ۲۔ کسی آئینی حکومت کے خلاف بغاوت کی تنظیم کرنا یا ترغیب دینا۔ اپنے فعل، تحریر و تقریر کے ذریعے لوگوں کو مشتعل کرنا۔
- ۳۔ نویں صدی کے قانون کی رو سے ہر وہ فرد سزائے موت کا مستحق تھا، جو بادشاہ (سربراہ) کی جان کے خلاف کسی کارروائی میں ملوث ہو۔
- ۴۔ غدار کی صحیح تعریف چودھویں صدی سے قبل متعین نہ تھی۔ اس لیے اس کا انحصار بادشاہ اور اس کے منصفین کے فیصلے پر تھا۔
- ۵۔ انگلینڈ میں ۱۳۴۸ء کے قانون میں بغاوت اور غدار کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی رو سے بادشاہ کے دشمنوں سے وفاداری، دشمنوں کو مدد یا سہولت، بہم پہنچانا غدار کی تعریف میں آتا ہے۔
- ۶۔ امریکی قانون کی رو سے ریاست کے خلاف جنگ، دشمنوں سے وفاداری، دشمنوں کو کسی قسم کی مدد یا سہولت بہم پہنچانا غدار کی تعریف میں آتا ہے۔

غدار کے لیے نیت بھی ضروری نہیں۔ لاعلمی اور سادگی میں سرزد ہو جانے والے اعمال غدار کی شمار بھی غدار میں ہی ہوتا ہے۔ دشمنوں کو غدار پہنچانا بھی غدار کی تعریف میں آتا ہے۔

کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

غذاری کو عرب بھی ناقابلِ معافی جرم سمجھتے تھے۔ ابو رغال ثقفی نے ابرہہ کے لشکر کی رہنمائی کی ذمہ داری قبول کی اور مکہ پہنچنے سے پہلے ہی مر گیا۔ اس غذا کی قبر کو صدیوں سنگسار کیا جاتا رہا۔ (ابن ہشام، صفحہ ۴۴)

خود مغربی قوانین قدیم و جدید کی رو سے کعب بن اشرف ایک غذا تھا جس کی سزا موت تھی۔ یہ سزائے موت اسے ایک ایسی مملکت نے دی جس کے پاس، اس وقت تک نہ اپنی باقاعدہ فوج تھی نہ پولیس۔ نہ جلیطخانے تھے نہ محکمہ جات دارو گیر۔ اگر سزا کی تعمیل کا ذریعہ ہو سکتا تھا تو یہی کہ مجرم کی سزا کا اعلان کر دیا جائے اور اس پر عملدرآمد کروانے کے لیے رضا کاروں کی خدمات طلب کی جائیں۔ کعب بن اشرف کے معاملے میں ایک دقت یہ بھی نظر آتی ہے کہ اسے گرفتار بھی نہ کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس کا قیام ایک قلعے میں تھا۔ اس قلعے پر گرفتاری کے لیے حملہ پورے قبیلہ کو جنگ میں ملوث کر دیتا۔ ایک فرد کے جرم میں قبیلہ کو سزا نہ دی جاسکتی تھی۔ انصاف کا تقاضا تھا کہ سزا دی جائے۔ جلد اور فوری سزا۔ شور و غوغا ہو نہ نقص امن۔ حفاظت و بہبود کا تقاضا تھا کہ اسے قتل کیا جائے۔ پس اسے انصار کی پانچ افراد کی جماعت نے قتل کر کے سزا دے دی۔ آج بھی ساری دنیا کی حکومتیں اپنے مفرد مجرموں کو جیسے بن پڑے سزا دیتی ہیں، اور اس میں اخلاقیات کہیں بھی حائل نہیں ہوتی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یہودیوں نے نازیوں کا پچاس سال تک پیچھا نہیں چھوڑا۔

ابورافع سلام بن ابوالحقیق: ایک اور یہودی ابورافع سلام بھی کعب بن اشرف کے ہم پلہ مفسد اور سرکش تھا۔ اس نے آس پاس کے قبیلوں کو بھڑکا کر مسلمانوں کے خلاف صف آرا کیا۔ اس کی غذا اری اور بغاوت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے بھی کعب کے انداز میں سزائے موت دی گئی۔

ان دونوں غذا اروں کے قتل کا حکم چونکہ خود حضور ﷺ نے صادر فرمایا اور لوگوں کو انکے قتل کرنے کے لیے روانہ کیا اس لیے انصاف کے تقاضوں سے آنکھیں بند کر کے مغرب ان واقعات کو کمرہ رنگ میں پیش کرتا ہے۔ اگر اس قسم کے واقعات مغرب میں پیش آتے تو انہیں انصاف کا نام دیا جاتا۔ یورپ کے اکثر ممالک، خصوصاً انگلستان کا قانون، باغی اور غذا اروں کے قتل کا اختیار ہر شہری کو عطا کرتا ہے۔ سولن نے اپنے شہر کی حفاظت کے لیے یونانیوں کو مختار کیا کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا کریں۔ لیکن یہی عمل اگر مسلمان اپنے معاشرے اور اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے اختیار کریں تو یہ ایک جرم قرار دیا جاتا ہے۔

بنو نضیر کا اخراج: بنو نضیر کا ایک سال بعد یہود کا دوسرا قبیلہ بنی نضیر بھی مدینے سے شہر بدر کیا گیا۔ میثاق مدینہ کی رو سے خوں بہا کی ادائیگی تمام شرکائے میثاق کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ جب احد (مارچ ۶۲۵ء) کے بعد عرب قبائل نے مدینے کے خلاف کارروائیاں کرنی شروع کیں۔ بنو عامر (شاخ بنو سلیم) کے رئیس ابوالبراء کی درخواست پر مدینے سے مبلغین کی ایک جماعت جو تقریباً چالیس افراد پر مشتمل تھی، روانہ کی گئی۔ یہ جماعت جب بزمعونہ پر پہنچی تو بنو سلیم کے قبائل، ذکوان، رعل وغیرہ نے اس جماعت پر حملہ کر کے ایک فرد عمرو بن امیہ کے سوا سب کو شہید کر ڈالا۔ بقیۃ السیف عمرو بن امیہ نے مدینہ لوٹے ہوئے راستے میں بنو عامر کے دو افراد کو پایا اور انہیں اپنی جماعت کے قتل کے انتقام میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چونکہ بنو عامر جماعت مبلغین

کے قتل میں شریک نہ تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کے دونوں مقتولین کا خوں بہا دینا طے فرمایا۔ خوں بہا کی رقم شرکائے معاہدہ سے فراہم کی جانے لگی۔ بنوفیسر سے بھی انکے حصے کی رقم طلب کی گئی۔ ابن ہشام کے بیان کے مطابق بنوفیسر اور بنو عامر ایک دوسرے کے حلیف بھی تھے، جس کے باعث بنوفیسر کے تعاون سے یہ قضیہ آسانی کے ساتھ طے ہو سکتا تھا۔ چنانچہ حضور ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ بنوفیسر کے پاس گئے۔

اس واقعے سے آٹھ ماہ قبل کعب بن اشرف، جو بنوفیسر کا سردار تھا، قتل کیا جا چکا تھا۔ بنوفیسر اس واقعے کو بھولے نہیں تھے۔ اپنی ہستی میں رسول اللہ ﷺ کو موجود پایا تو بنوفیسر نے اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ حضور ﷺ کو ایک دیوار کے سائے میں بٹھایا اور حامی بھری کہ آپ جیسا چاہتے ہیں ویسا ہی کیا جائے گا۔ پھر یہود مشاورت کے بہانے سے کھسک لیے۔ جیسے جیسے دیر ہوتی گئی یہود کی نقل و حرکت مشتبہ ہونے لگی، اور آخر کار یہ یقین ہو گیا کہ یہ تاخیر محض کسی سازش کا حصہ تھی۔

سازش : قدیم سیرت نگاروں نے اس سازش کی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ چنانچہ ابن ہشام نے تحریر کیا، 'پھر بنوفیسر نے تخیل میں یہ مشورہ کیا کہ ایسا موقع پھر ہاتھ نہ لگے گا۔ محمد ﷺ کو زندہ نہ چھوڑو۔ چنانچہ ایک شخص عمرو بن جحاش کو اس کام پر آمادہ کیا کہ جس دیوار کے نیچے حضور ﷺ تشریف رکھتے تھے، دوسری طرف سے اس دیوار پر چڑھ کر وہ ایک بڑا پتھر حضور ﷺ پر گرا دے، تاکہ وہ (نعوذ باللہ) شہید ہو جائیں۔'

(سیرت ابن ہشام، باب بنوفیسر کی جلا وطنی، صفحہ ۴۰۵، مرتبہ اسماعیل پانی پتی)

ب: تاخیر حد سے بڑھی تو حضور ﷺ بغیر کسی کو اطلاع دیے مدینے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کسی شخص نے انہیں مدینے میں داخل ہوتے دیکھ کر ان اصحاب کو جا کر اطلاع دی جو بنوفیسر کی ہستی میں ہی آپ ﷺ کے منتظر تھے۔ اصحاب کی واپسی کے بعد آپ ﷺ نے محمد بن مسلمہ کے ذریعے تحدیدی پیغام روانہ فرمایا کہ بنوفیسر دس [۱۰] دن کے اندر مدینہ خالی کر دیں۔ پراسن طور پر مدینہ خالی کرنے کی صورت میں بنوفیسر کو یہ رعایت بھی دی گئی کہ ان کے باغات پر ان کی ہی ملکیت تسلیم کی جائے گی اور ان کی پیداوار پر ان ہی کا حق ہوگا۔

بنوفیسر میں مدینہ خالی کرنے کے معاملہ میں اختلاف پیدا ہوا۔ سلام بن مشکم اطاعت کے حق میں تھا، جبکہ حمزہ بن الخطاب اس کے خلاف تھا۔ ابھی فیصلہ نہ ہو پایا تھا کہ رئیس المنافقین ابن ابی کا پیغام پہنچا کہ گھبرانا نہیں، ہم تمہارے ساتھ ہیں، اور بدوی قبائل مدینہ پر حملہ کرنے کو تیار ہیں۔ لہذا یہود نے تحدیدی پیغام کو مسترد کر کے قلعہ بندی کر لی۔ محاصرہ ہوا جو پندرہ دن قائم رہا۔ بنوفیسر نے دیکھا کہ ابن ابی کچھ نہیں کر رہا اور کوئی بدوی قبیلہ مسلمانوں کے خلاف نہیں اٹھ رہا تو ان کی ہمت پست ہو گئی۔ ادھر مسلمانوں نے ان کے باغات کے کھجور کے درخت کاٹنے شروع کر دیے۔ ابھی صرف چھ درخت ہی کٹے تھے کہ بنوفیسر کو اپنی شررگ کنتی نظر آنے لگی کیونکہ باغات کے بغیر وہ زندہ نہ رہ سکتے تھے۔

مجبوراً انہوں نے باغات کی ملکیت باقی رکھنے کی شرط پر مدینے سے نکل جانے پر رضامندی ظاہر کی۔

لیکن چونکہ رعایت یہود ابتدا میں ہی مسترد کر چکے تھے اس لیے اس کے اعادہ سے انکار کیا گیا۔ پھر ان کی درخواست کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

پر یہ اجازت دی گئی کہ اسلحہ کے سوا، جائیداد منقولہ لے کر اونٹوں پر نکل جائیں۔ یہود نے اپنا مال و اسباب، یہاں تک کہ کھڑکی دروازے تک اکھاڑ کر اونٹوں پر لادے، اور جان بچ جانے کی خوشی میں، جشن مناتے ہوئے گاتے بجاتے مدینہ چھوڑ گئے۔

صورتحال کا تجزیہ: اس واقعے کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر معاندین سخت تنقید کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک جو جو بات جنگ بیان کی جاتی ہیں وہ نہایت بودی اور کمزور ہیں، کہ سازش کا کوئی ثبوت نہیں، اور الزام کی بنیاد محض وحی ہے۔ [حالت جنگ میں کون سی مملکت اپنے دشمنوں کے خلاف کارروائی کے لیے ثبوت فراہم کرتی ہے؟] گویا وحی جو ہمارے لیے سب سے معتبر ذریعہ ہے، ان کے لیے غیر معتبر ہے۔ تعصب اگر انہیں وحی پر یقین کی اجازت نہ دے تو اس میں کسی غیر کا تصور نہیں۔ ہمیں بہر حال انبیائے بزرگ اور حضرت عیسیٰ کی وحی پر کوئی شک و شبہ نہیں کہ انہیں اپنی زندگی کے آنے والے ایام کے بارے میں جو علم ہوا وہ بذریعہ وحی ہوا۔ اگر دانیال نبی کی پیشینگوئیاں اور یوحنا عارف کے مکاشفات جو صدیوں کا احاطہ کرتے ہیں، صحیح ہو سکتے ہیں تو سازش کے بارے میں یہ وحی بھی غلط نہیں ہو سکتی۔

وحی سے قطع نظر کئی شواہد ایسے ہیں جو اس سازش پر پوری پوری روشنی ڈالتے ہیں۔

۱۔ حضور ﷺ خون بہا کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ دوسرا مقصد جو بیان کیا جاتا ہے کہ حلیف ہونے کی حیثیت میں بنو نضیر اپنے حلیف بنو عامر سے اس قضیہ کو طے کرانے میں مدد دیں۔ ان دونوں معاملات میں صرف ہاں یا نا کا ایک لفظ کافی تھا۔ تاخیر کیوں کی گئی؟ یہ تاخیر کتنی زیادہ تھی، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کافی انتظار کے بعد حضور ﷺ مدینہ واپس تشریف لے آئے اور مدینے سے ایک شاہد نے جا کر اصحاب نبی کو انکی واپسی کی اطلاع دی۔ وہ بھی واپس آ گئے لیکن یہود کی یہ مشورت ختم نہیں ہوئی۔ یہودی ذہن اور سازش میں جو مناسبت ہے اس کے پیش نظر یہی کہا جاسکتا ہے کہ صرف وقت حاصل کیا جا رہا تھا کہ کچھ کر گزرنے کا کوئی موقع ہاتھ آ جائے، اور اس کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔

۲۔ دیوار پر سے پتھر گرا کر ہلاک کرنے کا طریقہ کار خالص یہودی طریقہ کار ہے۔ جس کی مثالیں خیبر اور قریظہ کے محاصرے میں بھی ملتی ہیں۔ بنو نضیر کے لیے الٹی میٹم غیر متوقع نہ تھا۔ ان میں دو گروہ تھے۔ ایک یقیناً اس سازش سے متفق نہ تھا اور اس کی مخالفت کے باعث ہی یہ تاخیر ہوئی ہوگی۔ لیکن دونوں گروہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ان کے ارادوں سے اگر مسلمان واقف ہو جائیں گے تو کیا ہوگا۔ اچنبھا تو انہیں صرف یہ ہوا ہوگا کہ راز مسلمانوں تک کیسے پہنچ گیا۔ اگر صورتحال غیر متوقع ہوتی یا یہود خود کو مجرم تصور نہ کرتے تو گفت و شنید کے ذریعے مصالحت کی کوشش ضرور کرتے۔ سلام بن مشکم اور حنی بن اخطب کے درمیان اطاعت قبول کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ زیر بحث نہ آتا۔

۳۔ مغربی تجزیہ نگاروں کے نزدیک صلح حدیبیہ تک حضور ﷺ کی پوزیشن مدینے میں مضبوط نہیں تھی۔ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ،

”بدرو اور جنگِ خندق کا درمیانی عرصہ ان کے لیے خاصا گراں رہا ہوگا۔ قرآن میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کا حکم، کم از کم چالیس مرتبہ دیا گیا ہے۔ شائد بار بار حکم کے باوجود لوگ پوری طرح اطاعت پر تیار نہ تھے اور اس پر اس لیے اصرار کیا جاتا رہا کہ اقتدار ان کے ہاتھوں میں پوری طرح مرکوز ہو جائے۔“ (Montgomery Watt; Mohammed at Medina, p.233)۔

وہ یہ تاثر دیتے ہیں کہ انصار کے رؤساء اب بھی مقتدر تھے۔ اگر تجزیہ نگاروں کا تجزیہ درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ احد میں شکست ہو چکی ہے۔ عرب قبائل دشمنی پر آمادہ ہیں۔ مدینے میں مسلم قوت کی ساکھ کو دھچکا لگ چکا ہے۔ مسلمانوں میں بھی اقتدار ابھی مرکوز نہیں ہے۔ ان نازک حالات میں بنوفصیر پر بلا وجہ فوج کشی کیسے ممکن ہو سکتی تھی۔ خود یہود مدینہ، یہود خیبر، اور یہود کے بدوی اور مدنی حلیف اس زیادتی کو برداشت کیسے کر گئے۔ یقیناً بنوفصیر کے جرائم اس سازش کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ جس کے باعث ان کے خلاف اس کارروائی پر کوئی ردِ عمل نہیں ہوا۔ اس کارروائی کے باعث مسلمانوں کا اقتدار مضبوط ہو رہا تھا، تو نہ صرف یہود بلکہ مشرکین قریش، منافقین مدینہ اور بدوی قبائل کے مفادات بھی مجروح ہو رہے تھے۔ ان سب کی خاموشی اس امر کی دلیل ہے کہ بنوفصیر اس سزا کے مستحق تھے۔ خود بنوفصیر بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ سلام بن مشکم اطاعت کا حامی نظر آتا ہے۔

۴۔ اس سازش کی تصدیق بنوفصیر کے ایک فرد کے اس اقدام سے ہوتی ہے جو اس نے مسلمان ہونے کے بعد کیا۔ ابن ہشام کے مطابق بنوفصیر کے دو افراد نے اسلام قبول کیا۔ ان میں سے ایک یامین بن عمیر بن کعب تھے۔ ایک موقع پر حضور نے یامین سے کہا: ”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے [چچا زاد] بھائی عمرو بن جحاش [بن کعب] نے میرے ساتھ کیا ارادہ کیا تھا“۔ اس پر یامین نے ایک شخص کو کچھ دے دلا کر عمرو بن جحاش کو قتل کروادیا۔

(سیرۃ ابن ہشام، باب بنوفصیر کی جلاوطنی، صفحہ ۴۰، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، لاہور، ۱۹۶۵ء)

پس وجوہات اتنی کمزور نہ تھیں جتنی مغربی علماء تصور کرتے ہیں۔ منافقین کے گروہ ان ہی یہود کی شہہ پر قائم رہے۔ پھر جیسے جیسے یہود کی قوت ختم ہوتی گئی، منافقین بھی کمزور ہوتے گئے۔ بنوفصیر کی دشمنی کا اندازہ کرنے کے لیے اتنا کافی ہوگا کہ مدینے سے اخراج ان کے لیے سہق نہ بن سکا۔ انہوں نے خیبر میں قیام کیا اور وہاں سے مدینے کی تباہی کے سامان کیے۔ انہوں نے جنگِ احزاب میں غطفان کو خیبر کی آدھی پیداوار کے عوض مدعو کیا۔ اس قبیلے کے سردار حنظل بن اخطب نے مدینے کے آخری یہودی قبیلے بنو قریظہ کو حضور ﷺ سے غداری پر اکسایا اور بنو قریظہ کے ساتھ ان کے قلعے سے گرفتار ہو کر مارا گیا۔

بنو قریظہ کی غداری : بنو قریظہ بھی میثاقِ مدینہ کے شرکاء میں سے تھے۔ مدینے کے جنوب میں ان کے

قلعے تھے۔ بنو قریظہ اور بنوفصیر کے برخلاف ان کا معاہدہ حلف اوس کے ساتھ تھا۔ بنوفصیر کی سرکشی کے درمیان کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

بنو قریظہ نے بھی حصہ لیا تھا لیکن اس وقت انہیں معاف کر دیا گیا تھا۔ جنگِ احزاب میں ابتدائاً ان کا رویہ مصالحانہ تھا۔ خندق کی کھدائی کے لیے اوزار فراہم کر کے انہوں نے مسلمانوں کی مدد کی تھی۔ جنگِ احزاب میں مسلمانوں کو ان کی جانب سے حملے کا خدشہ نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی پوری دفاعی قوت احزاب کے مقابلے میں تعینات تھی۔ جنوب کی سمت بنو قریظہ اور مدینہ کے درمیان کسی رکاوٹ یا دفاعی قوت کی تعیناتی کی ضرورت محسوس نہ کی گئی تھی۔ یہ صورتِ حال بنو قریظہ سے معاہدے پر دلالت کرتی ہے۔

جب احزاب نے مدینے کا محاصرہ کر لیا اور انہیں پیش قدمی کے لیے راہ نہ مل سکی تو جلاوطن قبیلہ بنو نضیر کے سردار خنی بن اخطب نے اپنے ہم مذہب بنو قریظہ سے رابطہ قائم کیا اور انہیں کسی نہ کسی طرح غدار پر آمادہ کر لیا۔ خنی کے مقاصد ڈھکے چھپے نہ تھے۔ احزاب کا اجتماع اس کی اور قریش کی دوزدھپ کا نتیجہ تھا۔ شمالی قبیلہ غطفان اور اس کی شاخوں فزارہ، ثعلبہ، اشجع اور سلیم کو وہی جنگ میں گھسیٹ کر لایا تھا۔ اس کی ساری محنت پر خندق نے پانی پھیر دیا تھا۔ ایسا عظیم اجتماع دوبارہ نہ ہو سکتا تھا۔ کامیابی کی شکل صرف یہ رہ گئی تھی کہ بنو قریظہ مدینے کے جنوب میں ایک نیا محاذ کھول دیں۔ یہ سمت صرف معاہدے کی بنیاد پر غیر محفوظ چھوڑ دی گئی تھی۔ چنانچہ بنو قریظہ نے احزاب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہ مدینے کے گرد و نواح کا جائزہ لینے لگے۔ ایسا ہی ایک گروہ حضرت حسان بن ثابت، شاعر نبوی کے قلعے تک جا پہنچا، جہاں عورتیں اور بچے مقیم تھے۔ اس کے ایک فرد کو جو قلعے کی دیوار تک آ پہنچا تھا، حضرت صفیہ بنت عبدالمطلب نے ٹھکانے لگایا۔

بنو قریظہ کی عہد شکنی کی اطلاع حضور ﷺ کو ملی تو آپ نے ان کے حلیف قبائل کے سرداروں کو دریافتِ حال کے لیے بنو قریظہ کے پاس بھیجا۔ جب یہ لوگ پہنچے تو گفتگو دور دور سے ہی ہوئی۔ بنو قریظہ قلعے کے اوپر تھے اور ان کے حلیف قلعے سے باہر۔ یہ اس امر کو واضح کرتا ہے کہ بنو قریظہ اپنے حلیف سرداروں سے بھی منحرف ہو چکے تھے۔ انصار کے سرداروں نے بنو قریظہ کو یاد دلایا کہ ان کا حضور ﷺ سے معاہدہ ہو چکا ہے جس پر عملدرآمد کے وہ پابند تھے۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ کون سے معاہدے کی بات کی جا رہی ہے اور یہ کس کے ساتھ ہوا تھا۔ محمد ﷺ کون ہیں۔ ان کے تو نام سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ [cf. Muir; Life of (Mohammed, Vol III, p.259)] اس گفتگو نے صورتحال میں کوئی شک و شبہ باقی نہ رہنے دیا۔

وہ قبیلہ جو اپنے شہر کی مدافعت سے بے پروا رہا، جس کے قلعے میں خنی بن اخطب جیسا جنگی مجرم موجود تھا، جو مملکت کے سربراہ سے بھی ناواقف تھا، ایسا سربراہ جس نے سب سے پہلے امن و امان قائم کرنے کے لیے نہ صرف مدینے کے قبائل بلکہ گرد و نواح کے مشرک قبائل سے بھی معاہداتِ امن کر رکھے تھے، اس کے ساتھ کیے گئے معاہدے سے لاعلمی کا اظہار، مدینے کی اس نازک صورتحال میں یہودی بنو قریظہ کی تخریبی سرگرمیاں، خود اپنے حلیفوں سے طعن و تشنیع، یہ ساری باتیں غدار کی کامنہ بولتا ثبوت ہیں۔

چنانچہ احزاب کی پسپائی کے فوراً بعد بنو قریظہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ تاخیر کا نہ ہونا بھی اس امر کی دلیل ہے کہ یہ محاصرہ صرف اس جنگ کی صورتحال کا نتیجہ تھا۔ پچیس دن کے محاصرے کے بعد بنو قریظہ نے اپنے قابلِ اعتماد حلیفوں سے مشورے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔

قبیلہ اوس سے بنو قریظہ کا معاہدہ حلف تھا۔ اس واضح غذاری کے باوجود اوس کے کچھ لوگوں نے بنو قریظہ کی سفارش کی۔ حضور ﷺ نے بنو قریظہ کے مقدمے کو ان کے حلیف اوس کے سردار سعد بن معاذ کے حوالے کیا تاکہ ان کے فیصلے کو اوس کے فیصلے کی حیثیت حاصل رہے اور مجرم کے حق میں یہ نہ کہا جاسکے کہ فیصلہ غیر جانبداری سے نہیں کیا گیا۔ جس طرح بنو قریظہ کے معاہدے میں خراج کا خیال رکھا گیا تھا اسی طرح بنو قریظہ کا معاملہ اوس کے فیڈر دفرمایا۔

حضرت سعد ابن معاذ جب احزاب میں شدید زخمی ہو چکے تھے اور علالت کے باعث زخموں کے خیمے میں زیرِ علاج تھے۔ اوس نے جب ان کے حکم قرار پا جانے کا اعلان سنا تو ان کے خیمے میں پہنچ کر انہیں سواری پر بٹھایا اور مجمع عام میں لائے۔ راستہ بھر بنی اوس ان سے کہتے رہے کہ اے ابوعمر اپنے حلیفوں کے معاملے میں اچھا فیصلہ کرنا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو اسی لیے حکم بنایا ہے کہ آپ ان کا اچھا فیصلہ کریں۔

جب ان کا اصرار بہت بڑھ گیا تو حضرت سعدؓ نے فرمایا، ”درحقیقت سعد کا وقت آ گیا ہے کہ وہ اللہ کے معاملے میں لوگوں کی ملامت کی پروا نہ کرے“۔ (سیرۃ ابن ہشام، غزوہ بنو قریظہ، صفحہ ۲۲۵)۔ ان کا یہ جواب سن کر بہت سے لوگ اسی وقت کھسک لیے اور حضرت سعدؓ کے فیصلے سے قبل ہی بنو قریظہ کے قتل کی خبر مشہور کر دی۔ حضرت سعدؓ نے حاضرین سے اپنے فیصلے پر من و عن عمل درآمد کرنے کا وعدہ لیا اور پھر فیصلہ دیا کہ بنو قریظہ کے مردوں کو قتل کیا جائے اور ان کے بچوں اور عورتوں کو قیدی بنالیا جائے۔ یہ فیصلہ اسی دن ہوا جس دن بنو قریظہ نے ہتھیار ڈالے تھے، اور اس پر عملدرآمد دوسرے دن ہوا۔ قتل کیے جانے والوں میں حتیٰ بن اخطب بھی تھا۔

ابن ہشام کے برخلاف دوسرے مؤرخین و محدثین (ابن سعد اور امام بخاری) نے تحریر کیا کہ حضرت سعدؓ کو خود بنو قریظہ نے اپنا حکم بنایا تھا۔ کچھ مغربی اہل قلم نے اس فیصلے پر سخت لے دے کی ہے۔ انہوں نے فیصلے کو وحیانا اور غیر انسانی قرار دیا ہے۔ یہ تہمت بھی دھری ہے کہ سعدؓ بن معاذ کا انتخاب محض مطلق العنانی کو چھپانے کے لیے کیا گیا تھا۔ نیز یہ کہ ان کا فیصلہ آزاد نہیں تھا بلکہ دباؤ کے تحت تھا۔ یہ سب محض انکی ذہنی ایج ہے۔ ورنہ یہود قبائل کے فیصلوں میں ہمیشہ ان کے حلیف انصار قبائل کی رائے کا احترام کیا گیا۔ حضرت سعدؓ کا آخری وقت تھا۔ آخری وقت میں انسان کے پیش نظر دنیاوی مصلحتیں نہیں رہ جاتیں، بلکہ صرف آخرت کی مصلحت ہوتی ہے۔ لہذا حضرت سعدؓ نے وہی فیصلہ کیا جو ان کے نزدیک انصاف تھا۔ نیز ایسی کوئی سند نہیں ملتی کہ ثالث مقرر کیے جانے کے بعد سے فیصلے کے اعلان تک حضور ﷺ نے حضرت سعدؓ سے ملاقات فرمائی ہو، جب کہ اس تمام عرصے میں اوس انہیں گھیرے رہے۔ اور حضور ﷺ کی خدمت میں پہنچنے سے پہلے ہی اوس کو اندازہ ہو چکا تھا کہ حضرت سعدؓ کیا فیصلہ کرنے والے تھے۔ فیصلے کے بعد بنو قریظہ کو قتل کرنے کی ذمہ داری

بھی اوس نے ہی پوری کی۔ بنو قریظہ کو جو سرزادی گئی وہ خود ان کی شریعت نیز مروجہ عالمی قوانین کے عین مطابق تھی۔ [صلح حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کے طرزِ عمل سے، جس میں انہوں نے حضور ﷺ کے قربانی کرنے کے حکم کو نظر انداز کیا، جس سے حضور ﷺ دل گرفتہ ہوئے، نیز فتح مکہ کے بعد مولفہ القلوب کو مال دینے پر انصار کے طرزِ عمل سے یہ بات انتہائی واضح ہے، کہ عربوں کو اپنے جذبات کے اظہار پر قابو نہیں تھا، اور وہ ایسے معاملات میں بھی جو واضح طور پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے تھے، احتجاجی رویہ اپنا سکتے تھے۔ پس اگر یہودی قریظہ کے ساتھ کوئی زیادتی ہو رہی ہوتی تو ان کے مسلمان حلیف یقیناً احتجاج کرتے۔ بعض مسلمانوں کی طرف سے یہود کے حق میں سفارش صرف اوس کی ناک اونچی رکھنے کے لیے تھی، ورنہ وہ خود بھی جانتے تھے کہ انکا جرم کتنا قبیح تھا۔]

بنو قریظہ کے انجام کے ساتھ ہی مدینے سے بدامنی اور فساد کا قلع قمع ہو گیا۔ یہود اب بھی مدینے میں باقی تھے، لیکن وہ پرامن شہری تھے جن سے کبھی کوئی تعارض نہ کیا گیا۔ یہود مدینہ کے خلاف جو بھی کارروائی کی گئی، وہ امن و امان کے قیام اور حالات کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تھی۔ اس کے پیچھے کوئی متعینہ پالیسی یا نسلی دشمنی وغیرہ کے جذبات نہ تھے۔

فتح خیبر: خیبر مدینے کے شمال میں پچاس سائٹھ میل کے فاصلے پر یہود کی ایک بستی تھی جو کئی مضبوط قلعوں پر مشتمل تھی۔ مسلمانوں نے خیبر کے معاملات میں کبھی کوئی مداخلت نہ کی تھی۔ اس کے برعکس خیبر نے ہر طرح سے مدینے کے معاملات میں دخل اندازی کی۔ جب مدینے کے یہود خاموش ہوئے تو خیبر کے یہود مخالفت میں پیش پیش ہو گئے اور مدینے کی تباہی کے منصوبے بنانے لگے۔ ان کے وفود قریش کے پاس پہنچے۔ انہوں نے ہی اجتماعی حملے کا منصوبہ بنایا اور قریش کو اپنے حلیفوں کے ساتھ مدینے پر حملہ کرنے پر آمادہ کیا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جب خندق سے قبل قریش اپنی بت پرستی پر توحید کی فضیلت محسوس کرنے لگے تھے، اور یہی احساس جنگی کارروائی میں حائل ہو رہا تھا۔ محض شعلہ جنگ بھڑکانے کے لیے اہل خیبر نے قریش کو یہ باور کرایا کہ ان کی بت پرستی توحید سے اعلیٰ اور ارفع تھی۔ جب قریش کا جنگی پروگرام مرتب ہو چکا تو یہ خیبر لوٹے۔ اپنی دولت پانی کی طرح بہائی کہ ہمسایہ عربوں کو جنگ پر ابھار کر مدینے کو تاخت و تاراج کریں۔

یہود خیبر نے غطفان کی چار ہزار کی جمیعت کے ساتھ احزاب میں شرکت کی۔ قریش کے ساتھ ساتھ انکا مدینے پہنچنا، جنگی پروگرام سے واقفیت اور اس کی ترتیب میں شرکت کا ناقابلِ تردید ثبوت ہے۔ انہوں نے نہ صرف بیرونی عوامل سے مدینے پر حملہ کرانے کی منصوبہ بندی کی بلکہ مدینے میں موجود یہود بنو قریظہ کو بھی غزاری پر آمادہ کیا۔ اگر اللہ تعالیٰ انکا منصوبہ ناکام نہ بنا دیتا تو اسلام کی بیخ کنی میں انہوں نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔

انہیں بھی پورا پورا اندازہ تھا کہ ان کی یہ بے راہروی ایک نہ ایک دن رنگ لائے گی۔ اس صورتحال کے پیش نظر یہود خیبر نے یہ طے کیا کہ بدوی قبائل سے مدینے پر حملے کروائے جائیں، تاکہ مدینے کو خیبر کی طرف

رخ کرنے کی فرصت نہ مل سکے۔ بنو سعد اور بنو غطفان کو لالچ کے بل پر اپنا ہمنوا کیا۔ چنانچہ بنو غطفان کے چھاپے مدینے پر پڑنے لگے۔ عیینہ بن حصن فزاری کے سواروں نے مدینے کی چراگاہ پر چھاپا مارا، حضور ﷺ کے اونٹ پکڑے، اونٹوں کے گھراں کو قتل کیا اور اسکی بیوی کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد بنو غطفان کے متعدد عسکری اجتماعات کی اطلاعات ملیں جن کی سرکوبی کے لیے الغاب، ام قرفہ، الجھوم، وادی القرئی اور فدک کی مہتمیں روانہ کی گئیں۔ صلح حدیبیہ کے بعد شمال سے حملے کے خدشات اس قدر بڑھ گئے تھے کہ جب حضرت عمرؓ کو ان کے ہمسائے نے واقعہ ایلاء کی اطلاع دیتے ہوئے کہا کہ غضب ہو گیا تو ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ کیا بنو غطفان نے حملہ کر دیا؟ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بات چیت کے ذریعے خیر والوں کو امن قائم کرنے کی دعوت دی۔ خیر سے یہود کا ایک وفد بات چیت کے لیے اسیرم یا اسیرم نامی فرد کی سرکردگی میں حضرت عبداللہ بن انیس کے ہمراہ روانہ ہوا۔ راستہ میں اسیرم نے حضرت عبداللہ بن انیس کی تلوار چھیننا چاہی جس کے باعث نزاع پیدا ہو گیا۔ وفد کے ارکان اور مسلمانوں میں لڑائی ہوئی، جس میں اسیرم اور اس کے ساتھی ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد ہی اطلاع ملی کہ بنو غطفان کا اجتماع ہورہا ہے چنانچہ خیر کی جانب تیزی سے اقدام کیا گیا۔ قبیلہ سعد پر چند ماہ پہلے ہی حملہ ہو چکا تھا جس کے باعث اس کے کس بل نکل چکے تھے چنانچہ وہ تو مدد کو نہ پہنچا۔ بنو غطفان اپنی جمعیت لے کر خیر کی جانب بڑھے، لیکن مسلمانوں کی عسکری نقل و حرکت کچھ اس قسم کی دیکھی کہ اپنے ہی علاقے کی مدافعت کرنے کے لیے اٹنے پاؤں لوٹے اور مسلمانوں نے خیر کے تمام قلعے یکے بعد دیگرے فتح کر ڈالے۔

اس طرح یہود خیر نے خود اپنی تباہی کے بیج بوئے، اس کی آبیاری کی اور پھر اسکا ثمر انہیں مل گیا۔ انہوں نے نہ صرف عرب سیاست میں خود غرضانہ حصہ لیا بلکہ بلاوجہ اسلام کی راہ میں حائل ہوئے۔ دین اسلام سے تو وہ متفق ہو ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ ان کے عقیدے کی رو سے بنی اسرائیل سے باہر کوئی نبی نہیں آ سکتا تھا۔ تاہم وہ خود کو اسلام دشمنی سے باز ضرور رکھ سکتے تھے۔ جب وہ اسلام کو منانے کے درپے ہوئے تو اسکے نتیجے میں مسلمانوں نے ان کے خلاف کارروائی کی۔ وہ اسلامی معاشرے اور اسلام کے لیے خطرہ بن کر ابھرے اور کثیر کردار تک پہنچے۔ وہ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار تھے۔ اس میں کسی اور کو ملوث کرنا محض ایک خود فریبی ہے۔

واقعات خیر کا تجزیہ : یہی وہ واقعات ہیں جنہیں مغرب تو زمرور ذکر پیش کرتا ہے، اور خونریزی کی تہمت لگاتا ہے، سنگدلی کا طعنہ دیتا ہے، جس کی بنیاد یہود کے ساتھ سلوک پر کھی جاتی ہے۔ سنگدلی کی تہمت لگانے والوں کی نظروں میں یہود کی حرکتیں معیوب نہیں ہیں۔ بدر کے اسیروں، بنو قیقاع اور بنو نضیر کی جاں بخشی، مکہ کی پرامن فتح اور جنین کے اسیروں کے ساتھ فراخ دلانہ برتاؤ، بچوں کے ساتھ شفقت، اور لوگوں کی سنگین خطاؤں سے درگزر کے واقعات جو اس امر کا ثبوت ہیں کہ فطرت نبوی کو سنگدلی اور خونریزی سے دور رکھی واسطہ نہیں تھا، انہیں نظر نہیں آتے۔ دیرینہ دشمنوں کی معافی کسی سنگدل کا کام نہیں ہو سکتا۔

عجیب منطقی ہے کہ جو عمل وہ خود اپنے لیے جائز قرار دیتے ہیں وہی عمل مسلمانوں کے لیے ناجائز ہوتا ہے۔ مغرب نے خود ساختہ قوانین بنا رکھے ہیں اور ان خود ساختہ قوانین کی ہی روشنی میں وہ دوسروں کو

جانچتے ہیں۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی فیصلہ کر لیتے ہیں اور بقیہ کارروائی محض فیصلے کی صحت ثابت کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ کبھی انکی مذہبی اقدار کو قانون کا درجہ میسر آ جاتا ہے تو کبھی سیاست اور فلسفہ کی اقدار بنیاد بنائی جاتی ہیں۔ کبھی مغربی اخلاق کو کوئی بن جاتے ہیں۔ مقصد صرف ایک ہوتا ہے کہ بہر طور ایک شخصیت کو مطعون کیا جائے۔ اگر ان کی منطق کا ان کے اپنے بزرگوں پر اطلاق کیا جائے تو کوئی شخصیت بھی حاشا و کلا انسانیت کے معیار پر پوری نہ اتر سکے گی۔

خوئیزی جو ناحق و بدون استحقاق کی جائے، بلاشبہ ایسا فعل ہے جسے سراہا نہیں جاسکتا۔ لیکن باطل کی قوت سے ٹکرانا اور اسے بزور بازو دفع کرنا اور حق کے لیے سین سپر ہو جانا خوئیزی کی تعریف میں نہیں آتا۔ اگر یہ بھی خوئیزی کی تعریف میں آتا ہے تو بلا اتشی عہد نامہ قدیم کے تمام کردار متہم ہوں گے۔ دونوں عہد ناموں کا خدا ایک ہی ہے۔ عہد نامہ قدیم میں وہ رب الافواج ہے۔ نہ صرف جنگ کا حکم دیتا ہے بلکہ خود بھی اس میں حصہ لیتا ہے۔ جوش مخالفت میں کیا خود اپنے خدا کو متہم کرنے کی حماقت کی جاسکتی ہے؟ خدا کا حکم ابدی ہوتا ہے اور عام ہوتا ہے۔ اگر وہ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کو اذن جہاد دیتا ہے تو یہی اذن جہاد ختمی مرسلت ﷺ کے لیے کیوں باعث تعجب ہے؟ عیسائیت کو اگر یہ اذن میسر نہیں تھا تو کلیسا نے اس کی کمی دور کر دی۔ پتہ نہیں کلیسا کا یہ عمل ان کے خدا کی مرضی کے مطابق تھا یا اس کے خلاف۔

عیش کوشی

عیش کوشی اور نفیس پرستی کے شدید اتہامات سے مغربی لٹریچر پر ہے۔ سترہویں اور اٹھارویں صدی کی جس غلیظ زبان میں یہ اتہامات قلمبند کیے گئے ہیں ان کا اعادہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بے بنیاد الزامات اس کثرت اور شدت سے پائے جاتے ہیں کہ کارلائل کو کہنا پڑا،

"We shall err widely if we consider this man as a common voluptuary; intent mainly on base enjoyment...s, nay on enjoyment of any kind."

(Thomas Carlyle; On heroes and Hero-Worship, p. 65)

[ہم بہت بڑی غلطی کریں گے اگر ہم ان صاحب کو ایک ایسا عام لذت پسند شخص گردانیں گے، جو بنیادی طور پر گھٹیا عیش کوشی پر مائل ہو (جبکہ وہ) کسی بھی قسم کی لطف اندوزی سے گریز کرتے تھے۔]

معاندین نے یہ نظریہ عام کیا کہ ابتدائی مسیحی نظردنیادی اقتدار تھا۔ اور جب یہ اقتدار میسر آ گیا تو (نعوذ باللہ) ممکنہ داو عیش دی۔ یہ دعویٰ اور نظریہ ہی بنیادی طور پر بے حقیقت ہے۔ ختمی مرتبت ﷺ کا دور رسالت شروع ہوا تو عمر شریف چالیس [۴۰] سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ عیش کوشی کی عمر تو چالیس [۴۰] سال سے قبل کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد تو ایک عام شخص کے کردار میں بھی پختگی آ جاتی ہے۔ بدکردار افراد کے کردار میں بھی ٹھہراؤ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

آ جاتا ہے۔ نیک کردار پختہ ہو جاتا ہے اور اس میں کسی کجی کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ تیرہ سالہ [۱۳] مکی دور معاندین کو بھی تاباں نظر آتا ہے۔ اس پورے دور میں ایک جانکاہ جد و جہد کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہجرت کے بعد کم از کم چھ [۶] سال یعنی صلح حدیبیہ تک با مخالف کے تند و تیز طوفان اٹھتے رہے، جنہوں نے سکون درہم برہم کر رکھا تھا۔ ایک طرف معاشرے کی تطہیر و تعمیر، دوسری جانب قلیل وسائل کے ساتھ اس جدید معاشرے کا اندرونی اور بیرونی خطرات سے دفاع، ایسے مشاغل تھے جو ایک لمحے کی مہلت نہ دیتے تھے۔ صلح حدیبیہ ہی حیاتِ طیبہ کا وہ سنگِ میل ہے جس کے بعد حالات پوری طرح قابو میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت عمر شریف انسہ [۵۹] سال کی ہو چکی تھی۔ اگر کسی عیش و عشرت کا امکان ہو سکتا ہے تو اس کے بعد کے آخری ایام میں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آخری ایام بھی شدید جد و جہد کے ایام ہیں۔ فتح خیبر، فتح مکہ، جنگ حنین، محاصرہ طائف، جعرانہ کی مصروفیات، غزوہ تبوک، کئی چھوٹی مہمات، وفود عرب، حج الوداع، حبشہ اسامہ کی تیاری، یہ سب آخری چار برسوں کی مصروفیات ہیں۔ نہ جانے ان ایام میں معاندین کو عیش و عشرت کے کون سے آثار ملے جن کی بنیاد پر انہیں اس دعوے کی جرأت ہوتی ہے۔ عہد نبوی کے تمام راوی، ابتدائی مؤرخین و محدثین و سیرت نگار اس امر پر متفق ہیں کہ حضور ﷺ کی زندگی سادگی کا پیکر تھی۔ تمام گھریلو کام دستِ مبارک سے انجام پاتے تھے۔ اپنا لباس خود پونہ نہ فرماتے۔ اپنے نعلین کی خود مرمت کر لیتے۔ گھر میں انہماک المومنین خود اپنے ہاتھوں سے کام کاج کرتیں۔ دخترِ ولید کے ہاتھ چکی پیسنے سے خوں چکاں رہتے۔ رہائش گاہ تک پختہ نہ تھی۔ سخت اور کھر درے بستر پر آرام فرماتے۔ کھجور کی چھال بھرا انکیہ اور گدہ اسامان راحت تھا۔ کھجور کی چٹائی فرشِ استراحت تھی۔ کبھی شاہانہ لباس نہ استعمال فرمایا۔ ریشم کو نہ صرف اپنی ذات بلکہ تمام مسلمان مردوں کے لیے ممنوع قرار دیا۔ اوڑھنے کے سامان میں ہمیشہ کالی کلملی کا ہی تذکرہ کیا گیا۔ سفر کے لیے صرف ایک خیمہ تھا۔ غسل خانے میں صرف ایک برتن پتھر کا اور ایک مٹ لکڑی کا تھا۔

در بار نبوی میں آرائش و تزوین نام کی کوئی شے نہ تھی۔ نہ تخت تھا نہ تاج۔ کچی مسجد کے ناپختہ صحن میں زمین پر یہ دربار لگتا۔ فخرِ سلاطین فرشِ زمین پر، کھجور کے ستون کے سہارے جلوہ فرما ہوتے۔ نہ فرش تھا نہ پردے۔ مسجد اور حجروں کی چھت کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی جو بمشکل سات فیٹ بلند ہوگی۔ ریاستی خزانے کا کوئی وجود ہی نہیں تھا تو خازن و نگراں کا کیا سوال۔ دولت آتی تو صحنِ مسجد میں ڈھیر کر دی جاتی جو فی الفور مستحقین میں تقسیم کر دی جاتی۔ مطبخ شاہی نام کی کوئی شے نہ تھی۔ زندگی فقر و فاقے میں بسر ہوئی، ہر آنے والا دن رزق اپنے ساتھ لے کر آتا۔ وصال ہوا تو ترکے میں ایک درہم نہ چھوڑا۔ گھر میں کھانے کے لیے بھی کچھ نہ تھا۔ ورثے میں چند تلواریں، زربیں، نیزے، خود، وصال اور چند مولیٰ چھوڑے۔ نہ کوئی ذاتی جائیداد تھی نہ مال و دولت۔ صرف ایک نام اللہ کا تھا جو اپنے در ثناء کے لیے چھوڑ گئے۔

عیش و عشرت کا ثبوت سامانِ تعیش ہوتے ہیں، جن کا حیاتِ پاک میں کوئی وجود نہیں ملتا۔ مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں سوائے فقر و بے نیازی کے کسی اور کیفیت کا تصوّر تک نہیں پیدا ہوتا۔ کیا یہی کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

وہ عیش تھا جس کی خاطر اقتدار کی طلب تھی اور جسے حاصل کرنے کے لیے ساری زندگی جدوجہد کی گئی۔ اس قسم کا ہر دعویٰ محض کذب، افتراء، بہتان، اور تہمت تراشی ہے۔

کثرت از دواج

جنس کے بارے میں عیسائی نظریات یہ ہیں کہ جنس ہر صورت میں ایک سفلی جذبہ ہے۔ تاہم انسانی فطرت کی کمزوری کے پیش نظر نکاح کی صورت میں قابل معافی ہے۔ سینٹ آگسٹائن اس معاملے میں اس قدر حدت برتتا ہے کہ اس کے نزدیک مباشرت خواہ منکوحہ کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز اور فحشی حرکت ہے۔ (Radhakrishnan; Religion in a Changing World, p.114)۔ سینٹ پال کا عقیدہ ہے کہ انسانی محبت خدا کی محبت کی رقیب ہے اور اسے خدا کے قرب و معیت سے محروم کرتی ہے۔ جنس کے معاملے میں اسی حدت کے باعث یگ کو کہنا پڑا کہ عظیم مذاہب عالم میں عیسائیت کو حقیقی طور پر دشمنِ حیات مذہب قرار دینا چاہیے۔ (Radhakrishnan; Religion in a Changing World, p.115)

اس حدت کا عہد نامہ قدیم و جدید سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس عہد نامہ قدیم افزائشِ نسل کی ہمت افزائی کرتا ہے اور قطع نسل کو ایک قابلِ تعزیر گناہ قرار دیتا ہے۔ ”جب یہوداہ نے اودان سے کہا کہ اپنے بھائی کی بیوی کے پاس جا اور دیور کا حق ادا کر، تاکہ تیرے بھائی کے نام کی نسل چلے۔ اور اودان جانتا تھا کہ یہ نسل میری نہ کہلائے گی۔ سو یوں ہوا کہ جب وہ اپنے بھائی کی بیوی کے پاس جاتا تو نطفہ کوزمین پر گرا دیتا کہ مبادا اس کے بھائی کے نام سے نسل چلے۔ اور اس کا یہ کام اس کے بھائی کی نظر میں بہت برا تھا۔ اس لیے اس نے اسے بھی ہلاک کیا۔“ (پیدائش، باب ۳۸، ۲۹-۱۱)

عیسائیت کی اس حدت کا تعلق جب ان کی مذہبی کتب سے نہیں تو یہ نظریات یا تو معاشرتی ہیں یا پھر قدیم بت پرست مذاہب سے مستعار لیے گئے ہیں۔ مغرب کے پس منظر میں ہم نے دیکھا کہ رومن معاشرہ، ثقافت کے اعتبار سے یونان کا شاگرد تھا۔ رومی مذہب کی کوئی تحریری کتاب نہیں تھی۔ انہوں نے یونانی فکر کو اپنے عقائد کی بنیاد بنایا۔ رومی دیوتاؤں کا جو تذکرہ لاطینی شعراء نے کیا ہے وہ سب کے سب یونان سے مستعار ہیں۔ (Montgomery Watt; Truth in the Religions, p.31)۔ جب دیوی دیوتا مستعار لیے گئے تو ان سے محقق عقائد و تعلیمات بھی درآئیں۔ یونان میں ازمنہ قدیم سے تہذیب کو ایک صفتِ عالیہ کا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ مورخ ہیرودوتس نے ایک فرقے ’اگر پائی‘ کا ذکر کیا ہے، جو عیسائیت سے بہت قبل ایشیائی علاقوں میں پایا جاتا تھا اور رہبانیت کی زندگی بسر کرتا تھا۔

(Herodotus, quoted by Toynbee, A.J.; A Study of History, Vol. II, p.28)

ایرویشیا کی سرزمین کے بارے میں یہ تصور عام ہے کہ یہی علاقہ آریہ نسل کا وطن تھا۔ یہیں سے آریہ مختلف سمتوں میں پھیلے۔ یہیں سے ایک شاخ ایران اور اس کے بعد ہندوستان پہنچی اور ایک اور شاخ نے مغرب کا رخ کیا جن کی نسل سے یونانی اور جرمن اقوام ہیں۔ چونکہ آریہ کے مذہبی طبقے آج کے دواور ترک دنیا کے سختی سے قائل تھے اس لیے وہ جہاں کہیں گئے وہاں ان نظریات کو مذہبی حیثیت ملی۔ چنانچہ ہندوستان میں سنیاں، ایمیان میں مانکیت اور مغرب میں رہبانیت، یہ سب قدیم بت پرست آریاؤں کے اثرات ہیں۔ آریائی بت پرست مذاہب میں تجر کو تقدس کا لازمہ تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ سامی مذاہب میں ترک دنیا اور تجر کو مذہبی تقدس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

چھٹی صدی قبل مسیح میں جب بخت نصر نے یہود یہ کو فتح کیا تو یہود کا قتل عام کیا اور بقیۃ السیف کو اسیر کر کے بابل لے گیا جہاں سے ان کی واپسی پچاس [۵۰] سال کے بعد ہوئی۔ اس عرصہ میں ایک پوری نسل ختم ہو گئی، دوسری نسل بھی بوزھی ہو گئی اور تیسری نسل جوان ہوئی۔ جوان نسل کا مقامی فکر و نظریات سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ یہود میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہوا جو عقیدے کے اعتبار سے قدیم مذہب یہود سے قطعاً مختلف تھا۔ یہ فرقہ "ایسینی (Essene)" کہلاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے دور میں بحرِ ملح کی ترائیوں میں یہ لوگ بکثرت پائے جاتے تھے۔ یہ فرقہ سورج کی پرستش کرتا تھا۔ بستیوں کی بود و باش ترک کر کے جنگلوں میں زندگی بسر کرتا تھا۔ ان میں کسی عورت کا گزر نہ تھا۔ ان کے عقائد و نظریات، اغراض و مقاصد، راز ہائے سر بست تھے۔ بدترین تشدد بھی ان کے لب و لہجہ میں تھا۔ تجر، خود آزاری، نفس کشی اور جذبات سے بیگانگی ان کے اصول تھے جن پر یہ سختی سے کار بند رہتے تھے۔ ان اصولوں کی خلاف ورزی کی سزا، ذات برادری سے اخراج تھی۔ جس کے بعد مجرم صرف جڑی بوٹیوں پر گزر بسر کر سکتا تھا اور آہستہ آہستہ موت سے ہمکنار ہونا اس کا مقصد ٹھہرتا تھا۔

(cf. Fouard, Abbe Constant; The Christ The Son Of God, p.8)

اس فرقے کو عقائد اور عمل کے اعتبار سے عہد نامہ قدیم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ سور یہ پوجا، سنیاں، جذبات کشی، تجر، یہ سب کے سب آریائی مذاہب کے عناصر ہیں۔ پس یہود کے اس فرقے نے بابل کے قیام کے دوران مانکیت سے یہ اثرات قبول کیے ہونگے۔

۱۹۳۷ء میں بحرِ ملح کے خریطوں کی دریافت نے یہ واضح کر دیا ہے کہ عیسائیت حقیقتاً یہودی فرقے ایسینی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ (Radhakrishnan; Religion in a Changing World, p.38)۔ لہذا کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ تجر دور رہبانیت محض معاشرتی اثرات اور بت پرستوں سے مستعار نظریات ہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ حضرت عیسیٰ مجر داور محصور تھے۔ ورنہ ان کی اپنی تعلیمات کا ان نظریات سے کوئی تعلق نہیں۔ حضرت عیسیٰ کے برعکس تمام انبیائے بنی اسرائیل متاثر تھے، اور تجر دکی جانب عہد نامہ قدیم میں کوئی اشارہ تک نہیں پایا جاتا۔

یک زوجگی: تہذیب و تمدن کے ہر شعبہ کی بدولت عیسائیت کے ارباب حل و عقد نے بادل ناخواستہ معاشرے کو یہ زوجگی کی اجازت دی۔ یہی معاشرتی قدر رفتہ رفتہ عقیدے کی شکل اختیار کر کے جزو مذہب بن گئی۔ تاریخی اعتبار سے ایام قدیم میں یک زوجگی کو مشرق وسطیٰ، مصر، ایشیائے کوچک اور یونان میں معاشرتی یا قانونی حیثیت حاصل نہ تھی۔ تعدد وازواج بزرگان بنی اسرائیل میں عام بات تھی۔ قدیم یونان میں اس کا تذکرہ پلوٹارک نے کیا ہے۔ افلاطون نے تعدد وازواج کی حمایت کی ہے۔ [John Davenport; An Apology for]

(Mohammed and Quran, p.154)۔ صرف قدیم رومن تھے جو یک زوجگی کے قائل تھے، تاہم ان میں بھی تعدد پر پابندی نہ تھی۔ متعدد شاہان روم کی ایک سے زیادہ بیویاں پائی جاتی ہیں۔ تعدد وازواج کو روم میں قانوناً ۳۹۳ء میں ممنوع قرار دیا گیا۔ (Ibid, p.155)۔ لیکن شہنشاہ ولشائین کے عہد میں ایک فرمان کی رو سے مملکت کے باشندوں کو پھر سے تعدد وازواج کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ نویں صدی عیسوی تک مغربی شہنشاہوں کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوا کرتی تھیں۔ پاپاں اور شارلمین کی ایک سے زائد بیویاں بیان کی جاتی ہیں۔

کلیسا کی قدغن: یک زوجگی یا تعدد وازواج کے مسئلے پر تمام اناجیل گنگ ہیں۔ اناجیل سے جس مسئلے کا حل نہیں ملتا اصولاً اس مسئلے کے حل کے لیے عہد نامہ قدیم سے رجوع کرنا چاہیے۔ پال کے خطوط، (گلیتھون، باب ۳، درس ۱۰)، (رومیوں، باب ۳، درس ۲۱-۲۲) اور (باب ۶، درس ۱۵) وغیرہ سے ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ نے خود کوئی شریعت نہیں دی، بلکہ شریعت سے نجات دلائی۔ پال بانگ دہل شریعت کو لعنت قرار دیتا ہے۔ پال کے برخلاف حضرت عیسیٰ نے فرمایا،

”یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین نہ ٹل جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ تورات سے ہرگز نہ ٹلے گا۔“ (متی، باب ۵، درس ۱۷-۱۸)

پس اگر پال کو صادق مانا جائے تو عیسائی شریعت کا وجود نہیں لہذا ایک زوجگی کو شرعی عقیدے کی حیثیت حاصل نہیں ہو سکتی اور اگر حضرت عیسیٰ کے فرمان کے مطابق شریعت تورات منسوخ نہیں بلکہ اس کا ایک ایک لفظ رائج ہے تو شریعت تورات میں تعدد وازواج کی واضح اجازت موجود ہے۔ (استثناء، باب ۲۱، درس ۱۵-۱۶)، کی تحریر حسب ذیل ہے۔

”اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں، ایک محبوبہ اور دوسری غیر محبوبہ، اور دونوں سے لڑکے ہوں اور پہلونا بیٹا غیر محبوبہ سے ہو، تو جب وہ اپنے بیٹوں کو مال کا وارث کرے تو وہ محبوبہ کے بیٹے کو غیر محبوبہ کے بیٹے پر، جو فی الحقیقت پہلونا ہے، فوقیت دے کر پہلونا نہ ٹھہرائے۔“

اسی طرح ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت (خروج، باب ۲۱، درس ۱۰)، سے بھی ثابت ہے کہ اگر وہ دوسری عورت کرے تو بھی اس کے کھانے اور کپڑے کے فرض سے قاصر نہ ہو۔

ایک سے زیادہ بیویوں کا شرعی جواز تو مندرجہ بالا حوالوں سے ناقابل تردید ہے، لیکن ان کی تعداد کے بارے میں عہد نامہ قدیم نے کوئی حد مقرر نہیں کی۔ صرف (استثناء، باب ۷، درس ۱۷) میں بادشاہ کے لیے ممانعت ہے کہ، ”اور وہ بہت سی بیویاں نہ رکھے تانہ ہو کہ اس کا دل پھر جائے اور نہ وہ اپنے لیے سونا چاندی ذخیرہ کرے۔“

خط کشیدہ الفاظ میں کس قدر چمک ہے، گویا فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ عام آدمی ظاہر ہے کہ اپنی حیثیت سے تجاؤ نہیں کر سکتا، لہذا صرف بادشاہ یا بندے کیے گئے ہیں۔ جس طرح سونے چاندی کے ذخیرہ کی مقدار کا تعین نہیں ہے اسی طرح حقیقتاً شریعت موسوی میں تعداد ازواج کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ جدول ذیل انبیائے بنی اسرائیل کی تعداد ازواج کی کیفیت کو نمایاں کرنے میں مدد ہوگا۔ یہ تعداد عہد نامہ قدیم کی روایات پر مبنی ہے۔

جدول ازواج انبیائے بنی اسرائیل

اسم گرامی	تعداد ازواج	اسمائے ازواج	کیفیت و حوالہ
حضرت ابراہیم	۳	بی بی ہاجرہ، بی بی سارہ اور بی بی قطورہ	پیدائش، باب ۲۱ اور باب ۲۵
حضرت یعقوب	۴	بی بی راحیل، بی بی لیاہ، کنیز بلہاء اور کنیز زلفہ	پیدائش، باب ۲۹، ۲۵ تا ۲۸
حضرت موسیٰ	۲	بی بی صفورہ اور ایک کوشی خاتون؛ کنیزیں نامعلوم، جنکی اسیروں میں سے حسب منشاء خواتین کو کنیز بنانے کی اجازت تھی۔	خروج، باب ۲۲، ۲؛ گنتی، باب ۱۲، ۱؛ استثناء، باب ۲۱، ۱۰ تا ۱۳
حضرت داؤد	۱۰	شویمت ایشاگ؛ میکیل، اخنوم؛ یزرعیل، انیکل، معکہ؛ جحیت، ابرطال، عجلا؛ دسویں کا نام معلوم نہیں؛ بہت سی ایسی تھیں جنکی تفصیل نہیں ملتی (سموئیل باب ۵-۱۳) ان کے علاوہ دس حرم تھیں۔	سلاطین، باب ۳-۱؛ سموئیل، باب ۱۹-۱۱؛ باب ۲۷-۲؛ سموئیل، باب ۲-۲؛ باب ۲-۳؛ سموئیل، باب ۲، ۴ تا ۵؛ تعداد کے لیے سموئیل، باب ۱۵-۱۶؛ سموئیل، باب ۲۰-۳
حضرت سلیمان	۷۰۰	سات سو بیویاں اور تین سو حرم	سلاطین، باب ۱۱-۳

حضرت عیسیٰ کے تجزے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی نگاہ میں تعدد ازواج مکروہ تھا۔ انجیل متی باب ۲۵ میں انبویں نے ایک تمثیل بیان فرمائی جس میں ایک دولہا سے پانچ کنواریوں کی شادی کا ذکر پایا جاتا ہے۔ کتاب ہو شیت نیچی پوٹھنتے ہینا لیکھی (جہاں سو لکھی اور دو لکھی اسلامی مکتبہ کل سب سے ابولا مکتبہ تہذیبی)

باب ۲۳، میں ایک اور طویل تمثیل بیان ہوئی جس میں خود یہوواہ دو بہنوں آہولہ اور آہولیمہ کو اتنا لالچ اپنی بیویاں قرار دیتا ہے۔ یہ تمثیلیں واشگاف الفاظ میں واضح کرتی ہیں کہ خدائے تورات یہوواہ اور حضرت عیسیٰ کے نزدیک تعددِ ازاواج میں کوئی کراہت نہ تھی۔

ثابت ہوا کہ یک زوجگی کا حکم نہ تو حضرت عیسیٰ نے دیا اور نہ ان سے قبل کسی اور نبی نے دیا۔ یہ ایک خانہ ساز بدعت ہے جسے کلیسا نے رائج کیا۔ اسے مغرب میں معاشرتی قانون کی حیثیت حاصل تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ غیر موثر ہو رہا تھا۔ اس قانون کو مٹوئیت کے اثرات کے تحت کلیسا کی سرپرستی حاصل ہوئی، کیونکہ مٹوئیت جسم دشمنی کی تعلیم دیتی ہے۔ جب اپنے بدن سے نفرت ہوئی اور خود آزاری کو عبادت کا درجہ حاصل ہوا تو جسم کی آسائش اور اسباب آسائش سے گریز لازم و ملزوم ہوا۔ عورت سے گریز نے نفرت کی شکل اختیار کی۔ نفرت نے جنس کو فطری جذبے کے بجائے سفلی جذبے کا مقام دیا۔ اس نے ہی نفسیاتی الجھن پیدا کی۔ نظریاتی اعتبار سے یک زوجگی عقیدہ بنی لیکن جو اتری مغربی معاشرے میں پائی جاتی ہے اس کا عشرِ عشر بھی کسی اور معاشرے میں نہیں ملتا۔ عیسائی مفکرین مذہب نے عورت سے گریز کی یہ تاویل پیش کی کہ وہ خدا سے دور کرتی ہے۔ گویا بیوی نہ ہوئی خدا کی رقیب ہوگئی۔ بیوی کو آقا یا خدا کا درجہ کسی دور میں نہیں ملا۔ وہ محض انسان ہے۔ اگر انسان کی محبت خدا کی رقیب ہے تو دوستوں، رشتہ داروں، والدین اور اولاد کی محبت پر بھی یہی حکم لگے گا اور سب سے نفرت لازم قرار پائے گی۔ آدم بیزاری خدا پرستی کی شرطِ اولین ٹھہرے گی جبکہ دین عیسوی کا اہم ترین دعویٰ انسان دوستی اور خدمتِ خلق ہے۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ تجرّ داور یک زوجگی کو تعلیمات عیسوی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ نظریہ بھی دیگر متضاد نظریات کی طرح محض کلیسا کی خانہ ساز ایجاد ہے۔

ازواجِ نبوی : اس خانہ ساز قانون کی آڑ میں مستشرقین کی طرف سے تعدادِ ازاواجِ نبوی پر شدید قسم کی دریدہ دہنی کی گئی ہے۔ ان لوگوں کو عناد اس جانب توجہ کی اجازت نہیں دیتا کہ قانون کی غیر موجودگی میں کوئی بھی عمل جرم تو کیا الزام بھی نہیں ہو سکتا۔ چونکہ مغرب میں یک زوجگی کا ایک مستعار معاشرتی قانون نافذ ہے، اس لیے انہیں تعددِ ازاواج ناگوار گزرتا ہے۔ لیکن جس شخصیت پر اعتراض کیا جا رہا ہے وہ مغربی قانون کی ہرگز پابند نہ تھی۔ وہ ایک عرب شخصیت تھی اور اس دور کے عرب قانون کی رو سے تعددِ ازاواج باعثِ شرف تھا۔ تمام اشراف عرب کثرتِ ازاواج پر عمل پیرا تھے۔ شریعت موسوی کی طرح زمانہ قبل از اسلام میں عربوں میں تعدادِ ازاواج کی کوئی حد مقرر نہیں تھی۔ پیغمبر اسلام نے اس کی حد مقرر کی۔ اور ایک وقت میں زیادہ سے زیادہ چار بیویوں کی شروطِ اجازت دی۔ اس کے باعث ان لوگوں کو جن کی چار سے زیادہ بیویاں تھیں، زائد بیویوں کو طلاق دینا پڑی۔

مغرب جس انداز سے کثرتِ ازاواج پر اعتراض کرتا ہے اس کا حق اسے اپنی معاشرتی قدر کی بنیاد پر قطعی نہیں پہنچتا۔ ہاں شریعتِ اسلامیہ کی روشنی میں معترض ہوں تو کہہ سکتے ہیں کہ نبی ﷺ نے قرآن کی متعین کردہ حدود سے تجاوز کیا۔ ہمارا یہ جواب کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک خصوصی رخصت تھی

کسی غیر مسلم کو مطمئن نہیں کرتا۔ اس اعتراض کو رفع کرنے کے لیے ہمیں اعداد و شمار اور تاریخی حقائق کی طرف رجوع کرنا پڑے گا تاکہ کثرت از دواج کی حقیقت واضح ہو سکے۔

حضور کی ازواجِ مطہرات کی تعداد پر تمام سیرت نگاروں اور مؤرخین کا اتفاق ہے کہ بارہ [۱۲] تھیں۔ ان کی کیفیت درج ذیل جدول سے ظاہر ہے۔ (منگلری واٹ نے ضعیف اور موضوع روایت کے بل بوتے پر چھتیس [۳۶] خواتین کے نام گنوائے ہیں، [Montgomery Watt; Mohammed at Medina, pp.394-397]، اور یہ باور کرایا ہے کہ یہ سب کی سب ازواجِ نبوی تھیں، اور یہ دریدہ ذنی بھی کی کہ نعوذ باللہ شادی شدہ خواتین سے بھی تعلقات تھے)۔

جدول ازواجِ مطہرات، رسول اللہ ﷺ

شمار	سنہ نکاح	عمر شریف	اسمائے گرامی امہات المؤمنین	کیفیت	بیک وقت تعداد
۱	۱۵ قبل نبوت	۲۵ سال	حضرت خدیجہ بنت خویلد، قرشیہ	بیوہ تھیں، چالیس سال کی عمر میں حضور ﷺ کے ساتھ رشتہ از دواج میں منسلک ہوئیں اور پچیس سال تک حضور کی واحد شریک حیات رہیں	۱
۲	۱۰ نبوی	۵۰ سال	حضرت سودہ بنت زمعہ، قرشیہ	بیوہ، نکاح کے وقت پچاس سال کی تھیں۔ حضرت خدیجہ کی وفات کے بعد گھر کی دیکھ بھال کے لیے نکاح فرمایا۔	۱
۳	۲ ہجری	۵۵ سال	حضرت عائشہ صدیقہ بنت حضرت ابوبکر، قرشیہ	کنواری، رخصتی کے وقت عمر چھ تادس سال بیان کی جاتی ہے، تاہم حضرت اسماء کی عمر کے اعتبار سے قیاساً سولہ سال کی تھیں۔	۲
۴	۳ ہجری	۵۶ سال	حضرت حفصہ بنت حضرت عمر، قرشیہ	بیوہ، عمر اٹھارہ سال، حضرت عمرؓ انکے نکاح کی درخواست صحابہ کبار سے کر رہے تھے کہ حضور ﷺ نے خود منظور فرمالیا۔	۳
۵	۳ ہجری	۵۶ سال	حضرت زینب بنت خزیمہ، ہلالیہ	بیوہ، عمر تیس سال، نکاح کے تین ماہ بعد انتقال فرما گئیں، کل تعداد پچھرتین رہ گئی۔	۴
۶	۴ ہجری	۵۷ سال	حضرت اُم سلمہ بنت ابی امیہ، قرشیہ	بیوہ، بمعمر	۴
۷	۵ ہجری	۵۸ سال	حضرت زینب بنت جحش، اسدیہ	مطلقہ، عمر پچیس سال، حضرت زید نے طلاق دی تو انکے علوئے مرتبت کے لیے نکاح فرمایا	۵

۸	۵۸	۵۸	حضرت جویریہ بنت حارث، خزاعیہ	بیوہ: عمر بیس سال؛ انکا نکاح اسیران غزوہ بنو مصطلق کی رہائی کا باعث بنا۔	۶
۹	۵۹	۶۱	حضرت ام حبیبہ بنت ابوسفیان، قریشیہ	مطائف: عمر پینتیس سال؛ ہجرت حبشہ میں شریک رہیں؛ مصلحت دینی کے تحت نکاح فرمایا۔	۷
۱۰	۵۹	۶۱	حضرت ماریہ قبطیہ، مصری	مقبوس شاہ مصر نے بحیثیت کنیز روانہ کیا جنہیں قبول فرمایا گیا۔	۸
۱۱	۶۰	۶۱	حضرت صفیہ بنت حنی، اسرائیلیہ	بیوہ: عمر اٹھارہ سال؛ اسیر خیبر بھیس؛ علوئے مرتبت کی خاطر نکاح فرمایا۔	۹
۱۲	۶۰	۶۱	حضرت میمونہ بنت حارث، ہلالیہ	بیوہ: معمر؛ حضور ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس کی خواہش کے احترام میں نکاح فرمایا۔	۱۰

سے ھ کے بعد حضور ﷺ نے اور کوئی نکاح نہ فرمایا۔ تعداد تو دس ہی رہی، مگر حکم شرع کی مطابقت میں چار کے سوا دیگر ازواج مطہرات سے ار جا فرمایا گیا۔ (دیگر مسلمانوں کو تجدید ازواج کے بعد زائد ازواج کو چھوڑنے کا حکم دیا گیا تھا، یہی اصول ازواج نبی پر بھی لاگو ہونا چاہیے تھا، مگر چونکہ ان کو انہماک المؤمنین کا اعزاز حاصل تھا اور انہیں نبی کے بعد کسی سے بھی نکاح کرنے کی اجازت نہیں تھی اس لیے انہیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑا جاسکتا تھا)۔

جدول بالا سے ظاہر ہے کہ ایک وقت میں ازواج کی زیادہ سے زیادہ تعداد، کئیوں کو ملا کر، دس تک پہنچتی ہے، جو سنتِ داؤدی سے مطابقت رکھتی ہے۔ عمر شریف کی جانب توجہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ پچپن سال کی عمر تک صرف ایک شریک حیات کے ساتھ گزارا فرمایا۔ اس عمر میں منطقہ حازہ کا ایک آدمی بھی اپنے جذبات پر پوری طرح قابو پالیتا ہے۔ اس عمر کے بعد شادیاں خواہشات کے تحت نہیں کی جاتیں۔ یہ شادیاں دینی مصلحت، تالیفِ قلوب، عامۃ الناس کی فلاح و بہبود یا علوئے مرتبت کی خاطر کی گئیں۔

چنانچہ حضرت سودہ سے نکاح اس لیے فرمایا کہ گھر کی دیکھ بھال اور بچوں کی تربیت متاخر نہ ہو۔ حضرت سودہؓ کی کھولت اس دعوے پر دلالت کرتی ہے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سے نکاح سے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ سے رشتے استوار کرنا اور انکی دلجوئی مقصود تھی۔ (واضح رہے کہ حضرت عائشہؓ سے نکاح مکے میں ہی ہو گیا تھا، مگر وہاں کے حالات میں جان پر بنی ہوئی تھی، رخصتی آسان نہ تھی۔ اس کے علاوہ مدینے میں مہاجروں کے لیے ہم کفو رشتوں کا ملنا آسان نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کی پریشانی اور صحابہ سے درخواستیں اس کی غماز ہیں)۔ حضرت جویریہؓ سے نکاح کے باعث ہزاروں اسیران بنی مصطلق کو رہائی ملی، جو اسلام کے لیے نرم گوشہ پیدا کرنے کا باعث بنی۔ اسی حسن سلوک کے باعث ۶۱ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد بنو خزاعہ قریش سے ٹوٹ کر مسلمانوں کے

حلیف بنے۔ واضح رہے کہ بنو مصطلق بنو خزاعہ کی ہی ایک شاخ تھے۔ بنو خزاعہ اسلام کی دشمنی بھلا کر جاں نثار دوست بن گئے۔ ان کا اسلام، مسلمانوں کے لیے ایک گراں بہا قوت ثابت ہوا۔ حضرت زینبؓ اور حضرت ام سلمہؓ کو زوجیت میں قبول فرمانا ان کی تالیف قلب کے لیے تھا۔ حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح قریش کے دو نہایت اہم خاندانوں بنو ہاشم اور بنو امیہ کے آپس کے اختلافات کو مٹا کر خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے لیے تھا۔ (اس نکاح کے بعد حضرت ابوسفیانؓ کا رویہ کافی تبدیل ہو گیا تھا)۔ حضرت صفیہؓ سے نکاح ان کی خاندانی عظمت کو قائم رکھنے کے لیے تھا۔ غرضیکہ ہر نکاح میں کوئی نہ کوئی عظیم مصلحت درپیش تھی۔

ارجاء: تعدد ازدواج کا طریقہ عرب معاشرے میں عام تھا۔ اسے قانونی حیثیت حاصل تھی۔ شریعت اسلامیہ نے ابھی اس پر کوئی حکم نہیں لگایا تھا اس لیے قومی دستور کے مطابق تعدد ازدواج میں قباحت کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ بلکہ انبیائے سابق کی پیروی کے اعتبار سے یہ ایک عمل صالح تھا۔ پھر واقعہ ایلاء پیش آیا جس سے عامۃ المؤمنین میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ مسلمہؓ نے روایت کی کہ حضرت عمرؓ کے انصاری رفیق نے واقعہ ایلاء کی خبر اس تشویش ناک انداز میں دی کہ حضرت عمرؓ نے قیاس فرمایا کہ شاید غسانیوں کا حملہ ہو گیا ہے۔ اس بات کی اطلاع ملتے ہی حضرت عمرؓ انتہائی تیزی سے دریافت حال کے لیے خدمت اقدس میں پہنچے جہاں یہ پتہ چلا کہ کسی ام المؤمنین کو طلاق نہیں دی گئی ہے۔ (صحیح مسلم، باب ۱۶۲، بیان تسخیر لامرأته)۔ یہ تشویش اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ معاشرے کے نزدیک کثرت ازدواج مروجہ دستور تھا۔ اس کے برعکس طلاق کی خبر باعث تردد تھی۔

قرآن میں ازدواج مطہرات کے بارے میں حکم آیا،

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَ زِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ
وَأَسْرَحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا (سورة احزاب، آیت ۲۸)

”اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ فائدہ دوں اور خوش اسلوبی سے رخصت کر دوں۔“

چنانچہ حضور ﷺ نے فردا فردا ہر زوجہ مطہرہ کو پیشکش فرمائی کہ وہ چاہیں تو اللہ کے رسول ﷺ کو منتخب کریں اور چاہیں تو باعزت علیحدگی اختیار کر لیں۔ تمام ازدواج مطہرات نے حضور ﷺ سے رشتے کو برقرار رکھنے کی سعادت کو منتخب فرمایا۔ یہ آزادانہ انتخاب ظاہر کرتا ہے کہ اس معاشرے کے طبقہ نسواں کے لیے بھی کثرت ازدواج کا دستور ناپسندیدہ نہ تھا۔ جب ازدواج مطہرات نے حضور ﷺ کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن میں حضور ﷺ کو یہ حکم ملا کہ آپ بھی ان پر دوسری عورتوں کو اختیار نہ کریں۔

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ وَلَوْ أَغْنَبَكَ حُسْنُهُنَّ
إِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِينُكَ ط

”اس کے بعد آپ کے لیے اور عورتیں حلال نہیں، اور نہ یہ کہ آپ ان سے اور بیویاں تبدیل کریں، چاہے ان کا حسن آپ کو بھائے بھگرو جو آپ کی ملکیت ہوں۔“ (سورة الاحزاب، آیت ۵۲)

قرآن نے ان ازواجِ مطہرات کی حیثیت تبدیل کرنے کی ممانعت کی۔ انہیں امہات المؤمنین کا لقب عطا فرما کر (وَ اَزْوَاجُهُ اُمَّهَاتُهُمْ ... سورة الاحزاب) انہیں معاشرے کی دیگر خواتین سے ممتاز و محترم قرار دیا۔ امت مسلمہ پر ماں کی حیثیت سے ان کا نکاح حرام کیا۔ (وَلَا اَنْ تَنْكِحُوْا اَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهٖ اَبْدًا سورة الاحزاب)۔

ان حالات میں بیک وقت چار سے زیادہ نکاحوں کی ممانعت نازل ہوئی۔ طلاق کی رخصت نہ تھی اور چار سے زیادہ نکاح کی ممانعت بھی تھی۔ پس آپ ﷺ نے ان احکامات کی پیروی اس طرح فرمائی کہ ازواجِ مطہرات میں سے چار کو یعنی حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور حضرت زینبؓ کو اختیار فرمایا اور دوسروں سے عملاً کنارہ کشی (ارجاء) اختیار کی۔ خود امہات المؤمنین نے اپنے اپنے حقوقِ مقرب ازواج کو تفویض کیے۔

اقتدار و ازواج : ایک قیاسی الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ جب تک اقتدار میر نہ آیا تھا، ایک ہی شریک حیات پر اکتفا کیا گیا۔ لیکن جیسے جیسے اقتدار مستحکم ہوتا گیا، اس تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ بعض معاندین نے نفسیات کی آڑ لے کر اس تعداد ازواج کو ابتدائی دور کی محرومیوں کا ردِ عمل قرار دیا۔ یہ سارے قیاسات محض نقشبِ برآب ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اقتدار کب مستحکم ہوا؟ مغربی تجزیہ نگاروں کے 'مطابق' مدینے کے نصف دور کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ (نعوذ باللہ) محمد ﷺ کی حیثیت وہاں مضبوط نہ تھی۔ [M. Watt;] (Mohammed at Medina, p.229)۔ "۶۳۱ء کے بعد محمد ﷺ کا اقتدار مسلمہ ہو گیا۔ اور اب ان کے حکم کی خلاف ورزی ممکن نہ تھی۔" (Ibid, p.325)۔

حضور ﷺ کا وصال ۶۳۲ء میں ہوا۔ پس مغربی تجزیہ نگاروں کے مطابق مسلمہ اقتدار صرف آخری ایک سال رہا۔ اگر ان نام نہاد اتھارٹیز کا تجزیہ درست تسلیم کر لیا جائے تو یہ مفروضہ قطعاً غلط ثابت ہو جاتا ہے کہ تعدد ازواجِ اقتدار کا نتیجہ تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور ﷺ نے ۷ھ (مطابق ۶۲۸ء) کے بعد کوئی نکاح نہیں فرمایا۔ اگر نظریہ اقتدار درست ہوتا تو تعدد ازواجِ آخری ایام میں بڑھ جانا چاہیے تھا، جبکہ آخری چار سالوں میں ازواج کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ہاں اگر کثرت کا تعلق اقتدار سے ہی ہے تو پھر معاندین کو یہ مان لینا چاہیے کہ یہ اقتدار مدنی دور کی ابتدا میں ہی مسلمہ ہو چکا تھا۔

لفظ اقتدار سے جبر و اکراہ کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔ اس لفظ کا استعمال ہی بغض و عناد کا اظہار ہے۔ اقتدار کے سہارے کس سے نکاح کیا گیا؟ حضرت عائشہؓ سے نکاح مکہ کی دور میں ہو چکا تھا اور مکہ کی دور میں اقتدار کا کوئی شائبہ بھی نہیں تھا۔ ان کی رخصتی مدینے میں ہوئی۔ حضرت سودہؓ سے بھی مکہ میں ہی نکاح ہو چکا تھا۔ حضرت حفصہؓ، حضرت عمرؓ کی صاحبزادی تھیں۔ انکی اپنی شخصیت کے سامنے جبر کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ خود اپنی صاحبزادی کے رشتے کی خواستگاری صحابہ کبار سے کر رہے تھے، اور انکی خاموشی سے کبیدہ خاطر ہو رہے تھے کہ حضور ﷺ نے احسان فرما کر انہیں گرویدہ فرمایا۔ حضرت ام حبیبہؓ، حضرت ابوسفیانؓ کی

صاحبزادی تھیں، اور حبشہ میں تھیں جہاں ان کا نکاح حضور ﷺ سے ہوا۔ فاصلہ اور جگہ کا حلقہ اقتدار سے باہر ہونا اس تصدیق کی اجازت نہیں دیتا کہ اس میں کوئی جبر و اکراہ شامل رہا ہو۔ حضرت میمونہؓ کا نکاح مکہ میں ہوا۔ ان دنوں مکہ فتح نہیں ہوا تھا۔ قریش خنجر بکف تھے۔ دشمن کے شہر میں اور ان کے زمانہ اقتدار میں، سوائے رضا و رغبت کے کوئی اور عنصر کارفرما نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت ام سلمہؓ نے نکاح سے قبل کچھ شرائط پیش کیں، جنہیں قبول کیا گیا۔ شرائط اور جبر کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ ام المہاجرین حضرت زینبؓ بنت خزیمہ، حضرت عبداللہ بن جحش کی بیوہ تھیں۔ حضرت عبداللہ جبگ اعد میں شہید ہو گئے تو ان کی توقیر کے لیے نکاح فرمایا۔ حضرت جویریہؓ اور حضرت صفیہؓ دونوں اسیران جنگ تھیں اور حضرت ماریہ قبطیہ کنیز تھیں۔ ان تینوں سے نکاح انہی کے علوئے مرتبت کا باعث ہوا۔

حضرت زینبؓ بنت جحش : یہ حضور ﷺ کی پھوپھی امیمہ بنت عبدالمطلب کی صاحبزادی تھیں۔ مغرب ان کے نکاح پر زبان طعن دراز کرتا ہے اور پوری طرح دل کا غبار نکالتا ہے۔ واقعات کو تو زمرہ کرمغربی ذہن کے عین مطابق پیش کرتا ہے۔ حضرت زینبؓ اپنے بھائیوں کے ہمراہ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائی تھیں۔ پھوپھی زاد بہن ہونے کی حیثیت سے حضور ﷺ کے لیے اجنبی نہ تھیں۔ اگر مغربی انداز فکر درست ہوتا تو ان سے ابتدائی دور میں ہی رشتہ مناکحت استوار ہو جاتا۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ اس کے برخلاف حضور ﷺ نے ان کا نکاح حضرت زیدؓ بن حارثہ سے کر دیا۔ اس نکاح کے لیے حضرت زینبؓ اور ان کے بھائی ذہنی طور پر تیار نہیں تھے، لیکن فرمان نبوی کے احترام میں سر تسلیم خم کر دیا۔ حضرت زینبؓ، حضرت زیدؓ کو اپنا ہم کفو تسلیم نہ کرتی تھیں۔ ذہنی تفاوت نے نباہ مشکل کر دیا۔ حضرت زیدؓ نے حضور ﷺ سے شکایت کی، جس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس قسم کی باتوں پر طلاق نہیں دیا کرتے۔ پھر بھی نباہ نہ ہو۔ کیا تو حضرت زیدؓ نے حضرت زینبؓ کو طلاق دے دی۔ جس کے بعد حضور ﷺ نے حکم خداوندی حضرت زینبؓ سے نکاح فرمایا۔ اس نکاح پر حضرت زینبؓ ہمیشہ فخر کیا کرتی تھیں۔

نکاح کا یہ واقعہ ۵ھ میں پیش آیا۔ اس وقت تک مدینے میں منافقین کا خا صا زور تھا۔ اسی مہینے میں واقعہ اُفک پیش آیا جسے منافقین نے بڑے زور و شور کے ساتھ اچھالا۔ اگر واقعہ نکاح میں اختلاف کی کوئی گنجائش ہوتی یا کوئی پہلو اخلاق سے متصادم ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ منافقین اس پر شدید رد عمل ظاہر نہ کرتے۔ لوگوں کو اگر کوئی بات ناگوار گزری تھی تو صرف یہ کہ متنبی کی مطلقہ بیوی سے نکاح نہ ہونا چاہیے تھا کیونکہ ایام جاہلیت میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس نکاح کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ ایام جاہلیت کے تختل پر ضرب لگائی جائے اور واضح کیا جائے کہ منہ سے کسی کو بیٹا کہہ دینے سے شریعت کی نظر میں وہ بیٹا نہیں ہو جاتا۔ بیٹا اسی کا ہے جس کے صلب سے وہ پیدا ہوا ہے۔ اس تصور جاہلیت پر اگر اسی وقت ضرب کاری نہ لگائی ہوتی تو شاید منہ بولے بیٹے کا بیٹا وراثت نبوی کا بھی دعویدار ہوتا اور وصال نبوی کے بعد ہی نوزائیدہ مملکت اسلامیہ خانہ جنگی اور دھڑے بندیوں کا شکار ہو جاتی۔ دین کا ارتقاء، حکم کرام اسلامی معاشرہ فطری نمونے محروم ہو جاتا۔ غالباً یہی وہ مصلحتیں تھیں جن کے

باعث قرآن نے اعلان کیا: **کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی مکتبہ سے بڑا مفت مرکز**

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلَكِن رَّسُولَ اللَّهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ط
(سورۃ الاحزاب، آیت ۴۰)

”محمد (ﷺ) تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں، لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔“

اس آیت مبارکہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ایسا مقام آگیا تھا جہاں منہ بولے رشتے کا نبوت کے ساتھ تعلق ختم کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ جب حضور مردوں میں سے کسی کے باپ نہ تھے تو مردوں میں سے کوئی ان کا بیٹا بھی نہ تھا۔ جب یہ بنایا ہوا رشتہ ہی نہ رہ گیا تو اس رشتے کے تعلق سے ہر حرمت ختم ہو گئی۔

اب صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس حرمت کے اختتام کے لیے یہ شادی ہوئی یا اس کے برعکس اس شادی کے لیے یہ حرمت ختم کی گئی۔ قرآن، احادیث، کردارِ نبوی اور قرآن سب کے سب اوّل صورت کی تائید کر رہے ہیں۔ مفروضہ ثانی محض معاندین کی دریدہ ذہنی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا،

وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَانِكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ط ذَلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِأَفْوَاهِكُمْ ط (سورۃ الاحزاب، آیت ۴)
”اور تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے نہیں بنایا، یہ تمہارے منہ کی باتیں ہیں۔“

ظاہر ہوا کہ موضوع سخن لے پالک کو بیٹا سمجھنے کی مذموم رسم جاہلیہ ہے، جو ضرورت سے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی۔ اس اہمیت کے ڈانڈے غالباً رسالت و نبوت سے ملنے لگے تھے۔ اسی باعث، اسی ضمن میں حضور (ﷺ) کی ختم نبوت کا بھی اعلان کیا گیا۔ پھر حضور کا ارشاد ’نحن معاشر الانبياء لا نورث ولا نورث‘ کہ ہم گروہ انبیاء نہ کسی کو وارث کرتے ہیں نہ کسی سے وراثت پاتے ہیں، ہر مدعی وراثت کے دعوے کو ختم کرنے کے لیے تھا۔

کردارِ نبوی کا تابناک ترین پہلو یہ ہے کہ حضور (ﷺ) اصولوں کے خلاف کسی قیمت پر مصالحت نہیں فرماتے تھے۔ حیاتِ طیبہ کے ہر گوشے میں یہ پہلو پوری طرح جلوہ گر ہے۔ کوئی معمولی سے معمولی واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ کسی مصلحت کو اصولوں پر ترجیح دی گئی ہو۔ پس یہ تصور کرنا کہ حضرت زینبؓ کے معاملے میں یہ اصول برقرار نہ رہ سکا محض بدگمانی ہوگی۔

عیش کوش مذہب

عیسائیت کے بنیادی عقائد سے اختلاف کے باعث، عالم عیسائیت نے اسلام کو ایک جداگانہ مذہب پایا۔ ان کے مذہب میں گناہ آدم کے باعث ہر شخص پیدا نشی گناہگار تھا جبکہ اسلام میں انسان پیدا نشی معصوم ہے، جو اپنے اعمال کے سبب گناہگار یا نیکو کار بنتا ہے۔ ازلی گناہ کے بوجھ سے آزاد ہونے کے باعث اسلام میں اس عقیدے کی گنجائش نہیں کہ خدا انسان کے پیکر میں زمین پر اترے، اپنی ہی قربانی اپنے ہی حضور پیش کرے اور

اس کی یہ قربانی انسان کی نجات کا وسیلہ بنے۔ اسلام نے شویت کو مسترد کر کے وحدانیت کی تعلیم دی۔ جسم روح کا مقبرہ نہ رہا۔ خود آزاری فعلی عبث ہوا۔ رہبانیت غیر پسندیدہ بھری۔ تجر و غیر فطری عمل قرار پایا۔ خالق و مخلوق میں راست تعلق قائم کیا گیا، جس کے باعث مذہب پیشہ گروہ کا واسطہ غیر ضروری ہو گیا۔ کلیسا قسم کے ادارے کا قیام عمل میں نہ آ سکا۔ معبود سے راست تعلق کی بدولت ہدایت عام ہوئی اور ہر شخص اس ہدایت کی روشنی میں دنیاوی زندگی بسر کر کے، آخرت میں نجات کا حقدار ہوا۔ نجات پانے والوں کو ہر قسم کے آرام و آسائش کی ضمانت دی گئی اور جو اس ہدایت کی خلاف ورزی کریں انہیں تنبیہ کی گئی کہ وہ آخرت میں نجات سے محرومی کو مقدر سمجھیں اور آرام و آسائش سے محرومی اور شدید تکالیف و مصائب کو اپنا انجام جان لیں۔

ان بنیادی اختلافات کے باعث اسلام اور عیسائیت کی راہیں ہر مرحلے پر جدا ہوتی گئیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف مذہب نظر آنے لگے۔ سب سے بڑا اختلاف توحید اور تثلیث کا تھا۔ مغربی تثلیث کو عالم عیسائیت پر رومی شہنشاہ نے مسلط کیا تھا۔ اسے پورے عالم عیسائیت میں قبولیت عام میسر نہ آ سکی۔ عیسائیوں کے مختلف فرقوں نے شدت سے اسکی مخالفت کی۔ نسطوری اور ایرین فرقوں کے عقائد تثلیث سے کہیں زیادہ توحید سے قریب تھے۔ ان کے عقائد نے عیسائی معاشرے میں شدید انتشار پیدا کیا جسے شدید خونریزی کے ذریعے دبا دیا گیا۔

چونکہ مغربی تثلیث کے مقابلے میں ہر عقیدے کو بدعت کا نام دیا گیا اور ابتدائی ایام میں مغرب نے رسول عربی ﷺ کو عیسائی ہی تصور کیا اس لیے اسلام ان کی نظر میں بدعت قرار پایا، جسے کیتھولک مخالف عقیدے کے عیسائیوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اسلام کی تیز رفتار فتوحات اور اسکا استحکام بھی ایک مسئلہ رہا تھا، جس کا سبب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کچھ نے کہا تلوار، کچھ نے کہا فریب۔ اور آخر میں یہ خیال کیا گیا کہ اسکا سبب اسلام کی سطحی تعلیمات تھیں۔ جنگجویی، لوٹ، کثرت ازدواج، زندگی کے عیش اور پرکشش جنت کے وعدے اولین پیروکاروں کے لیے رغبت کا باعث ہوئے۔

ان بے سرو پا نظریات کے باعث ایک اور اعتراض یہ وارد ہوا کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک عیش پرست مذہب رائج کیا۔ اس تیغ کے باعث بے شمار عیسائی اہل قلم ایسے ہیں جن کی تحریروں کا مقصد ہی اسلام کو لٹاؤنا اور غلط رنگ میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ اسلام کی تفہیم کی رفتار انیسویں صدی کے آغاز تک نہایت سست رہی لیکن بیسویں صدی کے نصف کے بعد اس میں خاصی تبدیلی ہوتی نظر آتی ہے۔

جب کسی مذہب کی کامیابی کا ذکر کیا جاتا ہے تو حقیقتاً ان نظریات کا ذکر ہوتا ہے جو بیشتر انسانی زندگی کی تسکین کا باعث ہو چکے ہوں۔ یہ کامیابی اتفاقات، جبر و زیادتی، یا کمزور فریب کے باعث نہیں ہوتی۔ انسانی ارتقاء کسی ایسی فکر کا مہو ہون منت نہیں ہوتا جو بر خو و غلط ہو۔ یہ ایک معتدل اور مستحکم فکر ہوتی ہے۔

اسلامی معاشرے کی کامیابی اور استقرار، اور اسکا استحکام یہ یقین کرنے کے لیے کافی ہیں کہ اسلامی تعلیمات اور عقائد اتنے مستحکم فعال اور تسلی بخش ہیں کہ جہاں کہیں انہیں اپنایا گیا وہاں صدیاں گزر گئیں لیکن کسی دوسرے کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

عقیدے کو بارنٹل سکا۔ اسلامی معاشرہ اپنے عقائد و نظریات سے مطمئن ہے اور اسلام ان کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں کسی اور عقیدے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اسلام دنیا کا جدید ترین مذہب ہے۔ باقی تمام مذاہب اس سے پہلے کے ہیں۔ اسلام ایک ایسا ترقی یافتہ مذہب ہے جو ہر علاقے، ہر نسل اور ہر دور کے لیے ہے۔ یہ نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ زندگی کی مسرتوں کا بھی ضامن ہے۔ یہ مذہب کی انتہائی ارتقائی شکل ہے۔ مغرب کو اسلام میں نہ جانے کون سی عیش کوشی کی شکلیں نظر آتی ہیں۔ فحاشی یہاں ممنوع؛ نفع آؤر اشیاء یہاں حرام؛ سادہ زندگی کی تلقین؛ ہنسنے پر روکنے کو ترجیح؛ ارتکاز دولت کی ممانعت؛ دولت کو معاشرے پر [اہل کلیسا یا مسجد پر نہیں] خرچ کرنا عین ثواب؛ فخر و نمائش پر پابندی؛ دولت پیدا کرنے کا کہیں تذکرہ نہیں؛ دولت کو اپنی ذات پر نہیں بلکہ غرباء، یتامی اور مساکین، بیوگان اور دیگر مستحقین پر خرچ کرنے کی تاکید؛ آمدنی پر حلال و حرام کی پابندی؛ لہو و لعب کی ممانعت؛ وقت اور زندگی کا مصرف عبادت اور تزکیہ نفس؛ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے اللہ کو یاد کرنے کا حکم؛ دن رات میں پانچ مرتبہ ادا کی صلوٰۃ کا حکم جس کے لیے بدن کی پاکیزگی شرط اول؛ سال میں تیس دنوں کے روزے اور تراویح، زندگی میں ایک بار حج لازم؛ ضرورت ہو تو مذہب کے لیے جان قربان کر دینے کا حکم؛ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تمام زندگی پابندی؛ مہدے لحد تک حکم الہی کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین؛ کم خوری، کم خوابی اور کم گوئی شعار؛ گفتگو میں احتیاط؛ بدگوئی گناہ؛ عیب جوئی، غیبت اور بدظنی جرم؛ گناہوں سے پرہیز اور نیکی کی کوشش مومن کی شان؛ شہوت پرستی کا شرک کے بعد سب سے بڑے گناہ کا مقام؛ شہوت کی نگاہ سے دیکھنا آنکھ کا گناہ؟ شہوت کی باتیں سننا کان کا گناہ؛ ایسی باتیں کرنا زبان کا گناہ؛ ان سب پر سخت گرفت کی تنبیہ؛ ناجائز جنسی تعلق کی سزا دڑے؛ چوری کی سزا عبرت ناک؛ کسی پر تہمت لگانا قابل تعزیر؛ کسی کے عیب بیان کرنا سخت مکروہ؛ حسد ممنوع؛ عدل و انصاف معاشرے کی روح؛ قوانین وقتی اور خود ساختہ نہیں بلکہ ازلی اور ابدی جو شاہ و گدا پر یکساں لائق؛ دوستی اور دشمنی کا معیار حق؛ قرآن ہر شخص پر اور ہر شخص کے لیے ہر وقت حجت؛ معیار برتری دولت و اقتدار کی جگہ صرف تقویٰ؛ مفتی مسکین غیر مفتی شہنشاہ سے برتر؛ علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا فریضہ؛ دیانت اس کا طرز و امتیاز؛ والدین بزرگوں اور علماء کا احترام و عزت جزو ایمان؛ دل آزاری چاہے غیر مسلم کی ہی کیوں نہ ہو گناہ؛ یہاں تک کہ جھوٹے خداؤں کو بھی برا کہنے کی اجازت نہیں کہ اس سے بھی دل آزاری ہوتی ہے؛ عہدیت سب سے بڑی شان، جو عجز و انکسار کی انتہا ہے؛ تکبر صرف ذوالکبریا کے لیے، بندے کی ذات کو اس سے کوئی علاقہ نہیں؛ دنیا کی زندگی نیابت خداوندی، وہ بھی چند روزہ اور فانی؛ زندگی کا مقصد عقبی کو سنوارنا؛ مقصود حقیقی دنیا کی جگہ آخرت؛ زندگی ایک مسلسل امتحان، جس کے نتائج پر آخرت کا دار مدار؛ زندگی کی ذمہ داریوں سے گریز غیر مستحسن، ان کی بحسن و خوبی ادائیگی مذہبی فریضہ؛ ہر عمل کی نیت خوشنودی الہی لازم؛ وہ اعمال جن سے اللہ کی خوشنودی مقصود نہ ہو ان کا گناہ؛ ہر عمل کی جواب دہی کا تعہد، جس کے عوض حجت یا جہنم ٹھکانہ۔

یہاں جنت کی بشارت بھی بے راہ روی پر مائل نہیں کر سکتی۔ اس مذہب میں دوزخ کا خوف بھی اعتدال سے تجاوز و گریز کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک عظیم اعتدال ہے جو اسلام کے عقائد اور تعلیمات کے سبب قائم ہوتا ہے۔ یہاں نہ دنیا ترک ہونے پاتی ہے نہ دین سے بے تعلقی پیدا ہو سکتی ہے۔ نئی معاملات ہوں کہ ملتی، معاشرتی ہوں کہ تمدنی، سیاسی ہوں کہ مذہبی، علمی ہوں یا روحانی، اقتصادی ہوں کہ ثقافتی، اخلاقی ہوں یا فکری سب کے سب دین کے تحت ہیں۔ اسلام زندگی کی مسرتوں، اقتدار، عظمت و سر بلندی، علو اور ارتقاء کا مخالف نہیں، لیکن ان سب کی حدیں مقرر کرتا ہے۔ ان حدود میں رہتے ہوئے ہر طرح کی مسرتوں کی اجازت دیتا ہے اور ان حدود سے تجاوز کرنے پر پابندی عائد کرتا ہے۔

یہ ہے اس مذہب کی اجمالی کیفیت جو متفہم اسلام کے توسط سے دنیا کو ملا۔ اس میں عیش کوشی کا تصور تک نہیں۔ یہاں فکر و عمل میں یکسانیت ہے۔ کہنے کی باتیں الگ اور کرنے کی باتیں الگ نہیں۔ مغرب کی منطقی اقدار کچھ اور، اور عملی اقدار کچھ اور ہیں۔ وہ اسلام کو اپنی منطقی اقدار پر جانچتے ہیں، جس کے باعث انہیں مایوسی ہوتی ہے۔ مغرب میں تجربہ دور بہانیت کتنے فی صد لوگ اختیار کرتے ہیں؟ یک زوجگی اگر معاشرتی حل ہے تو مغرب جنسی انتشار میں کیوں مبتلا ہے۔ بہشت میں اگر آرام و آسائش میسر ہے تو اس میں قباحت کیا ہے۔ ابدی زندگی کو آسائشوں سے مزین کیوں ہونا چاہیے۔ اسلام میں اعراف ایک ایسا مقام ہے جو بہشت سے کمتر ہے اور اعراف سے ارذل جہنم ہے۔ اگر مغرب کا آئیڈیل اعراف ہے اور اسلام اعراف سے برتر مقام کو آئیڈیل بناتا ہے تو اس میں کلام کیوں؟

اصل بات مابعد الطبیعیاتی نظریات کی ہے۔ ان کے خیال میں جسم میں روح قید ہے۔ اگر حیات ثانیہ میں روح پھر قید ہوگئی تو یہ نجات تو نہ ہوگی۔ لہذا روح آزاد رہے گی اور جسم کا وجود نہ ہوگا۔ جب جسم نہ ہوگا تو جسمانی آسائش کا خیال مضحکہ خیز ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے صرف جنت ہی کیوں مورد الزام ہے، جہنم کا وجود بھی تو بے معنی ہو جاتا ہے کہ روح اگر لذت سے نا آشنا ہوگی تو جسمانی کرب سے بھی نا آشنا رہے گی۔ جب جنت دوزخ نہیں تو عذاب و ثواب کا کیا تصور؟ جب ثواب و عذاب نہیں تو پھر اعمال کی تخصیص کیوں۔ عبادت کس لیے اور نیکی کیا کام آئے گی اور بدی سے کیا نقصان پہنچے گا۔ پھر مذہب کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ آزاد روح چاہے نیک کی ہو یا بد کی یا تو آوارہ پھرتی رہے گی یا اپنے مستقر تک پہنچ جائے گی۔ یہ محض فلسفیانہ انداز فکر ہے اسے وحی سے کوئی تعلق نہیں۔

فکری مذہب میں ایسے تضاد عموماً پائے جاتے ہیں۔ اور عیسائیت کی بنیادوں میں فلسفیانہ فکر کو خاصا دخل ہے۔ یہ مشرک نہ رسوم، مذاہب وحی اور مذہب فکری کا آمیزہ ہے۔ اور اسی سبب سے الجھنوں سے دوچار ہے۔ داعی اسلام پر تمام اعتراضات سطحی، بے بنیاد اور وضعی ہیں۔ نفرت، دشمنی اور تعصب کی پیداوار ہیں۔ عیسائیت کے دفاع کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ انکی مجروح ان کی تسکین کا سامان ہیں۔ ان اعتراضات کی آبیاری صدیوں کی گئی ہے۔ اس پر مغرب نے بڑی توانائیاں خرچ کی ہیں۔ بہترین دماغ اس کے لیے وقف کر دیے گئے۔ وقت اور سرمایہ بے دریغ خرچ کیا گیا تب یہ کذب بانی ممکن ہو سکی۔ لیکن اب اس کا منبع اتر رہا ہے اور دنیا پر کھل رہا ہے کہ محسن انسانیت ﷺ کا دامن ان تمام آرائشوں سے پاک ہے۔

باب ششم

حاصلِ کلام

حاصلِ کلام

ہر معاشرہ کچھ خاص فکری بنیادوں پر قائم ہوتا ہے، جس میں مذہب مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ جب کسی مستحکم معاشرے میں کوئی نیا مذہب جنم لیتا ہے تو یہ نیا مذہب معاشرے میں تبدیلی اور انقلاب پیدا کرتا ہے۔ یہ انقلاب مقتدر طبقہ کے حق میں نہیں ہوتا۔ اس لیے نئے مذہب کو خود اپنے ہی معاشرے کے اندر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایک معاشرے کا انقلاب ہمسائے معاشرے کے لیے تشویش کا باعث بن جاتا ہے۔ جب کوئی انقلابی فکر ایک معاشرے میں کامیابی سے ہمکنار ہو کر دوسرے معاشروں کی طرف رخ کرتی ہے تو وہاں اسے اور بھی شدید مزاحمت پیش آتی ہے۔ دوسرا معاشرہ جتنا زیادہ مہذب اور مستحکم ہوگا یہ مزاحمت اتنی ہی شدید ہوگی۔

دیگر عالمی مذاہب کی طرح اسلام کو بھی عالمِ عرب میں نظریاتی انقلاب پیدا کرنے کے لیے شدید جدوجہد کرنی پڑی۔ اپنے معاشرے میں کامیابی کے بعد جب اسلام ہیلیک 'معاشرے میں پہنچا تو اس معاشرے کے محکوم سماجی عناصر نے تو اسے خوش آمدید کہا، لیکن مقتدر یونانی اور رومی عناصر نے امکان بھرا اسکی مخالفت کی۔

رومن معاشرے کی نظر میں عرب غیر مہذب اور نیم وحشی تھے۔ اسلام کو انہوں نے ایک غیر مہذب قوم کے فکر و نظریات سے تعبیر کیا۔ مہذب اقوام کبھی بھی غیر مہذب اقوام کی فکر کو آسانی سے قبول نہیں کرتیں۔ اسلامی عقائد و تعلیمات اگر نظریات کی حیثیت سے پر امن حالات میں عیسائی دنیا میں پہنچتے تو بھی نسلی، مذہبی، لسانی اور سیاسی اختلافات کے پیش نظر اس قدر متنازع ہوتے کہ عیسائی دنیا کا سکون درہم برہم ہو کر رہتا۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو باب اول میں؛ 'مغرب کا معاشرہ'، 'باشندے' اور 'اختلافی عقائد') اور معاشرتی بقا کے لیے ان عقائد کی مخالفت ناگزیر ہی ٹھہرتی۔

تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام اور عالمِ عیسائیت کا تعارف ہی میدانِ جنگ میں ہوا۔ دورِ نبوی میں اسلام جزیرہ نمائے عرب سے باہر نہ پہنچا تھا۔ وصالِ نبوی کے وقت جیشِ اسلام قباہل بنو غسان کی سرکوبی کے لیے روانہ ہونے کو تیار تھا، جو وصال کے فوراً بعد عہدِ صدیقی کے ابتدائی ایام میں روانہ ہوا۔

غسان کی حمایت کے لیے شہنشاہ ہرقل کی افواج کا اجتماع اسلامی مملکت کی سرحدوں پر ہونے لگا۔ جلد ہی سرحدی جھڑپیں باقاعدہ جنگ میں تبدیل ہو گئیں اور معرکہ یرموک میں (۶۳۵ء) حضرت خالد بن ولید نے رومی شہنشاہ ہرقل کی افواج کو فیصلہ کن شکست دے کر شام پر قبضہ کر لیا۔ پھر فتوحات کا مستقل سلسلہ بندھ گیا۔ یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر (۳۲۲ء) مسلمان افریقہ اور اسپین سے بڑھ کر مغرب کے قلبِ فرانس پر حملہ

کر رہے تھے۔ (تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو باب دوم، 'ریاست اسلامیہ کی توسیع اور عہدِ وسطیٰ کا مغرب')۔ آٹھویں صدی تک عیسائی دنیا نہ صرف اپنا نصف بڑی علاقہ کھوج چکی تھی بلکہ بحرِ روم پر سے اسکی ہزار سالہ اجارہ داری بھی ختم ہو چکی تھی۔ اس طرح عیسائی دنیا نے اسلام کو محض اپنے دشمن کا عقیدہ تصور کیا۔

مہذب اقوام شکست کھانے کے باوجود غیر مہذب اقوام کی برتری قبول نہیں کرتیں، لہذا ایک ایسی قوم جو ہزار سال سے بحرِ روم سے متصل دنیا پر حکومت کر رہی تھی، جو تہذیب و تمدن کے اوج کمال پر تھی، جس نے وحشی اقوام کی وحدہ دلیغاروں کو دیکھا تھا اور ان کی حربی برتری، اپنی تہذیبی برتری کے ذریعے ختم کر چکی تھی، کس طرح [اپنی دانست میں غیر مہذب] عربوں کی برتری قبول کر سکتی تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ روم کا اقتدار ابدی اور لازوال ہے۔ عربوں کی حربی برتری کے بارے میں بھی وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہی کہ بالآخر ان پر بھی اس کی تہذیبی برتری غالب آ جائے گی۔ لیکن عیسائی توقعات کے برخلاف اسلام نے خود ایک عظیم تر تہذیب کو جنم دیا جو نہ صرف روز افزوں تھی بلکہ عیسائی دنیا پر گونا گوں دباؤ بھی ڈال رہی تھی۔ (ملاحظہ ہو باب دوم، 'مسلم فتوحات کے دور رس اثرات، سیاسی معاشرتی مذہبی اقتصادی دباؤ')۔

ساتویں صدی کا عالم عیسائیت دو دھڑوں میں بنا ہوا تھا۔ مغرب کا لاطینی معاشرہ، مشرق کے یونانی معاشرے سے جدا گانہ خطوط پر استوار ہو رہا تھا۔ شدید اختلافات نے دونوں میں افتراق پیدا کر دیا تھا۔ اختلافات کی خلیج آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ مسلمانوں کی ابتدائی جنگیں مشرقی معاشرے سے ہو رہی تھیں اور مغربی معاشرہ ان جنگوں میں تماشائی تھا۔ مشرقی معاشرے (بازنطین) کی شکستیں اس کے لیے رقیب کی شکستیں تھیں۔ لیکن جب ان شکستوں کے گونا گوں اثرات خود مغرب پر مرتب ہونے لگے تو اس کا اذیلین ردِ عمل یہ ہوا کہ مغربی کلیسا نے کمزور بازنطین سے خود کو الگ کر کے ایک آزاد مغربی شہنشاہیت قائم کر لی۔ (ملاحظہ ہو باب اول، مغرب کا پس منظر)

مغربی معاشرہ کلیسا کا قائم کردہ تھا۔ کلیسا کی اپنی سیاسی اور اقتصادی پالیسی کوئی نہیں تھی۔ اس کا تجربہ محض مذہب تک محدود تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کے سوا ہر میدان میں مغربی معاشرہ حقیقی رہنمائی سے محروم تھا۔ کلیسا نے مذہبی پالیسی کو معاشرے کا مطمح نظر بنا دیا۔ یہ معاشرہ ہر طرف سے طاقتور مخالفین میں گھرا ہوا تھا۔ مشرق میں بازنطین، جنوب اور مغرب میں سلطنتِ اسلامیہ اور شاہان میں یورپ کی بت پرست وحشی اقوام تھیں۔ ان کے خلاف بدافعت کے لیے مغرب کے وسائل قطعاً ناکافی تھے اور اسکی اقتصادی حالت باقاعدہ افواج کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ کلیسا نے دفاعی مقاصد کے لیے ان تمام طاقتوں کے خلاف شدید پروپیگنڈہ کر کے اپنے دائرہ اثر میں ہر فرد کو برسرِ پیکار کر دیا۔ شمالی اقوام سے حفاظت کے لیے معاشرے کو نہ صرف غیر کیتھولک عناصر سے پاک کر دیا گیا بلکہ آس پاس سے غیر عیسائی اقوام کا وجود تک مٹا دیا گیا۔ بازنطینی عیسائیوں کو بدعتی قرار دیکر ان کا اثر و رسوخ ختم کیا۔ شہنشاہ بازنطین نے بھی مذہبی عصیت کے پیش نظر کبھی مغرب کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔ اس طرح دو مخالفین کی جانب سے اطمینان ہونے کے بعد کلیسا کی تمام توانائیاں صرف اسلام کے خلاف

وقف ہو گئیں۔ اس نے اسلام اور بانی اسلام ﷺ کے خلاف شعوری طور پر نفرت پیدا کی۔ مذہب کے نام پر پیدا کی گئی نفرت رفتہ رفتہ جزوِ فطرت بن گئی۔

پروپیگنڈے کی قوت سے کلیسا پوری طرح واقف تھا۔ یہ کلیسا کا پروپیگنڈہ ہی تھا جس نے رومن دنیا کو مسیحی بنایا اور مغرب کو بازنطین سے جدا کیا۔ اسی پروپیگنڈے کے بل پر مغرب کا اقتدار اعلیٰ کلیسا کو میسر آیا۔ یہ اقتدار کیسٹولک نظریات کا مرہونِ منت تھی۔ اس کے نظریات سے اسلام متصادم تھا۔ اسلام کی مزید وسعت کلیسا اور اسکے اقتدار کے حق میں ستم قاتل تھا۔ کلیسا کے پاس مدافعت کے لیے مالی وسائل نہ تھے۔ اس نے اسی قدیم آزمودہ پروپیگنڈے کی قوت سے اپنی بقا کے لیے بھرپور طریقے سے کام لیا۔

باہر سے عالم اسلام کا شدید دباؤ اور اندر سے کلیسا کی نفرت انگیزی ایسے عناصر تھے جنہوں نے مغرب کو اسلام کے حقیقی خد و خال سے واقف ہی نہ ہونے دیا۔ (ملاحظہ ہو باب سوم، چرچ کا کردار اور 'نظریاتی محاذ')۔ ازل تو انہیں مسلم فاتحین سے دشمنی کے باعث اسلام سے دشمنی رہی۔ ثانیاً اسلام کی تعلیمات اور عیسائیت کی تعلیمات میں اس قدر تضاد تھا کہ تجاہل میں ہی مصلحت تھی۔ ورنہ اسلام مغرب کے گرد و پیش تھا اور جہاں مغرب نے مسلمانوں کے دیگر علوم پر دسترس حاصل کر لی تھی وہیں اسلام کے بارے میں بھی صحیح معلومات حاصل کر سکتا تھا۔ ایک طرف علوم طب، ریاضی، فلسفہ اور فلکیات پوری صحت کے ساتھ مغربی زبانوں میں منتقل ہو رہے تھے، دوسری طرف اسلام کا نفرت انگیز تصور عام کیا جا رہا تھا۔ (ملاحظہ ہو باب چہارم، 'عالم اسلام سے علمی استفادہ')۔ اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ مغرب نے سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر عمداً اسلام کا ایک فرضی ہیولی ترتیب دیا۔ ان کی تحریروں کے خاص اغراض و مقاصد تھے۔ انہی اغراض و مقاصد کے تحت حقائق کو مسخ کیا گیا اور صرف نفرت کو ہوا دینے کے لیے بے بنیاد الزامات و اتہامات عائد کیے گئے۔ بیڈے کی اناجیلی تاویلات ہوں کہ عامیوں کی غیر ذمہ دارانہ اشتعال انگیز اور گمراہ کن تحریروں، صلیبی واقع نگاروں کی تعلق ہو کہ مقدس پادریوں کے رشحاتِ قلم، مورخین کی دقیق نظری ہو کہ شعراء کی پروازِ خیال، ہر فکر افراط و تفریط میں ملوث، مسخِ عمد کا شکار، خود ساختہ مفروضوں پر مبنی اور حقائق سے مبرا ہے۔ لطف یہ ہے کہ کذب بیانی کے اس میدان کے تمام شہسوار ارکان کلیسا ہیں۔

چودھویں صدی عیسوی تک یہ بے سرو پا پروپیگنڈہ بے ترتیب اور غیر منظم تھا۔ حروبِ صلیبیہ کی ناکامی اور یورپ میں ترکِ پیش قدمیوں نے ارکانِ کلیسا کے اس پروپیگنڈے کو باقاعدہ، منظم اور موثر بنانے کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اب تک جو کچھ تھا، اس میں محض لغویات، جھنجھلاہٹ، طعن و تشنیع کے سوا کچھ نہ تھا۔ چودھویں صدی میں ضرورت محسوس کی گئی کہ اسلام پر نظریاتی حملے کر کے اس کی بیخ کنی کی جائے۔ ریمینڈ ل اور راجر بیکن نے بیخ کنی کی تجاویز پیش کیں۔ (ملاحظہ ہو باب سوم، 'نظریاتی محاذ')۔ پندرہویں صدی عیسوی میں نظریاتی حملوں کی منصوبہ بندی کی گئی اور سولہویں صدی عیسوی میں اس پر باقاعدہ عمل درآمد شروع ہوا۔

مستشرقین کا گروہ اسی پندرہویں صدی کی طویل المیعاد منصوبہ بندی کی پیداوار تھا۔ اس کی آفرینش کا مقصد خدمتِ اسلام یا علمی پیش رفت نہ تھا، بلکہ اسلام کی خامیاں تلاش کرنا، کمزوریوں کو دریافت کرنا اور نظریاتی حمولوں کے لیے موادِ بہم پہنچانا تھا۔ مختصراً یہ کہ اسلام کی تیج کنی ان کا فرض منصبی تھا۔ جب تک مغرب کو عالمِ اسلام سے سیاسی خطرہ رہا اس وقت تک مستشرقین کی تحریریں شدید تر عناد میں ڈوبی رہیں۔ جیسے جیسے سیاسی خطرہ کم ہوتا گیا اس عناد کی شدت میں بھی کمی آتی گئی۔ اور جب مغرب کو خود عالمِ اسلام پر غلبہ حاصل ہو گیا اور سیاسی خطرہ باقی نہ رہا تب انہیں اسلام کو سمجھنے کی توفیق میسر ہوئی۔ انداز کی یہ تبدیلی عثمازی کرتی ہے کہ مستشرقین کی حیثیت سیاسی آلہ کار کی تھی اور ان کی تحریریں محض جنگی اور سیاسی پروپیگنڈہ تھیں۔

سترہویں صدی کی تحریروں کی زبان تلخ، بیان پر عناد اور اسلوب جارحانہ ہے۔ تاہم اس صدی کے لٹریچر سے وضعی مواد (مثلاً بستی کا مضحکہ خیز تصور، معلق تابوت، کبوتر، بیل یا کنوئیں کی من گھڑت کہانیاں وغیرہ) خارج کیا جانے لگا، کیونکہ یہ بے سروپا اور بے بنیاد افسانے پروپیگنڈہ کو تقویت نہ دے سکتے تھے۔ لیکن غلیظ بازاری زبان کے استعمال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس صدی کا پروپیگنڈہ محض مقامی اغراض و مقاصد کا حامل تھا۔ اس کے مقاصد ابھی عالمی سطح کے نہیں ہوئے تھے۔

اٹھارویں صدی میں ترکوں کی فوجی قوت کمزور ہونے لگی۔ مغرب کے لیے عالمِ اسلام سیاسی یا فوجی خطرہ نہ رہ گیا۔ نپولین بونا پارت کی افواج اٹھارویں صدی کے اواخر (۱۷۹۸ء) میں عالمِ اسلام کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں۔ حالات کا رخ تبدیل ہو چکا تھا۔ قوت کا توازن مغرب کے حق میں تھا۔ خوف اور دباؤ کا رخ مغرب سے ہٹ کر عالمِ اسلام کی طرف ہو چکا تھا۔ ان سیاسی تبدیلیوں کا واضح اثر اٹھارویں صدی کے لٹریچر پر نظر آتا ہے۔ غلیظ زبان کی جگہ متانت اور سنجیدگی نے لے لی۔ کمزور فریق کے مضبوط دلائل صورتحال کو بدل نہ سکتے تھے لہذا بے خطر مختلف علمی موضوعات پر گفتگو ہونے لگی۔ منافرت کے باوجود اسلام کے معاشرتی اثرات کی اہمیت تسلیم کی جانے لگی اور پیغمبر اسلام ﷺ کے کردار کے تابناک پہلو قابلِ تحسین قرار پانے لگے۔ تاریخ کا افق وسیع ہونے لگا۔ مسلمانوں کے تاریخی کارناموں کو مغربی تاریخ میں جگہ ملنے لگی۔

سائنس اوکھلے نے اپنی تاریخِ سراسین کی ابتداء وصالِ نبوی سے کی جبکہ اس کے پیشرو تاریخِ اسلام کے ابتدائی دور کو یکسر نظر انداز کر کے اس کی ابتداء ترکوں کے عہد سے کیا کرتے تھے۔ سائنس اوکھلے نے عہدِ نبوی سے گریز کر کے اسے سترہویں صدی کے مؤرخین کی ڈگر پر چھوڑا۔ اسلام اس کی نظر میں توہم پرستی، اور داعیِ اسلام (ﷺ) نعوذ باللہ غیر مخلص ہی رہے۔ لیکن نے بھی عربی زبان سے ناواقفیت کے بہانے کوئی قابلِ ذکر پیش رفت نہیں کی۔ تاہم اس نے نہ تو نازیبا زبان استعمال کی اور نہ ہی تاریخی مواد کو مسخ کیا۔ کردارِ نبوی ﷺ کو سرگرمی اور جوش و جذبات کا مرقع قرار دیا اور اسلام کے بارے میں جو طرزِ بیان اختیار کیا وہ آج بھی اس کے لیے طرہِ امتیاز ہے۔ والتبیغ گو حضور ﷺ کی نبوت کے اعتراف سے محروم رہا کہ اس نے بھی سترہویں صدی کے عدم خلوص کے الزام کو دہرایا، تاہم ان کے کارناموں کی عظمت کا قائل اور کردارِ نبوی، خصوصاً آپ کی شجاعت کا کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

مداح نظر آتا ہے۔ جرمن شاعر گوئٹے اپنے معاشرے کی روایتی روش کے برخلاف یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ ہو سکا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کسی طور غیر مخلص بھی ہو سکتے ہیں۔

یہ تبدیلی واضح کرتی ہے کہ اٹھارویں صدی کے اہل قلم کی رائے میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ زبان کی متانت اور غیر جانبداری کا دکھاوا یہ باور کراتا ہے کہ پروپیگنڈہ محض مقامی نوعیت کا نہیں رہ گیا تھا بلکہ اس میں بین الاقوامی شعور پیدا ہونے لگا تھا۔ کڑوی بات بیٹھی زبان میں کی جانے لگی تھی۔

انیسویں صدی عالم اسلام کے لیے ابتلاء کی صدی تھی۔ اس صدی میں مغرب نے عالم اسلام کو اپنے سیاسی اور اقتصادی شکنجے میں جکڑ لیا۔ تاریخ کا ناقابل شکست عالم اسلام، اسپرکمند مغرب ہو گیا۔ لے دے کرا ایک عثمانی پرچم تھا جو حوادث کے مقابلے میں سرگرم نہ ہوا تھا لیکن اس میں بھی بوسیدگی کی علامات پیدا ہو چکی تھیں۔ عالمی غلبے نے مغرب کو قدیم رومن احساس برتری پھر سے عطا کیا۔ سیاسی، اقتصادی، تکنیکی، علمی، معاشرتی اور حربی برتری نے باقی دنیا کو ناقابل اعتناء بنا دیا۔ انیسویں صدی کے مستشرقین کی تحریریں اس احساس برتری سے لبریز ہیں۔ طعن و تشنیع، استہزاء، نعرہ فحمانہ، دل آزاری اور انتقامی انداز عام پایا جاتا ہے۔

اس صدی میں مغربی اقدار کو بنیاد بنا کر اسلام کے بارے میں فیصلے کیے گئے۔ ہر فیصلے کی بنیاد میں یہ احساس موجود ہے کہ مغربی تہذیب اور مذہب عیسائیت افضل اور برتر ہے۔ مسلم تہذیب کو ثانوی درجہ دے کر اسلام کو عیسائیت کی ایک ثانوی اور کمتر شکل قرار دیا گیا۔ مغربی قدروں پر حیاتِ طیبہ کو پرکھا گیا۔ اور بعینہ اسی انداز میں فیصلہ دیا گیا جس انداز میں رومن عدالت نے اپنا پر رعونت فیصلہ حضرت مسیح کے خلاف پہلی صدی عیسوی میں دیا تھا۔ مغرب دوسروں کے فعل و عمل کو اپنی پسند اور ناپسند کی بنیاد پر نیک و بد قرار دیتا ہے۔ یہ احساس برتری مغرب کے لیے کتنا ہی حقیقی کیوں نہ ہو جنت نہیں تسلیم کیا جاسکتا۔

انیسویں صدی کا پروپیگنڈہ عالمی پروپیگنڈے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں تبدیلی صرف یہ پیدا ہوئی کہ اخلاص نبوی کو تسلیم کیا گیا۔ اخلاص کی بنیاد پر کردار اور تعلیمات نبوی کا جائزہ لیا گیا۔ جس کے سبب لغویات کم ہوئیں اور الزامات سمٹ کر محدود ہو گئے۔ صرف وہ عناصر شدت سے زیر بحث آنے لگے جو مغربی قدروں سے ہم آہنگ نہیں تھے۔ نوٹن بی ہو کہ برنارڈ شا، ڈیون پورٹ ہو کہ لین پول، میور ہو کہ اسپرنگر، کانٹانی ہو کہ گولڈ زیمر، سب کے سب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ گویا مغربی اقدار کے پابند ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کی تعلیمات کے بارے میں مستشرقین کی تحریریں بے لوث یا علمی نوعیت کی نہیں تھیں بلکہ قومی اور علاقائی اغراض و مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھیں۔ غرض، مفاد یا عصبیت سے آلودہ تحریریں مسخ بالبعد کا شکار ہوتی ہیں۔ ان میں دیانت اور نیک نیتی کا وجود نہیں ہوتا۔ ایسا علم جو بددیانتی پر مبنی ہو فریب ہے جس پر انسانیت اعتماد نہیں کر سکتی۔

مستشرقین کی تحریریں مغربی سرد جنگ کا ایک حصہ ہیں۔ یہ یک طرفہ سوچی سمجھی سرد جنگ گزشتہ پانچ صدیوں سے جاری ہے۔ اس کا ازالہ تو کیا، ابھی اس کے بیشتر گوشے پردہ راز میں مستور ہیں۔ مغربی ذرائع کتاب و سنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

الباغ اپنا پروپیگنڈہ دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچا چکے ہیں۔ یہ پروپیگنڈہ اس قدر طاقتور ہے کہ خود مسلم معاشرے کے بعض طبقات اس سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ ان میں نظریاتی بے چینی کروٹ لے رہی ہے۔ مغربی ممالک میں روزگار حاصل کرنے والے افراد کی اکثریت نظریاتی بے چینی کا شکار ہے۔ نظریاتی بے چینی معاشروں کا شیرازہ بکھیر دیتی ہے۔ لہذا انتہائی ضروری ہے کہ اس گمناؤنی مہم کو بے نقاب کیا جائے تاکہ نہ صرف رسول اقدس ﷺ کی تعلیمات کی حقانیت مامون رہے اور اسلامی معاشرے نظریاتی بے چینی سے محفوظ رہیں بلکہ غیر جانبدار معاشروں کی وہ غلط فہمیاں دور ہوں جو مغربی پروپیگنڈے کے باعث عام ہیں۔

دنیا تیزی سے عالمی برادری کی شکل اختیار کر رہی ہے۔ عالمی قوانین کے بعد عالمی ضوابط اخلاق اور عالمی معاشرتی قدروں کی ضرورت جلد ہی محسوس ہوگی۔ یہ ضابطے اور قدریں مذاہب عالیہ ہی فراہم کر سکیں گے۔ اسلام سے عالمی برادری کو صحیح طور پر روشناس کرانا اور کردار سازی کے لیے رسول اللہ ﷺ کے اسوہ حسنہ سے تعارف کرانا صرف مسلمانوں کی ہی ذمہ داری ہے۔

اگر عالم اسلام مغرب کی پیدا کردہ کدورت کو دور کر کے اسلام کو کما حقہ نہ پیش کر سکا تو یہ کوتاہی تاریخ اسلام کا عظیم ترین سانحہ ہوگی۔ مستقبل میں مغرب کی جانب سے ایک عالمی ضابطہ اخلاق اور معاشرتی اقدار کی تدوین و ترتیب ہو جانے کے بعد یہ تصور کرنا کہ مسلمان اس میں خوشگوار تبدیلی پیدا کر لیں گے محض ایک خواب ہوگا جو بمشکل شرمندہ تعبیر ہو سکے گا۔

[یہ تحریر ۱۹۸۰ء کے لگ بھگ لکھی گئی تھی، اور ۲۰۰۵ء میں شائع ہو رہی ہے۔ مصنف کا پیش دیدہ عالمی ضابطہ اخلاق تقریباً تکمیل پا چکا ہے۔]

☆☆☆☆☆☆☆☆

اختتام متن کتاب

کتبیات

Bibliography

English Books

- Ansari, Dr. F. R.; Islam and Christianity in the Modern World
- Arnold, Sir Thomas ; The Legacy of Islam
- Asquith, H.H.; Legacy of Rome, article 'Introduction'
- Barker, Earnest; Legacy of Rome, article 'The Conception of Empire'
- Barker, Earnest; The Legacy of Islam, article 'The Crusades'
- Bernard, Lewis ; The Legacy of Islam, 1975 ed., article 'Politics and War'
- Bucaille, Maurice; The Bible, The Quran and Science
- Bowl, John; A New Outline of World History
- Buckles; Civilization in England
- Budges, W.; The Monks of Kublai Khan
- Bailey, Cyril ; Legacy of Rome, essay 'Religion and Philosophy'
- Bowle, John; A New Outline of World History
- Brandon, S.G.F.; Man and his Destiny in the Great Religions, article
'Christianity'
- Bury , J. B.; History of the Later Roman Empire
- Carlyle, Thomas; On Heros, Hero- Worship, and the Heroic in the History
- Castro, A.; The Structure of Spanish History
- Cook, M. A.; Legacy of Islam, 1974 ed., article 'Economic Development'
- Craemer, Hendrik; The Christian Message in a Non-Christian World
- Dandini, Father Jerom; A Voyage to Mount Libanes
- Daniel, Norman; The Arabs and Mediaeval Europe
- Davenport, John; An Apology for Mohammed and Quran
- Dozy, R.; Spanish Islam
- Earl, Nick; 1967, Culture and Creed, London
- Ethinghausen, Richard; The Legacy of Islam, 1960 ed., article 'The
Impact of Muslim Decoration on the Art of Europe'

Folingo, Cesare; The Legacy of Rome, article 'The Transmission of the Legacy'

Fouard, Abbe Constant; The Christ The Son Of God

Frazer, G. B. Sir; Golden Bough

Francesco, Gabrieli; The Legacy of Islam, 1960 ed., article 'Islam in the Mediterranean World'

Fuller, J.F.C.; The Decisive Battles of the Western World

Gibbon, Edward; The Decline and Fall of Roman Empire

Glubb, Sir Johff; The Lost Centuries

Goldziher, Ignas; Muslim Studies

Goldziher, Ignas; The Religion of the Iranian People

Griffith, Taylor; 1927, Environment and Race, Oxford Univ. Press

Grunebaum, G.E. von; 1969, Mediaeval Islam, Oxford

Grutheric, W.K.C.; The Greeks and their Gods

Guillaum, Alfred; The Legacy of Israel, article 'The Jewish Factor in Mediaeval Thought'

Guillaum, Alfred; The Legacy of Islam, article 'Philosophy and Theology'

Hallam; Constitutional History of England

Halle; 1988, Muhammedaneche Studien

Hankle, L.; Aristotle and the American Indians

Hapgoog C.C.; 'Encyclopedia of Islam', article on 'Musa Shakir'

Hardy, P.; The Muslims of British India

Hill, Christofer; The Century of Revolution

Hill, Michael; The Sociology of Religion

Hitti, Phillips K.; History of Arabs

Heylyn, Peter; A Little Description of the Great World

Inge, W.R. Dean; The Church in the World

Phillips, K. Hitti; Islam and the West

James, M.R.; Apocryphal New Testament

Jones, A.H.M.; The Decline of the Ancient World

Kirk G.S.; The Nature of Greek Myths, p.76

Klein F. A.; The Religion of Islam

Krammer, H.; 'The Christian Message in the Non-Christian World

- Lake, K.; Earlier Epistles of St. Paul
- Lanepoole, Stanley; Introduction to Selection from Quran
- Lee, J.; The Life of Mahomet , the Famous Oriental Imposter
- Lecky; History of Nationalism in Europe
- Lloyd, Ludowik; Consent of Time
- Maqbool, S.; 'Encyclopedia of Islam', 2nd Ed., article 'Ibn Majid'
- Margoltouth, David G.; The Origins of Arab Poetry
- Maundeville, John; Travels
- Mayer, F.E.; The Religious Bodies of America
- Miles, G. C., The Circulation of Islamic Coinage of 8th to 12th Century in Greece
- Milis,C.H.; History of Crusades
- Miller, J.C.; The Works of Henry Smith, edited by, Nicholl's Series of Standard Devine
- Millman, Latin Christianity
- Mourret, F.; A History of the Catholic Church
- Muir, William; 1858, Life of Mohammed
- Muir, William; 1891, The Caliphate, Its Rise, Decline and Fall
- Naudxus; History of Magic
- Neil, Kennith Cameron; Humanity and Society
- Nicholson, R. A.; History of Arabs
- Nicholson, R. A.; Introduction to W.H. Palmer's translation of 'The Koran'
- Nock, A.D.; Saint Paul
- Noldeke; Dictionary of Islam
- Ookley, Simon; The History of Saracens, 5th ed.
- Palmer, E. H.; Translation of Koran
- Paris, Mathew; English History
- Pearson, George; Towards One World
- Peron, Cardinal; Luther's Al-Coran
- Pollard, G.E.; Objections to the Roman Catholicism
- Pirenne, Henry; A History of Europe
- Predeaux, Humphery; The True Nature of Imposture Fully Displayed in the Life of Mohemet, 8th ed.

- Proctor S. & Velyn E.; Alfonso X of Castile, Patron of Literature and Learning
- Radhakrishnan; Religion in a Changing World
- Rodinson, Maxime; Mohammed
- Rodinson, Maxime; 'The Western Image and Western Studies of Islam' In 'Legacy of Islam'
- Rodrigues, D. Cabanelas; Juan de Segovia
- Rodwell; The Quran
- Roshdali; Universities
- Rosenthal, Franz; The Legacy of Islam, 1974 ed., article 'Literature'
- Ross; A Needful Caveat, appendix to translation of 'Al-Koran of Mahomet'
- Sale, George; Essays on Islam
- Sale, George; The Quran
- Schacht, J.; Ibn Al-Nafis, Servetus & Columbo
- Shakespeare, William; Play 'Henry VI'
- Shaw, Bernard; Shaw on Religion, edited by Warner S. Smith
- Sheffield, John; A dialogue between Mahomet and the Duke of Guise
- Smith, Bosworth; Muhammed and Muhammedanism
- Smith, Lucy T.; York Plays
- Southern, R.W.; Western Views of Islam in the Middle Ages
- Springer; Life of Mohammed
- Stark, Warner; The Sociology of Religion
- Streeter, B.N.; The Four Gospels
- Stubbs, Henry; Rise and Fall of Muhammedanism
- Sybil, von; 'History and Literature of the Crusades, edited by Lady Duff Gordon
- Taylor; Gospel according to Mark
- Tesdall, Dr.; Sources of Quran
- Torrey, C.C.; The Jewish Foundation of Islam
- Toynbee, A.J.; A Study of History
- Toynbee, A.J.; Change and Habit

- Trend, J.B.; 1960, Legacy of Islam, article 'Spain, Portugal', Oxford University Press
- Turner, Bryan S.; Understanding Islam
- Turner, Bryan S.; Weber and Islam
- Turpin, Bishop; History of Charles the Great, Translated by Rodd, T.
- Vernet, Juan; 1974, Legacy of Islam, article 'Science'
- Waqdi, Kitab-ul-Maghazi, chapter 'Uhad', translated by Welhousen, Kolkata, 1856
- Watt, W. Montgomery; Mohammed at Mecca
- Watt, W. Montgomery; Mohammed at Medina
- Watt, W. Montgomery; Truth in the Religions
- Watt, W. Montgomery; What is Islam?
- Weber, Max; Economy and Society
- Weber, Max; The Sociology of Religion
- Westfall, James; History of Historical Writings
- White, Joseph; Sermons Preached before University of Oxford in the Year 1784
- Willman; Constitutional History of England
- Windover, Roger of; Flowers of History

Other English References

- Bales Select Works, Parker Society, 1849
- Bayl's Dictionary
- Bible
- Chronicles, Globe Edition, 1899
- Ecclesiastical History of England and Harmony
- Encyclopedia Americana, essay 'Paul'
- Encyclopedia Btitanica, 1979
- Encyclopedia of Islam; edited by Babinger, F.
- English History, Bohns Ed., 1854

Islamic Quarterly; 1955, Vol. II, Robert of Kitton,
Liturgical Services of the Reign of Queen Elizabeth
Our World Through Ages
'Prophecies of Christopher Kotterus', 2nd Ed., Hazlit 1664
Quran
Shorter Encyclopedia of Islam
Strange and Miraculous News from Turke', London 1642
The Concise Encyclopedia of the Living Faiths
The Consice Encyclopedia of the Ancient World
'The Coventry Mystries', Play XXII
The Siege of Milan and the Romance of Roland, N.E. Text Society, 1880
Translation of Koran in English
'The Great Vision sun in Turkey Land', 1702, Bib-Coll., W.C.Hazlit
'True News from Turkey', London 1664
'The Prophecies of a Turk', London, 1687, Guild Hall Library
William of Malsbury's Chronicles; Bohn, Bohn's ed.
Works of Francis Bacon

اردو کتب

سیرۃ ابن ہشام [اردو]، ۱۹۶۵ء، مرتبہ اسماعیل پانی پتی، صفحہ ۲۱۹، لاہور
'سیاسی وثیقہ جات'، از ڈاکٹر حمید اللہ خان، صفحہ ۱۹، لاہور، ۱۹۶۰ء
مقبول بیک، تاریخ ایران، صفحہ ۷۲۲-۷۲۳، لاہور، ۱۹۶۷ء

اشاریہ

۳۰۶، ۳۰۳، اعداء، اغراض و مقاصد	ابو ایوب انصاری، حضرت - ۸۷
۳۰۴، اعداء، تعاقب	ابو یکر، حضرت - ۸۶، ۱۹۳، ۲۴۳،
۳۰۵، اعداء، جنگ، مغلوبہ	۳۴۵، ۲۹۷، ۲۷۲، ۲۵۸
۳۰۷، ۳۰۴، اعداء، جنگی قیدی	ابو جہل - ۲۳۴، ۳۰۱، ۳۰۲
۳۰۵، اعداء، سوار دستہ قریش	ابو دجانہ، حضرت - ۳۰۶
۳۰۵، ۳۰۴، اعداء، شکست	ابو رغاب، ثقفی - ۳۲۹
۳۰۷، اعداء، شہداء	ابو سفیان، حضرت - ۳۰۵، ۳۰۱، ۳۰۶
۳۰۶، اعداء، جنگ، غیر فیصل	۳۱۷، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۷، ۳۱۷
۳۰۵، ۳۰۴، اعداء، قریش کی واپسی	ابو عبیدہ، مخزث - ۲۳۰
۳۰۵، اعداء، مسلم تیر انداز	ابو طالب - ۲۹۲، ۲۹۸
۳۰۴، اعداء، مسلم فوج	ابو معشر - ۲۹۱
۳۰۷، ۳۰۶، اعداء، مقتولین	ابی شعوب - ۳۰۶
۲۷۳، ۲۴۰، اعداء، رند، جنگ	ایمانی، فرقہ - ۶۶
۳۰۷، ۳۰۹، ۳۳۳، ۳۳۳، ۳۳۳، ۳۳۳	ابی جبران - ۱۷۳
۳۰۹، ۳۰۸، اعداء، ہندو اری برہمہدی	اپوستولس، فرقہ - ۸۱
۳۰۸، اعداء، ضمانت	اپولو - ۱۸۴
۳۰۷، اعداء، طرز دفاع	اتر سکین - ۲۵
۳۰۸، اعداء، محاصرہ	آتن، دیوتا - ۲۶۱، ۲۶۸
۳۰۸، اعداء، معاشی جنگ	اتھاؤلف - ۲۸
۳۰۷، اعداء، مقصد	اتھناکس، فادر - ۱۹۶
۲۰۸، ۲۲۲، احساس برتری	اتھیا - ۲۸
۷، احسان دانش	اٹھارویں صدی عیسوی - ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۳۳۷
۵۱، اختلافی عقائد	اثرات مابعد، مغرب - ۱۲۰
۲۵۴-۲۵۱، اعداء، ہارون	اجارہ داری - ۲۹۷
۷۸، اخراج از عیسائیت	اجازت رابداری - ۲۷۶، ۲۷۷
۲۵۶، آخرت کی زندگی	اجتماعیت - ۲۱۸
۲۵۲، اخراج قریش	اجتہاد - ۲۴۶
۲۶۲، ۲۲۸، اخلاق	اجنبیت - ۳۱۴، ۳۱۵
۳۱۹، اخلاقی الزامات	اجانبیت - ۳۰۱
۲۷۵، اخلاقی اقدار	اعداء، جنگ - ۲۳۰، ۲۷۳، ۲۹۸
۳۲۹، اخلاقیات	۳۰۳-۳۰۷، ۳۲۹، ۳۳۲، ۳۳۸
۲۰۶، اخلاص	اعداء، ابتدائی کامیابی - ۳۰۵، ۳۰۶
۲۶۸، ۲۵۵، اختناق، فرعون	اعداء، ایتیری - ۳۰۶
	۱
	آباء پرستی - ۲۲۳
	ابراہیم، حضرت - ۲۱۴، ۲۲۵، ۲۳۰
	۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰
	ابراہیم بن حی، صاحب الشرح - ۱۷۷
	ابراہیم بن عذرا - ۱۷۷
	ابرہہ - ۳۲۹
	ابرہہ کے حملے کا سال - ۲۸۱، ۲۸۲
	ابن ابی حاتم - ۲۹۱
	ابن الحنفی - ۲۹۱، ۲۰۵
	ابن اللہ - ۲۲۶
	ابن العربی - ۱۱۸، ۱۷۳
	ابن المیزر - ۲۹۱
	ابن المیشم - ۱۸۰، ۱۷۳
	ابن اوس - ۲۳۰
	ابن جریر - ۲۳۰
	ابن حنین - ۱۷۲
	ابن دھبیہ - ۱۷۸
	ابن رشد - ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۷۵، ۱۷۷
	۱۷۷
	ابن رشد، فرضی نظریات - ۱۱۹
	ابن زبیر - ۱۷۵
	ابن سعد - ۳۳۴
	ابن سینا - ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۷۷
	ابن عباس - ۲۰۵
	ابن عدون - ۱۷۱
	ابن ماجہ - ۱۷۸
	ابن مردیہ - ۲۹۱
	ابن ہشام - ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶
	ابہام - ۲۵۱
	ابوالبراء - ۳۲۹

آداب-۱۱۴	ازواج، بحر آنی حکم-۳۴۶	۳۳۲، ۳۱۸، ۳۱۷، ۲۸۷
اداروں کا قیام-۱۵۲	ازواج، لقب انبیا-۳۴۷	اسلام، نفرت انگیز تصور-۱۳۹، ۱۳۹، ۱۳۹
ادریانو پیل-۹۱	ازواج نبوی، جدول تعداد-۳۴۴	اسلام اور شمشیر-۲۳۷
ادرین، پوپ-۸۰	ازیمینہ-۱۱۵	اسلام دشمنی کے جواز-۱۸۶
آدم-۲۹۳، ۲۸۴، ۲۵۷	استغنیٰ-۱۳	اسلامی سلطنت ریاست-۲۳۹،
ادیسہ-۱۳۳، ۱۳۲	آستر و گاتھ-۲۷	۲۷۸، ۲۷۴
ادیلارد آف باتھ-۱۷۴	آستر و گاتھ سلطنت-۲۹	اسلامی معاشرہ-۲۶۶، ۲۷۸، ۲۹۹،
اذان-۲۳۰، ۱۴۳، ۱۲۷، ۹۹	استغراق-۲۳۰	۳۵۱، ۳۲۳، ۳۰۲
آرائش و زیبائش-۱۱۴	اسپرنگر-۳۱۸، ۳۱۷، ۲۳۷، ۱۶۵	اسماعیلین، حضرت-۲۱۴، ۱۸۳،
آرامی زبان-۲۲۹، ۲۲۸	ایسین-۲۵، ۲۹، ۳۲، ۳۳، ۴۲، ۷۷	۲۳۵-۲۸۴، ۲۳۷
اربن دوم، پوپ-۹۰، ۹۰، ۹۸، ۱۲۵، ۱۳۰	۲۳۱، ۱۷۵، ۱۲۶، ۱۱۶، ۹۲، ۸۷	آسانی بادشاہت-۴۰، ۴۰، ۲۰۰، ۲۵۷، ۲۷۹،
ارتقاء-۲۱۲	استغراق-۱۵۹	اسمیتھ، باسورٹھ-۲۰۷، ۲۰۷
ارتکاز-۲۶۹، ۲۱۸	اسنب، ہنری-۱۵۲، ۱۹۳، ۱۹۹، ۲۰۵	اسمیتھ، ہنری-۱۹۰، ۱۹۸
ارجاء-۳۳۵، ۳۳۶	اسٹیٹ-۲۳۸، ۹۵	اسوہ حسنہ-۲۶۳، ۳۲۱
آرڈر (جماعت کلیسا)-۱۳۹	الطی، حضرت-۲۳۵، ۲۳۶، ۲۸۴	آسیبی قوت-۲۹۵
آرڈریکس، ہوزنگ-۱۸۳	اسرائیل-۲۲۴، ۲۸۵، ۱۲۵	اسیدور، سینٹ-۱۹۳
ارس، فرقہ-۱۰۶	اسرائیلی، الطی-۱۷۳	اسیرم بریسریم-۳۳۶
ارسطو-۱۷۸، ۱۷۷، ۱۷۷	اسقف-۳۱	اشتراک کفر-۲۹۰
ارمس-۷۰	اسکاٹ، مانکل-۱۷۲	اشتراکیت-۲۱۸، ۲۱۹
ارض مقدس-۱۲۴، ۸۲	اسکاٹلبرج، جوزف-۱۵۱، ۱۸۲	اشراف و اشرافیہ-۳۰۸، ۳۱۹، ۳۲۰
ارکان عبادت، اسلام-۲۳۰، ۲۳۷، ۳۱۷	اسلام-۱۰۱، ۱۰۱، ۱۱۱، ۱۲۲، ۲۰۰، ۲۱۰	اشراقیت-۱۱۸، ۱۷۷
آرکیڈیس، شہنشاہ-۲۸	۲۱۲، ۲۱۹، ۲۲۱، ۲۲۸، ۲۳۸، ۲۴۱	اصحاب الاخدود-۲۳۷
آرفیس-۵۳	۲۵۷، ۲۶۱، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۷	اصحاب رسول-۲۷۹، ۳۳۳، ۳۳۰
آریہ-۲۶۱، ۳۴۰	۲۶۹، ۲۹۱، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۸، ۳۲۱	اصطراب-۱۷۹
آریہ، بت پرستی-۳۴۰	۳۲۳، ۳۲۶، ۳۳۶، ۳۴۰-۲۵۱	اصطلاحات-۲۲۰، ۲۲۷، ۲۶۸
آریوس-۶۷، ۶۷	اسلام، افادیت-۲۱۷	اصطلاحی معنی-۲۲۹
ازایلا-۱۲۶	اسلام بیرونی، عرب مذہب-۳۱۰	اصفہان-۳۱۵
آزاد میٹھ-۲۷۱-۲۷۱	اسلام، حملہ-۵۶	اصلاح مذہب، عیسائیت-۱۴۳، ۱۵۰
آزادی عمل-۲۶۶	اسلام، خطرہ-۱۲۹۵	اصنام، فرض اسلامی-۱۴۳، ۱۸۳
ازالہ اسلام-۱۴۱، ۱۴۸، ۱۵۰	اسلام، خفیہ دعوت-۲۹۷	اصول تنقید-۱۵۳
ازلہ اعتراضات-۲۱۶	اسلام، عالمگیری-۳۰۹	اطاعت کا حکم-۳۳۲
آزمائش کا دور-۲۷۷، ۲۷۷	اسلام، قبول-۹۲، ۱۱۷، ۱۶۸، ۲۳۳	اطالیہ (ٹلی)-۲۹، ۸۹، ۱۲۲
ازواج نبوی-۳۴۳، ۳۴۶، ۳۴۷	۲۳۷، ۲۳۸، ۲۴۰، ۲۴۲، ۲۷۷، ۲۷۸	اطم-دیکھیے قلعے

انجیل - ۵، ۵۷، ۱۱۷، ۱۳۳، ۱۳۷	ادفا، شاہ مرثیا - ۱۱۵	بائبل - ۱۳۷، ۱۵۱، ۱۶۱، ۱۶۷، ۲۰۰، ۲۱۳، ۲۳۹
انجیل پطرس - ۲۶۰	اوکلے، سائمن - ۱۵۳	بیلوینیک اور یخا لو - ۱۵۱
انجیل جیمس - ۲۶۰	اولو جیمس، راہب - ۱۲۷، ۱۲۸	پتسمہ - ۵۷، ۱۳۷
انجیل لوقا - ۲۵۷	اونٹ، کہانی - ۱۸۹	بتان حرم - ۱۸۶
انجیل متی - ۲۵۷	ایتھنز - ۹۰	بت، - پرست، - پرستی - ۱۸۲، ۱۸۳، ۲۱۳، ۲۳۹، ۲۳۵، ۲۳۶، ۳۱۷
انجیل یوحنا - ۲۶۰	ایڈسن، لنکارٹ - ۲۰۲	بٹوہ - ۲۷۹
اندریو - ۱۳۶	ایران (پرشیا) - ۸۶، ۲۶۱، ۲۶۷	بجارت، سلطان - ۹۱
انڈو جرمانک - ۳۸	۳۴۰، ۳۱۳، ۳۰۲، ۲۷۵	بجران - ۷۶
انس بن مالک، حضرت - ۲۳۸	ایروشیا - ۳۴۰	بحر روم - ۱۱۱، ۱۰۹، ۱۷
انسان - ۲۱۹، ۲۳۹	ایرین، فرقہ - ۳۰، ۱۹۶، ۳۵۰	بحر روم، جزائر - ۲۹، ۸۹
انسان - خدا - ۳۶	آرزک، پادری - ۱۲۷	بحر مردار ملح - ۲۵۹، ۳۴۰
انسانی گوشت - ۱۳۳	ایٹنر - ۵۷	بحری اقتدار - ۹۲
انسانکوپیدیا آف اسلام - ۱۵۱	ایونیس - ۲۶۰	بحری فتوحات - ۸۹
انسائیکلو پیڈیا یارتیکا - ۲۱۱، ۲۵۵، ۲۵۶	ایسینی، یہودی فرقہ - ۳۴۰	بحیرہ، راہب - ۱۹۶
۲۸۶، ۲۶۰	ایشیا تک سوسائٹی آف بنگال - ۱۵۲	بخاری، امام - ۲۷۵، ۳۳۴
انصار مدینہ - ۲۳۳، ۲۴۱، ۲۴۷، ۲۷۷، ۲۷۸	ایشیا کے کوچک - ۹۱	بخت نصر - ۳۴۰
۲۳۳، ۳۳۴، ۳۰۲، ۲۹۹، ۲۷۸	ایلاء، واقعہ - ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۷	بدر، جنگ - ۲۲۷، ۲۳۳، ۲۳۷، ۲۷۷
انصاف - ۳۳۴، ۳۲۹	ایل شدوائی - ۲۲۵	۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲
انطاکیہ - ۳۲، ۳۹	ایلیاہ، نبی - ۲۸۵	۳۳۴، ۳۳۷، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۷
انطاکیہ، چرچ - ۲۶۰	اعتر اوران کے علوم - ۱۷۵	بدر، اسیران - ۳۰۶، ۳۳۶
انفرادیت - ۲۲۰، ۲۱۸	ایننگز - ۷۰	بدر، بدلہ - ۳۰۶
انفرادی ملکیت - ۲۱۹	ایننگو کیسین سلطنت - ۲۹	بدر، مقتولین - ۳۰۶، ۳۲۸
انیسویں صدی عیسوی - ۲۰۶، ۱۵۵	ایوبی، صلاح الدین سلطان - ۱۳۳، ۱۳۵	بدر، میدان - ۳۰۶
۲۱۰، ۲۱۱، ۳۰۳، ۳۲۷		بدعت - ۲۰۱، ۷۷، ۸۱، ۱۰۰، ۱۹۵، ۳۵۰
ابانت کا ترقی یافتہ انداز - ۲۰۵	ب	بدعتی - ۲۲۸
اہرن - ۵۶		بدن - ۱۰۳، ۲۵۶
اہورہ مزدا - ۲۶۱، ۳۶	بابل - ۳۴۰	برادرز آف فری اسپرٹ - ۸۱
آوارہ قوم - ۳۳، ۳۰	بائین - ۱۳۳	برت، بلدے - ۱۸۹
اوٹو، شہنشاہ - ۷۷، ۹۷	بازان - ۳۱۳، ۳۱۶	برطانیہ - ۲۹
اودو، فرانسیسی حکمران - ۸۸	باربروسہ، فریدرک - ۷۹	برطانیہ کا قانون - ۳۲۸، ۳۲۹
اورگانا، معصوم - ۱۹۵	باربانی اور حضوری - ۲۸۳	برگندی سلطنت - ۲۹
اوس، قبیلہ - ۳۲۶، ۳۰۸، ۳۰۳، ۲۹۹	بازنطین - ۱۸، ۲۹، ۸۶، ۹۱، ۹۷، ۱۲۹	برگندی، قبائل - ۲۸
۳۳۵، ۳۳۴، ۳۲۷	۱۳۳	

برتاباس، سینٹ-۴۹	بنوعباس-۳۰۲	بونانچر، سینٹ-۱۱۸
برنارو، سینٹ-۹۶	بنو غطفان-۳۰۷، ۳۰۸، ۳۳۲	بہرو بیت-۱۵۳، ۱۶۲، ۱۶۴، ۱۶۵، ۳۲۰
برنارڈ شا-۲۰۸	۳۳۶، ۳۳۵، ۳۳۳	بہمیت-۱۳۳
بز دلی-۳۰۲	بنو کنانہ-۲۷۶	بورڈے آندر یو-۱۸۹
بشارت، فتح روم-۳۱۳، ۳۱۴	بنو فزارہ-۳۰۷، ۳۳۳	بوکاٹی، ڈاکٹر-۲۵۰
بشارتیں-۹	بنو قریظہ-۲۸۰، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۲۵	بوٹی فیس، پوپ-۷۲، ۸۳
بشریت-۲۸۵	۳۲۶-۳۳۱، ۳۳۵	بوہل-۲۲۷
بصر بن ابی ارقاطہ-۸۹	بنو قیس-۲۷۶	بیت المقدس-۱۳۲، ۱۳۵، ۲۲۸، ۳۱۳
بطلمیوس-۱۷۲	بنو قینقاع-۲۸۰، ۳۲۵-۳۲۶، ۳۳۲	۳۱۵
بخت-۲۷۶، ۲۸۱، ۲۹۸، ۳۲۱	۳۳۶، ۳۳۳	بے دین-۱۸۲، ۲۲۸
بعد ز مانی-۲۵۱، ۲۵۳	بنو قینقاع کا اخراج-۳۲۶	بیڈول، ولیم-۱۸۸
بعل-۲۲۴	بنو قینقاع، فساد-۳۲۸	بیسل کونسل-۱۴۷
بغاوت-۳۲۷-۳۲۹	بنو کنانہ-۳۰۱	بیسویں صدی عیسوی-۳۰۳
بغداد-۱۳۷	بنو مدح-۲۹۹	بیعت-۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۷۲
بک آف اسٹون-۱۷۶	بنو مرعہ-۳۲۵	۳۰۲، ۳۷۸
بگارد-۸۱	بنو مخزوم-۳۱۶	بیعت رضوان-۳۱۱
بلالؓ، حضرت-۱۹۷، ۲۹۳	بنو مرہ-۳۰۷	بیعت عقبہ ثانیہ-۲۷۱
بل کلیرکس-۸۲	بنو معاویہ-۳۲۵	بلیکن، راجر-۱۱۸، ۱۳۱، ۱۳۸، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲
بنیاد تقابل-۲۵۷	بنو مصطلق-۳۳۶، ۳۳۵	بلیکن، فرانس-۱۹۹، ۲۰۰
بنو اسد-۳۰۷	بنو ناعمرہ-۳۲۵	بیل، سمیر فلشی-۱۵۲
بنو اشج-۳۰۷، ۳۰۸، ۳۳۳	بنو نصیر-۲۸۰، ۳۰۹، ۳۲۵، ۳۲۶	بیل، جان بشپ-۲۰۳
بنو لہیہ-۳۳۶، ۳۰۲	۳۲۹-۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۶	بیل، کبانی-۱۸۹، ۱۹۳
بنو لکر-۳۱۶	بنو نصیر، شولہ سازش-۳۳۱	بیاری، افسانہ-۱۸۹، ۲۱۵
بنو ثعلبہ-۳۳۳، ۳۳۵	بنو نصیر، صورتحال کا تجزیہ-۳۳۱	بین الاقوامی برادری-۲۱۶، ۲۱۷
بنو ثقیف-۳۱۷، ۳۱۸	بنو نصیر کا اخراج-۳۲۹	بین الاقوامی مذہب-۲۱۶
بنو جندہ-۳۲۵	بنو نصیر کو رعایت نہ-۳۳۰	تہنقی-۲۹۰
بنو خزاعہ-۳۳۶، ۳۳۵، ۳۱۶	بنو ہاشم-۲۸۲، ۲۹۱، ۳۳۶	
بنو خزاعہ (مدرکہ)-۳۰۲	بنو ہذیل-۳۲۵	
بنو سعد-۳۳۶	بنی اسرائیل-۲۲۵، ۲۲۵، ۲۳۵-	
بنو عامر-۳۲۹-۳۳۱	۳۳۶، ۳۵۱، ۲۳۷	
بنو عمروہ-۳۲۵	بنی السلیل-۳۲۵	
بنو سلیم-۳۳۳، ۳۲۹، ۳۰۷	بنی الحارث (کنانہ)-۳۰۲	
بنو ضمہ-۲۹۹	بنی المصطلق (خزاعہ)-۳۰۲	

پ

پاپائی قیصریت-۹۶، ۹۴
 پاتال-۵۴
 پاریسٹ-۱۶۱
 پاسکل-۷۰

تاریخ مذاہب-۲۶۱	پوسٹال مجلہ دم-۱۵۱	پاگانی، انگلینڈ-۱۶۱
تاریخ نوت-۲۹۳	پوشاک-۲۷۹	پال، سینٹ-۱۸، ۴۷، ۵۶، ۵۸، ۶۰
تاریخی حقائق-۳۳۳	پول ٹیکس-۲۴۱، ۱۰۸، ۴۴	۲۵۷، ۲۴۸، ۲۳۲، ۲۲۶، ۶۱، ۶۰
تجارتی توقعات، اسلام-۱۸۷	پوکاک، ایڈورڈ-۱۵۱، ۱۵۳، ۱۸۳، ۱۹۷	۳۴۱، ۳۳۹، ۲۶۸، ۲۶۰
تہذیبی، انداز-۱۵۴	پولینڈ-۷۵	پال مخالف تحریک-۵۰
تبلیغ-۱۴۱، ۱۴۸، ۱۵۰، ۲۳۴، ۲۳۹، ۲۴۲	پیٹر، ہرمٹ-۲۶۸	پامر-۲۵۳، ۲۱۱
۲۹۲، ۲۷۸، ۲۷۷، ۲۶۳، ۲۶۴	پیرس ایشیاٹک سوسائٹی-۱۵۲	پانچواں کالم-۳۰۹
۳۱۴، ۲۹۵	پیرس، میٹھیو-۱۸۲، ۱۸۶، ۱۹۲، ۱۹۷	پانگہ خداوندی سوچ-۱۲۵
تبلیغی خطوط-دیکھیے مکتوبات	بیرون، کارڈینیل-۲۰۳	پتیاں-۳۳۱، ۳۳
تبوک، مخدومہ-۳۲۵	پیشور پادری-۲۳۱	پتیاں دی شارٹ-۳۳
تثلیث-۷۷، ۵۸، ۶۶، ۶۷، ۱۰۱	پیشین گوئی-۲۶۹	پچھتاوا-۲۹۰
۱۴۲، ۱۹۶، ۲۲۶، ۲۳۹، ۲۶۸، ۳۵۰	پیکھم، جان-۱۱۸	پراؤنس-۲۹
تثلیث پرست-۱۹۵	پیدائش کا سال، نبی ﷺ-۲۸۲، ۲۸۱	پرفیشن-۸۲
تجارت عرب-۲۶۸، ۲۷۷، ۲۹۷	پیمائش قطر زمین-۱۷۹	پرفیکٹس، براہب-۱۲۷، ۱۲۷
تجارت ذہن-۲۶۷	پیسیرانہ زندگی-۲۶۷، ۲۱۵	پروپیگنڈہ-۱۳۳، ۱۳۲، ۱۲۹
تجارتی سفر، رسول اللہ ﷺ-۱۶۰	پینٹنگ، سینٹ کیٹرین چرچ-۱۱۹	پروٹسٹنٹ چرچ-۱۰۶، ۱۰۵، ۶۹
تجارتی شاہراہ-۳۰۶	پینم-۱۸۴	۲۶۱، ۲۰۳
تجارتی قافلے-۲۳۴، ۲۷۱، ۲۷۳	پولیس ایکشن-۳۲۵	پروٹسٹنٹ، فرقہ-۲۵۹، ۶۸، ۶۰
۲۷۶، ۲۷۷	پیوٹک وارز-۲۵	پریڈو، ہمفرے-۲۰۲، ۱۵۳
تجارتی محصول-۲۷۷		پرمو-۱۷۱
تجارتی-۱۴۲		پلو تارک-۳۴۱
تجارت-۱۰۳، ۷۶، ۱۰۳، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۳		پلو مین، پیٹر-۱۸۶
۲۵۲، ۳۵۰		پناہ-۲۹۹
تجدیدی پیغام-۳۳۰	تابوت، خدا کے عہد کا-۲۳۶	پندرہویں صدی-۱۷۰، ۱۴۴، ۲۰۰
تحریک تحقیق-۱۴۸	تابوت، معلق دھاتی-۱۹۴	پہاڑ کی کہانی-۱۹۹
تحریک شہداء، ایمین-۱۲۷	تاتاری-۲۴۲، ۹۰	پہلوٹا-۳۴۱، ۲۳۶
تحریک منافرت، ایمین-۱۲۶	تاج کینی-۱۲	پہلی مطبوعہ انگریزی کتاب-۱۷۳
تحقیق-۱۴۸	تاراندے-۲۲۸	پوپ-۳۱، ۲۸، ۷۷، ۷۷، ۷۷، ۹۵
تحفہ-۱۵۹	تارتارس-۱۸۳	۱۰۶، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۹، ۱۴۹، ۱۶۱، ۲۰۱
تحفہ-۲۲۰	تاریخ فن-۲۸۳، ۲۸۲، ۲۷۷	۳۱۴، ۲۰۳
تدوین حدیث، کتاب-۲۴۸	تاریخ اسلام-۱۵۳، ۲۱۱، ۲۱۴، ۲۸۱	پوپ، مختص-۷۴
تراجم-۱۱۴، ۱۱۶، ۱۵۲، ۱۷۱، ۱۷۲	۳۰۹، ۲۸۳	پوپ، مکمل نسخہ-۸۰
۱۷۳، ۱۸۰، ۱۷۳	تاریخ چارلس اعظم، کتاب-۱۸۴	پورستا-۱۶۵
	تاریخ عالم-۲۸۳	

ت

نوٹن بی-۱۳۸، ۲۰۷، ۲۶۴، ۲۶۸، ۲۷۱، نیکس، روسن-۲۴، ۱۱۲، ۱۰۸	تقدس-۳۴۰ تقسیم مذہب-۱۵۶ مکذہب نبوت-۲۰۰ مکلفیر-۱۱۴	ترجمہ جالینوس، کتاب-۱۷۲ ترجمہ قرآن-۲۱۱ تردید-۲۰، ۲۰۷، ۵۰، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۹۳، ۲۰۲، ۲۰۵، ۲۲۶، ۲۳۰، ۲۴۰، ۲۵۰، ۲۵۷، ۲۵۸
ث	تلفظ، اختلاف-۲۵۲ تلوار، دیکھیے شمشیر تسخیر ادیان-۲۱۴ تفہید، اسلام-۱۵۳، ۱۴۲ تفہید، قرآن-۲۵۱ تھامس، سینٹ-۱۱۹ تہذیب و تمدن-۲۸۴، ۱۷ تہمتیں-۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۷ تھیمس، وادی-۲۵۵ تھیو، آرج بپ-۱۸۳ تھیوٹن تحریک-۱۰۰ تھیو دورک-۲۸ تھیو کرہ لسی تھیولوجی-۱۱۹، ۹۶، ۹۴ توبہ-۱۰۶ توحید-۱۰۱، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۶، ۲۵۰، ۲۹۰، ۲۹۲، ۲۹۶، ۲۹۸، ۳۳۵، ۳۵۰	۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۹، ۲۹۸، ۳۰۳، ۳۱۳، ۳۲۰، ۳۲۲، ۳۲۳ تردید، الوہیت غرائب-۲۹۶، ۲۹۵ تردید، ناقابل-۳۳۴، ۳۳۵، ۳۴۱، ۷۰ ترک-۲۰۴، ۱۸۳، ۱۳۲، ۹۱ ترکان عثمانی-۲۰ ترک دنیا-۲۸، ۲۶۶، ۲۷۰، ۳۴۰ ترک مولات-۲۹۱، ۲۹۵ ترک-۲۳۶ ترمیم، عقائد-۱۲۴ ترویلگان-۱۸۴ تریپولی-۱۳۲ ترویر دفاع، عیسائی-۱۵۸ تشلک-۲۸۴ تھوف-۱۱۸ تصادات-۲۵۲ تعارض-۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۹۹، ۳۰۰ تعصب-۳۳۱ تعد وازدواج-۱۶۲، ۱۹۳، ۲۱۵، ۳۲۹، ۳۳۱، ۳۳۳، ۳۴۶ تعد و، اور اقتدار-۳۴۷ تعد و، قرآنی حد-۳۴۷ تعد و، عرب قانون-۳۴۳، ۳۴۶ تعد و، قانونی ممانعت روم-۳۴۱ تعد و، کلیسا کی قدغن-۳۴۱ تعمیر کعبہ-۲۸۱ تعمیر معاشرہ-۲۶۹ تقیہ، ابن-۱۵۵، ۱۶۱
ثابت بن قرة-۱۸۰ ثقافتی اثرات، اسلام-۱۱۳ ثمنیہ-۵۵، ۵۶، ۱۰۳، ۲۳۶، ۲۵۶، ۲۶۷، ۲۷۸، ۳۲۳، ۳۵۰، ۳۴۳	ث	
ج	جادو-۱۹۷ جادوگر-۱۸۳ جاریت-۳۱۷ جاگیر دار طبقہ، روم-۱۱۱ جالینوس-۱۷۶ جان آف میگوریہ-۲۱، ۱۳۵، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۷۲، ۱۷۷، ۱۷۸ جان، تاجر-۱۲۷ جانبداری-۲۶۳ جان دواز دہم، پوپ-۷۶ جان، مشقی سینٹ-۲۹، ۱۹۷، ۲۰۰، ۲۱۰، ۲۱۱ جان بپتسم، پوپ-۱۲۴ جانینی، جمہوریہ مغرب-۷۴ جانینی، نیکل-۳۴۸ جالیہ، عرب-۲۱۲، ۲۲۰، ۲۲۵، ۲۳۷، جانداونکس-۴۴ جبر-۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۱، ۳۴۷ جبری تبدیلی مذہب-۴۱ جبریل-۲۰۶، ۲۹۱ جدول-۷، ۱۷، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۷	۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶

جرمن-۳۲۰	ج	جہاز-۳۰۰
جزیرہ-۲۷۵، ۲۴۱		جزیرہ اسود-۲۱۵، ۲۱۲
جعفر بن ابی طالب، حضرت-۲۹۲، ۲۵۸	چارلس دی بالڈ-۷۵	حدیبیہ-۳۱۰
جعل-۳۲۰	چارلس دی فیٹ-۷۵	حدیث-۲۱۳، ۲۲۳، ۲۳۶، ۲۳۸-۲۶۳
جستینین، شہنشاہ-۲۹	چاند-۲۹۲	حدیث، تدوین-۲۳۷
جسم، دشمنی-۳۳۳، ۵۳	چرچ-۲۰۶، ۱۵۰، ۱۱۶، ۶۱، ۴۹	حدیث، وضع-۲۳۷
جگر مراد آبادی-۷	۲۶۰، ۲۵۷	حرا، غار-۲۷۱
جمعہ-۱۶۱	چرچ، دوہر انتظام اقتدار-۷۱	حرکت-۲۱۹
جمود-۲۱۲، ۲۱۹	چرچ، فکری انتشار-۶۶	حرمت، ہر شتوں کی-۳۳۹
جن-۲۸۹	چرچ کا استحکام-۶۵	حرمت، سگ-۱۹۰
جنت-۲۵۲، ۲۵۸-۲۵۶، ۲۳۴	چرچ کا دور ابتلاء-۶۴	حرمت، شراب-۱۹۱
جنت المادنی-۲۹۴	چرچ کا غلبہ-۶۷	حرمت، عیسیٰ-۲۳۹
جنس-۳۳۳، ۳۳۹، ۲۵۷، ۱۵۸، ۱۰۳	چرچ کا کردار-۱۳۹	حرماتوں کے فسانے-۱۹۰
جنگ-۲۹۸، ۱۴۸	چرچ کونسل-۷۶، ۷۷، ۷۸	حروب، صلیبی-۷۹، ۸۱، ۸۳، ۹۰، ۹۷
جنگیس، عہد نبوی-۳۲۳، ۳۲۵	چرچ کی تاریخ-۶۳	۱۳۹، ۱۲۶، ۲۲۲
جنگ، مسند نشینی-۷۷	چرچ کی تقسیم-۶۹، ۱۲۰	حروف، مقطعات-۱۶۰
جنگی عقیدہ-۱۲۴	چرچ کی تنظیم-۶۲	حسان بن ثابت-۳۳۳
جنگی مذہب-۱۵۷	چرچ کی سرکاری سرپرستی-۶۵	حصول اقتدار-۱۹۴
جنگی مہمات-۲۹۹	چرچ، ڈیٹر شپ-۶۸	حطین، جنگ-۱۳۵
جہاد-۱۶۲، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۰	چرچ، فکر پر تسلط-۶۸	حفصہ، ام المومنین-۲۵۸، ۳۳۵، ۳۳۷
۲۷۹، ۳۱۷، ۳۲۳	چرچ، فوج-۷۲	حقوق مفتوح-۲۳۲
جہنم-۲۵۲	چرچ، متوازی سلطنت-۶۶	حکمت (کلام)-۶۰
جھولی-۲۷۹	چکی کا پاٹ، بصریات-۱۸۰	حکمت عملی کا تعین-۱۳۵
جوز، ولیم-۱۵۲	چنگیز خان-۱۲۲، ۱۳۸، ۳۲۳	حکمران-۲۶۷
جویریہ، ام المومنین-۳۳۵، ۳۳۸	چمبر لین-۳۸	حلف الفضول-۲۸۱
جیرارد آف کریوٹا-۱۷۲، ۱۷۹		حلیف-۳۱۶
جیروم، فادر-۱۹۱، ۲۶۰	ح	حلیفہ سعدیہ-۲۵۲
جیلانی، ڈاکٹر صاحب-۶		حراء الاسد، غزوہ-۲۷۳
جیمس، برادر-۵۰	حاصل کلام-۲۵۱، ۳۵۴	حمزہ بن عبدالمطلب-۲۹۷، ۳۰۶، ۳۰۷
جینا کل-۵۱	حبشہ-۲۲۸، ۲۷۰، ۲۷۷، ۲۸۷، ۲۹۲	حمید اللہ خاں، ڈاکٹر-۳۰۷
جینیٹیس، مترجم-۱۷۶	۳۳۸	حظانہ، حضرت-۳۰۶
جین جرمین-۲۱	حبشی زبان-۲۲۹	حنیف-۱۶۰، ۱۸۸، ۲۲۸
جیو پیٹر-۱۸۴	حج-۲۲۸، ۲۳۰، ۲۳۲، ۲۳۷، ۳۱۰	حنین بن الحنف-۱۷۷

دایو کلے تیان، شہنشاہ-۲۶	خریطے-۲۵۹، ۳۲۰	حنین، غزوہ-۲۹۸، ۳۱۷، ۳۲۵، ۳۳۶
دجال-۱۲۳، ۱۸۴	خرج، قبیلہ-۲۷۲، ۲۹۹، ۳۰۴	۱۶-۲۵۷
وجہ ^۲ ، کلبی، حضرت-۲۷۲	۳۲۶، ۳۲۷، ۳۳۴	حویطب-۲۴۱
درندہ-۲۰۳	نطبہ، جنگ، پوپ ار بن-۱۳۰	حیات بعد المات-۲۵۳، ۵۵، ۲۴۱، ۲۵۶
درندہ، دانیال کے خواب کا-۱۲۳، ۲۰۰	نطبہ، حجۃ الوداع-۲۱۷	حیات طیبہ-۱۶۲، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۳۷
دست گرد-۳۱۳، ۳۱۵	خطوط-دیکھیے مکتوبات	۲۶۱، ۲۶۸، ۲۹۲، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹
دشمن خدا-۱۸۲، ۱۸۵	خلوص رعدم خلوص-۱۶۳، ۳۲۰-۳۲۲	۳۳۸، ۳۳۹، ۳۳۴
دشمن عیسیٰ-۱۹۲	خندق-۳۰۷، ۳۰۹، ۳۳۴	حیات طیبہ، بعد نبوت-۲۸۳، ۲۷۷
دعوت ہجرت-۲۷۱	خندق، جنگ-دیکھیے احزاب	۲۹۱، ۳۳۷
دعویٰ-۲۲۹، ۲۳۰	خزیر، فساد حرمت-۱۹۰	حیات طیبہ، قبل نبوت-۲۸۲، ۲۷۷
دفاع-۲۷۸، ۲۹۹	خواب-۱۲۳، ۲۰۰، ۲۸۴، ۳۱۱، ۳۵۹	حیات طیبہ، مدنی دور-۲۷۷، ۲۷۸
دفاعی نظریہ-۱۵۸، ۱۵۹	خواب، تعبیر-۳۱۱	۲۹۳، ۳۳۷
دلائل برائے ازالہ اسلام-۱۵۰	خود زاری-۳۳۳، ۳۵۰	حیات طیبہ، مکی دور-۲۷۷، ۲۷۸
دمشق-۸۶	خود فریبی-۳۰۵، ۳۳۶	۳۸۱، ۳۳۸
دنیا بیزاری-۵۳، ۱۰۳	خوشگوار تعاون-۲۷۱، ۲۷۲	حیات عیسیٰ-۱۶۲
دنیا داری-۲۶۷، ۲۹۰	خوں بہا-۳۲۹، ۳۳۱	حیات نو-۵۷، ۱۰۲
دھوکہ-۳۲۳	خونریزی-۲۱۵، ۳۲۳-۳۲۵	حیدر آباد دشمن-۲
دور دانش-۱۹۹، ۲۰۱	۳۳۷، ۳۳۷، ۳۵۰	حیدر آباد سقوط-۳
دور سرد جنگ-۱۶۹	خیام، عمر-۱۷۹، ۱۸۰	حیی بن اخطب-۳۰۹، ۳۳۰-۳۳۳
دور موسوی-۲۵۱، ۲۵۲	خیبر-۳۰۷، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۵، ۳۳۶	
دو لائق-۱۶۹	خیبر، فتح-۳۳۵	خ
دور موسوی-۲۵۱	خیبر، واقعات کا تجزیہ-۳۳۶	خارجہ پالیسی، کلیسا-۹۶
دور نبرد آزمانی-۱۶۹		خالد الخلیق-۱۰
دوستی، فرقہ-۶۶	د	خالد بن ولید، حضرت-۸۶
دوکوائے-۳۰		خمیب بن عدی-۲۳۳
دولت کی پیشکش-۲۹۷	داخلی امور، کلیسا-۹۶	ختمہ کا حکم-۱۹۳
دو ہر نظام اقتدار-۷۳، ۱۶۸، ۲۳۶	دارالترجمہ-۱۷۲	خدا کا حصہ-۲۶۷
دیانتدارانہ جائزہ-۲۷۹	داروگیر، مذہبی-۴۱، ۱۰۰، ۲۳۸	خدا کی بادشاہت-۲۵۷
دین-۲۶۶، ۲۷۲، ۳۲۰، ۳۲۳	داعی اسلام-دیکھیے محمد ﷺ	خدا کی قوم-۱۲۵
دین ابراہیمی-۲۱۴، ۲۱۵، ۲۳۰، ۳۱۰	دانے-۷۵، ۲۸۶	خدیجہ، حضرت-۱۹۳، ۲۸۱
دین حنیفہ-۲۱۴، ۲۳۰، ۲۳۲	دانیال، کتاب تورات-۲۰۰	خرافات-۱۶۳، ۳۱۸
دینو-۲۶۱	دانیال، نبی-۱۲۳، ۲۰۰، ۳۳۱	خروج، موسیٰ-۲۷۷
دیوار، قاعدہ، بنو نضیر-۳۳۰	داؤد، حضرت-۲۸۵، ۳۳۷	

دیو مالائی قصے-۲۲۴	رائز، مترجم-۱۷۶	رومن ایسپائر کے دیوتا-۵۹
دیوی دیوتا-۳۶، ۲۸۸، ۲۸۷، ۲۸۹،	رکس، پیری ملارج-۱۷۸	رومن ٹیکس-۴۴
۲۹۳-۲۹۸، ۲۹۶	رب الافواج-۱۲۵، ۳۲۴، ۳۳۷	رومن چرچ-۲۶۰
ذ	رجع-۲۳۴	رومن دی ماہومت، کتاب-۱۹۳
ذات السواری، جنگ-۸۹	رجز، شاہ-۱۳۵	رومن زراعت، صنعت، تجارت-۱۰۹
ذمی-۲۳۸	رعل-۱۲۲	رومن سلطنت مغرب، مقدس-۳۵
ذوالحجاز-۲۳۷	رسول اللہ- دیکھیے محمد ﷺ	رومی مذاہب-۴۶، ۳۳۹
ذی الحج-۲۳۷	رسوم حج-۲۳۲	رومی معاشرہ-۱۸، ۲۶۷، ۳۳۹
ذی قعدہ-۲۳۷	رسوم، عیسائی-۱۰۶، ۵۷	رومی معیشت-۱۰۹، ۱۱۰
ڈ	رضا کارفوج-۱۲۳	رویاء-۲۸۵، ۲۸۴، ۳۱۱
ڈارون-۱۵۶	رعمیس-۲۵۵	رے راء، دیوتا-۲۵۵
ڈائریکٹر مقالہ، طاہر ملک-۲۲، ۱۲	رہبانیت-۱۱۸، ۱۶۸، ۲۷۰، ۳۳۹	ریاست کلیسا-۳۴
ڈمبر، ولیم-۱۸۶	۲۵۲، ۳۵۰، ۳۴۰	ریاست مدینہ-۲۷
ڈوزی-۳۱۹، ۲۳۲	رواقیت-۱۱۸	ریاست کی تعریف-۴۳
ڈنمارک-۷۵	روبرک-۱۳۶	رینڈائٹین-۳۷
ڈیپاٹا-۱۸۴	روح-۲۵۲، ۲۵۶، ۵۲	ریلند، اے-۱۵۲
ڈیوائن کامیڈی-۱۷۵	روح القدس-۱۹۶، ۲۰۳، ۲۰۸، ۲۲۶	ریند-۱۷۲، ۱۳۲
ڈیون پورٹ-۱۵۹	روحانی جسم-۲۲۱	ریناند-۱۳۵
ر	روحانی تسکین-۲۶۷	ز
راہرٹ-۱۷۳، ۱۳۹	روحانی معاد-۵۵	
راداگانیسس-۲۸	روحانی وارداتیں-۲۸۵، ۲۸۴	
رادرک، شاواہین-۸۷	روحانی دنیا-۲۲۱	زیر بن عبدالمطلب-۲۸۱
رازی، امام زکریا-۱۷۶، ۱۷۷، ۱۱۸، ۱۷۷، ۱۷۸	روح کائنات-۶۰	زیر بن عوام، حضرت-۳۰۶
راس، الیگزینڈر پاپادوری-۱۹۸	رودرج-۱۴۰	زرتشت-۲۶۱، ۵۶
راوینا، شہر-۷۸، ۲۹	روڈنس، میکسم-۱۶۴، ۱۵۹	زرتشتیت-۴۶
راہب-۱۹۳، ۷۱	روزانو-۷۷	زکریا، حضرت-۲۵۲
راوی حدیث-۲۴۸	روزہ-۲۳۱، ۲۲۷	زکوٰۃ-۲۲۸، ۲۳۱
	رولینڈ-۱۲۶	زمانہ جاہلیت، مغرب-۱۹۹
	روم-۳۲۵، ۲۰۰، ۱۲۲، ۹۰	زمان و مکان-۲۱۶
	روم، لافانی شہر-۴۰	زنگی، اتابک-۱۳۳
	رومن ایسپائر-۱۷، ۲۴، ۲۵، ۳۰، ۸۶	زنگی، نورالدین-۱۳۳
	۳۱۵، ۲۷۷، ۲۴۰، ۱۱۲، ۱۰۸	زورشمیر-۲۱۲، ۲۱۵، ۲۷۶
	رومن ایسپائر، سرکاری عیسائی عقیدہ-۶۷	زیارت-۲۳۶

زیارت بیت اللہ-۳۱۰	سترہویں صدی عیسوی-۱۵۱، ۲۰۵، ۳۳۷	سلوینس، پینس، پوپ-۱۳۱، ۱۳۸، ۱۳۷
زید بن ثابت-۲۵۸، ۲۳۵، ۱۶۰	تجدہ-۲۹۱، ۲۹۶، ۳۱۷	سلیمان، حضرت-۲۸۵، ۳۳۷
زید بن حارثہ-۳۳۸، ۲۹۷، ۲۷۴، ۱۹۷	تجہ-۲۳۵	سمرقند-۱۸۳
زنگریوس، دیوتا-۳۶	سد، ایل-۱۲۶	سمہ، کتاب-۱۱۹
زینیس، کارڈینیل-۱۱۴	سدرۃ المنتہی-۲۹۴	سخر-۱۷۹
زینب، ام المومنین-۳۲۸-۳۲۶	سدرن-۱۸۳	سنمرشپ-۶۸
زینب بنت جحش، ام المومنین-۳۳۹، ۳۳۸	سراسین-۱۲۳، ۱۳۲، ۱۸۲-۱۸۴	سنگدی-۳۳۶
زیو-۱۱۸	۲۷۵، ۲۳۶، ۱۸۷	سنگار-۳۲۹
	سراغرسائی-۳۰۰	سنیاس-۳۳۰
	سرافیم-۲۸۵	سہل-۳۱۶
ژاں ژرماں-۱۳۸، ۱۳۶	سرافیم-۲۷۵	سود، حرمت-۲۱۲
	سرخیس، قیس-۱۸۹، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۴	سودہ، ام المومنین-۳۳۵، ۳۳۷
	سریان زبانی-۲۲۸	سورۃ آل عمران-۳۰۱، ۲۵۱
	سزائے موت-۳۲۹	سورۃ حج-۲۹۳، ۲۹۱
	سسلی-۱۷۴، ۱۲۲، ۱۱۶، ۸۹، ۲۵	سورۃ حجرات-۲۵۳
سابقون الاولون-۲۷۸	سرف (کسان)-۱۱۲	سورۃ روم-۳۱۳
ساخو-۲۱۱	سقاکی-۳۲۳	سورۃ قمریش-۲۳۲
سازش رسا شیش-۳۳۱، ۳۰۹، ۲۸۰	سفر ایتین، مفروضہ رسول اللہ-۱۹۳	سورۃ کوثر-۲۳۲
سامی تہذیب رندہب-۳۳۰، ۱۱۰	سفرنامے-۲۰۴	سورۃ مریم-۲۹۲، ۲۵۸، ۲۵۱
سامی زبان-۲۲۹	سرقۃ کتب-۱۷۲	سورۃ نجم-۱۶۵، ۲۸۷، ۲۹۰، ۲۹۱
سامی نسل-۲۳۵، ۲۲۸	سرمایہ داری-۲۱۹، ۲۱۸	۲۹۵، ۲۹۴، ۲۹۲
ساکو-۱۲۷	سعد بن ابی وقاص-۳۰۹، ۲۹۷	سورۃ نجم، نزول-۲۹۱
سائمن آف تورنائے-۱۳۶	سعد بن معاذ-۲۳۳، ۳۲۷، ۳۳۴	سودے بازی-۳۱۸، ۲۹۷
سائمن، رچرڈ-۱۵۲	سقاط-۲۶۳	سورج-۲۹۲
سائمن-۲۸۷، ۲۸۶، ۲۵۰، ۱۷۷، ۱۱۶	سکے-۱۱۵	سورج رسوریہ پوجا-۳۳۰
سائمن بائیل اور قرآن، کتاب-۲۵۰	سکے، شہری-۱۳۳	سوسائٹی آف جیسس-۱۰۰
سانو-۲۶۰، ۸۰	سلاف، قوم-۳۴، ۳۰	سولن-۳۲۹
سبت-۱۶۱، ۵۷	سلازم بن مشکم-۳۲۹-۳۳۲	سولہویں صدی عیسوی-۱۵۱، ۱۵۰
سبعہ معلفات-۲۳۹	سلجوق-۱۲۸، ۹۰	سولیدی-۳۵، ۳۳
سبیلیزیم-۶۷	سلطنت ایران-۱۸	سیاست-۲۹۷، ۲۶۷، ۲۳۸
سپٹا جنٹ-۲۵۹	سلطنت روم-۱۸	۳۳۶، ۳۲۶، ۳۲۳
سپردگی-۲۸۷	سلطنت عثمانیہ-۹۱	سیاست کلیسا-۹۳
ستارہ-۲۹۴	سلمان فارسی، حضرت-۳۰۷	سیاستی تبدیلیاں-۱۳۴

سیاسی اختلافات-۱۹۲	شراب-۵۷، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۹۰،	شیطان فی فعل-۲۹۸
سیاسی امور-۲۶۸	۱۹۸، ۱۹۱	شیکسپیر-۱۹۶
سیاسی عزائم، مغرب-۹۸	شرائط-۳۳۸	شیوہ پیغمبری-۲۱۵
سیاسی نظریات، کلیسا-۹۵	شرک-۲۹۳، ۲۹۴، ۲۲۵، ۲۲۲، ۱۶۱،	
سیرت، کتب-۲۱۵	۳۵۱، ۲۹۸	ص
سیرت نبوی-۲۹۰، ۲۲۷، ۱۳۰، ۱۹۲	شریعت-۳۳۸، ۳۳۶، ۳۳۳، ۲۳۹، ۲۰۰،	صاحب (رسول اللہ)-۲۹۵، ۲۹۴
سیرت نگاری، مغربی-۲۱۱، ۱۹۲	شریعت، قانون-۳۲۱، ۲۳۶	صادق و امین-۲۹۵
سینر-۲۶۳	شریعت موسوی، تفسیح-۲۲۶، ۶۱	صالح معاشرہ-۲۷
سیکن، قوم-۳۴	شعار-۲۹۶، ۲۲۸، ۱۰۶	صبر و برداشت-۲۹۸
سیل-۲۵۸، ۲۲۵، ۱۶۰، ۱۳۳	شعب ابی طالب-۲۹۱	صحاح ستہ-۲۳۸
سینائی آکسٹرم-۱۱۸	شعبہ عربی زبان-۱۵۱	صحف سادہ-۲۳۸-۲۵۱
سینٹ بارتھولومیو-۴۱	شعر-۲۳۳	صد اذیت-۳۱۰
سینٹ-۲۰۰	شعری دیوان-۲۲۵	صرع-۲۸۴
سینیٹ، روم-۳۱	شعبیت، حضرت-۲۵۱	صفات ذات الہی-۲۲۲
سیوطی، علامہ جلال الدین-۲۵۳، ۲۳۰	شغل بیکاری-۲۶۸	صفوان-۳۱۶، ۲۴۱
	شفاعت-۲۹۵، ۲۹۴، ۲۹۱	صفین، جنگ-۲۵۹
	شکست و فتح-۱۲۵	صفیہ، ام المؤمنین-۳۲۸، ۳۲۶، ۲۵۳
	شکوہ و شبہات-۳۰۹	صفیہ بنت عبدالمطلب-۳۳۳
	شخص پرستی-۷۷	صلح حدیبیہ-۳۱۰، ۳۱۳، ۳۱۶،
	شمشیر-۲۳۷، ۲۳۲، ۲۱۲، ۱۸۹، ۱۵۸،	۳۲۵، ۲۲۸، ۳۳۶، ۳۳۱
	۳۲۳، ۳۰۳، ۲۷۹	صلوٰۃ-۲۳۰
	شمسیر، نبوی-۳۰۶	صلیب، مقدس-۳۱۵، ۳۱۳
	شہادت حفاظ-۲۵۸	صلیبی جنگ، پانچویں-۱۳۵
	شہر بدری-۳۳۰، ۳۲۹، ۳۲۷	صلیبی جنگ، پہلی-۱۳۱
	شہر دکن کی تحلیل، مغرب-۱۱۱	صلیبی جنگ، تیسری-۱۳۵، ۱۳۳
	شہریت-۳۵	صلیبی جنگ، چوتھی-۱۳۵
	شہنشاہیت، رومی-۲۶	صلیبی جنگ، دوسری-۱۳۳، ۱۳۸
	شوکت تھانوی-۷۷	صلیبی جنگیں-دیکھیے حروب صلیبی
	شیرازی، قطب الدین-۱۸۰	صلیبی نظریہ-۱۳۰
	شیرکوہ-۱۳۳	صنعت و حرفت-۱۷۳
	شیطان-۲۹۳، ۲۹۱-۲۸۹، ۲۸۶، ۱۹۸،	صنم اعظم-۱۸۴
	شیطان آیت-۲۸۸	صوفیہ-۹۱
	شیطان کلمات-۲۹۶، ۲۹۰	

ش

شادی، رسول اللہ-۳۳۲، ۲۱۳، ۱۹۳
شارٹرانسٹیکو پیڈیا آف اسلام-۲۲۷،
۲۸۹، ۲۸۱، ۲۳۶، ۲۳۲
شارحین اعظم-۳۳، ۳۵، ۷۲، ۱۲۶، ۳۲۱،
شاعر-۲۹۵
شافعی، امام-۲۳۰
شاگرد-۳۲۳، ۳۲۵
شام-۳۲۵، ۲۷۷، ۲۷۵، ۲۶۷
شامت اعمال-۱۸۷، ۱۸۹
شاہ پرستی-۳۶
شاہان عالم-۳۱۳-۳۱۵
شمیہ پرستی-۳۲
شجاع، ابو کامل-۱۷۹
شجرہ نسب، ڈاکٹر جیلانی-۱۳
شدید القوی-۲۹۴

عذرا (غیر) - ۲۵۹	عائیسی، رسول اللہ ﷺ - ۲۸۲	ض
عراق - ۲۵، ۸۶، ۱۰۸، ۱۷۹، ۲۷۷	عام الفیل - ۲۸۱	ضابطہ اخلاق - ۲۱۲، ۲۱۷، ۲۱۹
عرب - ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۵۱، ۲۷۵	عائشہ، ام المؤمنین - ۲۵۳، ۳۳۷، ۳۴۷	ط
۲۷۸، ۲۸۱، ۳۱۰، ۳۱۳، ۳۲۵، ۳۲۶	عبا - ۱۱۵	طارق بن زیاد - ۸۷
عرب، انقلاب - ۳۱۳	عبادت - ۲۳۰	طائف - ۲۹۰، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۸
عرب پر - ۱۶۱، ۲۹۰، ۳۰۱، ۳۱۱	عبادت، سیاسیت - ۱۰۵	۳۲۵، ۳۰۰
۳۱۶، ۳۰۰	عبادۃ بن صامت - ۳۲۷	طائف، بحارہ - ۳۱۷
عرب، دستور - ۲۵۷، ۳۰۹	عباس بن عبادہ، حضرت - ۲۷۱	طبری، محدث - ۲۹۱، ۲۹۶
عرب، طریقہ جنگ - ۳۰۵	عباس بن فرناس - ۱۷۹	طبری، علی - ۱۷۷
عرب، قبائل - ۳۱۷، ۳۱۷، ۳۲۵	عباسی خلافت - ۱۲۹	طبقات ابن سعد - ۲۱۱
۳۲۹، ۳۳۵	عبدالحمید، سید (والد ذوالکریلانی) - ۶	طبقاتی تقسیم - ۲۱۷
عرب کا ماحول - ۲۳۹، ۲۹۸، ۳۲۰	عبداللہ از - ۳۰۵	طب و عطاری - ۱۷۷
عربی الفاظ - ۱۸۰	عبدالرحمن الثامر، امیر - ۹۷	طریق عبادت، اختلافات - ۲۳۰
عربی زبان - ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۲۲، ۱۲۳	عبدالرحمن بن عوف، حضرت - ۲۷۲	طریقہ ہائے کار - ۱۲۸، ۱۳۹
۲۱۵، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۲۹	عبدالرحمن ثانی، امیر - ۱۲۷، ۱۲۸	طلحہ، حضرت - ۱۶۱، ۲۹۷
عربی طباعت - ۱۵۱	عبدالرحمن الفافقی، امیر - ۳۳، ۸۸	طلاق - ۳۲۶
عربی کتب - ۱۵۱، ۱۷۳	عبداللہ بن ابی منافق - ۳۰۳، ۳۲۶	ظیلطہ - ۱۷۲
عرب کی تاریخ - ۲۸۲، ۲۸۳	۳۳۷، ۳۳۰	ظواف - ۲۳۲، ۲۳۷، ۲۹۶
عرفات، میدان - ۲۳۷	عبداللہ بن انیس - ۳۳۶	طور، کوہ - ۲۳۷، ۲۸۵
عروہ بن زبیر - ۲۹۶	عبداللہ بن جحش، حضرت - ۲۷۳، ۳۰۰	طوس - ۳۳، ۸۸، ۳۰۳
عزم و استقامت - ۲۹۸	عبداللہ بن ربیعہ - ۲۳۱	طوسی، مظفر الدین - ۱۷۹
عزئی و حالات و منات - ۱۶۵، ۲۷۰	عبداللہ بن طارق - ۲۳۲	ع
۲۸۷، ۲۸۹، ۲۹۱، ۲۹۶، ۳۱۷، ۳۱۸	عبدالمطلب - ۲۸۱، ۲۸۲	عاشوراء، روزے - ۲۲۷
عسرت - ۲۱۳	عبدالملک بن مروان - ۸۷، ۲۹۶	عالم اسلام، انتشار - ۱۲۸، ۱۵۵
عشائے رباعی - ۵۷	عبر - ۲۵۲	عالم بالا - ۲۳۹، ۲۸۱، ۲۹۴
عشر - ۳۱۷	عبرانی - ۲۲۷، ۲۲۸	عالم بشریت - ۲۸۵
عشق رسول - ۲۸۰، ۵	عتبہ بن ربیعہ - ۳۰۱، ۳۰۲	عالمی ضابطہ اخلاق - ۳۵۹
عقائد - ۱۱۷	عتبہ بن غزوآن، حضرت - ۳۰۹	عالمی قوانین - ۲۱۷، ۲۱۹، ۳۳۵
عقبہ، مثنیٰ - ۲۳۳	عثمان، حضرت - ۸۷، ۸۷، ۲۵۸	
عقبہ بن نافع - ۸۷	۲۵۹، ۲۷۷، ۳۱۱	
عقیدہ دوام - ۳۹	عجائبات - ۲۹۳	
عقیدہ شکست و فتح - ۱۳۳	عجمہ - ۱۱۵	
عقیدہ لالہ - ۲۲۱، ۲۹۸		

عکاظ-۲۳۷، ۲۳۶	عمر دین جاش-۳۳۲، ۳۳۰	عمیق، مقام-۳۱۲
عکرمہ-۳۱۶	عمر دین حضرتی-۳۰۷، ۳۰۱	عمیق، علامہ-۲۹۰
عکرمہ-۱۳۵	عمرہ-۳۱۰، ۳۱۱	عمینہ بن حصن فزاری-۳۳۶
علت اولیٰ-۶۷، ۶۰	عمرے کا خواب-۳۱۱	
علماء-۲۳۱	عبد نامہ بید-۲۵۹، ۲۶۰، ۳۲۲	غ
علم الابدان-۱۷۷	عبد نامہ بنیق رقدیم-۵۶، ۱۰۷، ۱۹۸	
علم الاصاب-۲۰۵	۲۵۹، ۲۵۰، ۲۳۹، ۲۳۳، ۲۳۲، ۲۳۱، ۲۳۰	
علم المثلث-۱۷۹	۳۲۲-۳۳۹، ۳۳۷، ۳۲۲، ۲۶۸	غذاری-۳۳۲، ۳۳۳، ۳۲۹، ۳۲۸، ۳۲۸، ۳۲۸
علم المہنت-۱۷۹	عبد نامہ قدیم وجدید-۲۵۷، ۲۵۷	غذاری نیت-۳۲۸
علم اقلیدس، (جیومیٹری)-۱۷۹	۳۳۹، ۳۲۲، ۲۵۸	غذاری کی تعریف-۳۲۸
علم بردار-۳۰۵	عناد-۲۷۹	غذاری کی سزاموت-۳۲۸
علم بصریات-۱۸۰، ۱۷۷	عبد نبوی-۲۸۰	غرائیق، تائید واقعہ-۲۹۱
علم تشریح الاعضاء-۱۷۷	عوارض-۲۱۵	غرائیق، غور طلب پہلو-۲۹۱
علم جغرافیہ-۱۷۸	عورت-۳۳۳، ۲۵۷	غرائیق، صحیح واقعہ-۲۹۰
علم ریاضی-۱۷۸	عیاض، قاضی-۲۹۰	غرائیق، ممکن محرمات-۲۹۷
علم زراعت-۱۷۸	عیسیٰ، حضرت-۲۲۶، ۱۲۶، ۱۰۲	غرائیق، واقعہ-۲۱۵، ۲۷۵، ۲۷۷
علم نباتات-۱۷۸	۲۶۳، ۲۵۷، ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۳۳، ۲۳۲	۲۸۷-۲۹۳، ۲۹۱-۲۹۳، ۲۹۱-۲۸۷
علم نجوم-۱۷۶	۳۱۵، ۲۸۶، ۲۷۹، ۲۶۳	غز، تاریخی قبیلہ-۱۲۹، ۹۰
علم کلام-۲۲۲، ۱۲۸	۳۲۳-۳۳۰، ۳۳۱، ۳۲۵	غزالی، امام-۱۱۸، ۱۷۷
علمی استفادہ-۱۷۱	عیسیٰ، کلمہ اللہ-۶۰	غلام، رومی-۳۵، ۱۰۹، ۱۱۰
علوم کا پتہ-۱۷۱	عیسائی-۲۳۹	غلط فہمی-۳۲۰
علوم و فنون-۱۱۶	عیسائیت-۲۷۷، ۲۷۸، ۱۲۳، ۱۱۷	غیر الہامی کتاب-۲۱۰
علی بن ابی طالب-۲۹۷	۲۵۷، ۲۵۰، ۲۳۹، ۲۲۸، ۲۱۲، ۲۱۰	غیرت و جمعیت-۳۰۵
علی بن خلف-۱۷۹	۳۳۷، ۳۳۳، ۲۷۰، ۲۶۶، ۲۶۱	غیر مادی جسم-۲۵۶
علی بن عباس-۱۷۷	۳۳۹، ۳۳۰	
عمر ام-۲۵۲، ۲۵۱	عیسائیت، تضاد-۳۲۳	
عمران-۲۵۲، ۲۵۱	عیسائیت، جہان بینی-۱۶۸	
عمر بن خطاب، حضرت-۲۵۸، ۱۶۶	عیسائیت، دشمن حیات مذہب-۳۳۹	فارابی-۱۱۸، ۱۷۷
۲۵۹، ۲۷۲، ۲۹۷، ۳۱۷، ۳۱۸	عیسائیت، رومن کیتھولک-۶۱	فارسی، کمال الدین-۱۸۰
۳۳۶، ۳۳۵-۳۳۷	عیسائی دولت مشترکہ-۳۰	فارما کولوجی، کتاب-۱۷۶
عمر بن عبدالعزیز-۲۳۷، ۲۳۸	عیسائی نظریات-۳۳۹، ۲۶۷	فاطمی خلافت-۱۳۲، ۱۲۹
عمر دین امیہ-۳۲۹	عیش کوش مذہب-۳۳۹، ۳۵۰	فان سائبل-۱۸۳
عمر دین العاص، حضرت-۳۰۳، ۸۶	عیش کوشی-۳۳۷، ۳۵۱، ۳۵۲	فالک-۵۶
		فتہ گر-۱۸۲

قرآن، ترحیب نزولی-۲۹۳، ۲۹۲	فوجی ملازمت، مفروضہ-۱۹۳	فتوحات-۲۷
قرآن، ترجمہ-۱۳۹، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۶۱، ۱۶۴	فوجی ملازمت، روم-۲۵	فجاء، جنگ-۲۸، ۲۷
قرآن، تلاوت-۱۶۱، ۱۶۵، ۲۵۸	فورٹ ولیم کالج، کولکٹہ-۱۵۲	فرانس-۳۳، ۳۹، ۸۳، ۸۸، ۱۱۶
۲۸۷، ۲۸۸، ۲۹۲، ۲۹۵، ۲۹۶	فیوڈل سسٹم-۱۱۳	فرانس فان راولینجن-۱۵۱
قرآن، تسبیح آیات-۲۸۸، ۲۹۱	فینسیول آف دی سارٹا بیا-۵۷	فرانسسکن-۱۱۸
قرآن، حفظ-۲۳۳، ۲۵۸	فینکس-۸۹	فردوس الحکمہ-۱۷۷
قرآن، حصول-۱۸۹		فروینیند-۱۲۶
قرآن، قرأت بالجہر-۲۹۱		فرشتے-۲۸۳، ۲۹۲، ۲۹۵
قرآن، لاشعور کی پیداوار-۱۵۹، ۳۲۰		فرضی مناظرے-۱۸۸
قرآن، موازنہ-۲۲۵		فرعون-۱۸۵، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۵۶-۲۵۷
قرآن، مصنف-۱۶۰، ۱۶۲، ۲۱۳		۲۷۹، ۲۶۴
۲۱۴، ۲۳۴، ۲۸۸، ۳۲۰		فرقان-۲۲۷
قرآن، مدنی سورس-۲۹۳		فریب، الزام-۱۵۳، ۱۶۰، ۱۶۳، ۲۰۲
قرآنی لغت-۲۲۹		فریدک ثانی، شاہ سلی-۱۰۱، ۸۲
قربانی-۲۱۴، ۲۳۶، ۲۳۹، ۳۱۰		فرینک سلطنت-۲۹
۳۳۹، ۳۵۰		فرینک قوم-۱۲۵، ۱۳۵
قرطبہ-۱۲۶، ۱۷۱		فضا میں بلند ہونا-۲۸۶
قریش-۲۳۴، ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۷۰		فضل-۵۴
۲۷۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۹۰، ۲۹۳		فعالیت-۲۸۱
۲۹۵-۲۹۶، ۲۹۹-۳۱۰، ۳۱۲، ۳۱۳		فطری اقتصادی نظام-۱۱۲
۳۱۶، ۳۱۷، ۳۲۵-۳۲۸، ۳۳۲		فطری قانون، زندگی-۲۲۱
۳۳۳، ۳۳۵، ۳۳۵		فقہ-۲۳۶
قریش، جنگی تیاریاں-۳۰۰		فلپ پولس-۹۱
قریش، خواتین-۳۰۵، ۳۰۶		فلپچر-۱۳۳
قریش، ساکھ-۳۰۴		فلسفہ-۱۱۷، ۱۳۳، ۱۳۸
قتیس، بدعتی-۱۹۵		فلسفہ، فن، کتاب-۱۷۴
قطیفہ-۲۰، ۳۲، ۸۷، ۱۲۹		فلسفہ، مسیحی تقدس-۱۵۰
۱۳۵، ۳۱۵		فلسفہ، مسلم-۱۷۷
قسطین اعظم، شہنشاہ-۲۶، ۲۷، ۲۸		فلسفہ یونان-۲۶
قسطین افریقی-۱۷۴		فلسفیانہ موشگافی-۲۲۶
قسطین یازدہم-۹۲		فناء الفنا، کتاب-۱۷۴
قطع نسل-۳۳۹		فوجی مسلک اسلام-۱۵۸
قلج ارسلان، سلطان-۱۳۴		فوجی کارروائیاں، مغرب-۱۳۰

ق

کلمہ الحق - ۲۹۸، ۲۶۳
کلوئی تحریرات - ۱۳۹
کلبھازی، دوہری - ۳۶
کلیسا - ۱۹، ۳۱، ۱۱۶، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۸، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۱۹۶، ۱۷۲، ۱۶۸
کلیسا، تنظیم - ۳۴۳، ۳۳۷، ۲۶۷
کلیسائے مغرب - ۵۰
کلیسائے یروشلیم - ۵۰
کلمت بنیم، پوپ - ۱۳۳
کلینڈر، ششی - ۱۸۰
کنگ ڈیوڈ، (چنگیز خان) - ۱۳۷
کنوس کی کہانی - ۱۹۹
کنیت - ۲۵۲
کھجور کے باغات - ۳۳۰
کہانیاں، من گھڑت - ۱۹۰-۱۹۱
کوڑھ برص - ۱۹۴
کونسل آف ٹرائلٹ - ۱۰۵
کوہورت - ۴۵
کیتھولک بائبل - ۲۵۹
کیتھولک چرچ - ۲۰۲، ۱۴۳، ۱۰۵
کیتھولک (رومن) فکر - ۶۸، ۱۰۰، ۱۲۴
کیپ یون - ۲۴
کیپ سوریلو - ۲۴
کیمپوسانتو، جیسا - ۱۹۵
کینن - ۲۶۰
کیوریلا، چرچ - ۳۱

کتاب - ۱۱۶
کتاب سادی - ۱۰۵
کتھارس فرقہ - ۸۱، ۴۱
کثرت ازدواج - دیکھیے تعدد -
کثرت پرستی - ۲۲۴
کراچی - ۷
کرائسٹ - ۱۹۲، ۵۶
کردار، نبوی - ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۰، ۲۱۳
۲۶۳، ۲۶۷، ۲۸۰، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۱۹
۳۳۱-۳۳۳، ۳۳۹، ۳۵۷، ۳۵۸
کرجین اقدار - ۳۱
کرسس - ۵۷
کرونولوجی آف مینشیت میشنز، کتاب -
۱۷۶
کریت، جزیرہ - ۸۹
کریم، ہندرک - ۱۵۶
کسرلی - ۳۱۳، ۳۱۶، ۳۷۵
کعب بن اشرف - ۳۲۷-۳۳۰
کعب بن مالک - ۲۳۳، ۲۷۵
کعبہ حرم - ۲۱۳، ۲۲۸، ۲۳۲، ۲۸۲
۲۸۷، ۲۹۱، ۲۹۵، ۳۱۰، ۳۱۶
کعبہ، غلاف - ۲۹۵، ۲۹۶
کفارہ - ۵۳، ۱۰۴
کلائس، شہنشاہ - ۲۶
کلاریوس، مترجم - ۱۷۶
کلام (لوگس) - ۶۷
کلائن، ایف اے - ۲۳۵، ۲۸۷
کلبی - ۲۰۵
کلچر - ۲۳۸
کلچر، رومی - ۴۶
کلدانی زبان - ۲۲۸
کلرجی - ۱۰۱
کلمات خبیثہ - ۲۹۳

قلعہ بندی - ۳۳۰، ۳۳۷
قلعہ - ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۹، ۳۴۳
قوانین، قرآنی - ۲۱۳
قیدار بن اسمعیل - ۲۳۶
قیصری پاپائیت - ۹۳
قیصریت - ۲۶۴
قیصر - ۲۰۰، ۲۶۵، ۲۶۷، ۲۷۵، ۲۷۹، ۳۱۳
قیقار، بازار فساد - ۳۲۷

ک
کارپس - ۱۳۹، ۱۷۷
کارپو، جان آف پلیو - ۱۳۶
کارتھ جیہ - ۲۵، ۲۵۹
کارلائل، تھامس - ۱۵۵، ۱۶۳، ۲۰۶
۲۰۷، ۲۲۲، ۳۲۰، ۳۳۷
کارل مارکس - ۷۰
کارلینین - ۳۱، ۳۳، ۷۲، ۱۲۲
کالج آف کارڈینلز - ۷۷، ۷۹، ۸۰
کالج آف پروپیگنڈہ - ۱۵۱
کالج وی فرانس - ۱۵۱
کان، جان - ۱۰۴
کان، پیو - ۱۶۵
کانت - ۷۰
کانستانتین، شہنشاہ - ۸۹
کانستانتینس، شہنشاہ - ۵۷
کانٹن - ۱۴۵، ۱۴۸
کابین - ۲۹۵
کائیانی - ۲۲۷، ۲۳۷
کبوتر کی کہانی - ۱۵۳، ۱۹۵، ۱۹۶، ۲۰۲
کاپل - ۱۷۵
کتاب الفیہ - ۱۸
کتاب سیرت - ۱۱

مالی غنیمت - ۱۵۷، ۱۶۵، ۲۴۳، ۲۴۷، ۲۵۷	لذت پسندی - ۱۶۳، ۳۳۷	گارزے - ۱۷۸
۲۷۷	اشکر کشی - ۲۱۵، ۳۲۳	گال، شالی - ۲۹
مانڈیول، جان - ۱۹۱	اغزش - ۲۹۰، ۲۹۳	گنن، ایڈورڈ - ۱۵۴
ماہکیت - ۸۱، ۳۴۰	الغظی، فاطمہ - ۱۸۸	گراسٹ، رابرٹ - ۱۱۸
ماہ حرام - ۳۱۰	لگان - ۴۴	گرگوری، پوپ - ۴۰، ۷۱، ۸۷
ماہومت - ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۹۵	للس، ریمند - ۲۰، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۴۹	گریوٹے باؤم - ۱۵۸، ۱۶۵، ۲۳۷
ماہون، رہا نموند - ۱۸۳، ۱۸۶، ۱۹۲	لوخمر، مارٹن - ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵	۲۶۹ - ۲۷۲، ۲۷۴، ۲۸۹
ماہر، سیف اللہ - ۱۳۴	لوٹ - ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۷	گستا، کتاب - ۱۳۲
مبداء فکر - ۲۲۲	۳۱۱، ۲۹۹	گٹاؤم، الفریڈ - ۱۷۳، ۱۱۶
مبلغین، جماعت - ۳۲۹	لوٹ کی غلط فہمی - ۲۷۵	گلبرت آف نوجنت - ۱۴۰
مبشر ابن فائق - ۱۷۳	لوسیفر - ۱۸۴	گلبرت، مصنف گستا - ۱۳۲
مبتنی - ۳۴۸	لوٹ، حضرت - ۲۸۴	گلیلیو - ۱۷۵
مقبرائیت - ۴۶، ۴۷، ۵۶	لومبارت - ۱۷۰، ۳۰	گناہ آدم - ۵۲، ۵۳، ۱۰۴، ۳۲۹
مثالی زندگی - ۲۱۵	لوئیس، بجرم شہنشاہ - ۳۰، ۷۳	گناہ، ازلی - ۳۲۹
مجرمین - ۲۸۰	لی جن - ۴۵	گناہ، معانی - ۱۰۶
محاسبہ - ۲۱۷	لیڈن - ۱۵۱	گوتم - ۵۲
محدثین - ۲۴۸	لیسی نیس، قیصر - ۲۷	گولڈزبرگ - ۱۶۱، ۲۲۷
محققین - ۲۱۱	لیکچر - ۱۶۳	گولڈن لی جنڈ، کتاب - ۱۹۵
محمد، رسول اللہ ﷺ - ۱۲۷، ۱۹۱، ۲۱۵	لیسن - ۲۸۱، ۳۰۱	گوئٹے - ۱۵۴، ۲۰۶
۲۴۰، ۲۵۱، ۲۵۳، ۲۶۱، ۲۶۵، ۲۶۷	لین پول، اسٹیلے - ۲۹۰	گیارڈی، منظر الحسن - ۲۴۸
۲۶۹ - ۲۷۲، ۲۷۷، ۲۸۱، ۲۸۷	لیوسوم، پوپ - ۳۵	گیما، فریشیا - ۱۷۹
۲۸۸ - ۲۹۱، ۲۹۳، ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۹	لیوسوم، شہنشاہ - ۷۲، ۷۳، ۸۷، ۲۶۸	
۳۰۳، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۱۱، ۳۱۳، ۳۱۴		
۳۱۶ - ۳۲۱، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۳۰		
۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۶، ۳۳۹، ۳۵۰		

م

مذہب بن مسلمہ - ۳۳۰، ۳۳۷	مازی جسم - ۲۲۱	مات - ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹
محمد فاتح، سلطان - ۲۱، ۹۲، ۱۳۷، ۳۱۴	مازی دنیا - ۲۲۱	ماتری، جین - ۱۱۸
محمد بن ہنری - ۲۰۴	مارٹل، چارلس - ۳۳، ۸۳، ۸۸، ۳۰۴	ماتری، جین - ۱۱۸
محمود بن رقیع، حضرت - ۲۴۸	مارکو پولو - ۱۳۷، ۱۳۸	ماتری، جین - ۱۱۸
مخافت - ۲۱۴	ماریطانیہ - ۴۴	ماتری، جین - ۱۱۸
مخافت، رسوم عیسائیت - ۱۹۴	مارگولتھ، ڈی جی - ۲۴۰	ماتری، جین - ۱۱۸
مختار القم و محاسن الکلم - ۱۷۳	ماریہ، قبطیہ، ام المومنین - ۱۹۷، ۳۱۴، ۳۲۸	ماتری، جین - ۱۱۸
منظومات، انجیل - ۹	ماہوق الفطرت قوت - ۲۲۱	ماتری، جین - ۱۱۸

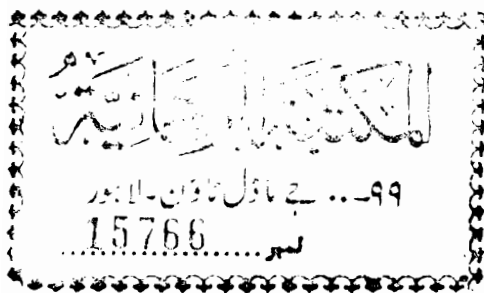
ل

ملک موعود-۲۷۹	مغربی شہریت-۴۰	معاشرتی مفاد، مستشرقین-۱۵۵
ملکوتی پیغام-۳۲۰	مغربی شہنشاہیت-۳۴، ۲۳	معاشرتی مقام-۲۶۸
ممالک-۲۳۹، ۲۳۷، ۲۳۰، ۲۲۸، ۲۱۶	مغربی فکر و عمل کا تضاد-۱۶۷	معاشرہ، ہمدن-۲۸۰
ممتحن-۱۷۹	مغربی معاشرہ-۳۴۳، ۱۶۷، ۹۳، ۳۶	معاشریات-۲۱۸
متمری-۱۸۴	مغیرہ بن شعبہ-۲۵۳	معاندین-۲۶۷، ۲۳۰، ۲۱۰، ۱۵۹
مملوک-۱۳۶	مفادات-۲۹۵	۳۱۷، ۳۱۶، ۳۱۴، ۳۰۹، ۲۹۰، ۲۷۸
منی-۲۳۳	مفاد، سیاسی-۲۹۷	۳۴۹، ۳۴۷، ۳۳۸، ۳۳۷، ۳۳۱، ۳۲۰
منات-دیکھیے عزّی	مفاد، مالی-۲۹۷	معاہدہ، معاہدات-۳۱۲، ۲۹۹، ۲۸۰
مناجات-۲۰۴	مفاہمت، وقتی جذبہ-۲۸۷	۳۳۳، ۳۲۶، ۳۱۷
منافرت، قبائلی ربط قاتی-۳۱۹	مفروضات-۳۱۳	معاہدہ فتنی-۳۲۳
منافع، منافقین-۳۴۸، ۳۳۲، ۲۲۸	مقامات عالیہ-۲۹۴، ۲۸۴	معاویہ، حضرت-۲۵۹، ۸۹، ۸۷
مشتعلی علوم، دورِ اوّل-۱۷۲	مقام نبوت-۲۷۹	معجزات-۲۴۷، ۲۴۵، ۲۱۵، ۱۴۱
منذ بن قدامہ-۳۲۷	مقام سعادت-۲۵۷	معراج-۲۸۴-۲۸۶
منزی، حافظ-۲۹۰	مقامی (نیو)-۳۷	معراج، کتاب-۱۷۵
منصوبہ، جنگی قریش-۳۰۱، ۳۰۰	مقامی اثرات-۲۳۲	معراج یعقوبی-۲۸۴
منصوبہ ساز-۲۹۲	مقبوضات، رومی-۲۷۸، ۱۱۲	معرب الفاظ-۲۳۰
منطق-۱۴۸	مقدس ایام-۲۳۲	معروفات-۱۶۱
منکول-۱۳۸، ۱۳۷، ۱۳۶، ۲۰۰	مقدس جنگ-۱۲۴	معلق تابوت-۱۹۵، ۳
من گھڑت تحریریں-۲۶۲	مقدس جھوٹ-۱۹۵	معلمین، مفروضہ-۲۴۹، ۲۲۱، ۱۹۶
مہاجرین حبشہ-۲۹۲، ۲۹۱، ۲۸۷	مقدس مقامات-۲۳۲	معیار تنقید مذہب-۱۵۷
مہاجرین مکہ-۲۷۴، ۲۷۳، ۲۷۱، ۲۷۰	مقوس، والی مصر-۳۱۳، ۳۱۴	معیار عظمت و کرم-۲۱۶
۲۷۵، ۲۷۴، ۲۹۹، ۳۰۲	مکتوبات نبوی-۳۱۴، ۳۱۳، ۳۰۰	مغالطہ-۲۸۴
مہمات نبوی-۲۷۳، ۲۷۲، ۲۷۱	مکروہ تشبیہات-۲۰۰	مغرب-۳۴۰، ۳۱۹، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۷۰
مہمات، الغابہ، اتم قرظہ، الجوم، وادی	مکہ-۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۳، ۲۷۸	۳۳۳، ۳۳۱
القرنی، ذک-۳۳۶	۲۸۹-۲۹۱، ۲۹۲، ۳۰۱، ۳۰۰	مغرب، باشندے-۴۴
مہمان نوازی، عرب-۲۷۲	۳۰۸، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۲۸	مغرب، تصو و عظمت-۳۲۰
موالی-۱۸۲	مکہ، فتح-۲۴۰، ۲۴۱، ۳۱۶، ۳۱۸	مغرب، خود ساختہ قوانین-۳۳۳، ۳۳۶
مواخات-۲۷۲	۳۲۵، ۳۲۶	مغرب، خود مختاری-۳۲
موازنہ-۲۲۹، ۲۸۰	مکئی زندگی-۲۶۵، ۲۶۴	مغرب، سیاسی ابتری-۹۴
مور-۷۰	۳۲۱	مغرب کے تہذیبی عناصر-۴۳
مورتیاں-۲۹۰	ملاذی گرد-۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۷	مغربی احساس برتری-۳۶
موزنین، مسیحی-۱۵۳، ۲۸۲	ملک الحادول-۱۳۵	مغربی اقدار-۲۱۰، ۲۵۷، ۳۲۰، ۳۳۷
موزارب-۱۲۶	ملک الکامل، سلطان-۸۲	مغربی سلطنت روم-۲۶

نفسیاتی الجھن-۳۳۳	نبوت، شان-۱۶۴	موسیٰ، حضرت-۲۳۳، ۲۲۵، ۲۱۴
نفسیاتی اعتبار-۱۶۴	نبوت کی عالمیت-۲۶۲	۲۵۱، ۲۵۳، ۲۶۴، ۲۷۹، ۲۸۵
نقشے-۱۷۵، ۱۷۹	نبوت کی گواہی-۱۹۷	۳۳۷، ۳۳۳
نکاح-۳۳۷، ۳۳۸	نبی گر-۱۹۵	موسیٰ بن شاكر-۱۷۹
نكلسن، آراء-۱۶۴، ۲۳۳، ۲۵۸	نجات، عیسائیت-۱۰۴، ۵۳، ۳۵۰	موسیٰ بن عقبہ-۲۹۱
نکولاس آف کیوسا-۱۳۵	نجاتی-۳۱۳، ۲۵۸	موسیٰ بن میمون، (میمونائیڈ)-۱۷۴
نکولاس، پوپ-۷۴	نجران-۲۵۳	موسیٰ بن نصیر-۸۸
نکولاس ثانی، پوپ-۷۷	نخلہ، مہم-۲۷۳، ۳۰۱، ۳۰۹	موقع پرستی-۲۱۵، ۲۷۷، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۷
نماز-۳۷۷	نذر-۲۳۶	مولد، رسول اللہ-۱۹۲
نمود-۲۶۴	نزاری، فرقہ-۶۶	مولک-۲۲۵
نوح، حضرت-۲۲۵، ۲۸۴، ۲۹۳	نسب، سلسلہ رسول اللہ-۱۹۲	میٹھو ڈسٹ-۱۰۱
نوفل بن معاویہ (عدوی)-۳۱۶	نسطوریہ-۱۳۶، ۱۹۶، ۳۵۰	یثاق مدینہ-۲۹۹، ۳۲۶، ۳۲۹، ۳۳۲
نولد کی-۱۶۰، ۲۱۱، ۲۳۵، ۲۵۸	نسطوری تحریریں-۲۲۸	یثاق مدینہ، شرکاء-۳۲۹
۲۹۱، ۲۸۸	نسل پرستی روشنی-۲۱۷، ۳۱۹، ۳۳۵	میرودکھن-۱۲۲، ۱۱۲، ۳۲
نومیدیا-۴۳	نشۃ ثانیہ-۸۴، ۶۹	میری-۲۵۱
نووی، علامہ-۲۹۰	نظریہ خیر-۱۱۸	میسوپوٹامی تصور حیات-۵۳
نیپلز-۹۰	نظریہ موت و حیات-۵۳	میکسی میٹن، شہنشاہ-۲۷
نیرو، شہنشاہ-۲۶	نظریاتی انتشار-۲۸۰	میکلیاوی-۷۰
نیگرو-۳۷	نظریاتی تثلیث (یونان)-۶۰	میکنس، البرٹ-۱۷۸، ۱۷۷
نیقہ-۶۷	نظریاتی حملے-۱۵۵، ۱۵۶	میونہ، ام المومنین-۳۳۸
نیوش، تختی-۱۸۰	نظریاتی حجاز-۱۴۹، ۱۵۰	مینوئل، شہنشاہ-۱۳۳
نئی راہ-۱۵۵	نظریاتی معاشرہ-۲۱۷، ۲۶۶	مینوئی معاشرہ-۳۶
	نظریہ ارتقا-۱۵۶	میور، ولیم-۱۵۸، ۱۶۰، ۱۶۵، ۲۳۵
	نظریہ توحید، ارتقاء-۲۲۳	۲۵۸، ۲۸۸، ۲۹۱
	نعمان بن منذر-۲۷۶	
بابس-۷۰	نعم بن مسعود، حضرت-۳۰۸، ۳۰۹	ن
باجرین-۱۸۲	نعم، جرم-۳۰۹	
بارون، حضرت-۲۵۱، ۲۵۳، ۲۵۴	نعمات رولینڈ-۱۸۴	ناروک مین-۳۸
بامان-۲۳۵، ۲۳۴، ۲۵۶	نفرت-۲۰، ۴۸، ۵۱، ۶۳، ۹۶، ۱۰۲	ناستک، فرقہ-۶۶
۲۵۵	۱۰۳، ۱۱۳، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۳۹	نامہ مبارک-دیکھیے مکتوبات
بامان، توتنگ-۲۵۵	۱۸۲، ۲۰۱، ۲۳۷، ۳۱۹، ۳۳۳	نبوت-۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۹، ۲۷۸
بامان، کردار استر-۲۵۴	نفس پرستی-۳۳۷	۲۸۳، ۲۹۵، ۳۲۰
بانک-۲۹۶	نفسیاتی اثرات-۲۹۸، ۳۳۷	نبوت، تصور-۲۶۹
بتھیار-۳۱۶		

۳۱۷- وفد طائف	۲۵۴، ۲۲۸، ۲۲۵- بیکل	۲۲۸، ۸۸- بیتی، فلیس کے
۳۲۵، ۳۱۷- وفود عرب، قبائل	۲۳۶- بیگ	۲۷۱، ۲۳۹، ۲۳۳، ۱۹۷- ہجرت
۳۳۵- وفود یہود	۱۹۲- تیلین، پیٹر	۲۷۲، ۲۷۵، ۲۷۹، ۲۹۹، ۳۱۹،
۲۳۶- وقف، برائے خدا	۷۰- بیوم	۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۸، ۳۲۸
۲۳۲- ولہوزن		۲۹۷، ۲۹۹، ۲۹۲، ۲۶۹- ہجرت حبشہ
۱۱۸- ولیم آف آرگنا	و	۳۱۵، ۳۱۳، ۸۶- برقل، شہنشاہ
۱۳۸- ولیم آف روبرک		۲۲۸- برماس، بن زیاد وہابی، حضرت
۱۹۲، ۱۹۰- وندور، راجر	۲۸۸، ۲۳۰، ۲۳۲- واٹ، ٹنگری	۵۶- ہرمزد
۱۵۳- وہانت جوزف	۳۴۴، ۳۰۳، ۳۰۰، ۲۸۹	۶- ہسو
۱۵۴- ویانا، اورینٹل اکیڈمی	۲۲۰- واجب الوجود	۲۲۸- بلالی، تہذیب
۱۴۲- وینن کونسل	۲۵۵- وادی مقابر شاہان	۱۹۴- بلدے برت
۱۶۴، ۱۵۷- ویبر، میکس	۷۸- وارم	۳۶، ۱۷- بلیٹک سوسائٹی
۲۷- ویزی گاتھ	۳۰۴، ۲۰۵- واقدی	۲۵۶- 'ہم'
۸۷، ۲۹- ویزی گاتھ سلطنت	۱۵۴، ۷۰- والسیغ (والسیر)	۲۵۶- 'ہم آمن'
۱۷- ویسلیس، آندرے	۱۷۴- والچر	۲۸۴- ہم کلائی
۱۳۹، ۱۴۳- وے کف	۱۹۲- والدین، رسول اللہ	۲۵۶- 'ہم نسر'
۲۹- ویندال سلطنت	۲۸۴- واہمہ	۲۷- ہن
۱۸۲، ۲۸- ویندال، قبائل	۱۰۶- وتن برگ	۲۹۱- ہنس
۲۲۷- ویشک	۳۵۰، ۲۹۸- وحدانیت	۲۶۱- ہند
۱۸۹- ویتکن دی وارڈ	۱۹۶، ۱۹۳، ۱۸۹، ۱۶۵، ۱۶۰- وحی	۳۸- ہند-اروپائی
۲۱۱، ۱۳۵، ۱۳۹- ویتیر، سیل، پیٹر	۲۴۹، ۲۴۶، ۲۴۳، ۲۲۶، ۲۲۱، ۲۰۶	۳۰۶- ہند بنت عقبہ
	۳۱۸، ۲۹۵، ۲۹۴، ۲۸۸، ۲۸۴، ۲۵۸	۱۷۳- ہند سے
ی	۳۳۱، ۳۲۴- ۳۲۱	۱۰۱، ۷۷، ۷۷- ہنری، شہنشاہ فرانس
	۴۴- وراشت ٹیکس	۸۲- ہنسا اسٹینس
۲۰۳، ۱۸۳- یاجوج ماجوج	۳۴۹، ۳۲۸- وراشت نبوی	۳۴۰- ہندوستان
۲۹۳- یاسر، حضرت	۳۹- ورجل	۷۵- ہنگری
۳۳۲- یاسین بن عمیر بن کعب	۲۰۵، ۱۹۷- ورق بن نوفل	۱۸۲- ہونگر
۲۵۲- یحییٰ، حضرت	۹۱- ورنہ، جنگ	۶۹- ہولی رومن ایمپائر
۲۴۰- یرموک، جنگ	۱۵۰- وسائل، درکار	۲۸- ہونوریش، قیصر
۳۱۵، ۱۳۵، ۱۳۲- یرودلم	۲۶- ویا سین، شہنشاہ	۱۸۵- ہیرود
۲۳۴- یزید بن ہشام	۳۲۱، ۳۱۸، ۲۷۹، ۲۴۳- وصال نبوی ﷺ	۳۳۹، ۵۶- ہیرودوس
۸۷- یزید بن معاویہ	۴۶- وطن پرستی، روم	۲۵۶- ہیروگلف
۲۸۵- یسعیہ، نجی	۱۲- وفات، ڈاکٹر جیلانی	۲۵۵- ہیریبور

یوحنا - ۳۳۱، ۳۱۱	یسوع - ۲۲۶، ۲۵۷، ۲۶۳، ۲۶۸،
یوحنا، حضرت - ۳۱۱	۲۸۰، ۳۲۴، ۳۲۵
یوحنا بن - ۳۲۹، ۹۰، ۲۵، ۱۷	یعقوب، حضرت - ۲۸۴، ۲۲۵
یونانی - ۳۴۰	یک زوجی - ۲۵۲، ۳۳۱
یونانی اثرات - ۲۵۷	یکسانیت - ۲۳۰
یونانی اعتراضات - ۲۵۷	یکٹی قبائل - ۳۱۹، ۲۲۸
یونانی علم الاضنام - ۵۴	یگہ - ۳۲۰
	یہوواہ - ۲۵۴، ۲۲۵، ۱۲۳
	یہود - ۳۳۶، ۳۲۵، ۳۲۹، ۲۱۳، ۱۱۶، ۱۰۲
	یہودیخیر - ۳۳۶، ۳۳۵، ۳۳۲، ۳۰۸
	یہود، عربی النسل - ۳۲۵
	یہود مدینہ - ۳۲۵، ۳۰۷، ۲۹۹، ۲۳۲
	۳۳۵، ۳۳۴، ۳۳۳، ۳۳۲، ۳۳۱
	یہود نصاریٰ - ۳۳۱
	یہودیت - ۲۳۷، ۲۲۸، ۲۲۷، ۲۱۲، ۲۱۰
	یہودیت و نصرانیت - ۲۲۰، ۲۱۳
	یہودی تہو و رموز - ۵۴
	یہودی تہو و رخصت - ۲۲۵، ۲۲۳
	یہودی توحید - ۲۲۵، ۲۲۴، ۲۲۲، ۲۲۱
	یہودی خدا، بھولنے والا - ۲۲۳
	یہودی خدا، بڑی لوشنے والا - ۲۲۳
	یہودی خدا، ترساں و پشیمان - ۲۲۳
	یہودی خدا، شراکت دار - ۲۲۳
	یہودی خدا، متذبذب - ۲۲۳
	یہودی خدا مجسم - ۲۲۳
	یہودی خدا، محدود طاقت والا - ۲۲۳
	یہودی خدا، مغضوب الغضب - ۲۲۳
	یہودی خدا، نسل پرست - ۲۲۳
	یہودی روایات - ۲۲۳
	یہودی سازش - ۳۳۰
	یہودی شریعت - ۳۳۵، ۲۲۶
	یہودیہ - ۳۴۰
	یہود کے تراجم - ۱۷۳



www.kinabalu.com

تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ اسلام اور عیسائیت کا باہمی تعارف حرب و ضرب کی اس صلیبی رزمگاہ میں ہوا جس میں مسلمان ہمیشہ فاتح رہے۔ عیسائی مبلغین نے پندرہویں صدی عیسوی تک مسلسل ہزیمت کے بعد اپنی جنگ کا نیا میدان افکار و نظریات کی معرکہ آرائیوں میں تلاش کر لیا۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے علمی مصادر کا تحقیقی مطالعہ معاندانہ نیت سے کیا جس کے نتیجے میں اسلام قرآن پیغمبر اسلام اور اسلامی تہذیب کے خلاف اتہامات و الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ اہل مغرب کے اس تحقیقی رویے کو استشراف اور ان مطالعات میں مصروف حضرات کو مستشرقین کہتے ہیں۔ گزشتہ چار صدیوں میں اسلامی لٹریچر کے بارے میں ان کا جو ذخیرہ سامنے آیا ہے وہ سیکڑوں معاندانہ کتابوں اور ہزاروں خصمانہ مقالات کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ پیش نظر علمی مقالے میں مستشرقین کے اسی انداز فکر کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس ذخیرے میں ہمارے بعض علمی مصادر کو انہوں نے جس تحقیقی جانفشانی سے مرتب و مدون کیا ہے وہ لائق داد ہے۔

اس تحقیقی مقالے کے محقق ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی مرحوم بنیادی طور پر ایک انجینئر تھے مگر انہوں نے جامعہ کراچی سے اس موضوع پر اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کی جس میں استشراف کی جملہ سببی، تحریری اور منفی کارروائیوں کے آغاز و ارتقاء کو بڑے سلیقے اور فنی پختگی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس مقالے کو ان کے فرزند ارجمند آصف اکبر صاحب نے بڑی علمی متانت اور تحقیقی ذمہ داری کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ مستشرقین کی ایک بڑی تعداد عربی زبان سے ناواقفیت کے باعث تراجم پر انحصار کرتی ہے نیز وہ قرآن و حدیث کے اساسی مصادر کی بجائے تاریخی روایات کو ترجیح دیتی ہے۔ تاریخی روایات کے اس پلندے سے انہوں نے بڑی محنت اور بدینتی کی خوردبین لگا کر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ہرزہ سرائیاں کی ہیں۔ قدرت کا یہ عجیب فیصلہ ہے کہ اس خاصیت کی لئے اُن کے ہاں جتنی بڑھتی چلی گئی، اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و عظمت میں اسی قدر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے نیز قبولیت اسلام کی لہر روز افزوں ہے۔ اسلام اور مستشرقین کے حوالے سے اس تحقیقی مقالے کی اشاعت بیت الحکمت کے لیے وجہ افتخار اور باذوق قارئین کے لیے باعث طمانیت ہوگی۔

پروفیسر عبدالجبار شاکر
ڈائریکٹر بیت الحکمت، لاہور



فَضْلِ بَکْسِ پَر واکرٹ

اُردو بازار، نزد پو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے

پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، دارالحدیث، لاہور



فرسٹ فلوور، الحمد باریکٹ، مغربی سٹریٹ

اُردو بازار، لاہور فون: 7320318

ای میل: hikmat100@hotmail.com